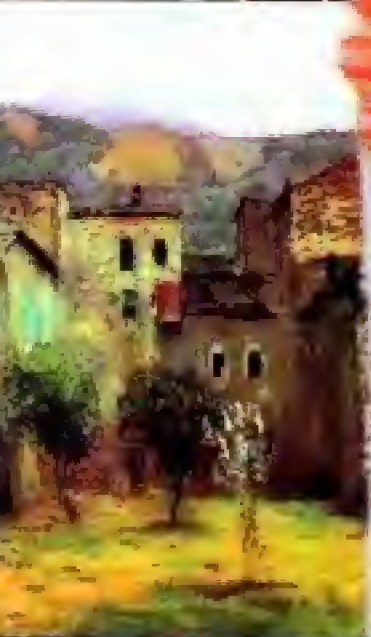


مچی کہانیاں آپ جیساں چاہیں

# سنگزشت

ماہنامہ مارچ 2015

معارف  
معراج جمال



## PDFBOOKSFREE.PK

قلمی الف لیلا: علی صفیان آفاق (مجموعہ) کا آخری حصہ  
استاد ادب علامہ صاحب کے ایک مشہور ناول کا اردو ترجمہ  
پراسرار قلندر مغرب کے معروف ادیب کی سوانح حیات  
بہارِ لعل کہ جس نے دلی ایک اچھوتی سی شوق آموغہ جیوانی

www.pdfbooksfree.pk



آپ کی باتیں آپ کے  
مشورے اور آپ کے سوال

ایک صفحے میں مکمل، مختصر، مختصر  
ایک نادر روزگار کا تعارف



مغرب کے ایک  
معروف ادیب کا ذکر خاص



سبھی ادیب کو پروان  
چڑھانے والے کا زندگی نامہ



اردو ادب کے ایک تاج  
تقدیر ادیب کا احوال



اس وقت لوگ  
آدھی دنیا سے لاعلم تھے



مسلم صحافت کی کہانی کہانیاں  
مسلم نگری کی باتیں یادیں



مشرق و مغرب کے  
خطائے شہر کا تذکرہ



بلند چو صلوں اور بے مثل لولوں سے  
گندھی سنسنی خیز اور تہمت انگیز داستان



ملک ملک میں  
مدفون خزانے کا تذکرہ



بی آئی اے کے ایک  
ریشہ نژاد افسر کی خودنوشت

قرآن حکیم کی معجز آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور  
جہلے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر  
آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق پڑھنے سے محفوظ رکھیں۔





قارئین کرام!  
السلام علیکم!

عرصہ دراز سے ہم ایک نعرہ سنتے آئے ہیں کہ اس ملک کو سب سے زیادہ خطرہ یہود و ہنود سے ہے۔ وہ سازشیں کر کے ہمارے ملک کو کمزور کر رہے ہیں۔ اس بات میں صداقت سچی ہے یہ اہل دانش جانیں، ہم تو اپنے اطراف میں کچھ اور دیکھتے ہیں۔ سڑک پر ٹھیکس تو بے پتہ ٹریفک، ایک دوسرے کو کچل دینے کی طرح اوور ٹریفک، پولیس کی کھلے عام رشوت ستانی، کیا یہ یہود و ہنود کی کارستانی ہے؟ پرائیویٹ اسپتالوں میں منہ مانگی فیس، اسپتال کے چار جز دگنا کرنے کے لیے خواہ مخواہ مریض کو لالچنی مرض کا خوف دکھا کر ٹیسٹ کرانے کی ہدایت تاکہ اسپتال کے ٹیکنیشنز کی تنخواہ نکلتی رہے۔ اسپتال کی روٹی بحال رہے۔ جعلی دوائیں بنانا، دواؤں کی قیمت کئی گنا زیادہ رکھنا تاکہ دکاندار و دیگر ایجنٹس کو کمیشن زیادہ دیا جاسکے۔ رہ رہ کر ایسی دوائیں جو مریض کے لیے انتہائی ضروری ہیں مارکیٹ سے غائب کر دینا، کیا یہ بھی یہود و ہنود کی سازش ہے؟ پینے کے پانی کی لائنوں میں۔ نالے کے قریب سے گزرتے ہوئے پائپ میں سوراخ کر دینا تاکہ سیوریج کا پانی بہ آسانی پینے کے پانی میں مل جائے اور بدبودار پانی سے خوف زدہ ہو کر لوگ منزل وائر کے نام پر صرف کلورین سے صاف شدہ پانی کی بوتلیں خریدنا شروع کر دیں جس کا معقول ٹیشن اداروں کے چند افسران کی جیب میں جائے؟ ٹنگوں سے کس طرح کا پانی آرہا ہے۔ یہ ہاتھ کراچی بالخصوص بفرزوں کے پانی کا تجزیہ کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔ کیا یہ بھی یہود و ہنود کی سازش ہے؟ لکھنے بیٹھوں تو ایک طویل فہرست بن جائے گی۔ اگر یہ دشمنان وطن کی سازش نہیں ہے تو پھر ایسی حرکتیں کرنے والوں کو ہم کیا نام دیں؟ اگر اس ذہنیت پر لگام نہ لگایا تو اس کا انجام کیا ہوگا اس کا اندازہ بھی ہر ایک کو ہے بقول سید آل احمد چمن پھیلائے ناچ رہے ہیں پگ پگ کالے ناگ بستی بستی قریہ قریہ آگ مگلی ہے آگ ہائے رہے اپنے بھاگ

معراج رسول

جلد 25 • شماره 03 • مارچ 2015ء

ماہنامہ  
بیت

مدیر: عبدالغنی: عذرارسل

شعبہ اشتہادات

نمبر اشتہادات: 0333-2256789

لایہ کراچی: 0333-2168391

لاہور: 0323-2895528

فریڈل ہارٹ: 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 50 روپے وہ ضررانات 800 روپے

پبلشر: پرویز انور: عذرارسل

مقام اشاعت: لاہور 11 ایکس پریس

ڈیفنس سٹریٹ پرائمری کورنگی روڈ

تقریبی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: این جی پرنٹنگ پریس

باکی اسٹیڈیم کراچی

ڈاکٹریٹ کراچی • پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802351  
E-mail: jdgroopia@hotmail.com





# تربیت کار

سرگزشت

سکندر لودھی کے ساتھ 935 ہجری میں چشت سے ہند آنے والے ابوالاعلیٰ کے گھرانے نے کرنال کے قریب براس کو سکونت کے لیے منتخب کیا تھا لیکن شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں یہ خاندان مستقلاً ودلی آ گیا۔ اس خاندان میں 1857ء کی جنگ آزادی سے دو سال پہلے سید احمد حسن پیدا ہوئے۔ جب سرسید نے علی گڑھ میں مدرسہ قائم کیا تو اپنے قرابت داروں سے استدعا کی کہ اپنے بچوں کو ہمارے مدرسے میں داخل کراؤ۔ سید احمد حسن کی ماں سرسید کی رشتے دار تھیں۔ انہوں نے سید احمد حسن کو علی گڑھ بھیج دیا۔ انہی وہ وہاں پڑھ ہی رہے تھے کہ ودلی کے ایک شخص کا وہاں جانا ہوا۔ اس نے وہاں کچھ بچوں کو کرکٹ کھیلتے دیکھ لیا۔ ان بچوں میں سید احمد حسن بھی تھے۔ ایک ہی طریقہ کار کا پتہ فرنگیوں کا کھیل کھیلتے نظر آیا تو وہ سخت متعجب ہوئے اور ودلی آتے ہی سید سے اس کے والد سے ملے اور بولے۔ ”بھائی صاحب احمد حسن سے تو ہاتھ دھو لیجیے۔ یہ تو گیا کام ہے۔ وہاں علی گڑھ میں، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ کافر کرتی (پینٹ شرٹ) پہنے، ہاتھ میں یہ بڑا سا چوڑا ڈنڈا لیے۔ گول گیند کو پیسنے کا کفرانہ کھیل کھیل رہا تھا۔ باپ نے جو یہ سنا تو سخت طیش میں آ گئے کہ ہمارا بیٹا کافروں والا لباس پہنے، انہوں نے اسی وقت اسے واپس لانے کے لیے آدمی دوڑا دیا۔ اس طرح احمد حسن کی انگریزی میں تعلیم حاصل کرنا رک گیا مگر ذہن میں کشادگی آ چکی تھی۔ اس لیے ماں سے ضد باندھی کہ مجھے الہ آباد بھیجا جائے۔ میں قانون پڑھوں گا۔ ماں نے کسی نہ کسی طرح شوہر کو رام کیا اور احمد حسن کو الہ آباد بھیج دیا۔ وہاں رہ کر اس نے اسکول کی اعلیٰ جماعتیں پاس کیں پھر مختار (قانون) کی تعلیم حاصل کی تاکہ وکالت کر سکے۔ مختار کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کہاں وکالت کی جائے یہ ابھی طے نہ کر پایا تھا کہ ریاست دیو گڑھ سے بلادوا آ گیا۔ راجا دیو گڑھ کے ولی عہد کے لیے اتالیقی کی ضرورت تھی۔ وہ وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ اسی اسمی کے لیے ان کے استاد جنہوں نے ایام طفلی میں ابجد سے روشناس کرایا تھا وہ بھی آئے ہوئے تھے۔ احمد حسن نے اپنے استاد کے آنے کا سن کر راجا صاحب کو کہلوا دیا کہ ”میں اپنے استاد کے مقابلے میں پیش نہیں ہو سکتا اس لیے یہ نوکری انہی کو دے دیں اور مجھے والہی کی اجازت دیں۔“ دوسری طرف استاد نے جب یہ سنا کہ ان کا ایک پرانا شاگرد مقابلے پر ہے تو انہوں نے کہا: ”وہ میرا شاگرد ہے۔ بھلا میرے مقابلے میں کیا پڑھائے گا۔“ اخلاق کا یہ نمونہ دیکھ کر راجا صاحب نے کہا: ”بھیس استاد کی ضرورت نہیں، بھیس تو شاگرد کا اخلاق پسند آیا ہے۔ اسے ہی میں اپنے ولی عہد کا اتالیق مقرر کرتا ہوں۔“ کئی سال تک احمد حسن دیو گڑھ میں رہ کر ولی عہد کو خوب تعلیم سے آراستہ کرتے رہے۔ پھر وہاں سازشوں کا سیلاب سا آ گیا اور بالآخر ولی عہد کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس سانحے نے اسے صدمے سے دوچار کر دیا اور وہ دیو گڑھ کی ملازمت ترک کر کے واپس ودلی آ گئے مگر ودلی میں دل نہ لگا تو ایک کے بعد ایک کئی شہر گھوم ڈالے۔ آخر میں شہر کولہوا میں ایک عازمی آباد اور بھی بلند شہر میں وکالت کرتے دن گزارتے رہے۔ 1896ء میں ایک مقدمہ کے سلسلے میں وکالت کے لیے اورنگ آباد (دکن) تشریف لے گئے۔ یہاں مولوی محی الدین خان صوبے کے میر عدل (چیف جسٹس) تھے جو احمد حسن کے رشتے میں بچا تھا۔ ان کے ایما پر احمد حسن نے گلبرگ میں وکالت شروع کر دی اور چند ہی ماہ میں خاصی ترقی کر لی۔ اب تک وہ ایک ناکام مختار (وکیل) تصور کیے جاتے تھے مگر گلبرگ میں جلد ہی ان کا توفی بولنے لگا۔ اب ان پر فرکیٹ کے اثرات حاوی ہونے لگے تھے۔ انگریزی خیالات و طرز معاشرت کا غلبہ ہونے لگا تھا۔ وہ اب پوری طرح فرنی لباس (کوٹ پتلون) پہننے لگے تھے جب کہ عام مسلمان ایسے لباس سے نفرت محسوس کرتا تھا مگر یہ عرصہ طویل ثابت نہ ہوا۔ ان کے شکستے قدم کو مولوی محی الدین خان نے روک لیا اور وہ پھر سے مذہب کی جانب لوٹ آئے۔ ادھر ادھر کی شہروں میں وکالت کی مگر اب وہ کیس لینے میں حد درجہ احتیاط کرتے تھے کہ کسی جموں یا مجرم کی پیروی نہ کر جائے۔ اس لیے وکالت ناکام ثابت ہونے لگی۔ گوکہ ایک ناکام وکیل تھے مگر بچوں کی تربیت پر خاص نظر رکھتے تھے۔ بچے کو جیسا کہ چاہتے نظر آ رہے تھے۔ 1920ء میں وہ بھوپال اپنے بڑے بیٹے سید ابو محمد کے پاس گئے ہوئے تھے وہیں ان پر فلاح کا حملہ ہوا اور وہ ودلی کے علاج کر گئے۔ جانتے ہیں یہ سید احمد حسن کون تھے؟ یہ سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی کے والد تھے۔



# شہر خیال



جیٹا شوکت رحمن خلک کا پٹا اور سے تعزیت بھرا خط۔ ”محترم آفاقی صاحب مرحوم لکھتے وقت دل پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میرے عزیز دوست شاہ جہانگیر شاہد نے میرے بچے کاشف کو فون پر بتایا کہ آفاقی صاحب کا انتقال ہو چکا ہے، میرے برادر راست خلک صاحب کو نہیں بتا سکتا اس لیے تم اپنے والد کو احسن طریقے سے بتا دو کہ وہ بیمار ہیں کہیں وہ اس بات سے اثر نہ لے لیں۔ میں اس وقت فلمی لفٹ لیلہ میں اداکار ویاہمن خان کے مضمون کے سلسلے میں آفاقی صاحب کو خط لکھ رہا تھا کہ اچانک کاشف میرے کمرے میں آیا آتے ہی بولا۔ ”کاشف بے کہا۔ ”مگر وہ تو شدید بیمار ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کاشف بچے! آفاقی صاحب ہجرت سالی میں بھی بہت مضبوط ارادوں کے مالک ہیں۔ ان کو جراتی میں طرح طرح کی بیماریاں ملی ہیں مگر وہ مردانہ وار مقابلہ کر رہے ہیں، کاشف نے سر ہچا کیا ”مگر وہ تو۔۔۔۔۔“ عزیز اس میں اس نکو خبر کے سنانے کی تاب نہ لگی کہ خبر غصے کے بخور کا سطر نے خبر سنائی کہ مشہور ادیب علی ستیان آفاقی کا انتقال ہو چکا ہے۔ انہیں ماؤں کاؤں کے

قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی جیسے بجلی بجھ کر پڑی۔ اب جب میں آفاقی صاحب پر لکھتا ہوں تو میرے سوچنے اور لکھنے کی تمام قوتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ محترم آفاقی صاحب سے میری پہلی ملاقات 50 سال پہلے ہوئی تھی۔ جب وہ 32 سال کے اور میں 22 سال کا نوجوان تھا۔ 1966ء میں جب میں نے اداکار بننے کی غرض سے لاہور جانے کا فیصلہ کیا۔ میرے والد صاحب کی قصہ خوانی بازار میں کتابوں کی دکان تھی۔ قریبی دکان صادق کمیشن اینجینی کی تھی جس کے مالک لالہ وزیر محمد صدیقی تھے میں نے ان کو دل کی بات بتائی کہ میں فلموں میں کام کرنا چاہتا ہوں، میری رجحان کریں۔ انہوں نے مجھے چند سفارشی خطوط دیے۔ ان میں ایک خط آفاقی صاحب کے نام بھی تھا۔ لاہور پہنچ کر سیدھے ایور نیو اسٹوڈیو پہنچا۔ آفاقی صاحب اپنی کار سے فیک لگائے اداکاروں کے جمعیت میں گھرے تھے۔ پہلی ملاقات میں آفاقی صاحب کا مجھ پر اچھا اثر پڑا۔ دراز قدم، چادڑ نظر، خوش لباس۔ میں نے آفاقی صاحب سے علیک سلیک کی۔ انہیں صدیقی صاحب کا خط دیا۔ انہوں نے خط پر سرسری نظر ڈالی اور خط واپس کر دیا کہ میرے پاس کام نہیں ہے۔ اس غیر متوقع جواب پر ذہنی تکلیف ہوئی مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ لاہور میں شاہ نور اسٹوڈیو سے کچھ فاصلے پر ایک دکان اداکاروں کے رہائشی علاقے میں اداکارہ اوما دیوی کی معرفت ایک مکان کا بیٹھک 20 روپے ماہوار کرائے پر لے کر اس میں رہنے لگا۔ کچھ عرصے میں سے زیادہ فلموں میں کردار کیے۔ آخر کار 1972ء کے لگ بھگ جیسے شباب کیرئری نے فلم ”بازار“ میں شائستہ قصیر کے مد مقابل ہیرو منتخب کیا۔ دوسرے دن شباب اسٹوڈیو میں کنٹرکٹ سائن کر کے جانا تھا مگر میں نے ایک خاص وجہ کی بناء پر ہمیشہ کے لیے فلمی دنیا سے جھوڑ کر پٹا دور کا راستہ اختیار کر لیا۔ بعد میں ہیرو کا مکی کردار عمران کو دیا گیا۔ 2007ء کی بات ہے کہ ایک جانے والے نے فلمی لفٹ لیلہ پڑھنے کو دی۔ یہ ماہنامہ سرگزشت کی فلمی لفٹ لیلہ کا انتخاب تھا۔ جب میری نظر لالہ وزیر محمد صدیقی صاحب کے مضمون پر پڑی تو مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے شکوہ شکایت کی صورت میں ایک خط آفاقی صاحب کو لکھا۔ مجھے اس خط کا جواب چند دنوں بعد 8 مارچ 2007ء کو ملا۔ یہ آفاقی صاحب کا پہلا خط تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے خط میں لکھا کہ میں نے بھی اپنے گھر یلو ملازم کو بھی ”تو“ سے نہیں پکارا اور اپنے روپے پرائسوں کا اظہار کیا اس طرح ہمارے مابین خط و کتابت کا سلسلہ چلنا رہا۔ میں نے انہیں ایک خط میں لکھا کہ مجھ میں لکھنے کے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں تو انہوں نے مجھے لکھنے کی دعوت دی۔ 7 مئی 2007ء کو میرا پہلا مضمون ”قصہ خوانی“ کے عنوان سے چھپا اور میرے دیگر پانچ مضامین بھی متواتر چھپتے رہے اور ساتھ ساتھ آفاقی صاحب کا ارشاد تھا کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔

میری فلمی یادداشتوں کو فلمی لفٹ لیلہ میں پٹا اور سے خط کے عنوان سے چھپاتے رہے۔ میں ان کو مزید اجیدانہ امداد سے لکھتا اور میرا انداز آفاقی صاحب کو بہت پسند تھا۔ پہلی ملاقات کو لگ بھگ پچاس سال کا عمر گزر چکا ہے۔ میں اب نوکر ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ الجہا ہی شخص تھے۔ وہ ایک اچھے اویس اور داستان گو تھے اس کے ساتھ ساتھ مشاہدہ کرنے والے انسان تھے۔ ان کا ہنر و بخشش اور دلچسپ شخص تھے۔ مجھے اس بات پر



انسوس نہیں کہ وہ میرے ہم عصر نہ تھے بلکہ میری خوش قسمتی تھی کہ ان کا اور میرا زمانہ ایک تھا۔ محترم آفاقی صاحب خور ایک اچھے قصہ گو تھے لیکن وہ قصہ سننے میں بھی لطف لیتے جیسے پاک و ہند کے غالب، ایران کے خوب حافظہ اور ہمارے ہر محنت خواہ کے خوش حال بابا۔

آفاقی صاحب نے قومی زبان اردو ادب کی خدمت میں اپنی زندگی گزار دی۔ ایرانی سالی میں بھی وہ جوانوں کی طرح لکھتے۔ محترم آفاقی صاحب کا تعلق ایک وقت قلموں سے رہا مگر وہ فلمی آدمی نہیں تھے۔ ایک ایسے مسلمان جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ سچے مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ جس کا ظاہر اور باطن ایک ہو وہ اس مقولے پر پورا اترتے تھے۔ ان کا آخری خط 19 اکتوبر 2014ء کو ملا جس میں انہوں نے مجھے خالد نجیب خان صاحب سے رابطہ رکھنے کی ہدایت کی۔ اپنی بیماری کا تذکرہ کیا۔ میرا اور بچوں کا حالی احوال پوچھا۔ میں نے آفاقی صاحب پر ایک مضمون لکھا تھا جو انہوں نے بے حد پسند کیا مگر اس مضمون کی اشاعت سے انکار کیا اور لکھا کہ میں اپنی تشہیر پسند نہیں کرتا۔ اخبارات اور ٹی وی کو انٹرویو نہیں دیتا۔ گوشہ نشینی کی زندگی پسند کرتا ہوں۔ آفاقی صاحب جو اس گھر بلند حوصلہ بزرگ تھے۔ ان کا جس شعبے سے واسطہ رہا اس کو نمایاں مقام دلایا۔ یہ آفاقی صاحب کا کمال فن تھا کہ اپنے دور کے قابل قدر شخصیات سے ملے اور ان سے شرف دوستی حاصل کی جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ پاکستان کی پہلی مزاحیہ فلم ”ٹھنڈی سڑک“ کے نام سے جانی۔ اداکار کمال، آفاقی صاحب کی دریافت تھے۔ کئی روزناموں اور ہفت روزوں کے ایڈیٹر رہے۔ روزنامہ آفاق میں پہلی مرتبہ اداکارہ نگہت سلطانیہ کا انٹرویو لیا۔ انہیں یہ شرف بھی حاصل رہا کہ انہوں نے ہی روزنامہ آفاق سے فلم ایڈیشن کا آغاز کیا اور ان کے نام کے ساتھ آفاقی نام مشہور ہوا۔ (کوکہ وہ اپنے والد کی وجہ سے آفاقی لکھتے تھے ہفت روزہ فلمی میگزین کے اجراء کے ساتھ بطور ایڈیٹر مرتے دم تک رہے اور بانی ایڈیٹر کا شرف حاصل کیا۔ 1990ء سے ماہنامہ سرگزشت میں اپنی یادداشتوں کو فلمی الف لیلہ کے عنوان سے ترتیب دیتے رہے جس نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں، ایوارڈز حاصل کیے اور فلمیں بنائیں مگر سب سے بڑھ کر وہ ایک عظیم انسان تھے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاں اور دھما۔

ہذا انجم فاروقی ساحلی کا مکتوب لاہور سے۔ ”ہمارے والد صاحب کے دوست اور ممتاز کالم کار علی سفیان آفاقی وفات پا گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ شاید فلمی الف لیلہ کی جگہ اب کچھ اور شروع کیا جائے گا۔ میں آپ کی توجہ کا طالب ہوں۔ غنوغ اور شیر نیاں کے بعد ابھی تک ”سکھ پور کا آدم خور“ شائع نہیں ہوئی۔ (الفاظ کے برتنے پر توجہ دیں)۔ اُمید ہے ”تذکرہ“ چمن کے بعد ”تذکرہ کھان“ محترم اعلیٰ علم صاحب کے ذریعے سے آپ تک پہنچ گئی ہوگی۔ (دونوں ہی سرگزشت کے انداز کی نہیں ہیں)۔“

ہذا ڈاکٹر قمر العین نے اسلام آباد سے لکھا ہے۔ ”پشاور میں آرٹی چیک اسکول کے واقعے نے پوری قوم کو صدمہ پہنچایا۔ ہمیں بھی اس واقعے نے متاثر کیا ہے کیوں کہ میرے کزن کا بیٹا بھی اس سانحے میں شہید ہوا ہے۔ چار بہن بھائی اس اسکول میں پڑھتے تھے۔ تین بھولے بہن بھائی جو جو نیئر سیکشن میں تھے پیدل ہی گھر بھاگ گئے جب کہ یہ بڑا بھائی اسی کلاس میں تھا جس کے سب بچے شہید ہوئے۔ معصوم بچے تو ایک گولی سے مر گئے تھے لیکن ان ہتاکہ درندوں نے ان کو پھینکی کیا۔ میرے کزن کے بیٹے کے سر پر بہت سی گولیاں لگیں۔ (پھر بھی بہت سے لوگ ان درندوں کو برا نہیں کہتے) سلیم قیصر صاحب نے مجھ سے مدد کی درخواست کی ہے۔ آپ کی مدد تو قانون کا کوئی ماہر ہی کر سکتا ہے۔ یہ میری فیلڈ نہیں ہے۔ سرگزشت کا فروری کا شمار بھی ہمیشہ کی طرح بہترین رہا۔ فلمی مضامین بہت اچھے رہے۔ پاکمال میں آئن اسٹائن کے متعلق معلومات میں اضافہ ہوا۔ غلامی غلام بابا سے فارسی، سندھ کے بھید، خون کے آنسو بہت پسند آئے۔ سچ جاننا بہت اچلی درجے کی تھیں۔ سرگزشت نے اپنا معیار نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ روز بروز بہتر ہو رہا ہے۔ رانا محمد شاہد صاحب کی والدہ کی وفات بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔“

ہذا طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ ”میں علی سفیان آفاقی انگل کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتی ہوں۔ علی سفیان جیسا درخشاں باب ہند ہو گیا لیکن کیا ہم ان کو بھول جائیں گے؟ کیا فلم انڈسٹری ان کی خدمات بھول جائے گی؟ شاید بھول جائے کیونکہ ہم بہت بے وفا اور بے حس لوگ ہیں، ہم اپنے محسنوں کو بہت جلد بھولتے ہیں لیکن مجھے نہیں ہے کہ ہم میں سے بہت سے حس بھی موجود ہیں جن کے دل میں درد اور آنکھوں میں سوز کے آنسو مسلسل چمکتے ہیں اور علی سفیان صاحب کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ ان جیسے نہیں، شائستہ اور دوستوں کے علم خوار انسان کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا کرے اور ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ میں نے 27 جنوری کو ہی فیس بک پر علی سفیان آفاقی صاحب کے لیے سب دوستوں سے دعائے مغفرت کی درخواست کی۔ ”ایم گروپ میں سیمپل عشق، JDP فن کلب، سرگزشت، جاسوسی اور سپینس گروپ اور جی ٹی ٹی وی اور مشہور ڈائریز باصر ملک، امجد جاوید اور طاہرہ گلزار صاحب کو فون کر کے بتایا تو وہ سب بہت دکھی ہو گئے اور ان کی مغفرت کے لیے دعا کرتے رہے۔ آفاقی صاحب کے جانے سے جو کمی ہمارے دل میں ہوئی ہے وہ شاید کہ پوری نہ ہو۔ یہ کھوتو ہمارا مشترکہ ہے جو بھی شتم نہیں ہوگا۔ نہ بھلا جائیں گے۔ انار سے میں معراج رسول انگل کی پرموز باتیں بڑھ کے بہت دکھ ہوا کہ ہم سب مسلمان اتنے کفر و ایمان کے کیوں ہو گئے ہیں۔ کیوں اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ واقعی آج ہم تمام پاکستانی یکجا نہ ہوئے تو کچھ قیامت ہم یک جا نہیں ہوں گے۔ اللہ ہم سب پاکستانیوں کو اتفاق اور اتحاد سے رکھے۔ یک جہتی پہ بابائے فارسی، جناب پروفیسر ڈاکٹر سید سبطین رضوی کے بارے میں پڑھا۔ علم کی



کمی تھوڑی اور کم ہو گئی دل سے سرگزشت اور ادارے کے لیے دعا گوئی کہ ہمارے اسنے پیارے سرگزشت میں ہم طرح طرح کی معلوماتی تحریریں پڑھتے ہیں اور اپنی علمی طاقت میں اضافہ کرتے ہیں ویلڈن معراج رسول صاحب ادارے کی خدمات دینے کے لیے دل سے دعا گوئی ہے کہ دن دن کی اور رات چٹکی ترقی کریں، آمین۔ چلتے ہیں اب ذرا دوستوں کے خطوط پر کی طرف۔ پہلے نمبر پر ہمارے پیارے دوست رانا محمد سجاد صاحب آئے۔ سچ کہتے ہو سجاد بھائی میرا دل کرتا ہے کہ میں سراپا بارہ دین جاؤں اور ان تمام آدم خور جو انسانیت کے روپ میں چھپے درندے ہیں ختم کر دوں۔ ظالموں نے نہ صرف معصوم بچوں کو آنکھوں اور سر میں گولیاں ماری ہیں بلکہ چھری سے ان کے گلے بھی کاٹے ہیں۔ میرے کانچ سے صرف 15 یا 20 منٹ کے فاصلے پر یہ انہوں نے ناک حادثہ ہوا ہے۔ ہمارے کتنے اسٹاف ممبر کے رشتہ دار ان میں شامل تھے کچھ شہید ہو گئے کچھ زخمی ہوئے۔ ابھی تک پورا پشاور سو گوار ہے اور بچے اور ان کے والدین ذاتی مریش بن گئے ہیں۔ شکر یہ سجاد بھائی آپ نے مجھے خبر دے کر کے قابل سمجھا۔ بھائی محمد انور مردوان والسلام شکر یہ کہ آپ نے ہمیں یاد کیا۔ بھائی سکیل احمد عباسی صاحب آپ کس برابری کی بات کرتے ہیں، میں نے کوئی نامناسب بات نہیں کی۔ ارے بھر میرے پیچھے پڑ جاؤ گے برابری تو بڑے بڑے پیغمبروں سے نہیں ہوئی تو تم عام مرد کیا کر سکو گے۔ جب عورت ایک ظالم شوہر کے ساتھ یا مغرور شوہر کے ساتھ رہ سکتی ہے تو تم مردوں کا گزرا ایک عورت کے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتا؟ عمران جوانی بھائی آپ کا خط اچھا اور دلچسپ لگا۔ بشری افضل جی چھوڑیے لوگوں کو، ان کو تو حسد اور کینہ کے مرض نے مارا ہے۔ بشری افضل جی مردوں سے عورت کی کامیابی اور شہرت کہاں برداشت ہوتی ہے۔ آپ لکھا کریں کوئی پسند کرے یا نہ کرے۔ بشری جی ڈٹ کر مقابلہ کریں میری طرح، مکروہی نہ دکھائیں لکھا کریں۔ سرگزشت ہم عورتوں کا بھی ہے۔ ہم باذن فیصلہ ہیں۔ ہمارا زیادہ حق بنتا ہے۔ مگر ہمیں تو ہم جیتیں گے۔ اویس شیخ صاحب کا خط بھی کافی دلچسپ اور شاعرانہ تھا۔ قیصر خان بھائی آپ نے میری تعریف کی شکر یہ لیکن آپ مجھے آپاٹا ہوا مگر اور باہمی گلے صلہ بھی کہتے ہیں۔ میں آپ کو تاؤں مجھے ہرے۔ بن بھائی اور کرن باہمی گلے کہتے ہیں۔ اب تو بھائیوں اور بھینچے بھینچے باہمی گلے کہتے ہیں۔ آپ کا انداز تحریر بہت پیارا ہے قیصر بھائی۔ سید انوار عباس شاہ کا طرز تحریر بہت اچھا ہے۔ بہت دلچسپ ہوتا ہے آپ کا خط لکھنا مجھے بہت پسند ہے شکر یہ بھائی۔ رانا محمد شاہد بھائی اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ ہر شے کا اپنا مقام ہے لیکن ماں کا تو مقام ہی اعلیٰ ہے آپ کا تحریر کردہ خط بہت اچھا لگا یا اور بات کہ بھائی مجھے آپ نے یاد ہی نہیں کیا۔ ششی محمد عزیز سنے کا ظلم نامہ بھی واقعی ظلموں سے پر تھا۔ سب کو یاد کیا لیکن بحال ہے کہ اس نا تو اس بوڑھے عزیز سنے نے مجھے یاد کیا ہو۔ ویسے بڑا تفصیلی اور مکھن لگانے والا خط تھا۔ ویلڈن۔ ناصرہ احمد آف امریکا دیکھ آپ کی تجویز بہت عمدہ ہے کاش کہ ہم قدم بڑھا سکیں۔ احمد خان تو حیدر بھائی آپ کا یوں بے بی گڑیا بہن کہنے سے میں شرمائی۔ ہائے بھائی اتنا پیارا اللہ آپ کو خوش اور سلامت رکھے آمین۔ آپ کا خط ہمیشہ کی طرح دلچسپ رہا۔ محمد خیر بھائی آپ کا خط بھی کافی دلچسپ لگا۔ کہ انہوں پر آپ نے زبردست تبصرہ کیا ہے۔ آخری خط رانا فیصل جاوید کا خط بھی کافی بہتر تھا۔ آتے رہے (پیشیز زرا مختصر لکھا کریں تاکہ دوسروں کو بھی موقع مل سکے)۔“

بھائی محمد احمد رضا انصاری نے کوٹ ادو سے لکھا ہے۔ ”میں سرگزشت کا تھوڑا پرانا قاری ہوں۔ پچھلے دو سال سے پڑھ رہا ہوں مگر پہلی دفعہ خط لکھ رہا ہوں۔ اب بات ہو جائے فروری کے سرگزشت کی۔ ادارہ پر پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ انگل جی یہ دہشت گرد کیا مسلمان ہیں؟ شہر خیال میں سارے خط اچھے تھے۔ آئن اسٹائن کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ دوسری تحریریں بھی اچھی لگیں۔ اس کے بعد سید مجھے اپنے پسندیدہ سلیٹے ”سراب“ کی طرف لکھے۔ انگل جی یہ تو طویل ہوتا جا رہا ہے میں سمجھا تھا کہ شاید چند قسط باقی ہیں۔ پہلی سچ بیانی جاسوسی قسم کی مگر بہت اچھی تھی۔ دوسری سچ بیانی بھی اچھی تھیں۔“

بھائی سید انور عباس شاہ نے دو یا خان بھکر سے لکھا ہے۔ ”فروری 2015ء کا شمارہ ہاتھ میں آیا تو رانا محمد شاہد کی والدہ کے انتقال کی خبر پر نظر پڑی۔ دل افسردہ تو بہت ہوا لیکن کیا کریں ایک ضایک دن ہم سب کو اس دنیا سے جانا ہی ہے۔ بہر حال رانا صاحب کے اس دکھ میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ رانا محمد سجاد اپنے خوب صورت قصے کے ساتھ کرنی صدارت کی زینت بنے بہت بہت مبارک نواں فرما کریں۔ ملک محمد ظفر اللہ، محمد انور اور سکیل احمد عباسی مختصر لیکن معبود کن بہن کے ساتھ ”عہد خیال“ کی زینت بنے۔ محمد عمران جوانی کراچی سے تشریف لائے، خوب مزے خڑے کی باتیں کیں۔ بشری افضل صاحبہ بھی اس وقت مختصر خط کے ساتھ حاضر ہوئیں لیکن کچھ ناراضی ناراضی لگ رہی تھیں۔ ہمیں لوگ آپ کے لکھنے پر کیوں حسد کرنے لگے۔ کم از کم میں نے تو سرگزشت میں کسی بہن بھائی کو آپ پر تنقید کرتے نہیں دیکھا۔ نہ پڑھا بلکہ آپ کی تعریف کرتے ضرور پڑھا ہے۔ آپ آتی رہا کریں۔ آپ تو ہماری عظیم بہن ہیں۔ اویس شیخ سنے بھی خوب لکھا۔ قیصر عباس خان صیب دستور اپنے سابقہ خطوط کی طرح خوب صورت انداز میں جلوہ افروز ہوئے۔ رانا محمد شاہد سنے کی ملاقات ہوئی۔ ششی محمد عزیز سنے کا خط بھی نانا نانا اور مفصل تھا۔ ناصرہ احمد بہت دور سے تشریف لا کر شہر خیال پر چھا گئیں۔ فقیر غلام حسین ضیا اور خالد علی بھکر سے تشریف لائے۔ ان کا خط دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات کا خزانہ لیے ہوئے تھا اس دفعہ کے شمارے میں ہم بھکر کے چار قاری شامل ہیں خیال ہوئے بہت خوشی ہوئی۔ درود دل رکھنے والے رحم دل انسان احمد خان تو حیدر یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ بھائی سلیم قیصر کے لیے روزانہ دعا گوئی پڑھتے ہیں۔ خداوند کریم آپ کی دعائیں



قبول فرمائے۔ اس کے علاوہ عزیر اللہ محمد خواجہ اور رانا فیصل جاوید کے خطوط بھی شاندار تھے۔ ایک دفعہ پھر چند عظیم ہستیاں بلیک لسٹ کی نذر ہو گئیں جن کا انفسوس ہے۔ قابل احترام و محترم شخصیت شاہد جہانگیر شاہد اور ہر اعز بہن طاہرہ گلزار نے تو شعر خیال کی زینت بنے اور نہ ہی بلیک لسٹ میں ان کا نام شامل تھا۔ خدا خیر کرے ان دونوں کو محفل میں نہ پا کر ہمارے ہاتھ خود بخود ان کی سلامتی کے لیے اٹھ گئے۔ خداوند کریم ان کو بھی مع اہل و عیال اسے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ میں ایک دفعہ پھر اپنے ان تمام بہن بھائیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری سلور جوبلی والی تجویز کو پسند کیا اور کر بھی رہے ہیں۔ انتشاء اللہ سلور جوبلی نمبر سچ و سچ کے ساتھ اپنے وقت پر ضرور خوشبو نکھیرے گا۔ اس دفعہ ”فلمی الف لیلا“ کو پڑھتے ہوئے آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ ماضی کے لاہور کی سیر اور بارہ دروازوں کے بارے میں معلومات مع ان کی تصاویر۔ واہ کیا لا جواب خزانہ تھا۔ کون سی کمی جو اس مضمون میں رہ گئی تھی۔ بہر حال ہر لحاظ سے یہ مضمون اپنی مثال آپ تھا۔ ”خوارز مائے“ ایک بے مثال تحریر تھی۔ مجبور یاں بھی انسان کو کہاں سے کہاں تک لے جاتی ہیں۔ مجبور انسان بالکل بے بس ہوتا ہے لیکن خدا کی ذات کہیں نہ کہیں سے کوئی راہ نکال ہی دیتی ہے۔ زیادتیوں اور نصرت کے ساتھ بھی ہوتی رہیں۔ نعمان سے شادی والی خواہش بھی پوری ضروری ہوئی مگر کچھ دیر کے لیے۔ واقعی قدرت کے بھید بھی نزلے ہیں۔ بچوں کے بارے میں مختار روئے اور ظالموں کے گھٹاؤنے کرتوتوں پر مبنی کہانی ”شیطان، فرشتہ“ اپنی مثال آپ تھی۔ عبدالجیسے دلدرد و مصفت انسان اب بھی ہمارے ارد گرد و گردناتے پھرتے ہیں۔ جس ان پر کڑی نظر رکھی جاوے۔ ”سفاک محسن“ واقعی ایک دل دہلا دینے والی تحریر تھی۔ اس عجیب و غریب واقعے نے پڑھتے وقت ہمیں پوری طرح اپنی گرفت میں لپیٹ لیا۔ ہوش میں جب آئے جب کہانی ختم ہو چکی تھی، بالکل فلمی چوٹیشن تھی اس واقعے میں۔ اس کہانی کا عنوان یعنی سفاک محسن مکمل طور پر واقعے سے مطابقت رکھتا تھا جس سے اس کی شان میں مزید اضافہ ہو گیا۔“

پڑا اولیس شیخ کا غلوں نامہ نو بہ ایک سنگھ سے۔ ”ادارہ پڑھائی تھا کہ سانحہ شکار پور ہو گیا۔ مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آئی ایس آئی اور ان سے ضلک ادارے آخر کس مرض کی دوا ہیں؟ دوسرا یہ کہ ایک طرف پوری قوم دہشت گردی کے خلاف نیکو ہو گئی لیکن ہمارے سپاہیوں میں آج بھی اتحاد و یکپارگی نہ رہے۔ کوئی جوڈیشل کمیشن کارروانا رو رہا ہے تو کسی فوجی عدالتوں پر تحفظات ہیں۔ ہر کوئی اپنے مفادات کے پیش نظر کام کرتے نظر آتے ہیں اور عوام دہشت گردی کا شکار ہو رہی ہے۔ ری سی سی کمر پیروں کی بحران نے پوری کر دی ہے۔ ”بابائے فاری“ پڑھ کے ایک اور شخصیت کا تعارف ہوا۔ ”شیر خیال“ کی جانب کا مزن ہوئے۔ جنابانی صاحب کا ”ایک فلمی سرگزشت“ متعلق جملہ شاندار تھا۔ سردار ہونا گوری اور طاہرہ گلزار غیر حاضر ہیں۔ ”عصیر خیال“ کے خطوط نگاروں سے گزارش ہے کہ اگر کوئی ”بیانا بیانا“ نمبر کی ایک حد کا پل رکھتا ہے تو مجھے دے دے۔ بہت اشد ضرورت ہے۔ میرے پاس پہلے شمارہ تھا۔ ایک جانے والے نے مجھ سے مانگا۔ جب میں لیتے کیا تو اس نے شمارہ کھوجانے پر انفسوس کا اظہار کیا۔ وہ مجھے پیسے دیتا رہا لیکن میں نے کہا جو چیز کھوئی وہ ان ہیروں سے کئی گنا اہم تھی۔ ”باکمال“ تحریر کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں لیکن یاد اور محفوظ ہمیشہ کے لیے ہو گئی۔ ”خون کے آنسو“ ایک بار پھر رلا گئے۔ منظر نامہ کا مضمون پابندی کا شکار کتابوں کا ذکر مختصر اور جامع تھا۔ سمندر کی شیریں کا تذکرہ بس ٹھیک لگا۔ ”فلمی الف لیلا“ کے معنف علی سفیان آفاقی رحلت فرما گئے۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جلد دے، آمین۔ لاہور کے بارہ دروازوں کا تفصیل سے ذکر بہت خوب لگا۔ ”الوداع“ سفر نامہ اس دفعہ دلچسپ تھا۔ ”عباد عظیم“ کی عیاری نے شش و شنبہ میں جتنا کر دیا۔ سچ یا جھوٹ میں ”سفاک محسن“ ایک معاشرتی کہانی تھی۔ پاکستان کا ”بھٹی پاکستان“ پتا نہیں کہ اس کی نظر لگی تھی۔ وہ بھی ایک وقت تھا جب امریکی سفارت کار کہتے تھے کہ ہم 60 کی دہائی میں سوچتے تھے کہ 80 کی دہائی میں کون سا شہر نمبر ایک ہو گا۔ واشنگٹن، لندن یا پھر کراچی۔ ”قسمت“ ایک لائف کولمٹک تحریر تھی۔ ”سوکن“ سچ بیانی میں حد سے بڑھا ہوا اور نظروں پر ”منہری دھوپ“ پڑی گئی لڑکیوں کا ایسا یہ ہے کہ ہر چھٹی چیز کو سنا سمجھتی ہیں۔“

پڑا وحید ریاست بھی صاحب کمر سید اس سے۔ ”ماہ فروری کا سرگزشت“ ابھی موصول نہیں ہوا تھا کہ دل دہلا دینے والی خبر ملی کہ سدا بہار شخصیت جناب علی سفیان آفاقی اس جہان غائبی سے انتقال فرما گئے۔ حق معفرت کرے، مجھ آزاد مر تھا۔ ابھی بچپنے شمارے یاد جنوری میں آفاقی انگل لاہور کے قبرستانوں کا تذکرہ فرما رہے تھے، اب آخری کی چند دن بعد خود بھی ہر قبرستان ہونے والے ہیں۔ معراج انگل یقیناً ہمیں انھوں کا سبیل رواں ہے جو تھمے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ اللہ تعالیٰ ان کے عزیز و اقرباء ان کے چاہنے والوں اور آپ تمام حضرات کو سر جمیل عطا فرمائے۔ معراج انگل آپ سے ایک پُر زور گزارش ہے کہ آپ فی الفور ہجوم و مغفور جناب علی سفیان آفاقی صاحب پر ایک جائدار مقالہ ڈالیں سنا جدا صاحب یا انور فراد صاحب سے قلمبند کروا کر اگلے مہینے شائع فرمائیں۔ یہ آفاقی انگل کی یادوں اور وقاؤں کا ادنیٰ ترین صلہ ہو گا اور ان کے عقیدے پر احسان و تعلیم (آفاقی صاحب نے اپنے بارے میں اتنا مختصر لکھا کہ کوئی اور لکھ ہی نہیں سکتا)۔ روز اول کی طرح سب سے پہلے فکر انگیز ادارہ پڑھا جو کہ آپ نے حزن دل سے تحریر فرمایا تھا، خاص کر انتخاب شعر میں تو آپ کو ملکہ حاصل ہے۔ ماہر باغی کی طرح آپ نے شعر بھی درست تجویز فرمایا۔ ایک فلمی سرگزشت میں برو فیروز اکٹر سید سبط حسن رضوی صاحب کے متعلق بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔ سید سبط حسن رضوی صاحب میرے استاد و گرامی برو فیروز اکٹر عبدالغنی صاحب کے استاد و گرامی تھے۔ ”عصیر خیال“ میں کرسی صدارت پر ہمارے دیرینہ کرم فرما جناب رانا محمد سجاد صاحب تشریف فرما تھے۔ ان کے خیالات کو پڑھ کر لطف آ گیا۔ انہوں نے میری سالانہ رپورٹ کو بے حد سراہا۔ فقیر چند بات احسان مندی کا اظہار کرتا ہے۔ محترمی جناب محمد عمران جو تانی صاحب، بشری افضل صاحب، قیصر خان صاحب، سید انوار عباس شاہ صاحب نے ہماری



سالانہ رپورٹ کو سراہا۔ شکر یہ ادا کرنے کے لیے الفاظ ہی نہیں۔ فنی عزیز نے، احمد خان قحیدی اور رانا فیصل جاوید کا بھی بے حد شکر یہ جوا نہیں لے سالانہ رپورٹ کو سب سے قبولیت بخشی، دوستانہ، اللہ اگلے سال کو شش ہوگی کہ اس سے بھی بہتر انداز میں رپورٹ مرتب کی جائے گی۔ اس ماہ شاہد جہانگیر شاہ، طاہرہ بخارا صاحبہ، ایچ اے مسکن، سجاد، سردار بانو، گوری، انجم فاروقی، ساحلی وغیرہ غائب تھے۔ اللہ خیر کرے (خطوط ملے مگر تب تک پرچا پر لیں جا چکا تھا) میرے خیال ناقص میں اس ماہ کا سب سے قیمتی خط محترمہ ناصرہ احمد فرام امریکا تھا۔ کتنی انسانیت، ہمدردی و تواضع ان کے خط میں اقامت پذیر ہیں۔ اللہ پاک انہیں حسن نیت، راجز، عظیم عطا فرمائے دیتے بھی حدیث شریف ہے کہ سرکاری کریم نے ارشاد فرمایا۔ ”مومن کی نیت اس کے عمل سے بڑھ کر ہوتی ہے۔“ معراج انکل، ہم رانا محمد شاہ صاحب کی والدہ محترمہ کے وصال پر ان سے دلی تعزیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ پاک مرحومہ کو اپنی خصوصی رحمتوں، شفقتوں کے سائے تلے جگہ عطا فرمائے، آمین۔ ڈاکٹر صاحبہ صاحبہ انسانی تاریخ کے سب سے بڑے سائنسدان آئن اسٹائن کے حوالے سے زبردست تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے آئن اسٹائن کو اعلیٰ اردو کے لیے دوبارہ زندہ کر دیا۔ ویلڈن ڈاکٹر صاحب۔ معراج انکل سے ایک احساس کرنا چاہوں گا اگر ہو سکے تو معروف، صوفی شاعر، بیہم شاہ وادی کے حوالے سے کوئی تحریر شائع فرمادیں تو از حد مہربانی ہوگی۔ منظر امام صاحب پڑھنا منع ہے کے باوجود پڑھنے کے لیے مجبور کرتے نظر آئے۔ بہت قابل قدر ستائش مضمون جناب منظر امام صاحب کے زور قلم کا نتیجہ تھا۔ ویسے بھی میں کتابوں کے حوالے سے جانکاری کو پسند کرتا ہوں۔ ہمارے ہر عزیز جناب انور فرہاد صاحب شہداء کے حوالے سے تاثرات جمع کرتے نظر آئے۔ انور صاحب کا یہ پہلو بھی دل کو بھا گیا۔ محترمی ابن کبیر صاحب خلا میں نماز کے حوالے سے ایک یادگار تحریر لے کر حاضر تھے۔ بہت خوب ابن کبیر رحمہ

ہم بشری افضل نے بہاولپور سے لکھا ہے۔ ”سرگزشت ملا۔ واہ جی واہ تین تین صنف کرخت ہاتھل پر برا بھان ہیں۔ صلیب نازک حیران و پریشان ہیں اپنی مغل میں پہنچے کسی صدارت رانا محمد سجاد کے جھمے میں آئی۔ خاصا مصلحتی تبصرہ تھا۔ رانا محمد سجاد مابعد دولت تو ہر ماہ حاضری دے رہی ہیں۔ رانا محمد شاہ کی والدہ کے انتقال پر دکھ ہوا۔ خدا ان کو جوار رحمت میں جگہ دے، آمین۔ قیصر خان آپ کی دعائیں ہی تو ہیں کہ دشمن سے بچی ہوئی ہوں۔ میری پیاری بہن ام کو 16 جنوری کو تنہا چھوڑ گئیں۔ ان کی کسی کوئی پوری نہیں کر سکتا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آتا وہ وفات پا گئیں ہیں، بہت یاد آتی ہیں ان کے لیے دعائے مغفرت کریں سب ساتھی۔ میگزین لیٹ ملا اس لیے کہانیوں پر تبصرہ نہ کر سکی۔ انشا، اللہ اگلے ماہ ضرور دکھوں گی۔“

جناب خرم علی راؤ کا ای میل۔ ”محترم آفاقی صاحب کی وفات پر تعزیت قبول کریں۔ میں اولین شماروں سے ہی سرگزشت کا قاری ہوں۔ اسی سے آفاقی صاحب سے شناسائی ہوئی۔ (آپ کا مضمون سرگزشت کے مزاج کا نہیں تھا۔ آپ اس قسم کی تحریر بھیجیں جو سرگزشت کا حصہ بنتی رہی ہیں)“

ہم عبدالقیوم انک شہر سے۔ ”میں رسالے کا سالانہ خریدار نہیں لیکن انک میں ایک دوست کی شاپ سے سرگزشت مل جاتا ہے۔ مجھ تحریریں تو ادبی لحاظ سے قابل قدر ہوتی ہیں اور کچھ تھی دلچسپ کہ ہر ماہ رسالے کا انتظار رہتا ہے۔ مضمون کی شکل میں ایک مزاحیہ ”فلمی ایکٹرز سے مختصر انٹرویو“ ارسال ہے۔ (اس قسم کی تحریر سرگزشت کے مزاج کی نہیں ہے) تین سال کی عمر سے نصف صدی کراچی میں گزار کر کیا دہ سال سے غیر قسم کے ماحول میں سسک رہا ہوں۔ فلمی جماعت سے سیکنڈ ایئر ایل ایل بی کی تعلیم پائی۔ کراچی کی فلمی صنعت میں سالوں گزارے۔ پراسن کراچی کی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔ حال دوست کچھ منوں مٹی تلے جا سوئے کچھ ہجرت کر گئے۔ یاد آتے ہیں تو دل اٹاںس ہو جاتا ہے۔ دل میں ہوک ہی اٹھتی ہے اور یہ سوچ بے چین کر دیتی ہے کہ نہ جانے کب یہاں سے چمکا رہا یا کراصل وطن یعنی کراچی کو دیکھنا نصیب ہوگا۔“

ہم اشفاق احمد ڈیرا سکور، حفرہ ضلع، کھٹے ہیں۔ ”میں گزشتہ پندرہ سال سے سرگزشت کا قاری ہوں اور 2000ء سے لے کر اب تک تمام شمارے میرے پاس محفوظ ہیں۔ میرے چھوٹی جناب اختر رشید کو گھر کے پاس کوئی بار دی گئی ہے اسی لیے خط بھیجے میں تاخیر ہوئی۔ قارئین سے فاتحہ کی اجل ہے۔ (بہت شکر یہ کہ آپ نے جن لوگوں کے بارے میں اطلاع دی۔ مصنف سے باز پرس کی جا رہی ہے)“

ہم سردار بانو ناگوری کا خلوص نامہ کراچی سے۔ ”میں بھی سرگزشت کا شمار و ملا اور اسی شام انکل علی سفیان آفاقی انتقال کر گئے۔ فلمی دنیا کا ایک بڑا نام کہ جنہوں نے ہمیشہ اپنے دامن کو فلمی دنیا کی آلودہ زمین سے پاک رکھا۔ ”فلمی الف لیلا“ ایسے رازوں سے بھری کھاتھی جو ان کے سینے میں محفوظ تھی۔ ایک دھوپ تھی جو گزشتہ آفتاب کے۔ انکل کے شے میں کیسے کیسے راز تھے کہ ابن مٹنی کا ایک شعر یاد آ گیا ”جو ہم کہہ گئے وہی ہمارا فن ٹھہرا اسرار۔ جو ہم کہہ نہ پائے نہ جانے وہ کیا چیز ہوگی۔ اور ہم کہتے ہی وہ کہے کہ ”زمانہ تو بڑے شوق سے سن رہا تھا تم ہی سو گئے داستان کہتے کہتے“ کیم فریدی کے ایکسپریس اخبار میں امجد اسلام امجد نے آفاقی انکل کا نام بڑے اچھے انداز میں کیا اور سرگزشت کو ایک ادبی جریہ قرار دیا جو کہ سرگزشت کے قارئین کے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ انکل آفاقی کے لیے ہماری طرف سے ایک چھوٹا سا تذکرہ سرگزشت کے صفحات کی درونیں بکھر گئیں جن کے دم سے قائم تھیں وہ محفلیں اجڑ گئیں۔ ادارے میں انکل نے ایک تہہ بھر 16 دسمبر کی یادیں تازہ کر دیں۔



عجب خوف اور کرب کا عالم ہے کہ معصوم بچوں کے پھول سے چہرے بھلائے نہیں بھولتے۔ روتی ماؤں اور اجڑے شہر پشاور کی اداسیاں، راتوں کو سونے نہیں دیتیں اور اس بارشکار پوری امام بارگاہ میں قیامت کا منظر دیکھنے کو ملے۔ آنکھیں نرم اور سینہ غم سے بوجھل (اگلے ہی جہد کو پشاور کی مسجد پر حملہ ہو گیا) بس خدا ہمارے حالوں پر رحم فرمائے۔ محکمہ ڈاک کی مہربانی سے اس مرتبہ ہم ”شہر خیال“ کی محفل میں شرکت نہیں کر پائے لیکن دوستوں کے خطوط میں ہمارا نام دیکھ کر اچھا لگا۔ طاہرہ باجی جنوری کے شمارے میں آپ نے ہماری تعریف کی آپ کا بہت شکریہ۔ رانا شہزاد اپنے مکتوب خاص کے ساتھ ”صدائے کرب“ کی کاپی پر نظر آئے اور چھانگے ویڈیو سجاد بھائی رانا شاہد بھائی کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ رب تعالیٰ ان کو اور ان کی فیملی کو صبر دے۔ سکیل ائمہ عباسی بڑی دیر کر دی آپ نے آتے آتے۔ ناصر باجہ آپ کی تجویز تو عمدہ ہے لیکن یہ باتیں صرف کتابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ عملی زندگی میں ان پر کوئی عمل نہیں کرے۔ انور بھائی آپ خود کو ٹالاق اور کندہ بن کیوں سمجھتے ہیں حالانکہ آپ نے مختصر لیکن بہترین لکھا ہے۔ ویری گنڈ ”باکمال“ میں ڈاکٹر ساجد امجد نے آئن اسٹائن پر لکھ کر کمال کر دیا اور اپنے خوب صورت انداز میں لکھ کر سرگزشت کے صفحات پر چار چاند لگا دیے۔ منظر امام کی ہدایت کے باوجود ”پڑھنا سنا“ ہم نے بڑے شوق سے پڑھا اور ممتاز شعرا کی نثر سے کوفور اپنی ڈائری میں ۲۰۱۵ء میں انور فرما ”خون کے آنسو“ لے کر آئے اور اداس لوگوں کی اداسیاں نکمیر گئے۔ ابن کبیر آپ کی تحریر کے پیر وئے ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہوگا گو کہ چاند پر پہلا قدم رکھنے کا اعزاز امریکیوں کے سر تھا لیکن خلا میں نماز اور روزہ رکھنے کا سہرا مسلمانوں کے سر تھا اور تاریخ کے اوراق پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سنہری الفاظ میں امر ہو گیا۔ ”سفاک محسن“ ایک انوکھی تحریر تھی کہ جس نے لڑزاکر رکھ دیا۔ سفاک محسن نے انسانیت کا ثبوت دے کر خود کو تعریف کا حق دار ٹھہرایا لیکن اس کا انجام دیکھ کر گیا بہت سے راز تلاش کرتی ”سوگن“ میں شہلا صاحب نے بروقت ہوش میں آکر اپنے گھر کو نکلنے سے بچا لیا۔ ”حوادث زمانہ“ میں نغیرت کے ساتھ قدرت نے بڑا الجھ کھیل کھیلایا۔ باپ کے بغیر زندگی کیسے گزرتی ہے اس تحریر میں واضح ہو گیا اور ہمیں بروقت ایک شعر یاد آ گیا کہ شبی ساتھ لاتی ہے زمانے بھر کے دکھ عالی۔ سنا ہے باپ زندہ ہوں تو کانٹے بھی نہیں جھپٹے۔ آخری جگہ بھائی ”ساحر“ میں ساحر نے عجیب سا محرطاری کر دیا۔ ساحر نے اپنے سحر سے میر کو بڑی افیت دی اور آخر میں اس کا انجام سارے گناہوں کو دھوکا اچھی تحریر تھی۔

ہنرمند محسنی محمد عزیز نے لندن خلیج بھاری سے کہتے ہیں۔ ”ایک بات کا اعتراف شاید آپ بھی کریں گے کہ جتنی محبت مجھے سرگزشت سے ہے۔ اتنی کسی اور سے نہیں۔ مجھ جیسا بچوں عاشق شاید ہی کوئی ہوگا اور اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ میں ہر ماہ بذریعہ جسطری خط آپ کو بھیجتا ہوں اور شاید سب سے پہلا موصول ہونے والا خط۔ ہر ماہ میری ہوتا ہے۔ ایک اور آپ کی محبتوں کا ثبوت جو آپ نے محترم علی سفیان آفاقی کی وفات سے متعلق ایس ایم ایس مجھے بروقت کر دیا لیکن اسے میں اپنی بد نصیبی ہی کہوں گا کہ میں ابھی تک لاہور نہیں جا سکا۔ بہت افسوس ہوا یہ سن کر اللہ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو یہ صدمہ جانکاہر راحت کرنے کا حوصلہ دے آمین۔ آہ آفاقی انگل! میں نے تین چار مرتبہ مفت

**سفر در سفر**

دیس تو زندگی ایک سفر ہے لیکن کہیں کہیں پڑاؤ بھی آتے ہیں۔ آخری صفحات پر ایک عجیب غریب پڑاؤ کی داستان **منظر امام** کے قلم کی روائی

**درماندہ عشق**

تاریخ کے اوراق سے ایک اور یادگار داستان۔

**الیاس سیتا پوری** کا حیران کن انداز

**سودائے جنوں**

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے ملت اسلام کے معصوم ارادوں کا عبرت اشر احوال

**ماروی**

بکھرے ہونے، زندگی کے تلخ و تلخ لحات پر مشتمل

**مکی الدین نواب** کا دلچسپ شاہکار

**مارچ 2015ء کے صفحات کی ہدایت**

**خواجہ شمس الدین عظیمی**

**سیرۃ النبی**

**مزیں**

**عظیمی کی محفل**

**عظیمی کی محفل**

**مرزا ابجد جنگ کا مدلل انداز**

**ڈاکٹر شیر شاہ سید** کا کاشف ذہن سلیم انداز

**تویر دہاوی اور ڈاکٹر ساجد امجد کی دلچسپ کہانیاں**

**اس کی حلاوت**



روزہ پہلی میکرین فون کیا تو آپ بٹرنے کہا کہ گیارہ سے تین بجے کے درمیان بات ہو سکتی ہے اور میں..... غم دوران کے چکر میں ان کی آواز سننے سے بھی محروم رہا، آہ، فروری کا سرد و قحط خاصہ منشی خیر تھا۔ یہ غالباً ذکر صاحب کے برش کا کمال ہے ناں؟ ادارہ پڑھ کر ایک بار پھر شہداء پشاور کی منقذت کے لیے بے ساختہ ہاتھ اٹھ گئے۔ یقین کریں اللہ تعالیٰ نے مجھے کچھ اس قسم کا دل دیا ہے کہ بقول شاعر نثر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ اب بھی اگر بھی کھانا کھاتے ہوئے مجھے وہ معصوم بچے یاد آجائیں تو خلق سے نوالہ نیچے نہیں اترتا اور کتنا خوب صورت جواب دیا ہے آپ نے سیدنا عباس شاہ کو کہ ضروری نہیں کہ محترم شاہد جہانگیر یا طاہرہ نگرار کے قریبی عزیز بننے ہوں۔ وہ سب بچے ہمارے تھے۔ ہمارا مستقبل تھے اور بزدل دشمن نے ہمارے مستقبل پر حملہ کیا ہے۔ بہر حال ایک بات حوصلہ افزا ہے کہ اس حکیم سانچے نے ایک بار پھر پوری قوم کو سمجھ کر دیا ہے۔ اللہ کرے ہمارا یہ اتحاد و اتفاق ہمیشہ قائم رہے تو شاید دشمن کو دوبارہ یہ ناپاک جسارت کرنے کا حوصلہ نہ ہو۔ ”معمبر خیال“ سے اس بار محترم شاہد جہانگیر شہید اور طاہرہ نگرار صاحبہ غیر حاضر تھے۔ (دونوں کے خط پر چار برس جانے کے بعد مجھ تک پہنچے) شاید ان میں حوصلہ تھا کہ وہ اپنے پیارے شہر پر پہنچنے والے اس سانچے کے بعد سرگزشت کے لیے کچھ لکھتے۔ محترم شاہد جہانگیر اور طاہرہ باگی! آپ دونوں کا غم بھیا ہم سب سے بڑھ کر ہے لیکن جب مجھے اپنے دل کی کیفیت کا پتا ہے تو آپ کے دل پر بیٹنے والی کیفیت میں بخوبی محسوس کر سکتا ہوں۔ اللہ ہم سب کو یہ صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ دے، آمین۔ رانا محمد عیاد مرے بعد آئے اور خوب آئے۔ کرسی صدارت کے لیے مبارک باد۔ سبیل احمد عباسی و عظیم بیگ۔ محترمہ بہن روبینہ نقیس انصاری، ایم اے خاتمی، بھٹی، عبدالرؤف عدم اور دیگر پرانے ساتھی کہاں غیر حاضر ہیں اور ہاں ہمایوں دین پوری کا کوئی پتا چلا دیکھے میں نے تو خط لکھ کر رکھ دیا ہے اور شکم سے کہہ دیا ہے کہ اگر میں مر جاؤں تو وہ خط سرگزشت کو بھجوا دینا۔ کہانیوں پر تبصرہ انہی طرف سے۔ آخری جگہ بیانی ساحر میں احسن کا ایک فقرہ لکھا ہوا، ساری کہانی کا نچوڑ ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ نیک عورتوں کے لیے نیک مرد اور بد عورتوں کے لیے بدکار مرد۔ دیگر یہ کہ اس ساحر کا انجام اچھا ہوا، ختم جہاں پاک۔ حواوت زمانہ میں ڈاکٹر عبداللطیف نے بے سہارا عورتوں کے جذبات کی اچھی ترجمانی کی ہے۔ جیسے نصرت کو کچھ تو فائدہ ہوا۔ شیطان فرشتہ پڑھ کر دل دہل گیا۔ عیدل جیسے درندوں کو عبرت ناک سزا ملنی چاہیے تاکہ دوبارہ کوئی ایسی حرکت کرنے سے پہلے سو بار سوچے۔ لیکن اس معاملے میں ہمارا قانون بہت نرم ہے شاید۔ خانہ بدوش و نجیدہ کرکٹی۔ بعض اوقات انسان کتنا بے بس ہو جاتا ہے۔ ”منہری دھوپ“ اس ماہ کی بہترین جگہ بیانی تھی۔ یہ ان لڑکیوں کے لیے سچی ہے جو محبت کے نام پر لٹ جاتی ہیں۔ حسنی اور اس کی سہیلی کا فعل بہت اچھا تھا۔ صائمہ اقبال کی ”آسیب محبت“ پُر اسرار سی عشق و داستان نگار تھی یا شاید یہ سدرہ کی چھوٹی بہن سارہ کی کارستانی تھی۔ ”سوگن“ میں فرزانہ نے بہت زبردست جال بچھا تھا لیکن شاہ کے خاندان کی قسمت اچھی تھی جو ایڈوکیٹ صاحب نے فرزانہ کا سارا کچا چھٹا کھول دیا۔ بہر کیف اپنے شوہر کے معاملات سے لا تعلق رہنے والی عورتوں کے لیے اس میں بہترین سبق پوشیدہ ہے۔ ”قسمت“ کو اس ماہ کی دوسری بہترین کہانی کہا جاسکتا ہے۔ نایاب کا جذبہ قابل تعریف ہے کہ اس نے اپنی ہمت کے غل بولتے پر اپنے گھر پر حالات اور مریض باپ کو بھی بھلا چکا کر دیا۔ ”سفاک سخن“ پہلی جگہ بیانی تیسرے نمبر پر رہی۔ عیوی کی قسمت بھیا اچھی تھی جو وہ نکال گیا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ ”خلا میں نماز“ اس شمارے کی بہترین تحریر ہے دیگر تحریروں میں باکمال، بخون کے آنسو، پڑھنا صحیح ہے اور مسند کے مجید پڑھ چکا ہوں۔“

ہم نا صر حسین رند، ناوید سے قطر از ہیں۔ ”سب سے پہلے آپ کا اقبال یہ پڑھا۔ آپ کے خیالات اور قلم کے چاؤ پر ہمارے دل سے یہ دعا نکلے اللہ تعالیٰ آپ کا ہر کام پر سلامت رکھے“ آمین۔ ”خون کے آنسو“ انور فرہادی 16 دسمبر کے سانچے پر غور طلب تحریر تھی جس میں انویم کبیر اور سلمان خان نے ہمارے مجید جی کے لیے جن عظیم خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہمارے دل سے خود بہ خود یہ دعا نکلے کہ رب العالمین انویم کبیر کو اسلام کی دولت نصیب فرمائیں اور سلمان خان کے ایمان کی حفاظت فرمائے، آمین۔ ”خلا میں نماز“ ابن کبیر کی عمدہ تحریر تھی۔ شیخ مظفر نے جب خلا سے زمین کی طرف نگاہ کی تو سورہ زمین کی آیات کا ترجمہ پڑھ کر تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو بھلاؤ گے۔ دل کی عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ ”پڑھنا صحیح ہے“ مظفر امام پوری گلد۔ ہمیشہ کی طرح ان کی تحریر لائے۔ ایسی کتابیں جن کا پڑھنا ممنوع نظر آئے مگر مظفر امام صاحب ان کتابوں کا ذکر بھی کر دیں جو پاکستان اور دنیا میں بام عروج تک پہنچیں تو ایمان کے شکر گزار ہیں گے۔ ”مسند کے مجید“ عائشہ جو نجو باگی والے کی طرح مسند کے مجید لیے حاضر تھیں۔ وہ پہلے کی طرح انوکھی اور حیرت انگیز تحریر لاتی ہیں۔ ان کی چو اس شاندار ہے۔ نئی کہانیوں میں آخر میں کبھی جانے والی تحریر ”ساحر“ نے واقعی بحر میں جتنا کر دیا۔ حیرت انگیز اور اپنے بحر میں جکڑے رکھا۔ اس طرح کے شیطانی قوتوں کے لوگ دنیا میں اتنی طاقت رکھتے ہیں تو اللہ کے روحانی بندے کتنی طاقت رکھتے ہوں گے۔ آخر میں یہ کہ ان آیات سے صد فی صد ہم متفق ہیں کہ نیک مردوں کے لیے نیک عورتیں اور بدکار مردوں کے لیے بدکار عورتیں۔ آخری کہانی ”ساحر“ اول دسمبر 2015ء ”آسیب محبت“ صائمہ اقبال ہمیشہ کی طرح سسٹمس تجسس سے بھرپور شاہکار لیے حاضر تھیں۔ اگر اس تحریر کو نفسیاتی مسئلہ سمجھیں تو پھر قلم ”مدھنی“ جان ابراہیم اور چاشا ساموکی دیکھیں اور اگر روحانی نظر سے دیکھیں تو پھر جو کی ”ہوایا دا آگئی“۔ تیسرے نمبر پر ”قسمت“ رزی۔ ”منہری دھوپ“ افسانہ کی رنگ لیے ہوئے تھی۔ رانا محمد عیاد و عائشہ لکھنے اور صدارت کی مبارک۔ رانا محمد شاہد کاش ایسے موقع پر جب آپ کی والدہ ماجدہ دارقانی سے رخصت ہو گئی ہیں ہم آپ کے گھر تک کر افسوس



کرتے، کیا کر سکتے ہیں ہر کسی نے جانتا ہے، اللہ تعالیٰ مہربان رحم آپ کی والدہ کو فردوس بریں میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ سکیل احمد عباسی! بھائی آپ کی غیر حاضری دل کو پریشان کر دیتی ہے کیا کریں آپ 1991ء میں ”عصر خیال“ میں داخل ہوئے اور ہم 1992ء میں۔ آپ سے تعلق ہی ایسا ہے بہر حال ہمارے بلانے پر آنے کا شکریہ۔ ڈیڑھ معراج رسول صاحب ہم نے سلور جوبلی کی تجویز نومبر 2012ء اور پھر دوبارہ مارچ 2014ء کو دی پھر وقتاً فوقتاً توجہ دلاتے رہے۔ سب سے پہلے ہماری تجویز کی تائید خود آپ نے کی۔ 2012ء کو ہم نے لکھا کہ آپ کے پاس صرف دو سال کا وقفہ ہے اس لیے کام شروع کر دیں آپ نے لکھا انتہاء اللہ ہماری تجویز پر بڑے سامنے رکھی جائے گی۔ خیال بہت اچھا ہے۔ پھر منشی محمد عزیز مئے نے اور جاوید خان درانی سرکافی نے سب سے پہلے ہم پر تائید کی تھی۔ لکھنے کا مقصد یہ ہے جب آپ نے ہماری تجویز قبول کر کے تیاری شروع کر دی تو ایک موصوف فرما رہے ہیں کہ ہماری تجویز ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہے جیسے شاہد جہانگیر شاہد کی تحریر شاعر اعظم کو سال دو سال بعد ہم شاعر ملی کے نام سے سرگزشت میں شائع کروادیں تو شاہد جہانگیر شاہد اور ادارہ کا ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟ جو ضرور بیان کر دینیے گا۔ بہر کیف ان خطوط کی فوٹو کاپی ثبوت کے ساتھ خط کے ہمراہ ہے۔ برائے مہربانی توجہ دیجیے گا۔ ان دنوں خونی چاند کا بہت زیادہ تذکرہ ہے یہودی کہتے ہیں جب آگے جیچے 4 دفعہ خونی چاند پڑے تو دنیا میں نظر آئے تو پھر ہمارا عظیم بادشاہ کا ظہور ہوگا۔ یعنی ”خروج و جال“ ہوگا۔ جن کا وہ پانچ صدیوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ پہلا خونی چاند 15 اپریل 2014ء کو نظر آیا۔ دوسرا خونی چاند 18 اکتوبر 2014ء کو ہوا۔ اب تیسرا خونی چاند 4 اپریل 2015ء کو نظر آئے گا۔ چوتھا اور آخری خونی چاند 28 ستمبر 2015ء کو نظر آئے گا۔ سلور جوبلی میں یا اس سے پہلے اس پر تحقیقی اور معلوماتی تحریر لکھیں۔ جنوری کے شاد سے منشی شیراز خان، جانی۔ لے لے نے آپ حیات لکھی۔ تلاش کی طرح عجیب زبردست تحریر تھی۔ ہمارے خیال میں وہ حیرت انگیز اور عجیب و غریب کہانیاں لکھنے پر تلے رکھتے ہیں۔ وہ سرگزشت میں اچھا اور خوب صورت اضافہ ہیں۔ ان کو سرگزشت سے نہ جانے دیجیے گا۔ آئی ظاہر و محض آپ نے اگلی صبت سے چکی برتھوڑے کی مبارک باد دی کہ دل چاہا کہ پشاور پہنچ کر آپ کا منہ مضاعف کرواؤں۔ سدرہ بانو ناگوری کہاں تم ہو نہیں؟ عمران جوانی آپ کا انتہائی مشکور ہوں۔ بشری افضل بہت ہمیشہ خوش رہیں۔ منشی عزیز مئے، احمد خان توحیدی اچھا لکھ رہے ہیں۔ عزیز اللہ کانی عرصے بعد ”عصر خیال“ میں آئے۔ انہوں نے مایا غریب سے نہیں، کن کن اور کالے بچھو کے بارے میں جو معلومات دی ہے تو ہم عرض کریں جناب دو کام تو ”وگرا“ بھی کر دیتا ہے۔ یہ کوئی اور پتھر ہے۔ یا تو کینسر والا معاملہ ہے یا کوئی اور۔ معراج رسول صاحب سے گزارش ہے کہ کن کن (زہر بلا جھپٹکا) اور کالے بچھو پر معلوماتی تحریر شائع کریں۔ سلور جوبلی نمبر غالباً اگست میں شائع ہوگا؟ ”باکمال“ آئن اسٹائن کا اس خط کے بعد مطالعہ کریں گے۔ اس تحریر کا شدت سے انتظار تھا۔ شکریہ۔

شاہد جہانگیر شاہد کا مختصر مگر پورے خط پشاور سے۔ ”سرگزشت چند ماہ سے حالات کچھ ایسے ہیں کہ کچھ لکھنے کوئی نہیں چاہتا جس کی وجہ چند بہت ہی عزیز ہستیوں کا دنیا سے کوچ کر جانا ہے۔ سب سے بڑھ کر جس واقعے نے خون کے آنسو رلائے ہیں وہ آدری پبلک اسکول کے معصوم بچوں اور اساتذہ کا انتہائی بے دردی سے قتل ہے۔ ہمارے ملک میں اس وقت سب سے سستی چیز انسانی جان ہے۔ ماضی میں ہمارے حکمرانوں نے حماقتوں سے جو فصل بوئی وہ آج ہم کاٹ رہے ہیں۔ زخم زخم پشاور آج بھی سو گوار ہے۔ اللہ رحم کرے۔ اسکول کا ٹم تازہ ہی تھا کہ حیات آباد کی مسجد میں عین جمعہ کی نماز میں حملہ ہو گیا۔ وہ بھی تو گلہ گو ہیں۔ عین نماز میں خود کش حملہ، انف خدایا۔ سرگزشت کے دیرینہ کالم نگار، قلم ساز و کہانی نویس علی ستیان آفاقی بھی ہمیں کو چھوڑ گئے۔ فہر خیال کے ساتھی رانا محمد شاہد کی والدہ کے انتقال پر تعزیت۔ اس سے زیادہ اور کچھ لکھنے کی تاب نہیں۔ آئندہ ماہ پھر پورے ہمارے ساتھ حاضری دوں گا۔“

ہملا مجید احمد جانی ملتان شریف سے رقمطراز ہیں۔ ”بندہ ناچیز کو مجید احمد جانی کہتے ہیں۔ منشی عزیز مئے کی رحمت پر ہم بھی شامل حال ہونے کی جسارت کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ میں بھی جگہ عنایت فرمائیں گے۔ آپ سب کے لیے غاضب ہوں لیکن ملے ہیں تو ساتھ رہے گا۔ معراج رسول کا ادارہ پڑھتے ہی دل خون کے آنسو روتے لگا۔ شہد پشاور کے لیے دیا گوہوں۔ اللہ تعالیٰ دشمنوں کو نیست و نابود کرے۔ مقبول ترین سلسلہ فہر خیال میں قدم جمائے تو رانا محمد شاہد کو صدمہ لگ کر سی پر برا جوان پایا۔ تفصیلی تبصرہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ اس کے علاوہ پیارے دوست منشی محمد عزیز مئے اور رانا محمد شاہد پر سے والے جن کو جانی بھی ہوں بہترین تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ ملک محمد ظفر اللہ، سکیل احمد عباسی، محمد عمران، ادلیس شیخ، بشری افضل، قیصر خان، سید انوار عباس شاہ، ناصرہ احمد، فقیر غلام حسین، غیا، خالد شفیع، احمد خان توحیدی، عزیز اللہ، رانا فیصل جاوید شاہد اور تبصرے فرما رہے تھے۔ سبھی کو مبارک باد قبول کیجیے۔“

بعد افسوس مندرجہ ذیل قارئین کے خطوط تاخیر سے موصول ہوئے۔

ادباز خان، مزہب، چکری (پشاور)، نادر مرزا (اسلام آباد)، مسیح اکرام (منظر گڑھ)، ادلیس حسن (ساہیوال)، نادر ش صدیقی (کراچی)، نادرین (سکھر)، ادباز علی وارث (جہلم)، مانی (دیر)، اکرم ترمذی (ملتان)، عباس علی خان (دہلی)، جانی (ای)

## استادِ ادب

آزادی کے بعد اردو ادب میں ایسے گنتی کے نام ابھرے جنہیں ہم معمارِ اردو ادب کہہ سکتے ہیں۔ انہی نابغہ روزگاروں میں ایک نام ابوالکلیت صدیقی ہے جنہیں ہم فخریہ پاکستان کا اہم قلم کار کہہ سکتے ہیں۔ ان کے کات دار جملے، پینی نظریہ الفاظ کی پرکھ اور جملوں کی مضبوط ساخت اپنی مثال آپ ہے مگر ان کی زندگی کتنے عجیب انداز میں گزری، کن مصائب کا سامنا رہا۔ یہ بلند مقام کس جہد مسلسل کے بعد حاصل ہوا اسے یاد رکھنا ضروری ہے کہ دوسروں کی زندگی سے یہ سبق بہ آسانی حاصل ہوتا ہے۔

انہی کی دختر نے شادی کی۔ جب انہوں نے اتنی ترقی کر لی تو ان کے والد ملک حمید الدین ہزوار نے بھی رشتہ منر بامعہاء ہزوار کو خیر باد کہا اور بدایوں آگئے۔ یہ بزرگ حضرت ابو بکر صدیق کی آل میں سے تھے۔ ان کی علمیت کو دیکھتے ہوئے دربار واپسی سے انہیں اعلیٰ مناصب عطا ہوئے۔ انہی بزرگ کی مناسبت سے یہ خاندان ”حمیدی“ کہلانے لگا۔ قاضی صدر الدین کے تعلق سے ارد گرد کے علاقے کو قاضی محلہ کہا جانے لگا۔

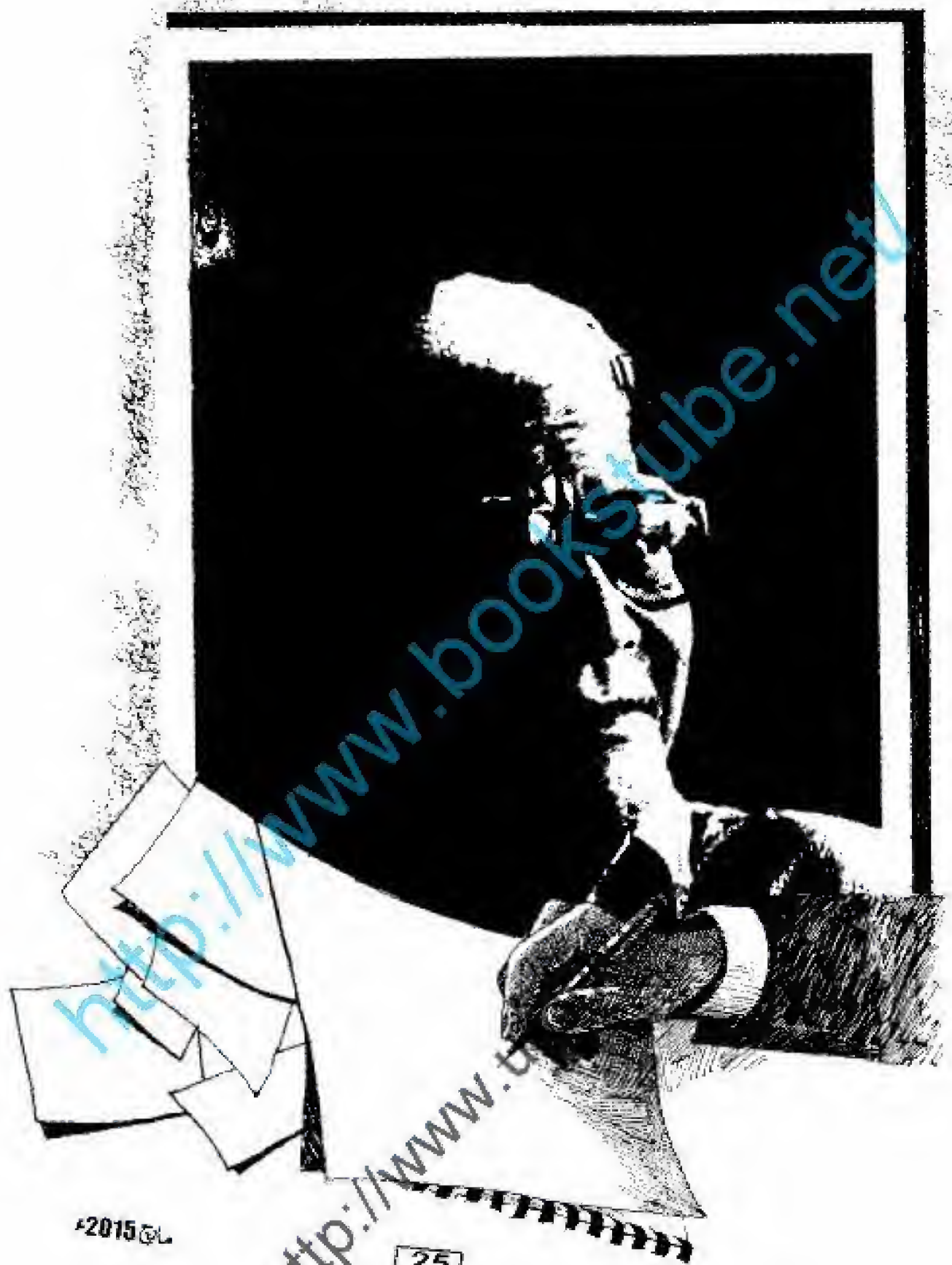
اس خاندان کے شجر ساپہ دار کی شاخیں پھیلیں تو حمیدیوں کے بہت سے مکانات تعمیر ہو گئے۔ اس خاندان کے فرزندوں نے بدایوں کی علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی ترقی میں ایسے نمایاں کردار ادا کیے کہ بزرگوں کی عزت و عظمت کو جادو جادو کہہ دیے۔

وقتِ ادرا کے بڑھا۔ ضرورتوں نے پاؤں پھیلائے۔ دلوں میں نئی مختاشوں نے پاؤں سمیٹ لیے۔

کہا نیاں جھوٹ بول سکتی ہیں، آنکھوں دیکھی کو جھوٹ کون کہے۔ ماضی نے حال کے بستر پر کئی شکلیں ڈال دی تھیں لیکن اب وہاں بھی اتنا تھا کہ جس دروازے پر چلے گا کا بھی جھوٹا تھا اب دو محوڑوں کی بھی آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس حویلی نما مکان کے ایک کینٹینی مظفر علی اس بھی پر سوار ہو کر شام کی سیر کے لیے نکلتے تھے کہ نیاں ان کے آگے آگے چلتی تھیں۔ ایک کہانی سب سے زیادہ پر عظمت تھی۔ وہ یہ کہ یہ صاحب جو بھی میں بیٹھے ہیں وہ ان کے چہرے پر نری اور جلال کے طے جلتے تاثرات نمایاں نظر آ رہے ہیں۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے لیے ان کے اجداد نے خون کا نذرانہ پیش کیا تھا۔

اس سے بھی پیچھے چلے جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے ایک بزرگ قاضی صدر الدین بہ عہد سلطان غیاث الدین بلبن ہزوار سے ہندوستان آئے اور بدایوں پہنچے۔ بدایوں کے قاضی سعد الدین کے جانشین ہوئے اور





© 2015

25

مہاراجہ شاہ شہزاد شاہ

نا اتفاقوں نے زور باندھا تو آنکھوں میں دیواریں اٹھنے لگیں۔ جسے بخرے ہونے لگے جن کی دستری میں تھا انہوں نے اپنے رہنے کے لیے الگ مکان بنوا لیے۔ مظفر علی نے بھی اپنے رہنے کے لیے الگ مکان بنوا لیا۔ یہ مکان بھی کسی حویلی سے کم نہیں تھا۔ اتنا خوب صورت بنا تھا کہ ماضی کی شان و شوکت کو حال کی آنکھوں سے دکھارہا تھا۔

☆.....☆

دیوان خانے میں چار دوست سر جوڑے بیٹھے تھے۔ ان میں ایک نظام الدین نظامی، نظامی پریس بڈایوں کے مالک تھے۔ دوسرے اختر الاسلام تھے جو جیلر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ تیسرے دوست مولوی ہیہ احمد صاحب تھے اور چوتھے خود مٹی مظفر علی تھے۔

گفتگو کے دوران میں نظامی صاحب خاموش بیٹھے رہے تھے لیکن جب سب اپنی اپنی کہہ چکے تو نظامی صاحب نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

”میرے خیال میں تو آپ کو یہ پیشکش قبول کر لینی چاہیے۔ ہمیں آپ سے پچھڑنے کا دکھ ضرور ہوگا لیکن بڈایوں سے آگرہ دور ہی کتنا ہے۔ آپ کے دل میں اگر ہماری محبت ہوگی تو ہفتہ پندرہ دن میں بڈایوں کا پھیرا لگا سکتے ہیں۔ میں تو اکثر آگرہ جاتا رہتا ہوں۔ اگر آپ نہ آئے تو اپنے اخبار میں اشتہار چھاپ کر آپ کو بلا لوں گا۔ غرض ملاقات ہوئی جایا کرے گی۔ ترقی کا ایک موقع ہاتھ آ رہا ہے تو کیوں ہاتھ سے جانے دیتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے نظامی صاحب۔“ مٹی مظفر علی کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

”جب ٹھیک ہے تو کیا ہے؟“

”سوچنا ہوں دوستوں کی جو کڑی ختم ہو جائے گی۔ دو شہروں کا فاصلہ بہر حال فاصلہ ہوتا ہے۔ یوں شام کو روز کیسے مل سکیں گے۔ نوکر پاں ہزار مل جائیں گی دو کھانا ملے ہیں۔“

”مظفر علی! بعض فیصلے جذبات سے کن عقل سے کیے جاتے ہیں۔ لوگ سرکاری نوکری اس لیے کرتے ہیں کہ

ترقی کریں۔ اس کے لیے سفارشیں کراتے ہیں آپ کو بھی

سفارش کے بغیر ہی ترقی مل رہی ہے۔ بڈایوں نہ سکی آگرہ

سکی۔ میری تو یہی رائے ہے ویسے آپ ہم سب سے زیادہ

عقل مند ہیں۔“

اختر الاسلام صاحب نے بھی اس وقت یہی رائے

دی۔ ”مظفر علی، یہ انگریز کا دور ہے انگریز کا۔ کسی ہندوستانی

کو ترقی اپنے ہی نہیں مل جاتی۔ میں جیلر رہا ہوں، مجھے معلوم ہے لوگ اس ترقی کے لیے کیسے کیسے پاؤں پٹیتے ہیں اور یہ بھی یاد رکھیے یہ قوم بڑی ظالم ہے جسے انگریز کہتے ہیں۔ اگر ایک مرتبہ آپ نے ان کے احکامات ٹھکرا دیے تو زندگی بھر کے لیے ترقی کے خواب دیکھنا چھوڑ دیجیے گا۔ رجسٹرار خلیہ عدالت کوئی معمولی عہدہ نہیں ہوتا، آگرہ بڑا شہر ہے بچوں کو اچھے اسکول بھی میسر آئیں گے۔ میں بھی نظامی کی طرح یہی مشورہ دوں گا کہ آگرہ چلے جاؤ۔“

مظفر علی سر جھکا کر سن رہے تھے۔ ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مطمئن تو ہو گئے ہیں لیکن ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچے ہیں۔ ابھی ان کے دل و دماغ نے کوئی واضح فیصلہ نہیں کیا ہے۔

دوست رخصت ہوئے تو وہ غالباً کچھ مزید سوچنے کے لیے اپنے کتب خانے میں چلے گئے۔ ان کے پاس کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ وہ شرفا کے مشغلے شاعری پر بھی کاربند تھے اس لیے ان کے کتب خانے میں شعرا کی دوا دین کثرت سے تھے۔ ان میں بھی زیادہ تعداد شعرا کے لکھنؤ کے دوادین کی تھی۔ نثر کی کتابیں بھی اچھی خاصی تھیں۔ طلسم ہوشربا اور داستان امیر حمزہ سے لے کر شعرا کے تذکرے تک، سب کچھ تھا۔

ملازم نے حقہ تازہ کر کے رکھ دیا تھا۔ حقہ کی گڑگڑاہٹ میں ان کا ذہن بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ بڈایوں چھوڑ کر آگرہ چلا جاؤں یا اسی ملازمت پر گزاردہ کرتا رہوں؟ دوستوں کی باتیں ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ وہ کبھی ایک فیصلہ کرتے تھے تو کبھی دوسرا۔ درمیان میں کتابوں کی ورق گردانی بھی کرتے جا رہے تھے۔ پھر انہوں نے کم از کم ایک فیصلہ کر لیا۔ آخری مرتبہ بیوی سے اور پوچھ لوں پھر جو وہ کہیں گی وہی کر لوں گا۔

وہ کتب خانے سے نکل کر اپنی بیوی فاطمہ صغرا کے پاس پہنچ گئے۔ فاطمہ صغرا کا شمار صرف خاندان ہی میں نہیں شہر بھر میں تعلیم یافتہ اور ذہین خواتین میں ہوتا تھا۔ ان کے خاندان میں عورتوں کے لیے لکھنے پڑھنے کا رواج ممنوع نہیں تھا البتہ لکھنے لکھنے پر پابندی تھی۔ اکثر عورتیں فارسی، اردو، روانی سے پڑھتی تھیں لیکن انہیں لکھنا نہیں سکھایا جاتا تھا۔ ان میں یہ نکتہ پوشیدہ تھا کہ لڑکیاں کسی کو عشقیہ خطوط نہ لکھ سکیں۔ اس وقت کی تہذیب کا یہی تقاضا تھا۔ اس پابندی کے باوجود فاطمہ صغرا نے اپنی تعلیم کو اس حد تک کھل کیا تھا کہ



نہ صرف اردو بلکہ انگریزی میں بھی دسترس حاصل کی تھی۔  
فاطمہ صغرا اس وقت کسی کتاب کے مطالعے میں  
مصروف تھیں کہ شوہر کی آہٹ سن کر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ بڑا بیٹا  
ابوظفر بھی قریب بیٹھا تھا۔ فاطمہ صغرا اٹھ کر بیٹھیں تو ابوظفر  
باپ کی شکل دیکھ کر وہاں سے کھٹک گیا۔  
فاطمہ صغرا بلا کی چہرہ شناس تھیں۔ شوہر کو دیکھتے ہی سمجھ  
گئیں کہ وہ اس وقت کسی الجھن میں ہیں۔

”خیر تو ہے آج دوستوں کے ساتھ بڑی لمبی نشست  
ہوگئی؟“ فاطمہ صغرا نے پوچھا۔

”وہ تو کب کے رخصت ہو گئے۔ میں تو کتب خانے  
میں تھا۔ وہیں سے سیدھا چلا آ رہا ہوں۔“

”ایسا کیا سوال انہوں نے پوچھا کہ آپ کو کتابوں  
کی ضرورت پڑ گئی۔“

”سوال ایسا ہے کہ جواب کتابوں میں بھی نہیں مل  
سکا۔ سوچا استانی جی سے پوچھا جائے۔“

”چھوڑیے بھی کیوں مذاق کرتے ہیں۔ میں کہاں کی  
عالم فاضل ہو گئی۔“

”میں اس وقت مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ میں واقعی الجھ  
گیا ہوں۔ آپ ہی کچھ بتا سکتی ہیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”اللہ خیر کرے۔ ایسا کیا معاملہ پیش آ گیا۔“

”بیگم بات یہ ہے کہ میری ترقی کے احکامات آئے  
ہیں۔ مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے۔“

”افو، مجھے تو آپ نے ڈرا ہی دیا تھا۔ یہ تو خوشی کی  
خبر ہوئی اس میں الجھن کیسی۔“

”آگے تو سنو۔ وقت یہ ہے کہ میری تعیناتی آگرہ  
میں ہوئی ہے۔“

”آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے ولایت جانا ہے۔  
آگرہ، بدایوں کا ایک محلہ ہی تو ہے۔“

”ہم نے کس چاؤ سے یہ مکان ہو گیا تھا۔ اب اسے  
چھوڑنا پڑے گا اور سچی بات تو یہ ہے کہ بدایوں سے جانے کو  
جی نہیں چاہتا۔ یہاں احباب ہیں، اجداد کی قبریں ہیں۔“

رشتے دار بھی سب قریب قریب ہیں اب تم بتاؤ مجھے کیا کرنا  
چاہیے؟“

اب فاطمہ صغرا سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ سمجھ گئیں کہ معاملہ  
سنجیدہ ہے۔ ترقی کا ایک موقع ملا ہے اور مظفر علی اس سنہری  
موقع کو ٹھکرانے کے لیے موقع ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس موقع

پر انہیں سمجھانا ضروری ہے۔

”دیکھیے انسان اور پتھر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ پتھر  
ایک جگہ پڑا رہتا ہے جب کہ انسان آگے بڑھتا ہے۔ آپ  
کے عہدے میں اضافہ ہو رہا ہے تنخواہ بھی بڑھے گی۔ ابوظفر  
کو ہم اچھی تعلیم دلا سکیں گے۔ چار دن کی زندگی عیش و عشرت  
میں بسر ہو جائے تو کوئی حرج ہے کیا؟ میرے خیال میں تو  
ہمیں آگرہ چلے جانا چاہیے۔“

”اور یہ مکان؟ اور بدایوں؟“

”ہم یہ مکان فروخت تھوڑی کررہے ہیں۔ بدایوں  
آنا جانا لگا رہے گا۔ اسی مکان میں ٹھہریں گے اور پھر ہمیشہ  
کے لیے تھوڑی جائیں گے۔ مدت ملازمت ختم ہونے کے  
بعد بدایوں ہوگا اور ہمارا یہ گھر۔“

”تو آپ کی رائے بھی یہی ہے۔“

”صرف میری رائے نہیں میرا اصرار بھی یہی ہوگا۔“

”اب کسی اور سے کیا پوچھنا جب آپ نے بھی  
میرے دوستوں کی رائے سے اتفاق کر لیا تو اب آپ تیاری  
کریں۔ میں آگرہ جا کر رہائش کے لیے کوئی اچھا سا مکان  
دیکھتا ہوں۔“

وہ آگرہ گئے۔ پتھلی منڈی وہاں کا ایک مشہور محلہ  
تھا۔ اس محلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی  
تھی۔ ایک گھر کسی ہندو کا تو اس کے برابر کسی مسلمان کا ٹھکانا  
اور لطف یہ کہ سب اس محبت سے رہتے تھے کہ مذہب کی کوئی  
تفریق ہی نہیں تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سب پڑھے  
لکھے لوگ تھے، کیا ہندو کیا مسلمان۔

اسی محلے میں مظفر علی نے بھی رہنے کے لیے مکان  
لے لیا۔ مکان کے سامنے ایک ہندو وکیل رہتے تھے۔ مظفر  
علی کا تعلق بھی چونکہ عدالت سے تھا لہذا وہ سب سے پہلے  
اس وکیل سے ملے اور اپنے آگرہ آنے کی نوید سنائی۔

مکان کا بندوبست ہو جانے کے بعد مظفر علی بدایوں  
آئے۔ بیوی اپنی ضرورت کی چیزیں سیٹ ہی چکی تھیں۔

زائد سامان گھر میں بند کیا۔ ضروری سامان کے ساتھ گھر  
سے باہر نکل آئے۔ پلٹ کر گھر کے دروازے کی طرف  
دیکھا۔ دروازے پر لگی سنگ مرمر کی تختی پر نظر پڑی جس پر

الکھانا لکھا ہوا شعر کندہ تھا

محل کی طرح رکھا ہے نگوں کو نشین کے  
پہلے سے لے مرے اللہ شاخ آشاں میری

☆.....☆

آگرہ کوئی شہر نہیں تھا۔ دہلی سے پہلے بھی

دار الخلافہ تھا۔ میر تقی میر، مرزا غالب اور نظیر اکبر آبادی کے نام یاد دلانا تھا۔ ادبی تقاضا بھی مظفر علی کے سبب منشا تھی۔ وہ بہت جلد یہاں کے ماحول میں ڈھل گئے۔ فطرتاً مجلسی مزاج کے حامل تھے۔ بہت جلد احباب کا کثیر حلقہ جمع کر لیا۔ اس حلقے میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ کیا گری کا شوق رکھنے والے بھی اور موسیقی کی تانوں پر سر و ہنسنے والے بھی۔ ان میں سے بہت سے تو ایسے تھے جو اپنا تمام وقت اسی وسیع و عریض گھر میں گزارتے تھے۔ غائب ہوئے تو ہفتوں غائب آکر پڑے تو جانے کا نام نہ ارد۔

مظفر علی نے اپنی ملازمت میں بھی خوب ترقی کی۔ مختلف عہدوں سے ہوتے ہوئے آخری منصرفی تک پہنچے اور ”منصرف صاحب“ کہلانے لگے۔

مظفر علی نے بھی کہا تھا۔ ”پہلے پھولے مرے اللہ شاخ آشیاں میری“ شاید اس کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا۔ فاطمہ صغرا نے شوہر کو خوش خبری سنائی کہ شاخ آشیاں میں ایک پھول کا اضافہ ہونے والا ہے۔

آگرہ کی سردیاں عروج کو چھونے کے بعد بہار کے موسم کی طرف راضی تھیں کہ پتیل منڈی کے اس مکان میں تو مولود کے رونے کی آواز سنائی دی۔

مظفر علی نماز فجر ادا کرنے کے بعد گھر لوٹے تھے کہ اس خوش خبری نے ان کی سماعت کو شاد کام کیا۔ اس بچے کا تاریکی نام ابواللیث صدیقی دانش مند تجویز ہوا جس کے اعداد اسے 1335ھ برآمد ہوتا تھا۔

اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ یہ بچہ آسمان ادب پر ستارے کی طرح چمکے گا محقق، مدربر، مدرس، نقاد، صحافی اور ماہر لسانیات ہو گا اور فی الحال ابواللیث صدیقی کے نام سے نامور ہو گا۔

اس کا بچپن گھنٹوں چلتا ہوا ایسے ہیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ چار سال کا ہو گیا تھا۔ اس وقت کے مسلمان گھرانوں میں اور تقریباً اب بھی یہ عمر ایسی ہوتی ہے جب بچہ بسم اللہ کے بعد بچے کی تعلیم کا آغاز کیا جاتا ہے۔

وہ اس عمر کو پہنچا تو مظفر علی کو شوق ہوا کہ بسم اللہ کی تقریب دھوم دھام سے کی جائے۔ دوستوں کا بھی اصرار ہوا کہ اس بہانے مل بیٹھنے کا موقع مل جائے گا۔ مظفر صاحب کا بیٹا پڑھنے کی عمر کو پہنچے اور تقریب نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مظفر علی نے فاطمہ صغرا سے ذکر کیا کہ گھر کی تنظیم تو وہی تھیں اور اس اعتماد کے ساتھ ذکر کیا کہ یہ خبر سننے ہی

بیوی کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہے گا۔

”لیٹ میاں خدا کے فضل سے چار سال چار ماہ کے ہو گئے ہیں۔“

”اللہ رکھے۔“

”اب اس کی رسم بسم اللہ ہونی چاہیے۔ بچہ ہے خوش بھی ہو جائے گا اور دوستوں کو جمع کرنے کا موقع بھی ملے گا۔“ بات خوشی کی تھی لیکن فاطمہ صغرا کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”میں نہیں چاہتی کہ میرا یہ بچہ بھی کسی حادثے سے دو چار ہو۔ ہمیں یہ رسم اس نہیں آتی۔ میں اس تقریب کے حق میں نہیں۔“

”وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ ضروری تو نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہی ہو۔ اس وہم کو دل سے نکال دو۔ کوئی حادثہ زندگی کو آگے بڑھنے سے روک نہیں دیتا۔“

”جانتی ہوں لیکن کیا کروں۔ میرا دل نہیں مانتا۔ ابواللیث کی بسم اللہ کا سن کر مجھے اپنا پہلا بچہ یاد آ گیا۔ اس کی بھی بسم اللہ ہوئی تھی لیکن کیا ہوا چند دنوں بعد ہی میرا بچہ کس بے بسی کی موت مر گیا۔“

مظفر علی نے بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مانیں۔ یہ تقریب نہ ہوگی۔

اس کا پس منظر یہ تھا کہ ابواللیث کا بڑا بھائی جس کی رسم بسم اللہ ہوئی تھی اس کے چند دنوں بعد جل کر فوت ہو گیا تھا۔ فاطمہ صغرا اس صدمے سے نکل نہیں سکی تھیں بلکہ ایک وہم سا ہو گیا تھا۔ وہ اسی لیے ایسی کسی تقریب سے گریزاں تھیں۔

مظفر علی کو تو سرکاری کاموں سے فرصت نہیں تھی۔ بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری فاطمہ صغرا پر ہی تھی۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ پڑھی لکھی تھیں۔ بڑے بیٹے ابوظفر کو بھی وہی پڑھانی تھیں۔ اب ابواللیث بھی پڑھنے کے لائق ہو گیا تھا۔ کسی مدرسے میں بھیجنے سے پہلے وہ خود اسے لے کر بیٹھ گئیں۔

چند روز ہی میں انہیں اندازہ ہو گیا کہ ابواللیث پڑھائی کے معاملے میں تنجید بھی ہے اور ذہن بھی۔ متین اور سخت دے دی جاتی اور وہ گھنٹوں بیٹھ کر لکھتا رہتا۔ کھیل کود سے کوئی سروکار تھا۔ چند مہینے نہیں گزرے تھے کہ وہ اردو قاعدہ خوانی سے پڑھنے لگا۔ اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ اسے کسی مدرسے میں داخل کر دیا جائے۔



انہیں محلے کے قریبی کتب میں بھیج دیا گیا۔ عمر ایسی نہیں تھی کہ کبھی دور بھیجا جاتا۔ فاطمہ صغرا اسے اپنی آنکھوں کی چھاؤں میں رکھنا چاہتی تھیں۔

اس کتب کے استاد مولوی سلامت اللہ تھے۔ نہایت بھاری بھر کم، کھنٹی، دائری، چہرے سے غصہ نکلتا تھا۔ شاید ہی کوئی بچہ ہو جو ان کی مار کھانے سے بچا ہو لیکن ابواللیث ایسا خلیق و متین تھا کہ وہ دو سال ان کے در سے میں رہا لیکن کبھی مار نہیں کھائی۔ جو سبق ملتا فرسنا دیتا۔ لکھنے میں وہ مشاق، ہم جویوں کی شرارتوں سے وہ دور پھر سزا ملتی تو کیوں۔

وہ صرف دو سال یہاں گزارنے کے بعد اس قافلہ ہو گیا کہ اسے کسی دوسرے اسکول میں داخل کرا دیا جائے۔ نگاہ انتخاب اسلام یہ ہائی اسکول پر پڑی اور اسے یہاں داخل کرا دیا گیا لیکن جلد ہی اندازہ ہوا کہ یہ انتخاب غلط تھا۔ یہ اسکول گھر سے بہت دور تھا۔ آنے جانے میں بہت وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ فاطمہ صغرا نے محسوس کیا کہ وہ اسکول سے آتا ہے تو بہت تھک چکا ہوتا ہے اگر کسی قریبی اسکول میں داخل کرا دیا جائے تو گھر پر پڑھنے کے لیے بہت وقت ضائع جائے گا۔ ایک مرتبہ پھر کسی ایسے اسکول کی تلاش شروع ہوئی۔ قرعہ فال و کنور یہ ہائی اسکول کے نام نکلا۔ اس کا تبادلہ کرا یا گیا اور وہ کنور یہ ہائی اسکول میں داخل ہو گیا۔ وقت پر لگا کر اڑنے لگا لیکن چینی کی بنسری بجاتے صرف دو سال گزر سکے۔

مظفر علی منصر جمی کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ ان کی دیانت داری کے چرچے پورے شہر میں تھے۔ مزید ترقی کے دروازے بھی ملے ہوئے تھے لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک مختصر سی عمارت میں بعد مظفر علی کا انتقال ہو گیا۔ یہ اس خاندان کے لیے معمولی حد تک نہیں تھا۔ بقول شخصے کچا ساتھ تھا۔ بیچ ابھی چھوٹے تھے۔ ابواللیث کی عمر صرف نو سال تھی۔ اس سے بھی دو چھوٹے بھائی تھے۔ بڑے بھائی ابوظفر کی عمر بھی زیادہ سے زیادہ چودہ سال کی۔ ان کی موت کا صرف گھر میں ہی کبرام نہیں تھا۔ شہر بھر میں سوگ کا عالم تھا۔ ایسی مقبول شخصیت تھے کہ جس نے سنا افسوس کیا۔ جس دن تدفین تھی عدالتیں ان کے سوگ میں بند ہو گئیں۔

جنازہ اٹھنے ہی والا تھا کہ بعض قریبی عزیز جو بدایوں سے آئے تھے انہوں نے اصرار کیا کہ تدفین بدایوں میں ہوئی جائے۔ خاندانی قبرستان بدایوں میں ہے۔ وہاں

سب بزرگوں کی قبریں ہیں۔ مظفر علی بھی اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوں گے۔ بدایوں کی سرزمین اولیاء اللہ کی سرزمین ہے۔ مظفر علی کو اسی پاکیزہ زمین میں سپرد خاک کرنا چاہیے۔

جنازہ تیار تھا اور یہاں یہ بحث ہو رہی تھی۔ فاطمہ صغرا تو ایسی بے حال تھیں کہ کوئی رائے دینے کا حوصلہ ہی نہیں تھا۔ بہر حال یہی ملے ہوا کہ تدفین آگرہ میں نہیں ہوگی بلکہ میت بدایوں لے جانی جائے گی۔

اتفاق کس کے پاس تھا کہ گھر سمیٹا جاتا۔ بھرا پرانے آگرہ میں موجود بعض عزیزوں کے سپرد کیا۔ جلدی جلدی میت کو فرین سے بدایوں لے جانے کا بندوبست ہوا۔

میت بدایوں پہنچ گئی۔ ظاہر ہے بچے اور بیوہ بھی ساتھ تھے۔

خاندانی قبرستان میں جو حوض قاضی قبرستان کہلاتا تھا منصر مظفر علی کو ہمیشہ کے لیے ملا دیا گیا۔

چند دن کی تعزیت اور رسم دنیا داری نبھانے کے بعد جب اعزہ رخصت ہوئے تو فاطمہ صغرا کو یوں محسوس ہوا جیسے سارے جہان کی دھوپ ان کے گھر میں اتر آئی ہے۔ وہ جو سایہ تھا جو دھوپ سے بچائے رکھتا تھا سردی سے بٹ گیا ہے۔ انہیں وہ دن یاد آئے جب وہ بدایوں سے آگرہ جا رہی تھیں۔ انہوں نے مظفر علی سے کہا تھا ہم ہمیشہ کے لیے تمھوڑی چارہ ہیں۔ مدت ملازمت ختم ہونے کے بعد اسی گھر میں چلے آئیں گے۔ پھر وہی بدایوں ہو گا وہی گھر۔ گھر وہی تھا مگر والا چلا گیا تھا۔ مدت ملازمت ختم نہیں ہوئی تھی کہ زندگی کی مدت ختم ہو گئی۔ گھر کے دروازے کھلے ضرور لیکن میت وصول کرنے کے لیے۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ عزیز واقارب تو جاہلاد پر نظر اس گاڑے بیٹھے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میری آنکھیں بھی بند ہو جائیں اور بچے بے سہارا رہ جائیں۔ مجھے جلد از جلد بچوں کو کسی قافلہ بنانا ہو گا تاکہ باپ کی چھوڑی ہوئی جاہلاد کی حفاظت کر سکیں۔ انہوں نے اس وقت بڑی ہمت سے کام لیا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت پہلے بھی انہی کے ہاتھ میں تھی اب ذمہ داری اور بڑھئی۔ انہوں نے مظفر علی کے دوستوں سے مشورہ کیا اور ابواللیث کو مشن اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس نیک ولی خاتون نے یہ مشن برقرار رکھی تھی کہ اسکول گھر کے قریب ہو۔ مشن اسکول کے قریب بھی تھا اور تعلیمی معیار بھی بہت اچھا تھا۔ ہیڈ ماسٹر ایسٹن انڈین تھے۔ اساتذہ کی اکثریت بھی عیسائی تھی لیکن ہندو، مسلمان اور سکھ بھی تھے۔



مشن اسکول سے آٹھویں پاس کرنے کے بعد اسے یہ اسکول چھوڑنا پڑا کیوں کہ یہ اسکول آٹھویں تک ہی تھا۔ اب اسے میٹرک کرنے کے لیے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخلہ لینا پڑا جو گھر سے خاصا دور تھا۔

وہ صبح ناشتا کر کے اسکول کے لیے نکلا تھا۔ فاصلے کا اندازہ کیا تو اسکول تک پہنچنے پہنچنے تین چار میل کا فاصلہ طے کر لیا ہوگا۔ ناشتا ختم ہو چکا تھا اور اب باقی وقت خالی پیٹ اسکول میں گزارنا تھا۔ کچھ پہلے دن کی اجنبیت کچھ بھوک، بڑی بے چینی سے وقت گزارنا۔ چھٹی ہوئی تو پیٹ میں کچھ ڈالنے کی فکر ہوئی۔ باہر نکلا تو اسکول کا مٹھائی فروش راچارام نظر آیا۔ اس سے مٹھائی لی اور گھر کی طرف واپسی کے راستے پر چل پڑا۔ تین چار میل پھر چلنا تھا۔

کچھ دن اور گزرے تو اسکول کا گراؤنڈ بھی دیکھ لیا جہاں اسکول کے طلبہ چھٹی کے بعد مختلف کھیلوں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ وہ بھی ان کھیلوں میں حصہ لینے لگا۔ اب معمول یہ ہو گیا کہ صبح گھر سے ناشتا کر کے اسکول کے لیے روانہ ہو جاتا اور شام کو کھیل سے فارغ ہو کر گھر کو لوٹتا تو مغرب کی اذان ہو رہی ہوتی۔ جیب میں پیسے ہوتے تو اسکول کے مٹھائی فروش سے کچھ لے کر کھالیتا ورنہ واپسی پر شام کا کھانا ہی نصیب ہوتا۔ ریڈیو بی وی وغیرہ قسم کی چیزیں تو آئی نہیں تھیں وقت گزاری کے لیے یہی ایک ذریعہ تھا کہ پڑھنے بیٹھا جائے۔

اسکول میں کچھ دن گزارنے کے بعد جب وہ میٹرک میں آیا۔ تعلیمی شعور بڑھا اور اچھے برے اساتذہ کی تیز ہوئی تو اس نے اپنے ارد گرد نظر ڈالی۔ اسے اپنے استاد سبطین احمد کی ذات میں نہایت کشش معلوم ہوئی۔ وہ اسے انگریزی اور تاریخ پڑھاتے تھے۔ محل گڑھ کے گرجوٹ تھے۔ گرجوٹ بہت سے ہوئے لیکن وہ تو علم کا بحر ذخائر تھے۔ بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں بھی اس قابلیت کے لوگ نہیں ہوتے جس پائے کے وہ تھے۔

ان کی قابلیت اور شخصیت دیکھ کر کسی طرح ان سے راہ و رسم پیدا کی جائے۔ لکھاس میں سبطین صاحب کا رتبہ بہت تھا۔ بچے ان سے بہت ڈرتے تھے۔ کسی کی ہمت نہیں کی کہ پڑھائی کے علاوہ ان سے کوئی بات کر سکے لیکن جب وہ ان کے قریب گیا تو معلوم ہوا وہ جتنے سخت نظر آتے ہیں اندر سے اتنے ہی نرم ہیں۔

سبطین صاحب، ابواللیث کے گھر کے قریب ہی

رہتے تھے لہذا جب ایک مرتبہ وہ وہاں گیا تو بار بار جانے لگا۔ وہ اسکول نہ چھوڑتے لیکن اپنی طبیعت کے اعتبار سے اپنی ذات میں علمی و تحقیقی ادارہ تھے۔ اعلیٰ پائے کے کتنے ہی لوگ تھے جو ان کی ذات سے فیض اٹھا رہے تھے۔ ان کی صحبت میں رہ کر ابواللیث کا ادبی ذوق پروان چڑھنے لگا۔ اس کا شوق دیکھ کر سبطین صاحب کی مہربانیاں بھی اس پر بڑھنے لگیں۔

ابواللیث کے دل میں جب ادبی ذوق نے جگہ بنائی تو اس نے والد کے کتب خانے کا رخ کیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کا کتب خانہ تقریباً بند پڑا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ والدہ کا حکم تھا نصاب کی کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب کو پڑھنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔

وہ ڈرتے ڈرتے کتب خانے میں داخل ہوا اور پھر جیسے وہ کسی نمائش میں آگیا ہو جس میں ناظرین موجود اشیا بھی ہوئی ہیں۔ تمام شعرائے لکھنؤ کے دواوین الماریوں میں ترتیب سے سجے ہوئے تھے۔ پھر وہ نثر کی کتابوں کی طرف گیا۔ اس نے محسوس کیا یہ اس کا خاص ذوق ہے۔ اس نے خود ہی طے کر لیا کہ کچھ لکھنے کے لیے لکھنا آنا چاہیے۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ لکھا کیسے جاتا ہے۔ کون سا اسلوب اختیار کیا جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ نثر کی کتابیں پڑھی جائیں۔ طلسم ہوشربا کی جلدیں رکھی ہوئی تھیں اس نے ایک جلد اٹھائی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اسے پڑھا کیسے جائے۔

اس نے ماں کی نظروں سے چھپ کر ان کتابوں کو پڑھنا شروع کر دیا۔ ”طلسم ہوشربا“ ختم کی تو وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا۔

اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ ”اردو“ کیا ہوتی ہے۔ نئے نئے الفاظ سے آشنائی ہوئی جو نصاب کی کتابوں سے میسر نہیں آسکتی تھی۔ بعض الفاظ اس کے لیے اجنبی تھے۔ لغت کی مدد سے اس نے ان معمول کو حل کیا۔

داستانوں کی جتنی کتابیں میسر تھیں ایک ایک کر کے سب پڑھ ڈالیں۔ پھر وہ شعراء کے تذکروں کی طرف مائل ہوا۔ ان کو پڑھ کر تو وہ یہ سوچنے لگا کہ اس کی اصل منزل تو یہ ہے۔ تذکرے لکھنے والوں نے کیسی جانفشانی دکھائی ہے۔ شعراء کے حالات کس محنت سے جمع کیے ہیں۔ انہیں کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی۔ اسے شاید پہلی مرتبہ معلوم ہوا ہوگا کہ ادب میں محنت کی اہمیت کیا ہے۔ لاشعوری طور پر وہ تحقیق کی طرف مائل ہوتا گیا۔ ان تذکروں میں جو اشعار تھے انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جو اشعار سمجھ میں نہ آتے انہیں سبطین



تھا اس لیے کسی عزیز قریب سے بھی کسی قسم کی مدد ان کو گوارا نہ تھی۔ دوسرے قرض لینا ان کی شریعت میں حرام تھا تیسرے مکان، جائیداد اور زمینداری کو بیچ کر کھانا انہیں قبول نہ تھا۔ کئی سال ہم نے ایسی سختی میں گزارے کہ میں ان کو لکھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا، نہ اس سے کوئی فائدہ۔ اپنے دشمنوں کو ہرا کر کے بہت سے عزیزوں کو اب کیا مطعون کروں۔“

1932ء میں جب اس نے میٹرک پاس کر لیا تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اب کیا کیا جائے۔ بدایوں میں کوئی کالج (رفعت دہود، ابواللیث مدنی) نہیں تھا کہ مزید تعلیم کے لیے وہاں داخل ہوا جاتا۔ قریبی ضلع بریلی میں کالج تھا لیکن وہ وہاں جاتا نہیں چاہتا تھا۔ بچپن میں بھی بریلی کے پاگل خانے کا تذکرہ سنا تھا۔ یہ تصور اس کے ذہن میں کچھ ایسا جاگزیں ہو گیا تھا کہ جیسے بریلی میں ہر طرف پاگل ہی کھوم رہے ہوں گے۔

سبیلین صاحب کی زبان سے اس نے علی گڑھ کے ایسے قصے سنے تھے کہ وہ علی گڑھ جانے کے لیے بے قرار تھا۔ اس کے خاندان کے اکثر و بیشتر افراد نے علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی۔ خود اس کے بڑے بھائی ابو ظفر علی گڑھ کے طالب علم رہے تھے۔ ان سب باتوں نے مل جل کر اسے علی گڑھ کی طرف راغب کیا لیکن والدہ کی اجازت کے بغیر وہ یہ قدم کیسے اٹھا سکتا تھا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر والدہ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”ای جان! کالج میں میرے داخلے کا مسئلہ ہے۔“  
”بدایوں میں کوئی کالج ہے نہیں۔ بریلی تم جانا نہیں چاہتے تو کیا بدایوں میں کالج کھلنے کا انتظار کرو گے۔“  
”میں چاہتا ہوں آپ علی گڑھ کالج میں میرے داخلے کا بندوبست فرمادیں۔“

”ابو ظفر کو میں علی گڑھ بھیج کر دیکھ چکی۔ اس میں جو بگاڑ پیدا ہوئے ہیں وہ وہاں کے ماحول ہی سے ہوئے ہیں۔ اب میں تمہیں وہاں بھیج کر دوسرا زخم نہیں کھا سکتی۔“  
”بھائی کے بگڑنے میں ان کے اپنے مزاج کا قصور ہو گا۔ ورنہ علی گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے والے تو بڑے بڑے عہدوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہاں کے ماحول میں ایسا کوئی خرابی نہیں۔ وہ تو مسلمانوں کا واحد ادارہ ہے جہاں قائلین اسلام سنا تہ ہیں۔ طلبہ کو نماز تک کی تلقین کی جاتی ہے۔ اب میں صاحب ہی کو دیکھ لیں۔ وہ بھی تو وہیں کے کریم بھٹ ہیں۔“

صاحب کی خدمت میں لے کر پہنچ جاتا وہ نہ صرف شعر کا مطلب سمجھاتے بلکہ اس شاعر کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات کرتے جو تذکروں میں بھی درج نہ ہوتے تھے۔ اس طرح نہ صرف اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا رہا بلکہ سبیلین صاحب کی طبیعت کا سکہ بھی دل پر بیٹھتا رہا۔

ان تذکروں کے عمیق مطالعے کے بعد جب وہ شعرا کے دوادین کی طرف راغب ہوا تو منظر نامہ بالکل صاف تھا۔ کس شاعر کا رنگہ سخن کیا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں۔ تشبیہات و استعارات کا نظام کیا ہوتا ہے۔ آتش و نارخ میں فرق کیا ہے۔ لکھنوی شعرا کن معنی میں دہلوی شعرا سے مختلف ہیں۔

اس کے والد کے کتب خانے میں لکھنوی شعرا کے دوادین کثرت سے تھے لہذا پہلے پہل وہ غالب سے نہیں آتش، نارخ، امیر مینائی وغیرہ سے واقف ہوا۔ وہاں کی زبان، وہاں کا طرز کلام، وہاں کے ادبی مناقشے سب اس کی یادداشت میں محفوظ ہو گئے۔

اس کے ادبی ذوق کو ہمیز دینے کے لیے بدایوں کا شاعرانہ ماحول بھی موجود تھا۔ یہاں شعر و شاعری کا ایسا چچا تھا کہ کم و بیش ہر پڑھا لکھا آدمی درچار شعر تو کہہ ہی لیتا تھا۔ جگہ جگہ مشاعرے ہوتے تھے۔ اچھے بھٹے شاعری ہوتی تھی۔ اس کے محلے میں بھی کئی شاعر تھے جن کے پاس اس کا اٹھنا بیٹھنا ہو گیا تھا۔

سبیلین صاحب سے علمی ہمیش ہونے لگیں۔ انہیں تعجب ہوتا تھا کہ اس کم عمری میں ابواللیث ادب کا ایسا پارکھ بن گیا ہے۔ وہ اس کی مسلسل حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ ”شاعری کے حلقے میں مست پڑنا۔ تمہارا مزاج علمی و تحقیقی ہے اس پر کار بند نہ ہونا۔“

وہ یہ مشورہ دے رہے تھے کہ ابواللیث سوچ رہا تھا کہ تعلیمی سلسلہ چلے گا کیسے۔ یہ دن اس کی زندگی کے سخت آزمائش کے تھے۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتا ہے۔  
”ذرائع آمدنی محدود کیا منظور ہو گئے تھے۔ والد کی وفات کی وجہ سے اور کچھ برادر بزرگ کی نادانی کی وجہ سے۔ ریکسوں کی اولاد کو بالائے مصاحب جس راستے پر لگاتے ہیں وہی راستہ بھائی صاحب نے دیکھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی سال میں والدہ صاحبہ سخت پریشانیوں میں مبتلا ہو گئیں۔ ان کے چند اصول تھے جن میں ایک یہ تھا کہ وہ اس بھرم کو قائم رکھنا چاہتی تھیں جو والد مرحوم کی زندگی میں قائم



”بجھلو بھیا! مجھے تجھ سے بڑی امیدیں ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تو وہاں سے کچھ بن کر رہی لوگے گا لیکن حالات تیرے سامنے ہیں۔ میں ابو ظفر کی تعلیم پر اتنا خرچ کر چکی ہوں کہ اب مزید خرچ کرنے کی سکت نہیں۔ کسی سے قرض لینے کی میں روادار نہیں۔“

گھر کے حالات ابواللیث سے چھپے ہوئے نہیں تھے اور پھر اس کی ماں نے ایسی درد بھری آواز میں اپنی بے بسی کا ذکر کیا کہ وہ کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔ بس جسے کہتے ہیں دل سوس کر رہ گیا۔

اسے علی گڑھ نہ بھیجا جائے لیکن کچھ نہ کچھ تو اسے کرنا ہو گا۔ گھر میں کئی دن تک یہی باتیں ہوتی رہیں۔ بالآخر بڑے بھائی نے ایک تجویز پیش کی کہ اسے ہومیو پیتھک ڈاکٹری کرنی چاہیے۔ ابواللیث ظاہر ہے اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ سبیلین احمد اور میر محفوظ علی سے ملاقاتوں کے بعد اس کا ذہن ادب کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ وہ تو اردو ادب میں کوئی کار ہائے نمایاں انجام دیتا چاہتا تھا۔ ہومیو پیتھمی اس کے بس کی کہاں تھی لیکن اس کی مرضی کے خلاف فیصلہ یہی ہوا۔ اس کے ایک عزیز معین احمد حمیدی تھے جو تھے تو سرکاری ملازم لیکن ہومیو پیتھمی سے شوق رکھتے تھے۔ ان سے بات کی گئی اور ابواللیث صدیقی کو ان کی شاگردی میں دے دیا گیا لیکن قدرت کچھ اور ہی سوچے ہوئے تھی۔

معین احمد حمیدی کے مشورے سے بذریعہ خط کتابت کلکتہ کے ایک ہومیو پیتھک کالج سے ہومیو پیتھمی کی کچھ کتابیں اور ایک عدد ”سند“ منگوائی گئی۔ دواؤں کے کپے بنوائے گئے۔ دوائیں خریدی گئیں اور ڈاکٹری کا کاروبار شروع کر دیا گیا۔

اس حقل کو ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ بدایوں میں پیسے کی وبا پھیل گئی۔ استاد معین صاحب کے دل میں خدمت خلق نے جگہ بنائی۔ اس وقتے خلوص خدا کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ جب ہم ڈاکٹر ہیں تو جہت میں جتنا لوگوں کا مفت علاج کرنا چاہیے۔ انہوں نے دولہا کا کبس اٹھایا۔ ابواللیث کو ساتھ لیا اور ان محلوں میں پہنچ گئے جہاں اس وبا کا زور تھا۔

یہ سلسلہ کئی دن چلتا رہا۔ فاطمہ صغرا کو معلوم ہوا تو انہیں ابواللیث کی فکر ہوئی۔

”آپ اسے احتیاطی تدابیر کے بغیر ایسے مریضوں کے پاس لے جاتے ہیں۔ میں اپنے بچے کو آپ کے پاس

نہیں جانے دوں گی۔“ انہوں نے نہ صرف اسے حمیدی صاحب کے ساتھ جانے سے روک دیا بلکہ ابواللیث کو ہومیو پیتھک ڈاکٹر بنانے کا خیال بھی دل سے نکال دیا۔ آہستہ آہستہ قدرت اسے اس مقام پر لاتی جا رہی تھی جو اس کا اصل مرکز تھا۔ وہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر بننے سے بال بال بچ گیا۔

اسی دوران میں کچھ ایسے خاندانی مسائل سامنے آئے کہ اس کا نکاح ضروری ہو گیا۔ یہ عمر شادی کے لیے ہرگز مناسب نہیں تھی۔ ابھی نہ کوئی روزگار تھا نہ آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ۔ پھر شادی کیسی لیکن مجبوری تھی پھر یہ طے ہوا کہ نکاح ابھی کر دیا جائے۔ رخصتی بعد میں کسی وقت دیکھی جائے گی۔ خالہ زاد ریحان فاطمہ شریک سفر بنیں۔ یہ نکاح نہایت سادگی سے ادا ہوا گیا۔

نکاح کے بعد ذمہ داری کا احساس خود بخود ہونے لگا۔ ہومیو پیتھمی بھی ہاتھ سے جاتی رہی تھی۔ اس نے سوچا اس سے پہلے کہ کسی اور کھمبے سے میں پھنسا دیا جاؤں علی گڑھ جانے کا کوئی بندوبست کر لیا جائے۔ علی گڑھ میں داخلے ابھی شروع نہیں ہوئے تھے۔ لہذا موقع اچھا تھا۔ یہ مسئلہ پھر بھی درپیش تھا کہ کسی سفارش کے بغیر داخلہ ممکن بھی ہو سکے گا؟ اگر کہیں سے سفارشی خط مل جائے کم از کم اتنا ہی ہو کہ علی گڑھ پہنچ کر کوئی کالج تک پہنچانے والا مل جائے۔ محوم پھر کر اس کی نظر اپنے ایک عزیز مولانا یعقوب بخش راغب کی طرف گئی۔ مولانا نہایت عالم فاضل تھے۔ علی گڑھ میں ان کے بہت سے شناسا تھے۔ وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔

”میرے ایک دوست ہیں پنڈت حبیب الرحمن شامتری علی گڑھ میں مسکرت کے استاد ہیں۔ ان کے نام خط لکھے دیتا ہوں علی گڑھ جا کر ان سے مل لیتا۔ وہ تمہاری ضرورت مدد کریں گے۔“

ابواللیث نے وہ خط ان سے لے لیا اور گھر چلا آیا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ سال سے زیا وہ نہیں تھی اور گھر والوں کی مرضی کے خلاف علی گڑھ جانے کا فیصلہ کر رہا تھا۔ یہ اس کا شوق علمی ہی تو تھا۔

20 ستمبر 1932ء کی رات کونریں میں بیٹھ گیا۔ جب میں صرف آٹھ مہینے تھے کہ ریل کے کرائے کے بعد شاید راجاردن کا خرچ نکل آتا۔

وہ علی گڑھ اسٹیشن پر اترا تو ایسی خوشی ہوئی جیسے چاند پر پہلا قدم رکھا دیا ہو۔ اپنی خوشی کو چھپاتا ہوا اسٹیشن سے باہر

## سوانحی خاکہ

نام: ابو الیث صدیقی

والد: منشی مظفر علی

والدہ: فاطمہ صغرا

وطن: بدایوں (بھارت)

پیدائش: آگرہ

تعلیم: ایم اے (اردو)، پی ایچ ڈی (علی گڑھ

یونیورسٹی کا پہلا پی ایچ ڈی)

ملازمت: علی گڑھ کالج، علی گڑھ یونیورسٹی،

اورینٹل کالج، لاہور۔ جامعہ کراچی۔

اہلیہ: رحمان فاطمہ

اولاد: زہرا صدیقی، پروین صدیقی، شریا

صدیقی، ابراہیم مظفر، مظفر صدیقی۔

تاریخ پیدائش: 15 جون 1916ء

وفات: 7 ستمبر 1994ء

مدفن: اسٹاف قبرستان، جامعہ کراچی۔

وہ ڈپارٹمنٹ میں تو دل نہیں رکھتے تھے اور یکے والا آگے جانے کو تیار نہیں تھا۔ ہاتھ پاؤں تو پھولنے ہی تھے۔ اب جاؤں تو کہاں جاؤں۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ یونیورسٹی آ رہا تھا تو ڈاک خانے کے قریب سے گزرا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اس کے رشتے کے ایک چچا یونیورسٹی کے ڈاک خانے میں ملازم ہیں۔ اس نے یکے والے کو راضی کیا اور ڈاک خانے پہنچ گیا۔ دل میں ڈرتا بھی جا رہا تھا کہ اگر وہ بھی نہ ملے تو کیا ہوگا۔ کسی ہونٹ یا سر اسے میں ٹھہرنے کے لیے توجیب میں پیسے بھی نہیں ہیں۔ شکر ہوا کہ اس کے چچا کرم احمد سے ملاقات ہوگئی۔ اس کی یکے والے سے اور یکے والے کی اس سے جان چھوٹ گئی۔ کرم احمد نے اس کی داستان سنی اور وعدہ کر لیا کہ ڈاک خانے سے اٹھنے کے بعد وہ اسے لے کر پنڈت حبیب الرحمن شاستری کے پاس جائیں گے چنانچہ اس دن سہ پہر کو وہ چچا کے ساتھ بالائے قلعہ پہنچ گیا۔ ڈاک خانے والوں کو چاٹلاش کرنے کی کیا دقت۔ ذرا سی دیر میں ان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ پنڈت جی گھر سے نکلے۔ دیکھا تو بڑے تپاک سے ملے۔ یہ سن کر سخت افسوس کرنے لگے۔ مکان ڈھونڈنے میں اتنی دقت اٹھانی پڑی۔ ”مولا! یہ تپاک بخش کو تو میرے گھر کا پتا معلوم تھا۔“

ماہ 2015ء

آیا تو علی گڑھ کے مشہور یکے نظر آئے۔ اس نے یکے والے کو یونیورسٹی چلنے کے لیے کہا۔ اس کے پاس تعارفی خط تو موجود تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یونیورسٹی میں حبیب الرحمن شاستری کا مکان کہاں ہے۔ یہ کوئی مشکل نہیں تھا۔ یونیورسٹی پہنچ کر کسی سے بھی معلوم کیا جاسکتا تھا۔ یکے جو نئی یونیورسٹی کے احاطے میں داخل ہوا ایک صاحب سائیکل پر جاتے نظر آئے۔ اس نے ان سے پوچھا۔ حبیب الرحمن کا مکان کدھر ہے۔ نہ ان صاحب نے تفصیل پوچھی نہ اس نے بتائی۔

”یکے واپس سڑک پر لے جائیں۔ کوئی دو تین سو گز چلو گے تو حبیب الرحمن کا مکان نظر آجائے گا۔“ ان صاحب نے کہا۔

ابو الیث نے یکے واپس مڑوایا اور ان صاحب کے بتائے ہوئے پتے پر چلتا ہوا مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازہ کھٹ کھٹایا تو جواب میں ایک لڑکا باہر آیا۔

”حبیب الرحمن صاحب کا مکان یہی ہے؟“

”جی ہاں۔“

”ان کے نام خط ہے اسے اندر پہنچا دیجیے۔ شاید وہ

مجھے بلوالیں۔“

وہ لڑکا خط لے کر چلا گیا اور جلد ہی واپس بھی آ گیا۔

خط اس کے ہاتھ میں دیا ہوا تھا۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ خط پنڈت حبیب

الرحمن شاستری کے نام ہے۔ یہاں تو شعبہ تعلیم کے استاد

حبیب الرحمن رہتے ہیں۔“

”حبیب الرحمن شاستری کہاں رہتے ہیں آپ کو

معلوم ہے؟“

”جی نہیں۔ یونیورسٹی میں کہیں رہتے ہوں گے۔“

صاحب زادے نے کہا اور وہ فخر سے بند کر لیا۔

اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے پوچھنے

والے سے حبیب الرحمن کا پتا پوچھا تھا۔ پنڈت حبیب الرحمن

کا نہیں۔ اسی لیے یہ خواری اٹھانی پڑی۔ وہ پھر یونیورسٹی

کے احاطے میں کہیں رہتے ہوں گے۔ وہ پھر یونیورسٹی

آ گیا۔ پنڈت جی کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ پتا تو معلوم

نہ ہو سکا البتہ یہ معلوم ہو گیا کہ وہ شہر میں کہیں محلہ بالائے قلعہ

میں رہتے ہیں۔ دل کو کچھ اطمینان ہوا کہ چلو اتنا تو معلوم

ہوا۔ ”بالائے قلعہ“ میں پہنچ کر مکان مل ہی جائے گا۔ یہ

اطمینان اس وقت غارت ہو گیا جب یکے والے نے آگے

جانے سے انکار کر دیا۔ یونیورسٹی میں تعطیلات تھیں اس لیے



آپ کو بتا دیتے تو یوں خوار کیوں ہوتے۔ خیر جو ہوا سو ہوا میں کل ڈاک خانے آؤں گا تمہارے داخلے اور اقامت کا انتظام کرتا ہوں۔“

جب تک داخلہ نہیں ہو جاتا اور ہاسٹل میں جگہ نہیں مل جاتی اسے ان عزیز کے گھر رہنا تھا جو ڈاک خانے میں ملازم تھے۔

دوسرے دن حبیب اللہ شاستری حسب وعدہ ڈاک خانے آ گئے اور اسے لے کر یونیورسٹی چلے گئے۔ یہ زمانہ داخلوں کا تھا اور قدرتی طور پر پورے ملک سے امیدوار اپنے والدین کے ساتھ علی گڑھ پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ یونیورسٹی کا اسٹریچنگ ہال کھینچ بھرا ہوا تھا کیوں کہ تمام داخلوں کے لیے ایک ہی مرکز تھا۔ اسے اپنی قابلیت اور شاندار رزلٹ کی وجہ سے یقین تھا کہ داخلے میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی لیکن پھر بھی اسے ہجوم کو دیکھ کر اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ سرسید کا دم کتنا غنیمت تھا کہ یہ ادارہ قائم کر دیا ورنہ یہ مسلمان لڑکے کہاں جاتے۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ میرا داخلہ ہونہ ہو ان بہت سے مسلمان لڑکوں کا داخلہ تو ہو جائے گا۔ مسلمانوں کو اس وقت تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔

اس کے اندیشے اس وقت خوشی میں بدل گئے جب اکتوبر 1934ء میں اس کا داخلہ علی گڑھ کالج میں ہو گیا۔ داخلہ فارم کے ساتھ اقامتی ایوانوں میں بھی داخلے ہوتے تھے کیوں کہ بنیادی طور پر یہ ایک اقامتی ادارہ تھا۔ صرف دس فیصد طلبہ کو اقامتی ایوان سے باہر رہنے کی اجازت تھی۔ وہ باہر رہتا تو کہاں رہتا۔ اس نے حبیب شاستری کے مشورے سے اقامتی ایوان کے خانے میں آفتاب ہال کھسوا دیا۔

آفتاب ہوسٹل اس سال بنا تھا بلکہ بن رہا تھا۔ اس ہوسٹل کی دو خصوصیات تھیں ایک تو یہ کہ اس میں داخلے کے لیے شرط بہترین تعلیمی ریکارڈ تھا۔ خرچ دوسرے ہوسٹلوں کے مقابلے میں بہت کم تجویز ہوا تھا اور اس میں بھی کھانے کے علاوہ صبح کا ناشتا شامل تھا جب کہ دوسرے ہوسٹلوں میں طالب علموں کی اپنی ذمہ داری تھی۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ ہر کمر صرف ایک طالب علم کے قیام کے لیے بنایا گیا تھا تاکہ پڑھائی سکون سے ہو سکے۔

اس کے شاندار تعلیمی ریکارڈ نے اس کی مدد کی اور اسے ہوسٹل کا کمر نمبر 62 دیا گیا۔

آفتاب ہوسٹل طالب علموں کو سستی تعلیم فراہم کرتا تھا لیکن پھر بھی یہ تعلیم مفت نہیں تھی۔ کچھ نہ کچھ تو خرچ ہونا ہی تھا یہ مسئلہ ایسا تھا جو داخلہ لیتے ہی سامنے نظر آنے لگا۔

سرسید احمد خان کے پوتے سرراس مسعود اس وقت وائس چانسلر تھے۔ اسے کسی نے بتایا کہ ایک درخواست لکھ کر ان سے ملو۔ انہوں نے اپنی تنخواہ سے ایک فنڈ قائم کر رکھا ہے جس سے وہ مستحق طلبہ کی مدد کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے تمہاری درخواست قبول کر لی تو تمہاری مالی مشکلات کا حل نکل آئے گا۔ کسی وائس چانسلر سے ایک طالب علم کا ملنا مذاق نہیں تھا۔ اس کے لیے ہمت درکار تھی۔ بہت سے طلبہ تو ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی ان سے ملاقات کی ہمت نہیں کر پاتے تھے لیکن وہ ضرورت مند بھی تھا اور باہمت بھی۔ ایک صبح ان سے ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔ ان کا قیام یونیورسٹی کے احاطے میں بنی کوشی میں تھا جو ”سرسید ہاؤس“ کہلاتی تھی۔ اس نے اسے آنے کی اطلاع دی اور اسے بلا لیا گیا۔ وہ سرراس مسعود کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ نہایت خوب صورت بلند و بالا قد کا انسان سفید براق کرتہ پا جامہ پہنے ایک تخت پر بیٹھا تھا اور بہت سے کاغذات اس کے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ یہی سرراس مسعود تھے۔ ان کا سیکریٹری ان کے قریب بیٹھا تھا۔ ابواللیث نے اپنی درخواست سیکریٹری کے حوالے کر دی۔ اس نے درخواست پر ایک نظر ڈالی اور سرراس مسعود کی طرف بڑھا دی۔ انہوں نے بھی اسے پڑھا۔ کچھ سوالات اس کے خاندانی پس منظر کے بارے میں کیے اور ایک ایسی معقول رقم کی منظوری دے دی جو اس کے اخراجات کا کچھ ازالہ کر سکتی تھی۔

ابواللیث نے جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اردو میں داخلہ لیا (1932ء) تو یہ یونیورسٹی میں شعبے کے قیام کا پہلا سال تھا۔ اس سے پہلے شعبے میں صرف لازمی اردو کا ایک نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ انٹرمیڈیٹ کالج الگ تھا۔ اس سال انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کو یونیورسٹی میں منتقل کر دیا گیا اور اسی سال اردو اختیاری کے نصاب کا نفاذ ہوا۔ وہ گویا شعبہ اردو کا پہلا طالب علم تھا۔ اس وقت شعبہ اردو میں صرف دو اساتذہ تھے۔ رشید احمد صدیقی اور مولانا احسن علی مدنی۔ ایک مزاح نگار ایک شاعر۔ وہ ان دونوں اساتذہ کی آنکھ کا تار بٹا ہوا تھا۔ اس کے ذوق تحقیق کو دیکھ کر رشید احمد صدیقی کو تعجب ہوتا تھا۔ اس جیسے ماہر تعلیم نے اینڈ میں یہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ ابواللیث اردو تحقیق میں بڑا



نام پیدا کرے گا۔ خود اسے اپنے آپ سے بڑی اُمیدیں تھیں۔ لیکن ذرائع آمدن نہ ہونے کے سبب پریشان رہتا تھا۔ کتابوں کو اڑھنا بچھوتا بنا لیا تھا۔ کئی مضامین مقامی رسائل میں شائع بھی ہو چکے تھے جو کسی طالب علم کے نہیں بلکہ کسی استاد کے قلم سے تحریر کیے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ سب تو تھا لیکن سوچتا تھا کہ آئندہ کا تعلیمی سفر کیسے جاری رہے گا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ قدرت قدم قدم پر اس کی مدد کر رہی تھی۔ ایسے لوگوں سے ملوا رہی تھی جو اس کی انگلی تھام سکتے تھے۔ پہلے ہی سال بعض ایسی شخصیتوں کی شفقت اسے نصیب ہو گئی جو اپنے علم و فن اور کردار کے باعث قد آور لوگوں میں شمار ہوتی تھیں۔ سر اس مسعود نے اس کا وظیفہ جاری کیا تھا۔ پروفیسر محمد حبیب جو آفتاب ہوسٹل کے پروفیسر تھے اور تاریخ پڑھاتے تھے اس پر مہربان ہوئے۔ اس کے حالات معلوم ہوئے تو اس کی مدد کرنے کو جی چاہا۔ یہ بھی جان لیا تھا کہ وہ خود دار ہے۔ براہ راست اس کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دن اس سے کہنے لگے۔

ابواللیث میاں پڑھنے لکھنے سے کچھ وقت بچ جاتا ہے؟  
ابواللیث نے اثبات میں جواب دیا۔ ”میں کھیل کود کا شائق نہیں ہوں۔ دیگر تفریحات بھی نہیں ہیں۔ وقت اتنا ہے کہ پڑھائی کے بعد بھی بہت سا وقت بچ جاتا ہے۔“

”اگر کچھ وقت تم ہمارے لیے پس انداز کر سکو؟“  
”آپ میرے استاد ہیں اگر وقت نہیں بھی ہو گا تو آپ کے لیے نکالوں گا۔“

”میاں کچھ زیادہ کام نہیں ہے کچھ علمی کام ہے کچھ انتظامی۔ وہ تمہیں کرنے ہوں گے، کتابوں کے نشان زدہ حصے کو ایک کاپی میں اتار دیا اور طلبہ کی حاضری کا رجسٹر درست کر دینا وغیرہ وغیرہ بس یہ کام ہیں۔“

انہوں نے ایک قسم کا پرائیویٹ ٹیچنگ سے مقرر کر لیا۔ اس پر یہ عقدہ اس وقت کھلا جب پروفیسر صاحب کو تنخواہ ملی اور انہوں نے کچھ رقم جیب خرچ کے نام پر اپنی جیب میں ڈال دی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک اس نے انٹرمیڈیٹ پاس نہیں کر لیا۔ یا شاید اس کے بعد بھی۔

ان مہربان استاد و کے سائے میں وہ اپنا تعلیمی سفر جاری کیے رہا۔ دو سال بعد یعنی 1934ء میں انٹرمیڈیٹ کی جو پہلی جماعت اردو کی اس یونیورسٹی سے کامیاب ہو کر نکلی اس میں وہ بھی شامل تھا۔ اس نے یہ امتحان فرسٹ

ڈویژن میں پاس کیا اور پوری یونیورسٹی میں سائنس و آرٹس کو ملا کر دوسری پوزیشن حاصل کی۔ اختیاری مضامین میں منطق اور نفسیات میں اس نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے جو ایک عرصہ تک ریکارڈ رہے۔

اسی سال یونیورسٹی میں اردو میں بی اے آنرز کے سال اول کا آغاز ہوا۔ اب وہ دور اسے پرکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا بی اے پاس میں داخلہ لوں یا آنرز میں۔ اختیاری نمبروں میں پاس ہونے کی وجہ سے وہ یونیورسٹی کی طرف سے ملنے والے وظیفے کا حقدار ہو گیا تھا۔ آنرز میں داخلہ لینے کی صورت میں وہ تین سال تک اس وظیفے کا حقدار ہو سکتا تھا۔ دوستوں کا خیال تھا کہ اسے فلسفے میں آنرز اور ایم اے کرنا چاہیے لیکن وہ تو عرصہ دراز تک اردو کی تحقیقی کتب پڑھتا چلا آیا تھا۔ ایک بے نام سی کشش تھی جو اسے اردو کی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس نے اردو میں آنرز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

لوگوں کے خیال کے مطابق اردو کی کوئی مانگ نہیں تھی۔ نہ کوئی ملازمت ڈھنگ کی مل سکتی ہے نہ کوئی احترام ہے۔ خود شعبہ اردو کا حال یہ تھا کہ یہاں صرف دو استاد تھے۔ رشید احمد صدیقی اور احسن مارہروی اور دونوں صرف پتھر مار رہے تھے۔

وہ اپنے آپ سے لڑنے میں مگن تھا کہ خاندانی بھگڑوں نے پھر سر اٹھایا۔ بدایوں سے تار آیا کہ دو سال پہلے تمہارا نکاح ہوا تھا۔ کب تک انتظار کیا جائے۔ تم بدایوں فوراً آؤ تاکہ رخصتی مل میں آئے۔ اسے جانا پڑا اور رخصتی بھی کرنی پڑی حالانکہ نہ ابھی کوئی ایسی عمر تھی نہ موقع۔ وہ تعلیم بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

شادی کے بعد اس نے کچھ دن بدایوں میں گزارے اور پھر علی گڑھ آ گیا۔ اب صورت یہ ہو گئی تھی کہ جید کی شام کو وہ علی گڑھ سے بدایوں چلا جاتا اور دو دن تعطیل کے گزارنے کے بعد پھر کی صبح علی گڑھ پہنچ جاتا۔

ابھی اس نے آنرز کا ایک ہی سال گزارا تھا کہ بعض بے چید گیوں کی وجہ سے اسے گھر والوں سے الگ ہونا پڑا۔ اس کا گزارا اس وقت صرف اس لیاقت کے وظیفے پر تھا جو یونیورسٹی کی طرف سے اسے ملتا تھا۔ یہ اس کے اپنے خرچ کے لیے تو کافی ہوتا لیکن ایک گھر کی ذمہ داری اس کے لیے بڑی ہونا مشکل تھی۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ کچھ ملازمت کر لے اور تعلیم کا سلسلہ پرائیویٹ طور پر جاری رکھے۔ اس مرتبہ وہ بدایوں گیا تو



اس نے بیوی سے مشورہ کیا۔

”قسمت نے ہمیں ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کیا ہے جہاں میں گھر چلا لوں یا ہوسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کر لوں۔ علی گڑھ اسکول میں استاد کی ایک اسامی خالی ہوئی ہے سوچ رہا ہوں وہاں ملازمت کر لوں اور تعلیم کا سلسلہ پرائیویٹ طور پر جاری رکھوں۔“

بیوی کو اس اطلاع پر ایسا افسوس ہوا کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”میں آپ کو ہرگز ملازمت نہیں کرنے دوں گی۔ مجھے یاد ہے آپ کتنے شوق سے علی گڑھ گئے تھے۔ مجرم میں ہوں مگر آپ کو کیوں ملے۔“

”نہ تم مجرم ہونہ مجھے سزا مل رہی ہے۔ یہ تو حالات ہیں جن سے ہمیں نمٹنا ہے۔ جو وظیفہ مجھے ملتا ہے اس سے گھر کا خرچ اچھی طرح نہیں چل سکتا۔ دنیا کو ہنسنے کا موقع ملے گا۔“

”آپ بے فکر رہیں میں آپ کو شرمندہ نہیں کروں گی۔ جتنی چادر ہوگی اتنے پاؤں پھیلاؤں گی۔ تنگی ترشی میں گزارہ کر لوں گی آپ اپنی تعلیم مکمل کر لیں۔ اللہ نے چاہا تو اچھے دن بھی آئیں گے۔“

بیوی نے ایسی ہمت بندھا لی کہ اس نے ملازمت کا ارادہ ترک کر دیا اور پوری طرح تعلیم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ابھی وہ آنرز کے پہلے سال میں تھا کہ اسے نواب حیدر یار جنگ پریس حبیب رنج کا کتب خانہ دیکھنے کی خواندہ ہوئی۔ بات یہ تھی کہ اس وقت ان کے کتب خانے کی بڑی دھوم تھی۔ ابواللیث کے تحقیقی مزاج نے شور مچایا کہ اس ناور کتب خانے کی سیر کی جائے جو کتابیں وہاں ہیں ان کی فہرست مرتب کی جائے۔ حوالے لیے جائیں تاکہ اگر کسی وقت کسی کتاب کی ضرورت پڑے تو اس کتب خانے سے رجوع کیا جاسکے۔ سوال یہ تھا کہ کتب خانے تک رسائی کیسے حاصل ہو۔ اس نے نواب صاحب کو نیورسٹری کے مختلف جلسوں میں دیکھا ضرور تھا لیکن ان سے تعارف نہیں تھا۔ ہر مشکل کا حل رشید احمد صدیقی۔ اس نے ذرا غور کرتے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ رشید صاحب نے احسن مارہروی کی نگرانی میں اسے حبیب رنج جانے کی اجازت دے دی۔

وہ قبلہ احسن مارہروی کی ہمراہی میں علی الصباح علی گڑھ سے روانہ ہوا اور دوپہر سے پہلے حبیب رنج پہنچ گیا۔ احسن مارہروی ساتھ تھے اس لیے تعارف کے لیے کسی لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت نہیں تھی۔ نواب صاحب نے مولانا

احسن کو دیکھا تو ایک خندہ زیر لب سے استقبال کیا اور گلے ملنے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ مولانا نے اس کا تعارف کرایا۔ یہ سن کر بہت خوش ہوئے تو ایک طالب علم کو ایسا شوق ہے کہ بعد اصرار کتب خانہ دیکھنے حبیب رنج چلا آیا۔ نہایت مہربانی سے کتب خانہ دیکھنے اور حوالے لینے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

یہ کتب خانہ قدیم و نادر خطوط و کتب کا خزانہ تھا۔ یہیں سے اس نے اپنے مقالے ”چند نامہ شغلی“ کے لیے مواد حاصل کیا۔ یہ گویا اس کی تحقیقی زندگی کا آغاز تھا۔ اس نے اپنے مقالے کو مکمل کیا اور جامعہ دہلی میں شائع کرا دیا۔ اس سے قبل اس تصنیف پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ یہ مضمون اتنا بھرپور تھا اور ایسے پختہ اسلوب کے ساتھ لکھا گیا تھا کہ کسی استاد کے قلم کا شاہکار معلوم ہوتا تھا۔ لوگوں کو جب یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی طالب علم کے قلم کی کاوش ہے تو وہ داد دینے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے کئی مضامین اس سے پہلے بھی شائع ہوئے تھے لیکن اس مضمون کے ذریعے تو اس نے ایک کم شدہ تصنیف کی بازیافت کر کے دنیا کے ادب سے متعارف کرایا تھا۔ یہ تنقید نہیں تحقیق تھی جس کی امید ایک طالب علم سے کم ہی کی جاسکتی ہے۔ اس کی ایسی پذیرائی ہوئی کہ خود اس کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی اس نے قدرت اللہ شوق کے تذکرے کی تلخیص، تذکرے اور مصنف کے تعارف اور تذکرہ نویسی کی تاریخ تفصیل کے ساتھ علی گڑھ میگزین میں شائع کی۔ علی گڑھ میگزین ہی میں ایک طویل مضمون ”تذکرہ حالی“ کے نام سے لکھا جس میں حالی کی حیات اور تصانیف پر روشنی ڈالی اور حالی کا مقام متعین کیا۔ ”شبلی اور اردو“ کے عنوان سے ایک مضمون میں شبلی کی تصانیف اور اسلوب کا تجزیہ کیا۔ ”امانت کی غزل گوئی پر ایک نظر“ کے نام سے ایک مضمون شائع کرایا۔ احسن کا کوردی کی نعت گوئی پر ایک مضمون لکھا۔

یہ اس کی وہ خدمات تھیں جو وہ کلاسیکی ادب کے سلسلے میں انجام دے رہا تھا۔ یہ خدمات یونہی ادا نہیں ہوئی تھیں۔ یہ اس کا جنون تھا جو ہوش مندی کی باتیں کر رہا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کھلندروں اور رئیسوں سے آباد تھی۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا لیکن ایسے طلبہ کی بھی کمی نہیں تھی جو تعلیم سے محبت رکھتے تھے۔ ابواللیث کا شمار ایسے ہی طلبہ میں ہوتا تھا لیکن ان کی کثیرا بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں وہ بھرپور حصہ لے رہا تھا لیکن اس کا میلان



تقریری مقابلوں اور مضمون نویسی کے مقابلوں کی طرف تھا۔ سیکڑوں تقریری مقابلے جیتے، انعام پائے اور میڈل حاصل کیے علی گڑھ میگزین میں اتنے مضامین و مقالات کسی ایک طالب علم کے شائع نہیں ہوئے۔ جتنے اس کے ہوئے خاص طور پر لسانیات پر بلا مبالغہ سیکڑوں صفحے لکھے۔ اس زمانے میں لسانیات اور اس کے مباحث سے دلچسپی بہت کم تھی۔ وہ ابھی طالب علم ہی تھا کہ اس نے اس مشکل میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔

علی گڑھ میگزین میں لکھنے والے طالب علموں میں ایک طالب علم کو بہترین علمی و ادبی مقابلے پر انعام ملتا تھا۔ 1936ء میں یہ انعام اسے ملا۔

وہ خود تعلیم کی غرض سے علی گڑھ میں تھا اور بیوی بدایوں میں تھی۔ اسے ہر ہفتے دو دن کی چھٹیوں میں بدایوں جانا پڑتا تھا۔ کرایہ بھی خرچ ہوتا تھا اور سفر میں جو وقت خرچ ہوتا تھا وہ ضائع بھی ہوتا تھا۔ جب رشید احمد صدیقی سے اس کی بے تکلفی بڑھی اور وہ ایک طرح سے ان کا پرائیویٹ سیکریٹری بن گیا اور وہ اس کی قابلیت سے متاثر بھی ہو چکے تو رشید صاحب نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اہلیہ کو علی گڑھ لے آئیں۔

”میاں تمہارے بچھن یہ بتا رہے ہیں کہ اب تم علی گڑھ سے جانے والے نہیں۔ تعلیم بھی یہیں حاصل کرو گے اور ملازمت بھی یہیں کرو گے اور اس میں ظاہر ہے ابھی بہت وقت درکار ہوگا کب تک چوہے بلی کا کھیل کھیلتے رہو گے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ہماری بہو کو بھی علی گڑھ لے آؤ۔“

وہ بھی یہی چاہتا تھا۔ صدیقی صاحب نے ہمت بندھائی تو وہ اہلیہ کو علی گڑھ لے آیا۔ وہ بھر سے پیرس روڈ کو ملانے والی سڑک پر نور منزل کے محلے واقع وارث منزل میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔

بیوی کو علی گڑھ لانے کے بعد ذہنی فراغت کی تھی لیکن مالی تنگی کا وہی عالم تھا۔ یونیورسٹی کی طرف سے سب سے والے وظیفے پر گزر رہے ہو رہی تھی اگر بیوی معقول نہ ملی ہوئی تو یہ دن کاٹنے مشکل ہو جاتے۔ وہ اللہ کی بندی ایسی صابر شاکر تھی کہ حرف بگڑا زبان پر آتا ہی نہیں تھا۔ کسی فرمائش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا حالانکہ یہ شادی کے شروع کے دن تھے۔ یہ بڑا جذباتی دور ہوتا ہے۔ وہ اس سلیقے سے گھر چلا رہی تھیں کہ شوہر کو یہ احساس ہی نہیں ہونے دے رہی

### چند قصائیف

لکھنؤ کا دبستان شاعری، مصحفی اور ان کا کلام۔ جرأت ان کا عہد اور شاعری۔ نظیر اکبر آبادی کا عہد اور شاعری۔ اردو قواعد، جامع القواعد، ہندوستانی گرامر (ترجمہ) غلوغات اقبال، اقبال اور مسلک تصوف، اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ تاریخ زبان و ادب اردو، رفت و بود اور ڈیڑھ سو سے زائد مضامین و مقالات جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ تیز نصابی کتب۔

جس کہ گھر میں کسی چیز کی کمی ہے۔ کسی کے گھر اس خوف سے جاتی نہیں تھیں کہ ہم کسی کے گھر جائیں گے تو کوئی ہمارے گھر بھی آئے گا۔

ابوالیث بھی اسی کفایت شعاری سے گھر چلا رہا تھا۔ اس نے بھی اپنے سب شوق ختم کر دیے تھے۔ طالب علمی کی شرارتوں میں بھی کوئی نہ کوئی علمی پہلو نکال لیتا تھا۔

علی گڑھ کے طلبہ کی شرارتوں میں ایک مشغلہ یہ بھی تھا کہ بغیر ٹکٹ دہلی کا سفر کرتے تھے اور محکمہ پھر کر واپس آ جاتے تھے۔ دہلی پہنچتے ہی دوست تو دہلی کی رنگینیوں میں مگمگ ہو جاتے اور وہ کباڑیوں کی دکانوں کا رخ کرتا اور پرانی کتابوں کی تلاش میں وقت گزارتا۔ ان ہی قلمی فنون کی بدولت اسے خطوط شناسی سے لگاؤ پیدا ہوا۔ فارسی اور اردو کی بہت سی کتابیں اس نے انہی کباڑیوں کی دکانوں سے خریدیں اور انہیں کا رآمد بنایا۔ ان کی مدد سے مضامین تحریر کیے۔ انہی دکانوں سے اس نے قدرت اللہ شوق کا تذکرہ طبقات الشعرا باز یافت کر کے اس کی تلخیص علی گڑھ میگزین میں شائع کی۔ ان پرانی کتابوں کی دکانوں ہی کی یہ دین تھی کہ وہ ”لسانیات“ کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل ہوتا چلا گیا۔ اردو زبان کی تاریخ اور صوتیات پر اس کے مضامین علی گڑھ میگزین اور ”سہیل“ میں شائع ہوئے۔

علمی ذہن رکھنے والے طلبہ کی معراج یہ تھی کہ وہ مجملہ علی گڑھ کے مدیر بن جائیں۔ یہ صرف ایک یونیورسٹی کا سیکڑوں نہیں تھا بلکہ اس کا شمار ادبی مجلوں میں ہوتا تھا بلکہ بہت سے ادبی رجحان سے زیادہ وسیع ہوا کرتا تھا۔ اس کا ایڈیٹر بننا نہایت خوش نصیبی کی بات سمجھا جاتا تھا اور یونیورسٹی بھر میں اس کے ایڈیٹر کا احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

ابوالیث کو اپنی اس کامیابی کا عمل عرفان تھا۔ اس کے



لا تعداد مضامین شائع ہو چکے تھے لہذا وہ بجا طور پر یہ خواہش رکھتا تھا کہ اسے ایڈیٹر بنایا جائے لیکن وہ ادبی سیاست کا شکار ہو کر پچھلے دو سالوں سے اس اعزاز سے محروم ہوتا چلا آ رہا تھا۔ اس وقت ترقی پسند ادب کا زور تھا بلکہ ترقی پسند کہلوانا فیشن بن گیا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی ترقی پسندوں کا ایک گروہ بن گیا تھا۔ جو ان کے ہم خیال نہیں تھے وہ رجعت پسند کہلاتے تھے۔ ابواللیث ترقی پسند ادب کے خلاف تھا۔ اس کی تحریر و تقریر سے ترقی پسندوں کی مخالفت ظاہر ہوتی تھی لہذا وہ ان کی نظر میں رجعت پسند تھا۔ لہذا اس کی مخالفت کی جارہی تھی۔

میگزین کا نگران کوئی استاد ہوا کرتا تھا۔ پچھلے دو سالوں سے خواجہ منظور حسین نگران تھے۔ یہ انگریزی کے استاد تھے۔ ابواللیث نے بھی ان سے انگریزی پڑھی تھی۔ ان کا جھکاؤ ترقی پسندوں کی طرف تھا لہذا وہ ابواللیث کو اس منصب کے لیے پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ معین الدین ورداکی اور دوسری مرتبہ جاں نثار اختر کو نامزد کر دیا تھا۔ ابواللیث اسے اپنی حق تلفی سمجھتا تھا۔

اس نے آنرز پاس کر لیا تھا۔ وہ نہ صرف فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا بلکہ اپنا معیار برقرار رکھتے ہوئے یونیورسٹی بھر میں اول آیا اور سونے کا تمغہ حاصل کیا۔

اس کا میاں بی نے نہ صرف اس کے اعتماد میں اضافہ کیا بلکہ اب اسے یہ خیال ہونے لگا کہ طالب علمی کا صرف ایک سال رہ گیا ہے۔ اگر اب بھی اس نے کوشش نہ کی تو اس سعادت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے گا۔ اس نے آخری سال میں آخری معرکہ لانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے بی حلیم اس وقت پر وہ انہیں چاہتے تھے۔ میگزین کے نگران کی سفارش پر دینی مدرسہ کی تعلیم کرتے تھے۔ وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ اپنے ساتھ ہونے والی حق تلفی کی روئداد بیان کی۔ حلیم صاحب نے اس کی باتوں کو سمجھنے سے سنا اس کے تعلیمی ریکارڈ پر نظر ڈالی۔ اس کی ادبی خدمات کی حضانہ میں کی۔ اس کے لیے انہیں کہیں دور جانا نہیں پڑا۔ ابواللیث اپنے ساتھ تراشے لے کر گیا تھا۔ حلیم صاحب نے ہر لمحہ کو غور سے دیکھا اور حیرت کا اظہار کیا کہ اب تک اسے کچھ جانتا کیوں نہیں گیا جب کہ وہ کوشش بھی کرتا رہا۔

ابواللیث نے اپنا کبھی کبھ اس طرح لڑا کہ اسے بی حلیم نے اس سال کے لیے اسے مدیر مقرر کر دیا۔ یہ خیر خواہ منظور حسین پر بھی بن کر گری۔ ابواللیث سمجھ رہا تھا کہ معاملہ

نست گیا لیکن معاملہ طویل پکڑ گیا تھا۔ خواجہ منظور کو اس کی تقرری پر اعتراض تھا۔ انہوں نے اسے بی حلیم کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ رشید احمد صدیقی ان کے دوست تھے۔ انہوں نے ابواللیث کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنا نام واپس لے لے لیکن وہ نہیں مانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خواجہ منظور حسین نے میگزین کی نگرانی سے استعفیٰ دے دیا۔

اس نے میگزین کی ادارت چیلنج کے طور پر قبول کی تھی۔ اسے یہ ثابت کرنا تھا کہ اس کی تقرری غلط نہیں ہوئی ہے۔ اس نے مجھے کی ترتیب کے لیے سخت محنت شروع کر دی۔

اسے احساس تھا کہ وہ جس دعوے کے ساتھ مدیر بنا ہے اس کے لیے اسے سخت محنت کرنی پڑے گی۔ اس کے ذہن میں جو خاکہ تھا اس کے لیے مواد جمع کرنا شروع کر دیا۔ بطور صحافی اس کا یہ پہلا تجربہ تھا لیکن جب علمی گڑھ نمبر کے نام سے اس مجلے کا ضخیم نمبر نکالا تو اس سے قبل اردو رسالوں کی تاریخ میں اتنا ضخیم نمبر کوئی نہیں نکلا تھا۔ اس رسالے میں اس نے سرسید اور علی گڑھ تحریک سے متعلق ایسی نادر تصاویر پیش کیں جو اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوئی تھیں اور بہت سے بزرگوں کی تحریروں کے عکس بھی شامل کیے۔ کئی تحریریں خود لکھ کر دوسروں کے نام سے شائع کیں۔ مدیر کی حیثیت سے اس کا لکھا ہوا ”شذرہ“ بھی قابل تعریف تھا۔ اس مجلے کی دوسری خاص اشاعت ”اقبال نمبر“ کی تھی۔ ایک نمبر وہ تھا جو علامہ کی زندگی میں ”نیرنگ خیال“ نے نکالا تھا۔ اس کے بعد کسی بھی اردو رسالے کا یہ دوسرا اقبال نمبر تھا۔ اس میگزین میں مدیر کے شذرات، اقبال کے گرامی نامے، مولانا کی سیرت و فلسفے پر مضامین کے علاوہ فارسی قطعات بھی شامل تھے جن میں اقبال کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ وہ جو کام کرتا تھا بے مثال کرتا تھا۔ یہ دونوں شمارے بھی ایسے ہی بے مثال کارنامے ثابت ہوئے۔ اقبال نمبر جیسا کارنامہ کسی ادبی پرچے نے بھی انجام نہیں دیا تھا اور بہت بعد تک اس معیار کا کوئی پرچہ نہیں نکلا۔

اس کی ادارت میں چار مجلے شائع ہوئے تھے کہ اس کا آخری تعلیمی سال ختم ہو گیا۔

ایم اے کا امتحان دینے کے بعد وہ گھر بیٹھا تھا مگر سب کچھ بھٹکتا تھا۔ اس کے مالی حالات اس کے تحمل نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ گھر بیٹھ کر نتیجے کا انتظار کرتا جب کہ وہ



دوران طالب علمی دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ اس نے بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور بدایوں پہنچ گیا۔

”جنگم بات یہ ہے کہ اگلے چند ماہ میں مولانا احسن مارہروی سبک دوش ہونے والے ہیں۔ اس وقت تک میں ایم اے کر چکا ہوں گا۔ مجھے اپنی لیاقت پر پورا بھروسہ ہے۔ رشید صاحب نے بھی اُمید دلائی ہے کہ ان کی جگہ میرا تقرر ہو جائے گا۔“

وہ بدایوں میں بے کاری کے دن گزار رہا تھا۔ زیادہ وقت سہیلین صاحب کے در دولت پر یا میر محفوظ علی کے ساتھ گزارتا تھا۔ یہ دونوں حضرات علم کے سمندر تھے۔ وہ ان کی صحبت میں بہت کچھ سیکھ بھی رہا تھا اور یہ ثابت بھی کر رہا تھا کہ علی گڑھ سے بہت کچھ سیکھ کر آیا ہے۔ ان صحبتوں میں بھی کبھی شیخ وحید احمد بھی شریک ہو جاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یوپی میں پہلی کانگریس حکومت قائم ہوئی تھی۔ گوہند بلوچ پنشنہ وزیر اعلیٰ تھے۔ شیخ وحید احمد اس وزارت میں پارلیمنٹری سیکریٹری تھے۔

ایک روز وہ سہیلین صاحب کے ہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میر محفوظ علی وہاں تشریف فرما تھے۔ یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایم اے کرنے کے بعد کیا پروگرام ہے۔ تعلیمی سلسلہ آگے رکھنا ہے یا ملازمت کا ارادہ ہے۔ اسی دوران میں شیخ وحید احمد بھی آ گئے۔ وہ ابواللیث سے بھی واقف تھے اور اس کی لیاقت کے بھی قائل تھے۔ اس کی تحریر و تقریر سے بھی آشنا تھے۔ ادبی شخصیت تھے لہذا ادب شناس تو تھے ہی ابواللیث کی تحقیق و تنقید کے کمالات سے واقف تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ وہ ان دنوں فارغ بھی ہے اور ملازمت کا خواہاں بھی تو انہوں نے پیشکش کر دی۔

”مجھے آج کل ایک ایسے مددگار کی ضرورت ہے جو مجھے اپنے متعلقہ محکمے سے متعلق تحریر و تقریر کے لیے مواد جمع کرنے میں مدد دے سکے۔“

کچھ تو ملازمت کی کشش کچھ شام اودھ کے نظاروں سے فیض یاب ہونے کا شوق۔ وہ شیخ احمد کے ساتھ لکھنؤ چلا گیا۔ شیخ وحید احمد کا قیام کونسلر ریزیڈنسی یعنی اراکین اسمبلی کی قیام گاہ میں تھا وہ بھی ان کے ساتھ رہنے لگا۔

اس کا قیام اور اس کی ملازمت کی نوعیت و دنوں سیاسی تھیں۔ یہاں وزراء، اراکین اسمبلی اور سیکریٹریوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ ان لوگوں کے پاس بات کرنے کے لیے سیاست کے سوا کوئی اور موضوع تھا ہی نہیں اور سیاست

بھی تعصب اور منافقت سے لبریز۔ اسے چند روز ہی میں یہ تجربہ ہو گیا کہ یہاں حکومت کا کاروبار کم اور اپنی اغراض پوری کرنے کے لیے جوتوڑ کا بازار زیادہ گرم ہے۔ چند دن بعد ہی اس کا دم ٹھننے لگا۔ وہ کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے لکھنؤ کی گلیوں میں نکل جاتا۔ وہاں کی ریوڑیاں کھانا کسی سڑک کے کنارے چائے خانے میں بیٹھ کر لکھنؤ کے ماضی پر غور کرتا رہتا۔

یہ ملازمت ہرگز اس کی طبیعت کے مطابق نہیں تھی۔ اس دوران میں اس نے ایم اے بھی کر لیا تھا۔ وہ ٹیگنر کا منہ دیکھ کر یہاں پہنچا تھا۔ وہ کسی ایسے ادارے میں کام کر رہی نہیں سکتا تھا جس میں ہندوؤں کا غلبہ ہو اور وہ زبردستی اپنا غلبہ منوانا چاہتا ہو۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر مجھے سرکاری نوکری ہی کرنی تھی تو اعلیٰ سول سروس کے امتحان میں بیٹھتا۔ اس کی تربیت اب تک ایسی ہوئی تھی کہ لکھنؤ پڑھنا ہی اس کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا۔ اسے بہت جلد احساس ہونے لگا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ پھر اگر ضرورتوں نے گلے پر پاؤں نہ رکھا ہوتا تو وہ یہ ملازمت بھی نہ کرتا۔

اسے لکھنؤ میں رہتے ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے کہ رشید احمد صدیقی کا خط آ گیا۔ انہوں نے یہ اطلاع دی تھی کہ مولانا احسن مارہروی ریٹائر ہو گئے ہیں۔ اب ان کی جگہ کسی کی تقرری کا مسئلہ ہے۔ تم فوراً علی گڑھ آؤ اور قسمت آزمائو۔ جو کچھ مجھ سے ہوگا میں بھی کروں گا۔ وہ اس وقت میدان میں اکیلا تھا۔ آل احمد سرور اس کے مقابلے میں آ سکتے تھے لیکن وہ اس سے ایک سال پہلے شعبہ اردو میں آ چکے تھے۔ اب کوئی کھٹکا نہیں تھا۔ وہ میدان میں تنہا تھا۔ اسے اپنی تقرری کی اتنی اُمید تھی کہ بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے لیا اور علی گڑھ پہنچ گیا۔

چند روز بعد اس تقرری کے لیے ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ وہ کونسل ہال کے باہر ایک کمرے میں چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا یہ انتظار کر رہا تھا کہ کب اجلاس ختم ہو اور کب اس تک خوش خبری پہنچے۔ ناکامی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اللہ اللہ کر کے اجلاس ختم ہوا۔ کونسل کے ایک ممبر عبدالحجید قریشی بھی تھے جن سے اس کی قربت تھی۔ وہ ان کے قریب پہنچا۔ ان کے تیور دیکھ کر صاف معلوم ہوتا تھا کہ اندر کیا ہوا ہے۔ وہ پھر بھی ان کے قریب پہنچا۔ اس کی تو صورت سوال بنی ہوئی تھی۔ قریشی صاحب اسے دیکھتے ہی بول پڑے۔ ”جاؤ میاں! دروازے کھلے۔ کچھ نہیں ہوا۔“



”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ رشید صاحب نے مجھے خود بلایا تھا۔ میری لیاقت و قابلیت میں بھی کوئی کلام نہیں۔ میرا مطبوعہ کام بھی سب کے سامنے ہے۔ ڈویژن بھی میری فرسٹ ہے۔ آل احمد سرور اور میرے سوا کوئی دوسرا فرسٹ ڈویژن نہیں۔ پھر جس کی تقرری ہوئی۔“

”ظہیر الدین علوی کی تقرری ہوئی ہے۔“

”ان کی تقرری کس خوشی میں ہو گئی۔ انہوں نے تو پرائیویٹ ایم اے کیا ہے اور ڈویژن میں فرسٹ نہیں۔ کوئی ایسا ادبی کام بھی ان کی پہچان نہیں بن سکا ہے۔“

”ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی سفارش تھی۔“

عبداللہ قریبی تو اپنے راستے چل دیے۔ ابواللیث غصے میں بھرا ہوا سیدھا رشید صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ غصے میں تو تھا ہی ڈاکٹر ذاکر حسین کی شان میں جتنی گستاخیاں کر سکتا تھا کرتا رہا۔ خوب برا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس نکال کر گھر واپس آ گیا۔ بیوی قیافہ شناس تھیں۔ صورت دیکھتے ہی ناکائی کی تحریر پڑھ لی۔ کچھ بوجھنے سے پہلے ہی غم زدہ ہو گئیں۔ وہ ابھی غصے میں تو تھا ہی ایک مرتبہ پھر ذاکر حسین کے خلاف زہرا مٹھنے لگا۔

”میری حق تلفی ان کے ہاتھوں ہوئی ہے جو عوام کی رہنمائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لوگوں کو ان کے بارے میں اتنی خوش فہمی ہے کہ ان کی دیانت داری کی قسمیں کھاتے ہیں۔ وہاں اور لوگ بھی تھے۔ مجھے نہیں معلوم کس نے اور کیا کردار ادا کیا۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ میری تقرری نہیں ہو سکی۔“

”آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ اللہ سب دیکھ رہا ہے۔ آپ کا حق آپ کو مل کر ہے گا۔“

”تمن بچیوں کا تھوڑا سا ہے۔ گھر چلانے کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور میں ہی نوکری کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ سوچتا ہوں اب کیا ہوگا۔“

”چلیے بچوں چلتے ہیں۔ وہاں عوامی بازار قارب ہیں۔ نہیں ہوا تو دوبارہ لکھنؤ چلے جائے گا۔“

اب وہ اسے کیا بتاتا کہ لکھنؤ کی موسمیاتی بھاگ کر ہی تو وہ یہاں آیا تھا۔ اس نے سامان باندھا اور بھائیوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس واقعے کے بعد اسے مایوس ہو جانا چاہیے تھا لیکن شکست مانتا تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اب بھی اس نے شکست قبول نہیں کی تھی۔ اس نے بیوی بچوں کو بھائیوں

میں چھوڑا اور اکیلا علی گڑھ آ گیا۔ اسے اے بی حلیم پر دو انکس چائٹری مہربانوں کا اس وقت تجربہ ہو چکا تھا جب وہ علی گڑھ میگزین کی ادارت کا حق مانگنے ان کے پاس گیا تھا۔ وہ پھر ان کے پاس پہنچ گیا اور اپنے ساتھ ہونے والی حق تلفی کا پورا ماجرا کہہ سنایا۔ انہوں نے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن ان کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔

”جسٹس شاہ محمد سلیمان وانکس چائٹری میں۔ تقرری کا اختیار ان کے پاس ہے۔“ اے بی حلیم نے کہا۔ ”میں آپ کو ایک مشورہ دے سکتا ہوں۔ آپ بی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرالیں۔ ریسرچ اسکالرشپ کے لیے 75 روپے ماہانہ وظیفہ جاری کرنا میرے اختیار میں ہے۔ میں وہ وظیفہ جاری کر سکتا ہوں۔ اس طرح آپ یونیورسٹی سے وابستہ رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کسی وقت مستقل ملازمت کی کوئی صورت نکل آئے۔“

”ابھی تک علی گڑھ کیا کسی اور یونیورسٹی سے بھی کسی نے اردو میں بی ایچ ڈی نہیں کیا ہے۔ کیا یہاں میرا رجسٹریشن ممکن ہوگا؟“

”یہ اس یونیورسٹی کے لیے اعزاز ہوگا کہ پہلا بی ایچ ڈی یہاں سے ہو رہا ہے۔ رشید احمد صدیقی آپ کے ٹرائل ہوں گے۔ ان سے مل کر تحقیق کے لیے کسی موضوع کا انتخاب کر لیں۔“

وہاں سے اٹھ کر اس نے جس کے سامنے بھی اپنے اس ارادے کا ذکر کیا اسے تعجب ہوا۔ بی ایچ ڈی اردو میں اور وہ بھی علی گڑھ سے۔ اس سے پہلے علی گڑھ میں کسی نے اس کی ہمت نہیں کی تھی۔

رشید احمد صدیقی ٹکراں مقرر ہوئے اور موضوع ”لکھنؤ کا دبستان شاعری“ قرار پایا۔

یہ ماننا پڑتا ہے کہ اوائل عمری کے تاثرات تمام عمر انسانی ذہن پر مرتبم رہتے ہیں۔ اس نے نوعمری میں اپنے والد کے کتب خانے میں لکھنؤی شعرا کے بہت سے دوادین دیکھے تھے اور ان کا بہ غور مطالعہ کیا تھا۔ یہ اثرات اس وقت ابھر کر سامنے آ گئے اور اس نے اس موضوع کا انتخاب کیا۔

دوسرے یہ کہ لکھنؤ سے اصلاح زبان کی تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ لسانیات ابواللیث کا خاص میدان تھا۔ ایم کرنے سے پہلے ہی وہ علی گڑھ میگزین میں کئی سو صفحات کا علمی سلسلہ مضامین کا لسانیات کے حوالے سے شائع کر چکا تھا۔ اس لیے بھی لکھنؤ کا دبستان شاعری اس کی

دلچسپی کا باعث تھا۔

اسے یہ مقالہ رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں لکھنا تھا اور مصیبت یہ تھی کہ رشید صاحب تحقیق کے آدمی نہیں تھے۔ وہ مزاج نگار تو بہت اچھے تھے لیکن تحقیق سے کوسوں دور تھے۔ انہوں نے پہلے دن ہی فرما دیا تھا کہ مواد کی فراہمی اور تحقیق و تفتیش تم جانو اور تمہارا کام۔ مقالہ لکھ لو تو مجھے دکھا دینا، نوک، پلک درست کروں گا اور کوئی بات نامعقول ہوئی تو خارج کر دوں گا۔ تحقیق کے آدمی کو اب صدر یار جنگ ہیں ان سے مشورہ کر لیتا۔ ان کا کتب خانہ بھی تمہارے بہت کام آئے گا۔

اس کے سامنے ایک مشکل یہ بھی تھی کہ اس وقت تک لی ایچ ڈی کے لیے اردو کا کوئی مقالہ ہندوستان بھر میں نہیں لکھا گیا تھا جس کو نمونہ بنا کر کام کا آغاز کیا جاتا۔ بہر حال اس نے بھاری پتھر سمجھ کر اسے اٹھا لیا۔ مگر ان مقالہ نے تو بالکل ہی ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ لے دے کے نواب صدر یار جنگ تھے جن سے وہ مشاورت کر سکتا تھا۔ انہوں نے بھی اسے مایوس نہیں کیا۔ اسے مشوروں سے نوازتے رہے۔ اپنے کتب خانے کے دروازے بھی اس پر کھول دیے۔ یہاں سے اسے وہ مواد میسر آیا جو کہیں اور دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اتنے پچھرے نگائے کہ علی گڑھ اور حبیب منج ایک ہو کر رہ گیا۔

مالی اعتبار سے یہ دور اس کے لیے سخت آزمائش کا دور تھا۔ وہ بیوی بچوں کو علی گڑھ لے آیا تھا۔ آمدنی وہی پچھرے روپے ماہانہ کی تھی جو ریسرچ اسکالرشپ کے طور پر اسے مل رہے تھے۔ اس کی بیوی کے لبوں پر ہر وقت کوئی شکایت نہیں تھی لیکن خود بھی کبھی ضرور سوچتا تھا کہ اس کے طور پر پچھرے تقرری ہوتی ہوئی تو کم از کم ایک سو پچیس روپے ماہانہ تنخواہ ضرور ہو جاتی۔

وہ دن بھر شعبہ اردو میں مصروف کار رہتا۔ رشید صاحب کی طرف چلا جاتا یا حبیب منج جاتا یا جاتا۔ گھر پہنچتا۔ بیوی کی ایک مشگراہٹ اس کی ٹھکن دور کرنے کے لیے بہت تھی۔ کچھ دیر اپنی بیویوں کے ساتھ کھیلتا۔ پھر دن بھر محنت سے جو مواد جمع کیا ہوتا اسے ترتیب دینے بیٹھ جاتا۔ صبح اٹھتا، ناشتے کے نام پر جو ہوتا، کھاتا اور کسی مزدور کی طرح پھر گھر سے نکل جاتا۔

ایک دن وہ شعبے میں پہنچا تو اسٹاف روم میں ایک اجنبی صورت نظر آئی۔ کوئی ملنے والے بھی نہیں ہو سکتے تھے

ماہنامہ سرگزشت

کیوں کہ ان کے ہاتھ میں طالب علموں کی حاضری کار جمر تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ مہمان نہیں بلکہ شعبہ اردو کے کوئی استاد ہیں لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا تھا کہ ان کا تقرر کب ہوا اور یہ صاحب ہیں کون۔ علی گڑھ کے طلبہ میں سے تو نہیں ورنہ صورت آشنا ہوتے۔ اس نے معلومات کیں تو پتا چلا کہ ان کا نام محمد عزیز ہے۔ یہاں آنے سے پہلے دارالمصنفین اعظم گڑھ میں تھے اور تالیف و تصنیف کا کام کر رہے تھے۔ ابھی حال ہی میں اردو میں ایم اے کیا ہے اور اب عارضی طور پر چھ ماہ کی مدت کے لیے پتھر مار مقرر کر دیے گئے ہیں۔

یہ سنتے ہی اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس کے زخم تازہ ہو گئے۔ میرے لیے اسامی نہیں اور ان صاحب کو رکھ لیا گیا۔ کوئی اشتہار نہیں درخواست نہیں انٹرویو نہیں۔ معلوم ہوا کہ اس چانسٹر کو کسی بھی جگہ پر خواہ جگہ ہو یا نہ ہو بجٹ میں ہونا ہو، اپنی صوابدید پر چھ مہینے کے عارضی تقرر کا اختیار ہے۔

”یہ تو چور دروازہ ہوا۔ جو صدر دروازے سے داخل نہ ہو سکے اسے عقبی دروازے سے داخل کر لو۔ بعد میں یہ اسامی مستقل بھی ہو سکتی ہے۔“

یہ چوٹ ایسی تھی جسے وہ آسانی سے نہیں سہہ سکتا تھا۔ ابھی پہلی چوٹ کی دھن کم نہیں ہوئی تھی کہ دوسرا زخم لگ گیا۔ اگر یہ چور دروازہ کھلتا ہی تھا تو میرے لیے کھلنا چاہیے تھا۔ اس کا حقدار تو میں تھا۔ وہاں کیا شور مچاتا۔ اٹنے پاؤں گھر لوٹ آیا۔ ابھی دن بھی نہیں گزرا تھا کہ دوپہر کو ملنے والی گاڑی میں بیٹھا اور دہلی پہنچ گیا۔

جسٹس سر شاہ سلیمان وائس چانسلر تھے۔ دو دن علی گڑھ میں گزارتے تھے اور پانچ دن دہلی میں رہتے تھے۔ گویا جزوقتی وائس چانسلر تھے۔ وہ ان کے علی گڑھ آنے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے دہلی آ گیا تھا اور اب ان کی قیام گاہ پر پہنچ کر ان سے ملاقات کی کوشش کر رہا تھا۔ کوشش اس لیے کہ ان کا سیکریٹری ملاقات کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔

جسٹس صاحب، یونیورسٹی سے متعلق کام صرف علی گڑھ میں ہی کرتے ہیں۔ یہاں وہ آپ سے نہیں مل سکتے۔ سیکریٹری نے بتایا۔

”کام کی نوعیت ایسی ہے کہ میں ان کے علی گڑھ پہنچنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔“



وہ اس خط کو لے کر باہر نکلا۔ بے تاب انتظار تھا کہ راستے ہی میں لفافہ چاک کیا۔ اس میں صرف دو سطریں لکھی ہوئی تھیں۔

”ابوالیث صدیقی کا تقرر چھ ماہ کی عارضی مدت کے لیے وائس چانسلر کے خصوصی اختیارات کے تحت کیا جاتا ہے اور اسی تاریخ سے جس سے محمد عزیز صاحب کا کیا گیا ہے۔“ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ سڑک پر ہی سجدہ کر لے۔ اللہ نے اس کی کسی بھی نہ تھی۔

علی گڑھ پہنچنے کے بعد اگلے ہی دن اس نے اے بی حلیم کی خدمت میں پیش ہو کر وہ خط ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے خط کو پڑھا اور اس وقت رجسٹرار سے حکم نامہ لکھوا کر شعبہ اردو کو روانہ کر دیا۔

اس کا تقرر تو ہو گیا لیکن شعبے میں گرم جوشی سے اس کا استقبال نہیں ہوا۔ اسے لگا جیسے وہ بین بلایا مہمان ہے۔ اس کے تقرر میں نہ صدر شعبہ کی سفارش تھی نہ کوئی درخواست نہ اسماعیلی نہ بھٹ لیکن کوئی کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اس کے مخالفین اسے پچھتر روپے کے وظیفے سے ایک سو پچیس روپے ماہانہ کا پچھڑا ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ اسے نکال نہیں سکتے تھے لیکن یہ تو کر سکتے تھے کہ اسے اتنا پریشان کیا جائے کہ وہ خود ہی چھوڑ کر چلا جائے لیکن وہ تو کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ غالب کے الفاظ میں ہوا یہ کہ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسماں ہو گئیں۔

نقلیسی اداروں میں کسی استاد کو پریشان کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار ٹائم ٹیبل ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ اس کے لیے ایسا ٹائم ٹیبل بنایا گیا کہ صبح پہلا گھنٹا بھی اسے لینا پڑتا اور سہ پہر میں آخری گھنٹا بھی۔ نہ صبح دیر سے آ سکتا تھا نہ شام کو جلدی جا سکتا تھا اور پھر مرے یہ سو رے اور بھی۔ ایک گھنٹا (ہیریڈ) سائنس میں دوسرا آئرش میں۔ ان دونوں شعبوں کے درمیان فاصلہ کافی تھا۔ سارا دن اسی بھاگ دوڑ میں گزر جاتا۔ گھر سے یونیورسٹی بھی دور تھی۔ سواری کی استطاعت نہیں تھی پیدل آنا پڑتا تھا۔ آتے ہی بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی۔ آئرش سے سائنس میں۔ پھر سائنس سے آئرش میں۔ سائنس ابھی قابو میں نہیں آتی تھی کہ کلاس شروع ہو جاتی تھی۔ کلاس بھی ایسی دی گئی جو تعداد کے اعتبار سے نئی نووارد کے لیے کسی امتحان سے کم نہیں تھی۔ آئرش میں بی ایس کی کلاس اتنی بڑی ہوتی کہ کوئی بڑے سے بڑا کمرہ کافی نہ ہوتا۔ اس کلاس کو اسٹریچی ہال میں لینا پڑتا تھا اور وہ

”انتظار تو آپ کو کرنا پڑے گا۔“  
”میں نے علی گڑھ سے دہلی تک کا سفر یہ سننے کے لیے نہیں کیا ہے کہ وہ نہیں مل سکتے۔ مجھے آج اور ابھی ان سے ملنا ہے۔“

”میں آپ کو ان سے ملوا بھی دیتا لیکن ان کی طبیعت ناساز ہے۔ وہ کسی سے نہیں مل سکتے۔“ سیکریٹری نے پینترا بدلا۔

”اگر آپ نہیں موانیں گے تو میں کوٹھی کے دروازے پر اس وقت تک بیٹھا رہوں گا جب تک وہ باہر آ کر مجھ سے مل نہیں لیں گے اور جو کچھ مجھے کہنا ہے ان سے کہہ نہیں لوں گا۔“

سیکریٹری نے اس کے یہ تیور دیکھے تو اندر جا کر اطلاع کی اور جنس صاحب نے اسے بلوالیا۔ وہ اندر مینا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتے اس نے اپنی داستان بیان کرنے کے لیے الفاظ تراش لیے۔

”میرا نام ابوالیث صدیقی ہے۔ میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس فرسٹ آنرز اور فرسٹ کلاس فرسٹ ایم اے کیا ہے۔ میرے علاوہ اس وقت تک کسی کو یہ اعزاز نہیں ملا ہے۔ میں پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی کام بھی کر رہا ہوں۔ یہ ہندوستان میں کسی بھی یونیورسٹی میں ہونے والا پہلا پی ایچ ڈی ہو گا۔ میں ایک نوکری چھوڑ کر مدریس کے جنون میں علی گڑھ آیا تھا۔ چند ماہ پہلے مجھے نظر انداز کر کے ایک تقرری عمل میں آئی جس کا فیصلہ میرٹ پر نہیں کسی اور معیار پر ہوا۔ یہ کہا گیا کہ امیدوار ضرورت مند ہے۔ ضرورت مند تو میں بھی تھا۔ میں اس وقت خاموش ہو گیا لیکن اب ایک بار تقرر ہو گیا۔ اس کی بنیاد بھی میرٹ نہیں۔ دروغ بر گردن (دھڑکی) سنا یہ ہے کہ وہ آپ کے کوئی عزیز ہیں۔ بس یہی میرٹ ہے۔ بے شک یہ میرٹ ہے لیکن بہر حال حق میرا ہے۔ اب آپ کی صوابدید پر ہے کہ آپ کیا حکم صادر فرماتے ہیں۔“

جنس صاحب نے خاموشی سے اس کی بات سن لی۔  
”اچھا آپ ملاقاتیوں کے کمرے میں تشریف رکھیں۔ میں کچھ کرتا ہوں۔“

وہ باہر آ کر ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ کچھ دن بعد جنس صاحب کا سیکریٹری اندر آیا اور ایک ہدف لفافہ اس کے ہاتھ میں دے دیا یہ اسے بی حلیم پرووائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی کے نام ایک خط تھا۔



بھی مانگیر و فون کے بغیر۔ دوسو کی کلاس اور وہ بھی علی گڑھ کے طالب علموں کی جو ذرا سی دیر میں آدمی کو اس کی حیثیت یاد دلا دیں۔ مضمون بھی اردو جس کی لڑکوں کے لیے کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

یہ بھی اسی سازش کا حصہ تھا کہ وہ چھوڑ بھاگے یا لڑکے اسے بھاگ دیں۔

اس کی عمر بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ پہلے دن کلاس میں جانے سے پہلے خود بھی سوچ رہا تھا کہ اتنی بڑی کلاس کا مقابلہ کر بھی سکے گا۔ اس کا قد ذرا کم تھا۔ اس وقت دبلا پتلا بھی تھا۔ نہیں پڑھا رہا تھا ان سے بھی چھوٹا نظر آ رہا تھا۔ پڑھانے کو بھی ملا تو اقبال کی باجگ در اس میں پہلا سبق ”خضر راہ“ کا تھا۔ سب سے پہلے صرف نظم کے عنوان خضر راہ پر گفتگو شروع کی اور کم از کم دو ہفتے اس کی علامتی اہمیت پر بات کرتا رہا۔ اس عرصے میں یہ نظم اسے زبانی یاد ہو گئی۔ کلاس میں جانا اور کتاب کھولے بغیر زبانی پڑھانا شروع کر دیتا اور ایسا تجربہ کرتا جو شاید بی اے کی سطح کے لیے ضروری بھی نہیں تھا لیکن طلبہ پر اس کا اچھا اثر پڑا اور وہ اسے توجہ سے سننے لگے۔ گویا وہ کامیاب ہو گیا۔ وہ قدرتی طور پر بلند آواز تھا۔ یہ خوبی بھی اس کے حق میں گئی۔

ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس کی آواز گونجنے لگتی۔

وہ ان کلاسوں سے نمٹ ہی رہا تھا کہ اسے ایم اے میں تاریخ زبان و ادب کا پرچہ پڑھانے کو ملا۔ یہ اس وقت بھی ایم اے کے سات پرچوں میں سب سے مشکل تھا۔

اس نے اس پرچے میں لسانیات کا ایک جزو داخل کر لیا اور اس کی تدریس شروع کی۔ یہ اس لسانیات کے شعبے کی داغ بیل تھی جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک مستقل، مضبوط اور الگ شعبہ ہے۔

اب وہ اپنی جگہ بنا جا رہا تھا۔ شروع میں اس کا حال ناخوادہ مہمان کی طرح رہا لیکن اس نے تدریسی مہارت اور حسن اخلاق سے سب کے دلوں کو فتح کر لیا۔ کم از کم شعبے میں کوئی مخالفت نہ رہی۔

اس زمانے میں یونیورسٹی گریجویٹ میں بی اے کی اردو کلاس شروع ہوئی۔

اچھے خاصے تعلیم یافتہ خاندانوں میں بھی لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسکول یا کالج بھیجتا تو درکنار لڑکوں کی تعلیم بھی عام نہیں تھی تو لڑکیاں بے چاری کس گفتی

میں۔ بہر حال بعض احباب کی کوششوں سے گریجویٹ کالج کے قیام کی نوید ملی۔ ابتدا میں صرف دو لڑکیاں تھیں۔ 1936ء میں اس کا الحاق یونیورسٹی کے ساتھ ہو گیا۔ صرف دو سال ہوئے تھے کہ ”خواتین کالج“ کے لیے جواب یونیورسٹی کا حصہ تھا اردو کے استاد کی ضرورت پیش آئی۔ لڑکیوں میں تعلیم کا رواج ہی نہیں تھا تو کسی خاتون پیکرار کا ملنا کیسے ممکن ہوتا۔ اس کے لیے ایوالیٹ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ اعزاز بھی اس کی قسمت میں تھا کہ وہ گریجویٹ کالج میں اردو کا پہلا استاد ہوا۔

ان دنوں مخلوط تعلیم کا رواج تو ہوا نہیں تھا۔ وہ پہلے دن کلاس میں گیا تو اسے ایک پردے کے پیچھے بٹھا دیا گیا۔ پردے کی دوسری جانب علی گڑھ کی وہ لڑکیاں تھیں جن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے علی گڑھ کے طلبہ سائیکلوں پر پردے لگے تاگوں کا پچھا کیا کرتے تھے یا علی گڑھ کی نمائش میں کالے برقعوں کی دھوم ہوا کرتی تھی۔ اس وقت کے نوجوان شعراء اس ناپیدہ مخلوق پر نظمیں لکھا کرتے تھے۔

وہ بھی بائیس سال کا نوجوان، دھڑکتے دل سے پڑھانا شروع کیا۔ دوسری طرف سے کسی نسوانی آواز نے سوال پوچھا۔ اس نے مسئلہ سمجھا دیا۔ کسی عاشقانہ شعر پر دلی دلی کسی کی آوازیں آئیں۔

کلاس ختم ہوئی۔ وہ ”بڑی مشکل سے دل قابو کیا ہے۔“ کہتا ہوا کلاس سے باہر گیا۔

پردے کی دوسری جانب بیٹھی ہوئی لڑکیاں سوچ ضرور رہی ہوں گی کہ موصوف نوجوان ہیں، کچھ دنوں میں کھلیں گے ضرور لیکن موصوف کا حال یہ تھا کہ شروع سے اتنی سختیاں جھیلی تھیں کہ عشق کرنے کی فرصت ہی نہیں مل سکی تھی۔

قط سانی کے وہ ایسے دن گزار رہا تھا کہ جس میں عشق کرنے والے بھی عشق فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ اس نے عشق کیا ہی نہیں تھا تو فراموش کیا کرتا۔ یہ احساس بھی تھا کہ وہ شام آوارہ میں ”استاد“ ہے۔ پردے کے کونے اٹھتے کرتے

ہے۔ عشقیہ اشعار کے مطلب بار بار پوچھے جاتے رہے۔ اسے خوشی تھی تو یہ کد اب تنخواہ ایک سو پچیس سے بڑھ کر ایک سو چھیانوے ہو گئی۔ پچاس روپے تنخواہ بڑھ گئی۔ اس پچاس روپے کے دن اسے بیٹھے میں اسے بیٹھے میں چار روز دو دو گھنٹے کا اس میں پڑھا کرتا تھا۔

اسے دوسری خوشی یہ بھی کہ اس کالج میں برصغیر پاک و ہند ہی کی نہیں بلکہ کپوڑیا، شمالی ہند، مصر، عراق اور سری لنکا



تک سے مسلمان لڑکیاں آتی تھیں اور اس طرح سرسید کے خواب کا دوسرا حصہ یعنی تعلیم نسواں بھی شرمندہ تعبیر ہو گیا تھا۔

خواتین گرلز کالج اس کے گھر "وارث منزل" سے قریب تھا لہذا پیدل ہی آ جاسکتا تھا۔

پچاس روپے کی اس اضافی آمدنی کے بعد اس کا ہاتھ کچھ ٹھیک گیا تھا۔ اس نے ایک ڈیپارٹمنٹ سے دوسرے ڈیپارٹمنٹ تک جانے کے لیے ایک سائیکل خرید لی۔ یہ پرانی سائیکل تھی بعد میں نئی سائیکل خرید لی جو 1947ء میں علی گڑھ سے رخصت ہوتے وقت تک اس کے پاس رہی۔

اس نے درس و تدریس کے ساتھ یونیورسٹی کے سب سے بڑے ہوٹل عثمانیہ کے گھرانے کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ وائس چانسلر کے دفتر میں ان کے معاون کے طور پر بھی کام کیا۔ اس دوران میں شعبہ اردو سے بدستور منسلک رہا اور کوئی اضافی تنخواہ نہیں لی۔

اس نے عروج کی کمی منزلیں دیکھیں لیکن یہ سب دیکھنے کے لیے اس کی والدہ زندہ نہیں رہیں جو اسے علی گڑھ بھیجے کی مخالفت کرتی رہی تھیں۔ جن کا خیال تھا کہ علی گڑھ میں رئیسوں کے بچے پڑھ سکتے ہیں۔ ہم وہاں کے اخراجات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ علی گڑھ کا ماحول بچوں کو بگاڑ دیتا ہے۔ والدین سے دور رہ کر بچوں کو بگڑنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ خیالات ان کے ذہن میں یونہی جاگزیں نہیں ہو گئے تھے۔ وہ اپنے بڑے بیٹے کو علی گڑھ بھیج کر دکھ چکی تھیں۔ جنہوں نے اپنی نادانیوں اور شاہ خرچیوں سے گھر میں مفلسی کا پہرا بٹھا دیا تھا۔ ابو اللیث والدہ کی مرضی کے خلاف علی گڑھ گیا اور ایسی عمر میں گیا کہ خرابی کا کوئی بھی دوا اسے تنگے کی طرح بہا کر لے جاسکتا تھا لیکن اس نے اپنی محنت اور لگن سے اپنا مقام بتایا عمر افسوس! یہ سب دیکھنے کے لیے اس کی والدہ اب اس دنیا میں نہیں رہی تھیں وہ اگر ہوتیں تو یہ محنتیں کہ انسان اپنی محنت سے جو چاہے کر سکتا ہے۔

☆.....☆

اس کا قیام وارث منزل میں تھا۔ اس میں دو بڑے کمرے تھے۔ ایک بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم۔ یہی کمرے وہ اپنے لکھنے پڑھنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ دونوں اطراف برآمدے تھے۔ اندر کی طرف برآمدے کے ایک پہلو میں اسٹورا اور دوسرے میں غسل خانہ تھا۔

اس وقت رات کے تقریباً دو بجے ہوں گے کہ پیاس سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اندر کے برآمدے میں صراحی رکھی تھی اور اس پر چاندی کا کٹورا ڈھکا ہوا تھا۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو کٹورا غائب تھا۔ اسٹے میں نظر جو اٹھائی تو اسٹور کا دروازہ جو مقفل رہتا تھا چو پٹ کھلا پڑا تھا۔ حیرانی ہوئی کہ دروازہ کھلا کیوں ہے۔ ذرا اور آگے بڑھا تو محن میں لحاف، گدے اور کپڑے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ یہ خیال آتا لازمی تھا کہ چوروں نے گھر کا صفایا کر دیا ہے۔ وہ گھبرا کر اندر کی طرف بھاگا۔ بیوی کو اٹھایا۔ اٹھایا کیا، بھینچوڑ کر رکھ دیا۔

"اٹھ کر دیکھو تو گھر میں چوری ہو گئی ہے۔" وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھیں۔ محن میں گھرے ہوئے سامان کو دیکھ کر انہیں بھی شک نہیں رہا کہ گھر کا صفایا ہو گیا ہے۔ چور کو لحاف گدوں سے غرض نہیں تھی۔ وہ بیٹیں چھوڑ گیا۔ اپنے کام کی چیزیں لے گیا ہوگا۔ اب دونوں نے تلاشی یعنی شروع کی کہ کیا چیزیں گئی ہیں۔ صبحے کا آغاز تھا جو پیسے صبحے بھر کے خرچے کے لیے رکھے تھے اب اپنی جگہ نہیں تھے کچھ تھوڑا بہت زیور تھا وہ بھی غائب تھا۔ چاندی کے کچھ برتن تھے وہ بھی چوروں کی نذر ہو گئے تھے۔ بستر کی چادریں تک کوئی لے گیا تھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ یہ سارا سامان سائیکل پر رکھ کر لے گیا تھا کیوں کہ سائیکل بھی نہیں تھی۔

سامان کو تلاش کرتے اور تخمینہ لگاتے لگاتے صبح ہو گئی۔

بیوی پولیس کہ پولیس میں رپورٹ درج کرا کر آؤ۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن اس نے تھانہ جا کر رپورٹ درج کرا دی۔

گھر میں جتنی رقم تھی سب جا چکی تھی۔ سر ہانے رکھی شیر دانی کی جیب میں تھوڑی سی ریز گاری رہ گئی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھی کہ اس سے دوپہر کی ہنڈیا کا انتظام ہو سکتا تھا۔ بیوی باورچی خانے میں گھسیں تو وہاں رکھا ہوا بھی کا بڑا کنستر بھی نہیں تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"میاں ہم تو بری طرح لٹ گئے۔ چوروں نے کچھ بھی تو نہیں چھوڑا۔ برتن تک نہیں چھوڑے۔ میں نے پانی پانی جوڑ کر کتنا کچھ جمع کر لیا تھا کچھ بھی تو نہیں رہا۔ ابھی تو پورا صبح پڑا ہے کیا ہم دانے دانے کو ترسیں گے۔ آپ کی سائیکل بھی چلی گئی۔ اب آپ کو پھر یونیورسٹی پیدل جانا



پڑے گا۔“

وہ سچ سچ رورہی تھیں اور ابواللیث انہیں تسلی دے رہا تھا۔

”اللہ اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے۔ یہ بھی ہمارا امتحان ہے۔ تم دیکھنا زندگی میں تمہیں اللہ اتنا دے گا کہ سنبھالا نہیں جائے گا۔ پوری دنیا دیکھے گی۔ جانے والے پرتوں کی حیثیت کیا ہے۔ دنیا بھر کی نادرا اور قیمتی اشیاء ہوں گی تمہارے پاس۔“

یہ وقت ایسی قبولیت کا تھا کہ یہ دعا حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ اللہ نے دولت، شہرت سب کچھ دیا۔ دنیا بھی گھومی اور وہاں سے لائے ہوئے نادرا تحفوں سے گھر بھی بھر گیا۔

وہ بیوی کو تسلی دینے کے بعد یونیورسٹی گیا اور رشید صاحب کو اطلاع دی۔ انہیں بھی سن کر فسوس ہوا تسلی دی اور بڑی محبت کا برتاؤ کرتے ہوئے فوری خرچ کے لیے کچھ رقم بھی دی۔

چوری ایسی تھی کہ گھر میں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اس کم آمدنی میں گھر کو دوبارہ بنانا پڑ گیا۔

وہ تو مضبوط اعصاب کا تھا اس صدمے کو سہہ گیا۔ عورتیں گھرداری کی طرف سے بہت حساس ہوتی ہیں۔ ریحان فاطمہ کو ایسا دھچکا لگا کہ کئی دن بخار میں پڑی اپنی کم شدہ چیزوں کو یاد کرتی رہیں۔

اس حادثے سے ایسا دھچکا لگا تھا کہ اس گھر سے جی اچاٹ ہو گیا۔ بیوی نے اپنی ذات کے لیے بھی کوئی تقاضا نہیں کیا تھا لیکن اب کہتی تھیں کہ چوروں نے گھر دیکھ لیا ہے۔ یہ گھر بدل لو۔

ابواللیث کا بھی اس گھر سے جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ بیوی بچوں کو لے کر ایک اور گھر ”مسزیت محل“ میں منتقل ہو گیا۔ اس مکان میں انہوں نے دو سال گزارے اور پھر یونیورسٹی کے مکان مارلسن روڈ میں منتقل ہو گئے جہاں پاکستان آنے تک مقیم رہے۔

☆.....☆

اس کا رجسٹریشن پی ایچ ڈی کے لیے ہو چکا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کے سامنے کوئی نمونہ موجود نہیں تھا جسے بنیاد بنا کر وہ کام کا آغاز کر سکتا کیوں کہ اس وقت تک اردو کا کوئی مقالہ ہندوستان بھر میں نہیں لکھا گیا تھا۔ مگر اس رشید احمد صدیقی مقرر ہوئے تھے۔ ان کا تحقیق سے کوئی واسطہ نہیں

تھا۔ انہوں نے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ مواد کی فراہمی اور تحقیق تمہیں خود کرنی پڑے گی۔ مقالہ لکھ لو تو مجھے دکھا دینا میں نوک، پلک سنوار دوں گا۔ اس سلسلے میں نواب صدر یار جنگ بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ وہ صرف اتنا کر سکتے تھے کہ اپنے سب خاٹے کے دروازے اس پر کھول دیں اور وہ انہوں نے کھول دیے۔ اس نے خود ہی کمرہ بستہ ہونے لگا۔ اپنے مقالے کے لیے خاک تیار کیا اور مواد کی فراہمی کے لیے کوشاں ہو گیا۔ جو غلام سب محفوظ کر لیا۔ تذکروں، تاریخوں اور دوسری کتابوں میں جہاں کہیں لکھنؤ اور لکھنوی شاعری کا ذکر آیا اسے محفوظ کر لیا۔ شعر کا کلام محفوظ کر لیا۔ سینکڑوں منٹوں کے حوالے جمع ہو گئے۔ اتنا مواد جمع ہو گیا کہ وہ گھبرا پڑا۔ اتنا مواد کتنے صفحات گھیرے گا اور اسے کون سیٹے گا۔ اب اس کے ذوق تنقید نے خود اس کی رہنمائی کی۔ میں لکھنوی شاعروں کا تذکرہ مرتب نہیں کر رہا ہوں بلکہ لکھنوی شاعری کے دبستان کا تجزیہ کرنا مقصود ہونا چاہیے۔ اس تجزیے کے بعد یہ ثابت کرنا ہے کہ بعض خصوصیات کی وجہ سے لکھنوی ایک ”دبستان“ ہے۔ وہ مواد پیشتر بے کار ہوا۔ محنت کا رت مٹی۔

اب اسے لکھنوی شاعری کا مطالعہ ایک دبستان کی حیثیت سے کرنا تھا اور اس میں سلطنت اودھ کے قیام وہاں کی مخصوص معاشرت اور اس میں ابھرنے والی شاعری اور اصلاح زبان کی تحریک کے اسباب و نتائج سے خاطر خواہ بحث کرنی تھی۔ قابل ذکر شعراء کا تعارف کرانا تھا اور ان کے کلام کے رنگ کو متعین کرنا تھا۔ یہ اردو دنیا میں اس کی اولین کوشش تھی۔ اب تک جو تذکرے ملتے تھے ان میں شعراء کا مختصر تعارف ہوتا تھا اور نمونہ کلام۔ لیکن لکھنوی شاعروں کو ایک دبستان کا نمائندہ اور لکھنوی شاعری کو ایک دبستان کی حیثیت سے مربوط کرنے کی تحقیق کاوش وہ پہلی مرتبہ کر رہا تھا۔

اس نے اپنے مقالے کو دس ابواب میں تقسیم کیا اور کام شروع کر دیا۔

اس نے پہلی مرتبہ اردو شاعری کے ایک خاص دور کو اس کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ لکھنوی تہذیب و معاشرت اور وہاں کے خاص مزاج کو متعین کرنے میں مذہب اور مسلک کو خاصا دخل تھا۔ اس نے اس موضوع کو اجاگر کرنے کے لیے مستند حوالے تلاش کیے اور بہت سا مواد جمع کر لیا۔



افسوس یہ سرمایہ جو میں نے بڑی مشکل اور محنت سے جمع کیا تھا ادبی اور سائنسی حیثیت سے نہ کسی تاریخی حیثیت سے محفوظ رہ جاتا۔

اس مقالے کو جانچنے کے لیے تین ممتحن مقرر ہوئے۔ ایک تو خود رشید احمد صدیقی تھے۔ دوسرے نغراں حسرت موہانی تھے۔ ایک اور ممتحن ڈاکٹر محی الدین قادری زور تھے۔ ان کو ممتحن اس بنا پر مقرر کیا گیا تھا کہ انہوں نے ایک یورپین ملک سے پی ایچ ڈی کیا تھا اور بیرونی ملکوں میں پی ایچ ڈی کے مقالوں کے لیے جو قاعدے قانون تھے ان سے وہ گزر چکے تھے۔

جب زبانی امتحان کا وقت آیا تو ابوالیث کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ وہ انہیں لینے اسٹیشن جائے۔ وہ ٹرین آنے سے پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹرین نے پلیٹ فارم کے پاؤں پکڑے تو حسرت موہانی اپنی روایت کے مطابق تھرو کلاس کے ڈبے سے برآمد ہوئے۔ ان کا بوریا ہسٹران کے ساتھ تھا جس کے ساتھ ری سے ایک لونا بھی بندھا ہوا تھا۔ تعارف کی ضرورت یوں پیش نہیں آئی کہ حسرت موہانی اسے کانپور اور بدایوں میں دیکھ چکے تھے۔

وہ ریل سے اترے اور پیدل یونیورسٹی تک گئے۔ اصرار کے باوجود اس وقت کی علی گڑھ کی واحد محبوب سواری ”یکے“ کا سفر قبول نہیں کیا۔ راستوں سے وہ واقف تھے کیوں کہ یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے تھے۔ ویسے بھی مشاعروں وغیرہ میں آتے رہتے ہوں گے۔

زور صاحب حیدر آباد سے سیکنڈ کلاس میں تشریف لائے۔ انہیں لے کر وہ رشید احمد صدیقی کے مکان تک گیا اور گھر چلا آیا یہ بتانے کی نوبت ہی نہیں آئی کہ جس طالب علم کا آپ امتحان لینے آئے ہیں وہ میں ہی ہوں۔

اگلے دن صبح شعبہ اردو میں صدر شعبہ کے دفتر میں (رشید احمد صدیقی صدر شعبہ اردو تھے) اس کا زبانی امتحان ہونا تھا۔ اس دفتر کا حال یہ تھا کہ درمیان میں ایک دفتری بہر پڑی رہتی تھی اور اس کے ساتھ ایک کرسی جو بظاہر صدر شعبہ کے لیے تھی لیکن رشید صاحب شاذ ہی اس کرسی پر نظر آتے تھے۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی کمرے کے ایک کونے میں ایک آرام کرسی پڑی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک اصول پر فیمل فین رکھا ہوتا اور نیچے ایک اکال دان۔ یہی رشید صاحب کی نشست تھی۔ صدارتی کرسی پر عموماً وہ نیاز مند جیٹا جہاں رشید صاحب کی طرف سے دفتری کام انجام

میری کی صنف کے بیان میں شعرائے لکھنؤ کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے ایک باب ہرزہ گوئی پر بھی لکھا۔ مقصد یہی تھا کہ لکھنوی شاعری میں جو کچھ لکھا گیا اسے تاریخی طور پر محفوظ کر لیا گیا لیکن اس کی یہ محنت رائیگاں چلی گئی۔

اس نے مقالے کی تکمیل کے وقت نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمن شروانی سے بھی مشاورت کی۔ نواب صاحب نے یہ دونوں حصے قلم زد فرما دیے۔ اس لیے نہیں کہ یہ غلط تھے بلکہ اس کی توجہ پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ ”بات ٹھیک سی مگر یہ اس کے اظہار کا کل نہیں۔ تم مناظرے میں کیوں پڑتے ہو۔ خدا معلوم ممتحن کون ہو، کس مسلک کا ہو اپنے خلاف علمی محاذ کیوں بناتے ہو۔“

وہ ابھی طالب علم تھا۔ نواب صاحب سے اختلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ڈراگ تھا کہ کہیں ڈگری ہی کھٹائی میں نہ پڑ جائے۔ یہ خیالات پھر کسی وقت کسی تصنیف میں بیان کیے جاسکتے ہیں۔ اس نے ایسے تمام حصے قلم زد کر دیے۔ یہ حوالے اس نے بڑی محنت سے جمع کیے تھے۔ وہ سب ضائع ہو گئے۔

نواب صاحب کی منتقلی طبیعت کو ہرزہ گوئی کی ثقافت بھی برداشت نہیں ہوئی۔ انہوں نے اسے بھی اصل مقالے سے خارج کر دیا۔ ”میں یہ تو گالیاں ہیں۔ ادب کے نام پر کیا گالیاں بھی لکھو گے۔“

اگر یہ باب مقالے میں شامل ہو جاتا تو تاریخ کا ایک اہم گوشہ رقم ہو جاتا اور اس مقالے کی دلچسپی اور انفرادیت میں بھی اضافہ ہوتا۔ یہ سرمایہ بھی جو اس نے بڑی مشکل اور محنت سے جمع کیا تھا ضائع ہو گیا۔

اسے اپنی محنت کے اس طرح ضائع ہونے پر بہت دن افسوس رہا چنانچہ اس نے اپنی خودنوشت میں لکھا۔

”اب سوچتا ہوں کہ اس صنف کے نمونے ہماری کسی ادبی تاریخ میں نہیں ملتے۔ جب ہم نے ”چرکین“ کے دیوان کی اشاعت قبول کر لی۔ کلیات اعلیٰ مرتب کر ڈالی۔ جان صاحب کا دیوان ایسا محقق بن گیا کہ لغت کی کتابوں میں اس سے سندیں اخذ ہونے لگیں تو پھر ہرزہ گوئی کے نمونے محفوظ رکھنے میں کیا تامل تھا۔ آخر گالیاں بھی تو ہماری لغت کا جزو ہیں۔ گالی سے بھی زبان کے ذریعے سے قوم کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کی شرافت کے معیار کا تعین بھی ہوتا ہے۔“



دیتا تھا۔

وہ رشید صاحب کے دفتر میں ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔ پہلے قادری صاحب پہنچے پھر حسرت موہانی بھی آگئے۔ قادری صاحب نے بیٹھتے ہی رشید صاحب سے کہا۔ اب امیدوار کو بھی بلا لیجئے تاکہ کارروائی شروع ہو۔ رشید صاحب نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ موجود ہیں۔“

”امیدوار یہ ہیں؟“ قادری صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

”جی ہاں امیدوار میں ہی ہوں لیکن آپ کو اتنی حیرت کیوں ہوئی۔“ ابواللیث نے کہا۔

اب قادری صاحب کو مزید حیرت ہوئی۔ فرمانے لگے۔ ”آپ کے مقالے کا موضوع اور لکھنے کا اسلوب دونوں کو پڑھ کر اندازہ ہوا تھا کہ اردو پڑھانے والے استادوں کی طرح عام سی دقت ہوگی۔ چہرے پر دائمی کا نور، میلی کھلی شیردازی، سر پر ٹوپی۔ علی گڑھ کے ہیں تو ترکی ہو گی۔ کناروں پر میل جما۔ منہ میں پان، ہونٹوں اور باجھوں سے پیک کے چھینٹے اثراتے ہوئے لیکن آپ تو اردو کے استاد سے زیادہ مشہور معلوم ہوتے ہیں۔“

بہر حال قہقہوں کے بعد زبانی امتحان کا مرحلہ ہوا۔ قادری صاحب نے کم لیکن حسرت موہانی نے بہت تفصیل سے امتحان لیا اور کامیابی کا مژدہ اسی وقت سنا دیا۔

یہ علی گڑھ سے ملنے والی اردو کی پہلی پی ایچ ڈی کی ڈگری تھی جو 1941ء میں عطا ہوئی۔ یونیورسٹی نے اس مقالے کی اشاعت کا ذمہ لیا اور طباعت کی مد میں پانچ سو روپے کی مالی امداد دے کر اسے یونیورسٹی کی مطبوعات کے سلسلے میں شائع کیا۔

”طباعت پر اس وقت بھی پانچ سو روپے زیادہ رقم صرف ہوئی۔ وہ کیسے پوری ہوئی اس میں مجھ اور حضرات کے سرعبد القادر کی امانت بھی شامل تھی۔“

”انہوں نے مقالہ شائع ہونے پر میری بڑی ہمت افزائی فرمائی اور تعریف کا ایسا غلہ لکھا جس کا نہ میں اس وقت مستحق تھا نہ اب ہوں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے بھی بڑی شفقت فرمائی اور اپنے تہرے سے میری حوصلہ افزائی کی۔“ (ابواللیث صدیقی)

اس وقت سے لے کر اب تک اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آج بھی یہ حوالے کی مستند کتاب

کے طور پر جامعات کے نصاب میں شامل ہے بلکہ یہی کتاب اس کی شہرت اور پہچان بھی جاتی ہے۔

اس کتاب کی پہلی اشاعت 1944ء میں ہوئی۔

اس کا عظیم سے نمٹنے کے بعد وہ اپنے پرانے ذوق

یعنی لسانیات کی طرف متوجہ ہوا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔

یہ شوق جنوں اور یواگھی میں تبدیل ہو گیا۔ ہندوستان میں رہ

کر اس شوق کی تکمیل کے لیے ذرائع نہ ہونے کے برابر

تھے۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ انگلستان جائے گا۔ اس نے

لندن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز سے خط کتابت شروع

کر دی۔ خیال تھا کہ یونیورسٹی سے تعلیمی رخصت ٹی جائے

گی۔ تعلیمی رخصت کے دوران میں اسے نصف تنخواہ مل سکتی

تھی۔ اس وقت تنخواہ تین سو نوے روپے ماہوار تھی۔ گویا کم و

بیش دو سو روپے مل سکتے تھے۔ اس میں کچھ رقم اہل و عیال

کے لیے چھوڑنا تھی اور باقی میں لندن میں گزارہ کرنا تھا۔

جب انگلستان میں داخلے کی امید بندھ گئی تو اس نے

تعلیمی رخصت کی درخواست دے دی۔ یہ کوئی انوکھی بات

نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی لوگ تعلیمی رخصت پر گئے

تھے۔ انوکھی بات یہ تھی کہ اردو کا آدمی اردو کی اعلیٰ تعلیم کے

لیے لندن جانا چاہتا ہے۔ انتظامیہ کو حیرت تھی کہ لندن میں

اردو کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے کیا معنی۔ درخواست نام منظور ہو

گئی۔ اعتراض یہی تھا کہ آپ کا مضمون اردو ہے لندن کا

اس مضمون سے کیا تعلق؟ اس نے سمجھانے کی کوشش کی کہ

اس کا مقصد اردو کے کسی شاعر پر تحقیق یا تنقید نہیں۔ میں تو

لسانیات کی تعلیم کے لیے جانا چاہتا ہوں۔

”اردو کے تعلق اور پس منظر اور مسائل کو سامنے رکھ

کر لسانی مطالعے کا آغاز ہمارے یہاں نہیں ہوا۔ اس سے

آگاہی لندن جا کر ہی ہو سکتی ہے۔ واپس آکر میں اردو پر

بہت کام کر سکتا ہوں۔“

اس کی یہ بحث بے کار گئی۔ کوئی یہ سمجھنے کو تیار ہی نہیں

تھا کہ لسانیات کا مفہوم کیا ہے اور یہ حیثیت ایک مستقل اور

الگ مضمون کے اس کی افادیت کیا ہے بلکہ یہ ماننے کو تیار

ہی نہیں تھے کہ یہ کوئی الگ مضمون ہے۔

وہ دل برداشتہ ہوتا تھا۔ مایوس ہونا اس نے سیکھا ہی

نہیں تھا۔ لسانا اسے آتا ہی نہیں تھا۔ یونیورسٹی انتظامیہ کی

طرف سے دل برداشتہ ہونے کے بعد وہ اس وقت کے

وائس چانسلر نواب محمد اسحاق خان کے پاس پہنچ گیا۔ نواب

صاحب خاندانی آدمی تھے نواب اختر خان کے بیٹے اور



نواب شیفتہ کے پوتے تھے۔ اپنے عہدے کو بالائے طاق رکھ کر نہایت شفقت سے پیش آئے۔ نہایت اطمینان سے اس کی پوری بات سنی۔ وہ انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ انہوں نے نہ صرف مدد کا وعدہ کیا بلکہ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ تعلیمی اخراجات کے سلسلے میں بھوپال کے عبید اللہ ٹرسٹ سے بھی مدد دلانے کی کوشش فرمائیں گے۔

اسی سلسلے میں وہ کرنل حیدر خان سے بھی ملا۔ وہ فوراً دھم کے آدمی تھے۔ کیمیا کے صدر شعبہ تھے اور یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ سنتے ہی فرمایا۔ ”ضرور جاؤ گے دیکھوں گا کون روکتا ہے۔“

ان دونوں حضرات کی کوششوں سے رخصت منظور ہو گئی۔ چھٹی منظور ہوتے ہی اس نے لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں داخلے کی درخواست بھیج دی۔ اس کے کوائف ہرگز ایسے نہیں تھے کہ داخلہ ملتا۔ داخلہ مل گیا۔

اس کی ان کوششوں میں اتنا وقت ضائع ہو گیا کہ سیاسی حالات نے پلٹا کھایا۔ وہ چنگاریاں جو ابھی وہی دلی نظر آرہی تھیں۔ شعلہ بن گئیں۔ پاکستان کے قیام کا اعلان ہو گیا اور ساتھ ہی ملک گیر ہنگاموں کا بازار گرم ہو گیا۔ فسادات پھوٹ پڑے۔ مسلمان ہونا جرم ہو گیا۔ اس نے

38ء میں لکھنؤ کی ملازمت کے دوران میں جو صورت حال دیکھی تھی اور جو تئیر مشاہدہ کیے تھے اب اس کی عملی شکل نظر آرہی تھی۔ علی گڑھ پر ہندوؤں کی خاص نظر تھی۔ یہ ادارہ سرسید کا قائم کردہ تھا اور سرسید نے مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں جانے سے روکا تھا۔ سرسید ہی وہ شخص تھے جنہوں نے یہ بائبل دہلی کہا تھا۔ ”ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک ساتھ رہنا ممکن نہیں۔“ قائد اعظم بھی علی گڑھ یونیورسٹی کو تحریک پاکستان کا اسلحہ ثابت کہ چکے تھے۔ تحریک پاکستان میں یہاں کے اساتذہ اور طلبہ نے بھرپور حصہ لیا تھا لہذا اس تحریک کے کامیاب ہوتے ہی نظر یہ پاکستان سے اختلاف رکھنے والے علی گڑھ سے بدلہ لینے پر توجہ مرکوز ہو گئی۔

اس انتقام کی پہلی شق تو یہ تھی کہ طلبہ اور اساتذہ کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ کم از کم ہندو مخالفین نے حکومت کو یہ یقین دلایا تھا کہ یہاں بہت اسلحہ ہے جو کسی بھی وقت ہندوؤں کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے چنانچہ یہ حکم جاری ہوا کہ تمام اسلحہ تھانے میں جمع کرا دیا جائے۔ طلبہ کے پاس ریوالور تک نہیں تھا لہذا لکھ کر دینا پڑا کہ اسلحہ نام کی کوئی چیز

یہاں نہیں۔ چند اساتذہ کے پاس شکار کے لیے ہندوؤں کے لائسنس تھے۔ ایسی تمام ہندوؤں کو رکھوالی گئیں۔

فسادات کی آگ آہستہ آہستہ پھیلی چلی جا رہی تھی۔ علی گڑھ خطرے میں ہے۔ یہ آوازیں روز بند ہو رہی تھیں۔ یہ باتیں یونی نہیں ہو رہی تھیں بلکہ ہندوؤں کی انتہا پسند جماعتوں نے آس پاس کے دیہات میں حملے شروع کر دیے تھے۔ رات ہوتے ہی کہیں آگ کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دیتے تھے، کسی طرف سے ہیبت ناک چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ صبح ہوتی تو معلوم ہوتا رات کو حملہ کہاں ہوا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ بلوائی کس رات یونیورسٹی کو نشانہ بنا میں۔ طالب علموں کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ تو یہاں تک کہہ رہے تھے کہ قریبی دیہات میں جا کر بے بس مسلمانوں کی ہم مدد کریں گے لیکن اساتذہ انہیں روک رہے تھے۔ ایک مرحلے پر تو یہ سوچا گیا تھا کہ یونیورسٹی کو بند کر دیا جائے لیکن اس کی مخالفت کی گئی۔ اس طرح حملے کا خطرہ اور بھی بڑھ جاتا البتہ یہ طے کیا گیا کہ گشت پارٹیاں بنائی گئیں اور طلبہ سمیت سب کو ہدایت کی گئی کہ راتوں کو جاگ کر پہرا دیا جائے۔ ابو الیٹ نے بھی یہ وحیرہ بنا لیا کہ بیوی بچوں کو لے کر عثمانیہ ہوشل چلا جاتا۔ نگران اعلیٰ کے دفتر میں بچوں کو سلاتا اور دونوں میاں بیوی ہوشل کی جھٹ پر پہرا دیتے۔

عجیب دن تھے عجیب حالات۔ پاکستان بن چکا تھا اور وہ لندن جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ موجودہ حالات میں یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ بیوی بچوں کو ہندوستان چھوڑ کر انگلستان چلا جائے۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ بیوی بچوں کو پاکستان میں چھوڑ کر خود لندن چلا جائے گا۔ غرض جب لندن جانے کا پورا ارادہ ہو گیا تو اس نے آخری مرتبہ ہدایوں جانے کا ارادہ کیا تاکہ باپ کی قبروں پر آخری مرتبہ فاتحہ پڑھ لے۔ فسادات ختم گئے تھے لیکن نفرتیں ابھی تک قائم تھیں۔ ٹرین کا سفر خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ڈبے میں جو ہندو بیٹھے تھے وہ مسلمانوں کو کھلم کھلا کالیاں دے رہے تھے۔ ہر گالی کے بعد کہتے اوسلے (مسلمان) پاکستان بن گیا تو ابھی تک یہاں ہے کیا ہم تجھے وہاں پہنچا دیں۔

ان خطروں سے بڑتا ہوا وہ بریلی گیا اور وہاں سے ہدایوں۔ اپنے باپ کا گھر دیکھا قبروں پر فاتحہ پڑھی اور عزیز و اقارب سے ملنے کے بعد علی گڑھ آ گیا۔

بھئی بچوں کو پاکستان پہنچانا تھا مگر کہاں پہنچایا جائے اور کس کے پاس چھوڑا جائے؟ وہ طالب علمی کے زمانے



میں ایک مرتبہ لاہور آیا تھا۔ وہاں کون ہے۔ اس نے غور کیا تو اپنے ایک شاگرد صابر علی خان کا نام یاد آیا۔ علی گڑھ کے بہت سے احباب کوئٹہ میں تھے۔ اس نے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ پہلے لاہور جایا جائے اور وہاں سے کوئٹہ۔ بیوی بچوں کو کوئٹہ میں چھوڑ کر خود لندن چلا جائے گا۔ اس نے صابر علی خان کو خط لکھ دیا اس خط کا جواب بھی آگیا۔

اس وقت جہاز کی نشستیں ملنا بھی آسان نہیں تھا۔ یہ کام بھی ایک صاحب کے ذریعے آسان ہو گیا۔ رحم علی الہامی جو ایک زمانے میں علی گڑھ کے شعبہ صحافت سے وابستہ رہے تھے۔ ان دنوں دلی میں تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سیکرٹری تھے۔ ان سے رابطہ کیا انہوں نے نشستوں کا انتظام کر دیا۔ جہاز میں کتنا سامان جاسکتا تھا جولا کہتے تھے لائے باقی وہیں چھوڑنا پڑا۔

درد و یار پر حسرت کی نظر کرتے ہیں

خوش رہو ابلی وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

جہاز کا انتظام ہونے کے بعد علی گڑھ سے دلی تک ٹرین سے سفر کرنا تھا۔ یہ سفر اس طرح طے کیا گیا کہ بیوی نے ہندو عورتوں کی طرح ساڑی باندھی۔ ہاتھ پر بندیا لگا لی اور ان سے کہہ دیا گیا کہ راستے بھر کچھ نہ بولیں۔ ایسا نہ ہو کہ بلوائیوں پر ان کے مسلمان ہونے کا راز کھل جائے۔ پانچ بچے ساتھ تھے ان سے بھی کہہ دیا گیا تھا کہ خاموش رہیں۔ بیوی کو زنا نہ ڈبے میں سوار کر کے خود مردانہ میں آگیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ ٹرین چلتے اور دلی تک پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔

خدا خدا کر کے دلی کے خوں میں نہایا ہوا چہرہ دکھایا۔ چاروں طرف پاکستان سے آنے والے شہراریہوں (سکھوں) کے ریلے تھے۔ کرپائیں اور سکھاریہ ہوا میں لہراتے پھر رہے تھے۔ میاں بیوی اور پانچ بچوں کا چھوٹا سا قافلہ ڈراسہا "پالم" کے ہوائی اڈے تک پہنچ گیا جہاں سے ہوائی جہاز کو روانہ ہونا تھا۔ یہاں عجیب نفسا کسی کا عام تھا۔ ہر طرف رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آرہے تھے۔ جانے والے آپس میں گلا مل کر رو رہے تھے۔ جانا نہیں چاہ رہے تھے مگر جا رہے تھے۔ کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ روکنا بھی تو کس امید پر۔ ہر طرف سامان بکھرا پڑا تھا اور تلاشی ہو رہی تھی۔ اس کی باری آئی تو سامان مقررہ وزن سے زیادہ نکلا۔

"ہم زائد محصول ادا کرنے کو تیار ہیں۔"

"نہیں جو سامان زیادہ ہے وہ نہیں چھوڑ دو۔ یہ احسان کیا کم ہے کہ تم کو یہاں سے صحیح سلامت جانے دے رہے ہیں۔"

ایک اور صاحب نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "لاہور چل رہا ہے تم کیا وہاں تماشادیکھنے جا رہے ہو۔"

اسب ان سے یہ بحث کون کرتا کہ ہم اپنے مذہب اور تہذیب کی حفاظت کے لیے پاکستان جا رہے ہیں۔ خون کا دریا پار کر کے جا رہے ہیں۔ جتنا سامان کم کیا جاسکتا تھا کیا۔ حکم ہوا تو ہوائی جہاز میں بیٹھے۔

صابر علی خاں کو خط پہلے ہی لکھ دیا گیا تھا۔ انہیں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ وہ ایک دن کا وقفہ دے کر کوئٹہ کے لیے ٹکٹ خرید کر نشستیں محفوظ کر لیں۔

جہاز لاہور کے ہوائی اڈے پر اترا۔ صابر علی خاں استقبال کے لیے موجود تھے۔

یہاں کا حال بھی دلی سے مختلف نہ دیکھا۔ یہ سوچتے بغیر کہ لٹے پٹے قافلے کس مشکل سے جان بچا کر یہاں تک پہنچے ہیں ان کے ساتھ ہنگ آمیز سلوک ہو رہا تھا۔ کشم ہال میں اسے سامان کھولنے کو کہا گیا۔ آدھا سامان پہلے ہی "پالم دلی" کے ہوائی اڈے پر چھوڑ آیا تھا۔ اب بچا ہی کیا تھا۔ اس میں بھی انہیں ایک برائریڈیو نظر آگیا۔

"اس پر ڈیوٹی لگے گی۔"

"کس قانون کے مطابق۔"

"ہم سے زیادہ قانون جانتے ہو۔"

"میں علی گڑھ یونیورسٹی کا پروفیسر ہوں۔"

"پھر بھی ہم رعایت نہیں دے سکتے۔ ڈیوٹی تو آپ کو دینا ہی ہوگی۔"

"یہ ریڈیو میرے ذاتی استعمال کا ہے اور دس سال پرانا ہے۔"

"ہم نے آپ سے اس کی عمر نہیں پوچھی۔ پرانا ہے اسی لیے تو کم ڈیوٹی مانگ رہے ہیں۔"

اس نے سمجھ لیا تھا کہ بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ڈیوٹی ادا کر سکتا تھا لیکن غصہ اتنا تھا کہ ریڈیو وہیں چٹا اور بقیہ سامان وہیں چھوڑ کر کھل آیا۔

اس نے لاہور پہنچے ہی شکر ادا کیا تھا کہ جان بچ گئی ایک نظریاتی ملکٹ میں آگیا۔ ہمارے ساتھ مہمانوں کی طرح سلوک کیا جائے گا لیکن مہمان کی شکلوں کو اس کے



تصورات کو سخت دھچکا لگا تھا۔

وہ رات اس نے اور غفلت کا لُج کے ہوش میں گزاری۔ اس وقت اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ دنیا کوئی ہے اسے محسوس پھر کر نہیں آتا پڑے گا اور اسی کا لُج میں خدمات انجام دینی ہوں گی۔

علی گڑھ والوں نے کوئٹہ میں بھی اپنی ایک برادری بنا رکھی تھی اس میں مقامی اور مہاجر دونوں تھے۔ پرانے لوگوں میں امتیاز احمد خاں تھے جو اس وقت وہاں ڈائریکٹر تعلیمات تھے۔ دوستوں میں صاحب محمد خاں تھے جو ڈپٹی اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ کچھ اور شناسا اور نیاز مند تھے خصوصاً محکمہ زراعت میں بہت سے لوگ تھے۔

صاحب علی خاں کا تھا ضا تھا کہ دو چار روز ٹھہر جائوں مگر اسے کوئٹہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ کیونکہ اسے لندن کا سفر کرنا تھا اور اس سے پہلے وہ چاہتا تھا کہ بیوی بچوں کے لیے کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لے۔

ایک دن کا وقت دینے کے بعد وہ کوئٹہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہاں کا ماحول یہاں کے لباس چہرے سب اجنبی تھے۔ آنکھیں ایسے چہرے دیکھنے کی عادی نہیں تھیں لیکن اس اجنبیت کے باوجود ایک قلبی سکون محسوس ہو رہا تھا۔ نہ جان کا خوف تھا نہ عزت و ناموس کا۔ سب اپنے تھے۔ سب مسلمان تھے۔ زبان مختلف تھی لیکن دین ایک تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے ہر دکھ بھول کر یہ خوشی طاری ہونے لگی کہ ہم پاکستان میں ہیں ایک نظریاتی مملکت میں ہیں۔ آزاد ملک میں ہیں۔

ریگٹانوں کا ایک وسیع سلسلہ پار کرنے کے بعد کوئٹہ کا اسٹیشن آیا۔ اسٹیشن پر احباب کی ایک جماعت موجود تھی۔ ان ہی احباب کی مدد سے وہ اپنے گھر کے لیے مختصر سادہ کمروں کا مکان مل گیا۔ امتیاز صاحب کی مدد سے بچیوں کا اسکول میں داخلہ بھی ہو گیا انہوں نے اور ان کی حکیم نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ اس کے چلے جانے کے بعد اس کی بیوی اور بچوں کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔

اس موقع پر اس کا لندن جانا بہت بڑا امتحان تھا کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار بیٹھتا۔ یہ بدا یوں یا علی گڑھ نہیں تھا۔ ایک اجنبی شہر میں محض دوستوں کے سہارے بچوں کو چھوڑ کر دیار غیر میں جانا اور وہ بھی کمانے کے لیے نہیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہمت ہی کی تو بات تھی۔ بیوی کی تابعداری کو دوا دینے کی ضرورت ہے۔ اس نے بھی طعنہ نہیں دیا کہ ہمیں

کس کے سہارے چھوڑ کر لندن جاتے ہو۔ ہمیں رہ کر ہاتھ پاؤں مارو۔ پہاڑوں سے چٹھے نکالو اور ہمارے عیش کا سامان فراہم کرو۔ اس کی خوش دامن، ان کی بڑی بیٹی ایک چھوٹا بچہ اور اس کے دو سالے یہ سب لوگ بھی اس کے سہارے کوئٹہ آ گئے۔ ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں۔ وہ جون میں یہاں پہنچا تھا اور ستمبر کے آخر تک ہر صورت میں لندن پہنچ جانا تھا۔ بڑی جدوجہد کے بعد انٹر لائسنز کے جہاز برکیشیا میں جگہ مل گئی۔

اس بحری جہاز کو پکڑنے کے لیے کوئٹہ سے کراچی جانا تھا۔

معلوم ہوا اور پائے سندھ میں سیلاب آیا ہوا ہے جس نے کوئٹہ کراچی ریلوے لائن اور سڑک کاٹ دی ہے۔ ہوائی سروس شروع نہیں ہوئی تھی۔ سفر ایسا تھا کہ ملتوی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر بروقت کراچی نہ پہنچتا تو جہاز نکل جاتا اور لندن میں داغی کا وقت گزر جاتا۔ مطلب اس کا یہ ہوتا کہ ایک سال ضائع ہو جاتا۔ علی گڑھ واپس کیا جاتا۔ یہاں بھی کسی نوکری کا امکان نہیں تھا۔ غرض اسنے مسائل تھے کہ جن سے بے یک وقت نہیں نمٹا جاسکتا تھا۔ وہ اللہ کا نام لے کر کوئٹہ سے روانہ ہو گیا۔ ٹرین نے اسے شکار پور اتار دیا۔ آگے راستہ بند تھا۔ فوج امدادی کاموں میں مصروف تھی۔ اس نے ایک فوجی افسر سے ملاقات کی۔ اپنا تعارف کرایا اور سفر کے متعدد سے آگاہ کیا۔ اس پر واضح کر دیا کہ اس کا کراچی جانا کتنا ضروری ہے۔ افسر نے اس کی مجبوری کو سمجھ لیا اور اس کی مدد کا وعدہ کیا۔

”آپ رات یہاں گزار لیں۔ صبح کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ آپ کو کسی نہ کسی طرح سکھر پہنچا دیں گے۔ سکھر سے آگے لائن صاف ہے۔ آپ کو کراچی جانے والی کوئی نہ کوئی ٹرین مل جائے گی۔“

صبح ہوتے ہی وہ افسر جیب لے کر آ گیا۔ دو روٹریک سڑک بند گئی تھی۔ جہاں تک جیب چل سکتی تھی چلی۔ پھر کچھ سفر کشتیوں میں کچھ پیدل طے کیا۔ مختصر سے راستے نے دن بھر کھا لیا۔ شام پانچ بجے کے قریب سکھر پہنچا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ٹرین صبح روانہ ہوگی۔ وہ ڈینگ روم میں بیٹھا تھا کہ اسے اپنے ایک دوست سراج الحق قریشی کا خیال آیا۔ انہوں نے بھی کہا تھا کہ ان کے ایک عزیز ریلوے میں ٹی ٹی آئی ہیں اور سکھر میں ہیں۔ اس نے اسٹیشن سے ان کا پتہ لیا اور ان کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے قریشی صاحب کا نام لیا اور



ہندوستانی زبانوں کی تدریس کا کام انجام دے رہے تھے۔  
گجراتی زبان سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔  
انگریز ماسٹر سے ان کی تفصیلی ملاقات ہوئی۔  
”آپ کو جرمن یا فرانسیسی زبان آتی ہے؟“ مسٹر  
ماسٹر نے پوچھا۔

”میں نے جب علی گڑھ میں سال اول میں داخلہ لیا  
تھا اس وقت جرمن زبان کا ایک اضافی کورس کیا تھا۔ اب تو  
دس میں جملے ہی یاد رہ گئے ہوں گے۔“  
”یہ تو ناکافی ہوں گے۔ آپ جرمن یا فرانسیسی میں  
سے کسی ایک زبان میں مہارت حاصل کریں اس کے بعد  
لسانیات پر کام شروع ہوگا۔“

”میں بیوی بچوں کو چھوڑ کر آیا ہوں۔ ہندوستان  
پاکستان کے سیاسی خلفشار سے بھی آپ واقف ہیں میں تو  
جلد سے جلد کام ختم کر کے واپس جانا چاہتا ہوں۔ اگر زبان  
سیکھنے میں دو تین دن بھی ضائع ہو گئے تو مجھے بڑی پریشانی ہو  
گی۔“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔“ مسٹر ماسٹر اٹھ کر  
کھڑے ہو گئے۔ ”اب ہماری ملاقات تین مہینے بعد ہوگی۔  
اس عرصے میں اپنی فرانسیسی ٹھیک کر لیتا۔“  
اس نے فرانسیسی زبان ٹھیک کی اور تین مہینے بعد  
لسانیات پر کام شروع ہوا۔

لندن اسکول کی مصروفیات سے جو وقت بچا جاتا وہ  
برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی لائبریری میں گزارتا تھا۔  
یہاں بھی اس نے اپنا فضل جاری رکھا۔ برٹش میوزیم کے  
بالکل سامنے پرانی کتابوں کی دکان تھی۔ اس مکان پر برٹش  
میوزیم کے بعض خطوط بھی دستیاب تھے۔ فرسٹ کافائدہ  
اٹھا کر اس نے کچھ خطوط پر مضامین لکھے جو بعد میں  
اورینٹل کالج میگزین میں شائع بھی ہوئے۔

☆.....☆

شمالی ہند میں آریائی زبانوں کے ارتقا کے موضوع پر  
کام کرنے کے بعد وہ مقررہ وقت پر لندن سے کوئٹہ واپس  
آ گیا۔ کام ختم کرنے کے بعد اس نے سوچا تھا کہ وہ یہاں  
تین ماہ مزید قیام کرے گا لیکن اہلیہ کی شدید بیماری کا خط  
موصول ہوا تو وہ پریشان ہو گیا۔ چند دن ہالینڈ میں اور چند  
دن مصر میں گزارنے کے بعد وہ کوئٹہ پہنچ گیا۔ بیوی کی صحت  
دیکھ کر مزید پریشان ہو گیا۔ بلوچستان کی شدید آب و ہوا نے  
ان کی صحت کو بگڑا دیا تھا۔ بہت کزور ہو گئی تھیں۔ یہ

اپنا تعارف کرایا۔ ان صاحب کا نام یاسین تھا۔ مل کر بہت  
خوش ہوئے اور مردانے میں اس کا بستر لگا دیا۔ وہ اتنا تھکا  
ہوا تھا کہ یاسین صاحب سے زیادہ دیر باتیں بھی نہ کر سکا اور  
سونے کے لیے لیٹ گیا۔ نماز فجر کے بعد کا کوئی وقت ہوگا  
کہ یاسین صاحب گھبرائے ہوئے آئے۔

”لیٹ صاحب بہت بری خبر ہے قائد اعظم کا انتقال  
ہو گیا۔“

یہ سننا تھا کہ ایک لمحے کے لیے دماغ ماؤف ہو گیا۔  
دونوں خاموش بیٹھے تھے جیسے اب کہنے کو کچھ بھی نہ رہا ہو۔  
”لیٹ صاحب! اب اس فوجائیدہ مملکت کا کیا ہے  
کا۔“

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ ابھی تو پاکستان اپنے  
پروں پر بھی کھڑا نہیں ہو سکا ہے۔ ابھی تو اس عظیم قیادت کی  
ضرورت تھی۔ قائد اعظم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میری  
جیب میں کھوٹے سیکے ہیں۔ یہ کھوٹے سیکے کتنے دن اس  
مملکت کو چلائیں گے۔ خیر اللہ مالک ہے۔ جس اللہ نے اس  
ملک کو بنایا ہے وہی اسے چلائے گا۔ اے اللہ تو میرے ملک  
کی مدد کرنا۔“

دونوں اس خلا کے پیدا ہو جانے کے بعد کے حالات  
پر غمگین کرتے رہے۔

یاسین صاحب نے اسے کراچی جانے والی ٹرین میں  
سوار کرا دیا۔ ٹرین میں بھی نفاسو گوار تھی۔ ہر شخص کی زبان  
پر یہی باتیں تھیں وہ کراچی اسٹیشن پر اترا تو ہو کا عالم تھا نہ قلی نہ  
مزدور نہ رکشا نہ دکنو رہ۔ خوش قسمتی سے ٹرین میں ایک  
صاحب سے دوستی ہو گئی جو ریلوے ملازم تھے۔ اس نے  
اپنا سامان ان کے یہاں چھوڑا اور پیدل اسی طرف چل پڑا  
جدھر ہر شخص قائد اعظم کے آخری دیدار کے لیے جا رہا تھا۔  
اگلے دن وہ جہاز پر سوار ہوئے تاکہ لیے بندرگاہ پہنچ  
سکیں۔

☆.....☆

داغیے کا انتظام پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب وہ لندن میں  
تھا۔ اب اسے لسانیات پر کام کرنے کے لیے موضوع کا  
تعیین کرنا تھا۔ اس نے شمالی ہند میں ”ہند آریائی زبانوں کا  
ارتقا“ کا موضوع یونیورسٹی کے سامنے پیش کیا۔

انہیں مسٹر ماسٹر کے ساتھ مل کر کام کرنا تھا۔ یہ  
صاحب دراصل انڈین سول سروس کے جینشن یا نڈ افسر تھے  
اور اس زمانے میں جڑ وئی طور پر لندن یونیورسٹی میں



کمزوری ہی ان کی بیماری تھی۔ ضروری تھا کہ ان کی آب و ہوا تبدیل ہو۔ اب سوال یہ تھا کہ کہاں جائے۔ وہ علی گڑھ سے تعلیمی رخصت پر لندن گیا تھا۔ چاہتا تو علی گڑھ واپس جاسکتا تھا۔ رشید احمد صدیقی ریٹائر ہونے والے تھے۔ ان کے بعد دوسرا نمبر اس کا تھا۔ یہ کچکا بھی نہیں تھا کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل تاریک ہے۔ تعلیم و تدریس کہیں اور رہتی نہ رہتی علی گڑھ میں ضرور رہتی۔ اس کے ذاتی مستقبل کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا ہندوستان میں اس کی نسلوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ انگریزوں کی غلامی سے تو آزادی مل گئی مگر اب کیا ہندوؤں کی غلامی میں رہتا ہوگا۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ یہاں کی قومی زبان اردو ہوگی۔ یہاں اردو کے اساتذہ کی ضرورت بھی ہوگی اور مچھائش بھی، کام کرتے ہوئے یہ احساس بھی ہوگا کہ ہم اپنے وطن کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے پاکستان میں رہ جائے۔ علی گڑھ چھوڑ دے۔ وہ سر عبدالقادر سے مشورہ کرنے کے لیے لاہور گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہیں اور ملاقاتیوں پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ وہ ملاقات کے لیے گیا تو بڑی شفقت سے اندر بلوا لیا۔ مشورہ بلکہ حکم دیا کہ ہندوستان جانے کی کوئی ضرورت نہیں یہیں رہ جاؤ۔ اس وقت کام کرنے والوں کی ضرورت ہے اور تم کام کے آدمی ہو یہاں ایسے لوگوں کی بہت ضرورت ہوگی جو اردو کے لیے کام کریں۔

وہ مولانا صلاح الدین (ادبی دنیا والے) سے بھی ملا۔ وہ اردو کے مشاقتی زار میں سے ایک تھے۔ انہوں نے بھی سر عبدالقادر کے مشورے کی تائید کی اور مجبور کیا کہ وہ یہیں رہ جائے۔

اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان دنوں ڈاکٹر ذاکر حسین خان علی گڑھ میں وائس چانسلر ہیں۔ ذاکر حسین خاں سے اس کے تعلقات اچھے نہیں رہے تھے۔ اس لیے اس نے مناسب نہ سمجھا کہ ان کی موجودگی میں وہ علی گڑھ چلا جائے۔ ان سب باتوں کی موجودگی میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان میں رہ جائے گا اور اپنی روزی یہیں تلاش کرے گا۔

انہی دنوں ایک اسامی مشہور ہوئی جس کے جواب میں اسے پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں سینئر لیکچرر کی حیثیت سے وابستہ کر لیا گیا۔

کالج کا شعبہ اردو اس وقت صرف کانڈی شعبہ تھا اور

فارسی شعبے میں ملا ہوا تھا۔ اردو پڑھانے والے مستقل اساتذہ میں صرف طاہر قادر تھے۔ سید عبداللہ شعبہ فارسی میں استاد تھے اور اردو بھی پڑھاتے تھے۔ باقی اساتذہ کالج سے باہر کے تھے اور جزوقتی یا اعزازی طور پر آتے تھے۔ ابواللیث کے بعد ڈاکٹر عبارت بدیلوی، سید وقار عظیم اور شرف انصاری بھی آگئے اور یوں چہار درویش اس کالج میں جمع ہو گئے۔

یہ سکون ملنے کے بعد اس نے ماڈل ٹاؤن میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کرایا اور بیوی بچوں کو کوئٹہ سے لاہور لے آیا۔ ”لکھنؤ کا دبستان شاعری“ کے بعد اس کالج میں رہتے ہوئے اس کی دو اہم تصنیفات سامنے آئیں۔ ”جرات ان کا عہد اور شاعری“ اور ”نظیر اکبر آبادی، ان کا عہد اور شاعری“۔

اس کے دل میں اور نہ جانے کیا کیا ارمان تھے جو وہ تصنیفی دنیا میں رہ کر نکالنا چاہتا تھا کہ بعض احباب نے اسے پیشہ وارانہ سیاست میں تھپیٹ لیا۔ جہاں اس سے محبت کرنے والے موجود تھے وہیں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن سے اس کی معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ جن لوگوں سے معرکہ آرائی ہوئی ان میں سرنہرست ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر وحید قریشی تھے۔ وہ بھی دہنے والا کہاں تھا۔ خوب خوب جھڑپیں ہوئیں۔ پے در پے ایسے واقعات ہوئے کہ وہ کبیدہ خاطر رہنے لگا۔

یہ جنگ اس وقت طول پکڑ گئی جب پنجاب یونیورسٹی میں ایک پروفیسر کی تقرری کا مسئلہ تھا۔ امید وارد تھی ایک سید عبداللہ اور دوسرا وہ خود یعنی ابواللیث صدیقی۔ اس اسامی کے لیے وہ خود کو جائز حق دار تصور کرتا تھا۔ اسے امید تھی کہ تقرری اسی کی ہوگی لیکن تقرری سید عبداللہ کی ہو گئی۔ اسی دوران میں ڈاکٹر وحید قریشی کے نام سے ”لکھنؤ کا دبستان شاعری“ پر ایک طویل تنقیدی مضمون بہمنی کے ایک رسالے میں شائع ہوا اور اس کے نسخے پاکستان میں تقسیم کیے گئے۔

ابواللیث کو یہ گمان تھا کہ یہ تنقیدی مضمون سید عبداللہ نے تحریر کیا ہوگا اور وحید قریشی کے نام سے شائع کرایا گیا یا کم از کم ان مضمون کی تیاری میں سید عبداللہ نے مدد کی۔

وہ ان سب باتوں کو ذاتی لڑائی سمجھ کر بھلا بھی سکتا تھا لیکن بعض باتیں انہیں جنہیں وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے تمام عمر اردو کی توسیع و ترقی کے لیے کڑی محنت



لیکن اب اس کی ناند رنی کے جلوے سامنے آرہے تھے وہ ایسے ناندروں کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مشرقی علوم کے سخت مخالف تھے۔ نئی محفلوں میں اکثر کہتے سنائی دیتے تھے۔ ”یہ علوم سرپیچکے ہیں۔ ان کو دفن کر دیجیے۔“

ان کے حاشیہ کشیں ان سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انہیں خوش کرنے کے لیے اور نیشنل کالج اور اس کے اساتذہ کو تشکیک و تذلیل کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ انہی دنوں اس نے ایک مضمون ایک تقریب میں پڑھا۔ یہ مضمون غزل کے موجودہ رجحانات سے بحث کرتا تھا۔ اس مضمون میں ضحیٰ نسیم ہند، خدادات، ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کی قربانیاں اور قیام پاکستان کے بعد کی صورت حال کو بیان کیا گیا تھا۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ ان حالات کی روشنی میں غزل کے موجودہ رجحانات پر بحث کرنا چاہیے۔

اس نے تو صرف حقیقت کی ترجمانی کی تھی۔

”آج بھی قافلے پہلے کی طرح بھٹکتے ہیں۔ آج بھی راہی حیران ہیں۔ افلاس، بھوک، بیماری اور جہالت کے طوق ایک آواز ملک کے آواز فرزندوں کی گردنیں اپنے بوجھ سے جھکا رہے ہیں۔ عدل و انصاف کے الفاظ آج بھی شرمندہ معنی نہیں۔ تقیاً یہ وہ منزل نہیں جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔ وہ منزل ابھی دور ہے۔ یہ وہ صبح نہیں جس کا انتظار تھا۔ وہ صبح ابھی دور ہے لیکن اُفق کی چار بجی میں دور سے کچھ کرنیں پھوٹی نظر آتی ہیں اور قافلہ اسی طرح رواں دواں ہے۔“

اس نے حقائق کی ترجمانی کی تھی لیکن مایوسی کا اظہار نہیں تھا۔ اسے انداز ہے میں کرنیں پھوٹی نظر آ رہی تھیں لیکن اسے اس کی دھن مٹنی سمجھ لیا گیا یا جان بوجھ کر اس کے خلاف محاذ بنانے والوں نے یہ موقع تلاش کر لیا۔ اتنی سخت مخالفت ہوئی کہ اس کا جی اچانک بھول گیا۔

کراچی یونیورسٹی میں ریڈر کی اسامی مشعیر ہوئی تھی۔ اس اسامی کے لیے دو امیدوار تھے ایک ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اور دوسرے ابواللیث۔ انٹرویو ہوا اور ابواللیث کی تقرری عمل میں آئی۔ یونیورسٹی اس زمانے میں ملک کا دارہ میں تھی۔

اس نے لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں رہنے کا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ ایک موٹر سائیکل خرید لی تھی جس سے وہ یونیورسٹی آتا جاتا تھا۔ ارادہ یہی تھا کہ اب وہ مستقل قیام لاہور میں کرے گا لیکن حالات ایسے ہو گئے کہ کراچی جانا پڑا۔ گھریا

چھوڑ کر کراچی جانا آسان نہیں تھا۔ اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد ایک ٹھکانا ملا تھا۔ اس کی بیوی کو تو لاہور سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ لاہور چھوڑنے کو تیار نہیں تھیں۔ کراچی میں قدم جماتے جماتے دیر لگ سکتی تھی۔ اس نے بیوی بچوں کو لاہور میں چھوڑا اور اکیلا کراچی آ گیا۔ انسان جب ہمت کر لیتا ہے تو خدا بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ علی گڑھ کے ایک رفیق کار سے ملاقات ہو گئی۔ کچھ دن ان کے ساتھ رہا۔ کراچی کی سڑکوں پر ہی اس کی ملاقات امین انشا سے ہو گئی اور وہ ان کے کوارٹر میں منتقل ہو گیا۔ بعد میں وہ پاپوش نگر کے ایک مکان میں رہنے لگا۔

اس وقت شعبہ اردو میں کوئی مستقل استاد نہیں تھا۔ شعبہ اردو کا وجود صرف انتظامی تھا۔ ابواللیث کے آنے کے بعد شعبہ قائم ہوا اور مستقل اساتذہ کا تقرر ہوا۔

وہ جہاں جاتا تھا نئے دوست بنالیتا تھا۔ طبیعت میں نیاز مند کی بھی لہذا بزرگ بھی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ مولوی عبدالحق سے قربت نصیب ہوئی۔ پھر حسام الدین راشدی سے تعارف ہوا اور پھر قربت بڑھتی چلی گئی۔ ڈاکٹر عباد الرحمن خان تو یونیورسٹی ہی میں تھے۔ ڈاکٹر عباد الرحمن خان علی گڑھ میں تھے۔ جس وقت ابواللیث طالب علم تھا وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں شعبہ جغرافیہ کے پروفیسر اور صدر تھے۔ علی گڑھ سے آنے کے بعد یہ پہلی ملاقات تھی جو ہو رہی تھی۔ دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ڈاکٹر بشیر احمد شاہی وائس چانسلر تھے۔ یہ بھی علی گڑھ کی برادری سے تھے۔ کچھ دنوں تک تو ابواللیث کو یہی معلوم ہوتا رہا کہ وہ علی گڑھ میں ہے۔ اس نے یونیورسٹی کی بہتری کے لیے وائس چانسلر کو ایک تجویز پیش کی۔ ”ہم دورانِ تعلیم اپنے بہترین طلبہ کا انتخاب کریں اور ان کو اپنے شعبوں میں پوری توجہ سے تربیت دیں۔“

”آپ کی یہ تجویز اچھی ہے لیکن اس کے لیے ہمیں اسٹاف کی کمی کا سامنا ہوگا۔“

”اس کے لیے مددگار پروفیسر مقرر کیے جاسکتے ہیں۔“

انہوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور مختلف شعبوں میں اس طرح کے زیر تربیت مددگار مقرر ہو گئے۔ اس کی درخواست پر انہوں نے شعبہ اردو کے لیے فرمان فتح پوری کو مقرر کر دیا۔

یہ منصوبہ جس تک پہنچا تھا کہ اسے خوبارک کی کولہیا



## چند اہم قومی کام

- 1- حکومت پنجاب کی طرف سے 1952ء میں اسکرپٹ کمیٹی کے کنویز مقرر کیے گئے۔ اردو اسکرپٹس ریسرچ بورڈ اور قاف وغیرہ پر ایک رپورٹ تیار کی اور سرکاری خریدوں میں شامل کرنے کے لیے اپنی سفارشات پیش کیں۔
- 2- 1976ء میں ترقی اردو بورڈ کے معتمد اور پھر لغت کے مدیر اعلیٰ بنے۔ لغت کی چھ جلدیں شائع کیں۔
- 3- اردو نائپ رائٹرز کا گلیڈی تحفہ (کی بورڈ) تیار کیا۔
- 4- ترقی اردو بورڈ کے لیے ایک ایسا کی بورڈ تیار کیا جو سندھی اور پشتو میں بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔
- 5- مرکزی اردو بورڈ لاہور کے لیے اردو کے بنیادی الفاظ پر مبنی ایک لغت تیار کی جس کے تراجم سندھی، پنجابی، فارسی اور ترکی میں شائع ہوئے۔
- 6- مرکزی اردو بورڈ کے ایک منصوبے کے لیے اردو کے نمایاں رسائل کا ابتداء سے 1960ء تک کے عرصے کا اشاریہ تیار کیا۔
- 7- سائنسی ادب کی کتب کا اشاریہ تیار کیا۔
- 8- اردو قواعد کا حصہ "صرف" تحریر کیا۔
- 9- علامہ اقبال کی صد سالہ جوبلی کے لیے نکسی مئی تمام کتب پر نظر ثانی کی اور ترتیب کی خاص کمیٹی کے رکن بھی رہے۔
- 10- پنجاب یونیورسٹی کے منصوبے کے مطابق ہندو پاک کے مسلمانوں کی ادبی تاریخ تحریر کرنے کے لیے جو پلاننگ کمیٹی قائم کی گئی اس کے ممبر رہے۔
- 11- کراچی یونیورسٹی کی جانب سے فرسٹ بیچنگ کانفرنس لاہور کے لیے سرکاری نمائندہ مقرر ہوئے۔

یونیورسٹی سے پیشکش آئی اور وہ مطالعہ پاکستان کے وزٹنگ پروفیسر کے طور پر امریکا چلا گیا۔ اس سفر میں وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے کر نہیں بھولا۔ اس لیے نہیں کہ وہ امریکا میں تنہائی محسوس کرتا بلکہ اس لیے کہ اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ بیوی بچوں کو اب تک سکون کا ایک لمحہ بھی فراہم نہیں کر سکا ہے۔ وہ امریکا پہنچا تو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ان سے مشورہ کیا کہ رہائش کہاں اختیار کی جائے۔ ان کا قیام "بٹلر ہال" میں تھا جو کولمبیا یونیورسٹی میں اکثر ویشٹر مہمان پروفیسروں اور ان کے اہل خانہ ان کے لیے مخصوص تھا۔ انہوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ بھی بٹلر ہال میں قیام کرے حالانکہ اس سے صرف چند گھنٹے آگے چلے اس سے بہت کم خرچ میں بھی انتظام ہو سکتا تھا۔ اس غیر فکری میں کسی شناسا مسائے کی موجودگی نعمت سے کم نہیں تھی۔ ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اشتیاق حسین قریشی وہاں کے گلی کوچوں سے واقف تھے۔ سستی دکانوں کے پتے جانتے تھے۔ اس کا فائدہ ابوالیث کو تو کم اس کی بیوی کو زیادہ ہوا۔ وہ ان کے ساتھ خریداری کے لیے نکل جاتی۔ حتیٰ کہ نئے دو

اہلکاروں میں انہوں نے خود خریداری شروع کر دی۔ اشتیاق حسین قریشی کا اکثر وقت کام کے اوقات کے بعد اس کے اور اس کے بچوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ ایک عظیم مورخ ایک عظیم اردو داں بٹلر ہال کی تو جیسے تقدیر ہی بدل گئی۔ ابوالیث تو جہاں جاتا تھا اپنے مطلب کے لوگ ڈھونڈ نکالتے تھے۔ اس نے بہت سے احباب بنا لیے۔ کھانے کا وہ شوقین بھی تھا اور کھانا خوش بھی ہوتا تھا۔ تھوڑے ہی دن میں اس کا گھر پاکستانیوں کا کلب بن گیا۔ جب بھی کوئی اچھی چیز پکیتی تو احباب کو مدعو کیا جاتا۔ ان میں پاکستانی بھی ہوتے اور علی گڑھ برادری کے لوگ بھی۔ کولمبیا پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد اس کا لسانیات کا شوق پھر عود کر آیا۔ یہاں وقت بھی تھا اور مواقع بھی۔ اس نے طالب علم کی حیثیت سے باقاعدہ داخلے کر تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ لسانیات میں مشینوں کے استعمال سے وہ سب سے واقف ہوا اور واپس آ کر جامہ کراچی میں لسانیات کی ایک تجربہ گاہ قائم کی جو پاکستان کی واحد تجربہ گاہ تھی۔ یہ دن اس کے آئینہ دل دن تھے۔ وہ بیک یونیورسٹی چلا



- 12۔ لینگو سٹاک ریسرچ گروپ آف پاکستان کے تاحیات ممبر مقرر ہوئے۔
- 13۔ کولمبیا یونیورسٹی میں 59ء تا 60ء وزٹنگ پروفیسر رہے۔
- 14۔ سیٹو (بنکاک) میں ماہر لسانیات کی حیثیت سے 61ء تا 63ء کام کیا۔
- 15۔ 1965ء میں مغربی جرمنی، ترکی، لبنان اور سعودی عرب کا مطالعاتی دورہ کیا۔
- 16۔ 1968ء میں فیڈریشن آف کامن ویلتھ لندن یونیورسٹی کی جانب سے سینئر فیلوشپ ملی اور لندن آکسفورڈ، کیمبرج اور اسکاٹ لینڈ کی جامعات کے لیکچرر پروگراموں میں شریک ہوئے۔
- 17۔ سعودی عرب کے لیے ثقافتی اور تعلیمی وفد کے رکن مقرر ہوئے۔
- 18۔ 70ء میں امریکن یونیورسٹی آف بیروت (لبنان) میں اعلیٰ تعلیم کے سینار میں شرکت کے لیے پاکستانی وفد کے فیڈر مقرر ہوئے۔
- 19۔ برکے یونیورسٹی کی امریکن اسکالرشپ لین نے ان کی رہنمائی میں اردو زبان میں قانون بیداری کے موضوع پر تحقیقی کام کیا۔
- 20۔ برطانوی کونسل کی درخواست پر باہر سے آنے والوں کے لیے ایک خاص مختصر البیاداردونصاب تکمیل دیا۔
- 21۔ باہر سے آنے والوں کی تعلیم کے لیے جامعہ کراچی میں اردو کا خاص سہی و بصری نصاب مرتب کیا اور چینی، جاپانی، فرانسیسی اور امریکی دانشوروں کو تعلیم دی۔
- 22۔ مختلف سیمیناروں اور صد سال تقریبات میں سرکاری نمائندے کے طور پر شرکت کی۔

☆☆☆

تعلیمی پجڑی اور ناظم آباد پہنچ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ یونیورسٹی ٹانگ واڑہ سے نئی عمارت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ یہ عمارت کسی ہوگی کہاں ہے، چل کر اسے دیکھنا تو چاہیے مگر کس کے ساتھ جاؤں۔ خیر کل سچ دیکھا جائے گا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے مہجر آفتاب حسن کی آواز آرہی تھی۔ ”مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کراچی پہنچ گئے ہیں۔“

”اللہ نے خیریت سے پہنچا دیا۔“

”آپ کو شاید معلوم ہو گیا ہو کہ یونیورسٹی نئی عمارت میں تبدیل ہو گئی ہے۔“

”مجھے نہ صرف معلوم ہو گیا ہے بلکہ وہاں جانے کے لیے بے چین بھی ہوں۔“

”پھر کیا خیال ہے کل چلیں۔“

”بھئی جانا تو ہے جو ٹانگ تو دینی ہے۔“

”تو پھر اسٹپے ہی چلیں گے۔ تین ہفتی سے ایک بس یونیورسٹی تک جاتی ہے۔ آپ وہاں آجائیں میں آپ کو وہاں لے جاؤں گا۔ وہ وہاں کے مطابق تین ہفتی پہنچ گیا۔ بس نے چلتا سڑک کیا تو راستہ نہیں جنگل تھا جس میں بس چل رہی تھی۔ وہ مہجر صاحب سے یہ بھی نہیں پوچھ سکا کہ وہ

جاتا۔ سہ پہر کو نیویارک کی سیر ہوئی۔ رات کو اکثر و بیشتر لسانیات کی تجربہ گاہ میں کام کرنے چلا جاتا۔ اس وقت بھی اہلہ اس کے ساتھ ہوتیں۔ دیر گئے وہ ابھی ہوتی۔

اس طرح دن گزر رہے تھے۔ کولمبیا کی زندگی خاصی پرکشش تھی۔ تفریح کے مواقع بھی میسر تھے اور مطالعے اور مشاہدے کے بھی۔ ڈاکٹر قریشی کی قربت بھی نصیب تھی۔ اس کے باوجود طبیعت اکثر ادا اس ہو جاتی تھی۔ ایک سال ہی گزرا تھا کہ پاکستان بہت شہرت سے یاد آنے لگا۔ قریشی صاحب کا بھی یہی حال تھا۔ دن گئے جانے لگے کہ تعلیمی سال ختم ہوا اور وہ پاکستان جائیں۔

تعلیمی سال کے خاتمے پر دونوں نے واپسی کا پروگرام بنایا۔ قریشی نے ہوائی جہاز سے جانا پسند کیا جب کہ بچوں کے اصرار پر ابو الیٹ نے بحری سفر کا پروگرام بنایا اور نیویارک سے کوئن میری میں اپنی نشستیں محفوظ کرائیں۔

واپسی میں ایک ہفتہ لندن میں قیام کیا۔ اس کے لیے لندن گیا نہیں تھا لیکن اس کی اہلیہ اور بچوں کے لیے یہ بالکل نئی دنیا تھی۔ ایک مرحلہ پھر پارک میوزیم کتب خانے دیکھے۔ لندن سے کراچی کے لیے روانہ ہوا۔ اس کی ایک بیٹی ناظم آباد میں مقیم تھی۔ اسے فی الحال وہیں قیام کرنا تھا۔ اس نے



اسے کہاں لے جا رہے ہیں کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ وہ یونیورسٹی جا رہا ہے۔“

یونیورسٹی پہنچ کر وہ مزید حیران ہوا۔ کچھ عمارتیں بن رہی تھیں کچھ بن چکی تھیں۔ بجلی نہیں تھی، پانی کے نلکے نہیں تھے۔ سڑکیں اور دکانیں نہیں تھیں۔ بیمار پڑ جائے تو ہسپتال اور ڈاکٹر نہیں۔ باہر نکلے تو کیپس سے نیوٹاؤن تک ویرانا ہی دیرانا۔ یہ بشیر احمد ہاشمی ہی تھے جو یونیورسٹی کو اس نئے کیپس میں اٹھالائے تھے۔ وہ پریشان ہو رہا تھا کہ روزانہ یونیورسٹی آنا جانا کتنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ اس ویرانے کو آنکھوں میں بسائے ہاشمی صاحب سے ملنے پہنچ گیا۔ وہ اس عمارت میں مقیم تھے جو یونیورسٹی کے مہمان خانے کی نیت سے بنی تھی۔ اس لحاظ سے وہ کیپس کے تباہ کن تھے۔ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

”میں تمہاری کمی بہت محسوس کر رہا تھا۔ اچھا ہوا جلدی چلے آئے۔ دو چار دن آرام کر کے جوائن کر لینا۔“

”آرام کیا کرنا۔ میں تو آج ہی جوائن کرنے کو تیار ہوں۔“

”قیام کہاں رکھا ہے۔“

”ابھی تو ناظم آباد میں بیٹی کے ساتھ ہوں۔ وہیں کرائے پر مکان لینے کا ارادہ ہے۔“

”وہاں سے آنے میں تو بڑی دقت ہو کرے گی۔“

”وقت تو ہوگی مگر میں نے بڑے بڑے پہاڑ کاٹے ہیں۔ یہ مشکل بھی گزرا ہی لوں گا۔“

”میں اس کیپس میں بالکل اکیلا رہتا ہوں۔ تم یہاں کیوں نہیں آ جاتے۔ نہ بس کا بھجوت نہ سواری کی تلاش شہر میں مکان لوگے تو کراہٹ بھی دینا پڑے گا۔“

”اس ویرانے میں مجھے کی ہمت آپ ہی کر سکتے ہیں۔“

”یہ تو سوچو یہاں کی تھانی میں کس کیسے پڑھنے کی کتنی سہولت مل جائے گی۔“

”میں اگر آ بھی جاؤں تو اہلیہ کو سخت اعتراض ہو گا۔ وہ تو کبھی نہیں آئیں گی۔“

”تم ہائی بھرو۔ ہم سب انہیں بھی منالیں گے۔“

”انہیں لاہور سے شش ہے۔ وہاں میں نے گھر بھی بنالیا ہے۔ انہوں نے اگر لاہور چھوڑا بھی تو کراچی کے کسی اچھے علاقے میں رہنا پسند کریں گی۔ اس جنگل میں کیا آئیں گی۔ اب تو وہ امریکا، انگلستان سب دیکھ چکی ہیں۔“

”آپ تو آ جائیں پھر وہ بھی آ جائیں گی۔ ہم انہیں منالیں گے۔“

وہ برابر اصرار کرتے رہے۔ وہ ان کی بات کو ایک حد تک ہی چل سکتا تھا، مان تو گیا لیکن یہ بھی ضروری تھا کہ اس مکان کو دیکھے جو اسے ملنے والا تھا۔ وہ کیپس کے اس حصے میں گیا جہاں رہائشی مکان تعمیر ہو رہے تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر گھبرا گیا۔ کوئی مکان مکمل نہ تھا۔ نہ بجلی نہ پانی نہ سڑک نہ کموڈ کام کرتے تھے۔

”آپ آ تو جائیں۔ سڑکیں تو ابھی نہیں بنیں گی لیکن مکان بہت جلد اس حالت میں آ جائے گا کہ آپ آرام سے رہیں گے۔“

”ہوں نے اتنا اصرار کیا کہ وہ آ گیا۔ وہ اس بہتی کا پہلا مکین تھا۔“

1960ء کے آخر میں اس کی اہلیہ بھی لاہور سے کراچی منتقل ہو گئیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یونیورسٹی کی خدمات سے سبکدوشی کے بعد وہ کراچی میں نہیں رہیں گی۔ لاہور والے گھر میں مستقل قیام کریں گی۔

اس کا تقرر ریڈر کی حیثیت سے ہوا تھا۔ دو سال بعد اسے پروفیسر کا درجہ دے دیا گیا۔

اس کی عظمت اور تنقیدی و تحقیقی کاموں کا اعتراف اب ہر جگہ کیا جا رہا تھا۔ غیر ملکی یونیورسٹیاں اس کی خدمات حاصل کرنے کے لیے بے چین تھیں چنانچہ کاسن ویلجھ یونیورسٹی کی تنظیم کی طرف سے برطانوی یونیورسٹیوں میں لسانی تحقیق کرنے اور اپنی پسند کی یونیورسٹیوں میں تدریسی اور توسیعی پیکچروں کے لیے اس نے فیلوشپ قبول کر لی۔ ایک مرتبہ پھر لندن یا ترائے کے لیے مکر کس لی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی بڑی بیٹی زہرہ لندن میں تھی۔ یہ سفر اس سے ملاقات کا بہانہ بھی بن سکتا تھا۔ جب بیٹی اور نواسی وہاں تھیں تو اہلیہ کو لے جانا بھی ضروری تھا کہ وہ بھی بیٹی سے مل لیں گی لہذا لندن کے اس قیام میں بھی اہلیہ ساتھ تھیں۔

اس نے اہلیہ کو بیٹی کے گھر چھوڑا اور خود انگلستان کے مختلف شہروں کی یونیورسٹیوں کے جائزے کے لیے نکل گیا۔ کسی یونیورسٹی میں پیکچر دینا تھا کہیں مختصر تدریسی فرائض انجام دینے تھے۔ یہ پیکچر زیادہ تر لسانیات پر ہوا کرتے تھے لیکن کراہے لسانیات سے عشق تھا۔ پاکستان میں اردو کے پروفیسر تو بہت تھے لیکن ماہرین لسانیات اگلیوں پر مئے جاسکتے تھے۔ وہ اپنی اس حیثیت کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینا چاہتا تھا۔ اس سلسلے کے لاتعداد مضامین شائع ہو چکے تھے۔



دوسرے یہ کہ انگلستان کی یونیورسٹیاں ہندوستان کی زبانوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات کی طلب گار تھیں لہذا اس کے یہ پتھر اسی نوعیت کے تھے۔

ان پتھروں سے بہت کردہ اپنا وقت انڈین آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں گزارتا تھا۔ اس نے یہاں کے ذخیرے سے استفادے میں دن رات ایک کر دیے۔ وہ چاہتا تھا پاکستان رواجی سے نکل جتنا فائدہ اٹھا سکتا ہے اٹھا لے۔ اس کی یہ محنت آئندہ لکھے جانے والے مضامین و تعنیفات میں نظر آتی ہیں۔ یہاں کی لسانی تجربہ گاہوں میں وقت گزار کر ان جدید آلات کا جائزہ لیا جو لسانی تجربات میں کام آتے تھے۔ واپس آ کر جامعہ کراچی کے شعبہ اردو میں لسانیات کی ایک تجربہ گاہ قائم کی جو پاکستان میں لسانیات کی واحد تجربہ گاہ تھی۔ یہ ایسی معیاری تجربہ گاہ تھی جس کا اعتراف بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہرین لسانیات بھی کرتے تھے۔

لندن میں قیام طول پکڑتا جا رہا تھا۔ وہ تو اپنے کاموں میں مشغول رہتا تھا۔ اہلیہ کا دل اب بھر گیا تھا۔ واپس جانے کا ابھی دور دور تک امکان نہیں تھا۔ ایک دن وہ گھر پہنچا تو منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔

”آپ تو اپنے تجربات میں اضافے کر رہے ہیں میرے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں۔“

”یہ کام کیا کم ہے کہ آپ میری واپسی کی راہ بھی رہتی ہیں۔“

”مذاق چھوڑیے میرے لیے کوئی کام بتائیے۔“

”یہ تو آپ پر منحصر ہے۔“

”میں یہ کہہ رہی ہوں کہ کہیں داخلہ لے لوں اور انگریزی روال کر لوں۔“

”رواں کرنا ہے تو انگریزی لیا جائے آپ انگریزی کا کیا کریں گی۔“

”آپ کی اردو ہی نے تو میری تھوڑی بہت انگریزی کا بیڑہ خرق کیا ہے۔“

انہوں نے ضد کر کے ایک ادارے میں داخلہ لے لیا اور پاکستان واپس آنے تک انگریزی روانی سے بولنے لگیں۔

☆.....☆

حکومت پاکستان کی ایک قرارداد کے ذریعے 1958ء میں ترقی اردو بورڈ کے نام سے ایک ادارہ وجود

”تہذیب نامہ سرگزشت“

میں آیا تھا۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ بورڈ کے ذمے آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے طرز پر اردو کی ایک جامع لغت کی تدوین کی جائے گی۔

باب لغت کا کام شروع ہوا تو مولوی عبدالحق پہلے مدبر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ اسامی تقریباً پندرہ سال خالی رہی۔ اس دوران میں یعنی 1976ء میں وہ جامعہ کراچی کی مدت ملازمت مکمل کر کے ریٹائر ہو گئے لیکن ان کی علمی و ادبی خدمات اتنی تھیں کہ ابھی جامعہ کو ان کی ضرورت تھی لہذا انہیں پروفیسر امیر طلس (پروفیسر تاحیات) مقرر کر دیا گیا۔ اب وہ کچھ وقت دوسرے کاموں کے لیے بھی دے سکتے تھے۔ صحت ماشاء اللہ ایسی تھی کہ جوانوں سے زیادہ تیز چلتے تھے لہذا اردو بورڈ کی نظر ان پر پڑی۔ لغت کا کام ادھر رائج ہوا تھا۔ لغت نوٹس کے لیے ان سے بہتر کون ہو سکتا تھا۔ انہیں مدبر اعلیٰ کی حیثیت سے متعین کر دیا گیا۔ صبح کیپس سے نکلتے۔ کچھ دیر شعبہ اردو میں آتے۔ انتظامی معاملات دیکھتے کوئی لی ایچ ڈی کا طالب علم انتظار میں بیٹھا ہوتا تو اس کا کام دیکھتے، کچھ مشورے دیتے، اساتذہ آکر بیٹھ جاتے۔ ان سے خوش گویاں کرتے اور پھر خود ہی ذرا تھک کرتے ہوئے اردو لغت بورڈ پہنچ جاتے اور ایسے تروتازہ جیسے ابھی غسل کر کے نکلے ہوں۔ یہاں پہنچ کر بھی عملے کے ارکان سے خوش اخلاقی سے ملتے۔ اراکین کے ساتھ ان کا رویہ نہایت نرم تھا لیکن کام میں کوتاہی قطعی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ طبیعت میں غصہ بہت تھا لیکن وہ ایسے ہی موقعوں پر نکلتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ طلبہ کے لیے ان کے پاس اس غصے کا ایک فیصد بھی نہیں تھا۔

جس طالب علم میں ذرا سی بھی قابلیت دیکھتے اسے اکساتے کہ وہ کسی موضوع پر تحقیق کرے۔ جب وہ کام شروع کر دیتا تو ایسے خوش ہوتے جیسے انہوں نے کوئی کتاب لکھ دی ہو۔ طالب علم سے محنت تو خوب کراتے لیکن اس کے وکیل بن کر مقدمہ ایسے لڑتے کہ ڈگری مل کر ہی رہتی۔ مشہور تھا کہ عمر انہیں بنا لو پھر ڈگری پکی ہے۔ وراسل بات یہ تھی کہ انتظامی معاملات میں ان کا عمل دخل بہت زیادہ تھا۔ سب لوگ ان کی عزت بھی بہت کرتے تھے لہذا جب وہ دیکھ لیتے تھے تو میٹروں کا کام ہمتوں میں ہو جاتا تھا۔ محنت کا انتخاب واپسی امتحان کے لیے محنت کو منتخب کرنا، سنڈیکیٹ کی میٹنگ میں ان کاموں کو پاس کر دانا جلد سے جلد انٹرویو کا اہتمام کرانا۔ یہ سب محنت دوز کے کام تھے اور وہ اس



تعبیر کروں گا۔ جس بات پر کوئی استاد دکھانے کے لیے ہی سہی بھڑک سکتا ہے اسے بھی وہ تحمل سے برداشت کر لیتے تھے۔

مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آتا ہے اور اب خیال آتا ہے کہ میری طرف سے ہی کچھ زیادتی ہوئی تھی۔ میں مقالہ تحریر کرتے ہوئے کسی جگہ انگ لگیا اور اپنی عادت کے مطابق سخت پریشان ہو گیا کہ کس طرح یہ مسئلہ حل ہو۔ میری بے مبری نے رات کا کتنا دو بھر کر دیا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ فجر کی نماز ختم ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میں یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ سردیوں کے دن تھے اور اس دن تو سردی معمول سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اتنی سردی کسی کے گھر جانا ٹھیک نہیں۔ کچھ دیر اور انتظار کر لوں ذرا دھوپ تو چمکنے دوں۔ میں تو خیر جوان ہوں جس سے ملنے جا رہا ہوں وہ تو بوڑھا آدمی ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کے سو کر اٹھنے کے معمولات کیا ہیں۔ وہ سو رہے ہیں یا اٹھ گئے ہوں گے۔ فجر کی نماز کے بعد کیا خبر پھر سو گئے ہوں۔ غرض میں نے کچھ نہیں سوچا اور کیسپس چلنے لگا۔ دستک کے جواب میں دروازے کی اوٹ سے ایک سربراہر آیا۔ سر پر ایک اس طرح کا اونٹنی ٹوپا تھا کہ پورا چہرہ ڈھکا ہوا تھا صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ یہ تھے ابواللیث صدیقی۔ چند لمحوں تک تو وہ آنکھیں مٹھورتی رہیں اور پھر آنکھوں نے مسکراتا شروع کر دیا۔ ان کی فراخ دلی نے دروازہ کھول دیا۔ ”جلدی اندر آجائیے باہر بہت سردی ہے اور آپ ایک سوئٹر میں چلے آئے۔“ انہوں نے چھت پر ایک کمر لٹایا ہوا تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے کتلی کا زینہ تھا۔ غالباً کمر میں سب لوگ سو رہے تھے اس لیے وہ مجھے لے کر چھت پر چلے گئے۔ مجھے وہاں بٹھا کر کچھ کہے بغیر خود نیچے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد آئے تو ایک ٹرے میں دو کپ رکھے ہوئے تھے۔

”ساجد میاں اس وقت تو گرم گرم چائے پو، سردی بہت ہے۔“

مجھے یقین ہے یہ چائے وہ خود بنا کر لائے ہوں گے۔ اس وقت کسی کو اٹھانا مناسب نہ سمجھا ہوگا۔ گفتگو شروع ہوئی تو جیسے ایک کے لیے یہ نہیں کہا کہ یہ کوئی وقت ہے آنے کا۔ کوئی مہمانی کا وقت ہمارے گھر آجائے تو ہمارا منہ بن جاتا ہے لیکن ان کا چہرہ اسی طرح گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ جو میرا مسئلہ تمام حل کرنے کے بعد جب میں اٹھنے

طرح بھاگ دوڑ کرتے تھے جیسے یہ ان کا اپنا کام ہو۔ وہ علی گڑھ کے اساتذہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے جہاں اساتذہ طلبہ کے دوست بن جاتے تھے۔ ان کے استاد رشید احمد صدیقی کا یہی عالم تھا۔ یہی اثرات ابواللیث صدیقی میں آئے تھے۔ علم کا کوئی آدمی کتنے ہی ضروری کام سے ان کے پاس آیا ہوتا اور کوئی طالب علم آجاتا تو اس سے معذرت کر لیتے اور کام چھوڑ چھاڑ کر طالب علم کی مشکلات سننے لگتے۔ ان کی اس مہربانی کا میں خود بخوبی شاہد ہوں۔

یونیورسٹی دور بھی اس لیے انہوں نے مجھے یہ اجازت دے دی تھی کہ میں ان سے اردو بورڈ کے دفتر میں مل لیا کروں۔ جو اس وقت ناظم آباد میں تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ کسی کام میں مشغول ہیں یا بورڈ کا کوئی رکن کسی کام سے آیا ہوا ہوتا اور میں پہنچ جاتا وہ اسے کچھ دیر بعد آنے کے لیے کہتے اور میری طرف متوجہ ہو جاتے۔ بعض گمراہ طالب علم کی طرف سے لکھے گئے مواد کو پڑھنے میں کئی کئی بھٹے لگا دیتے ہیں جس سے کام میں دیر لگتی ہے۔ طالب علم بے چارہ انتظار کرتا رہتا ہے کہ گمراہ کی طرف سے پچھلا مواد جانچ لیا جائے تو وہ اگلا باب شروع کرے۔ مجھے بھی ان کی جانب سے یہ شکایت بھی نہیں ہوئی۔ وہ کہتے ہیں اسے رات میں پڑھ لوں گا کل آکر لے جانا۔ مجھے پہلی مرتبہ تو تعجب ہوا تھا کہ اتنی مصروفیت سے وقت نکال کر کس طرح وہ اسے پڑھ لیں گے لیکن دوسرے دن گیا تو میرے لکھے ہوئے صفحات ان کی ٹیبل پر رکھے ہوئے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ یہ صفحات انہوں نے پڑھے بھی ہیں یا یونہی واپس کر دیے لیکن جب یہ نوٹ لکھا ہوا دیکھا کہ اس باب کے لیے فلاں کتاب بھی دیکھ لینا تو مجھے یقین ہوا کہ صفحات انہوں نے پڑھے ہیں۔ پھر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ کئی دیر ہوئی تو میری طرف سے ہوئی۔ انہوں نے مجھے بھی کچھ نہیں لکواے۔ نہ کبھی کوئی ایسی بات کی جس سے میری دل تنگی ہو۔

میں خود استاد تھا۔ استادوں سے واسطہ رہتا تھا۔ لیکن میں نے ان جیسا استاد دوسرا نہیں دیکھا۔ فروغ علم کا ایسا شوق تھا کہ طلبہ کو اس کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ایسی عزت کرتے تھے جیسے ان کا اس سے کوئی مطلب ہو۔ مطلب یہی تھا کہ اس کے علم کا کچھ حصہ اسے منتقل کر دیں اور پھر وہ اسے آگے بڑھائے۔ اس طالب علم سے تو بہت ہی خوش ہوتے تھے جس میں علم کے حصول کی تڑپ دیکھتے تھے۔ اس کے ساتھ جو وہ سلوک کرتے تھے اس کو تو میں ناز برداری کے لفظ سے



لگا تو انہوں نے مجھے روک لیا۔ ”سواری ہے؟“

”جی نہیں۔ بس سے آیا تھا۔“

”اب کہاں یہاں سے وہاں تک پیدل جاؤ گے اور پھر بس پکڑو گے۔ میرے ساتھ ہی چلا۔“

وہ اردو پورڈ جانے کے لیے نکل رہے تھے۔ ان کے پاس اس وقت باقی روف تھی۔ مجھے بھی بٹھالیا۔

اسی طرح ایک اور واقعہ میں نہیں بھولتا۔ اس وقت میں بی ایچ ڈی کر چکا تھا۔ میرا پہلا مجموعہ کلام ”قافیہ پیاکی“

کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی تقریب رونمائی ہونا تھی۔ میں نے جو دعوت نامہ چھپوایا اس میں ابوالکلیث صدیقی کا نام بطور

مقرر یہ سوچ کر نہیں رکھا کہ انہیں کیوں زحمت دی جائے کہ وہ یونیورسٹی سے اس معمولی سی تقریب میں شرکت کے لیے

آئیں البتہ دعوت نامہ ان کی خدمت میں پہنچا دیا۔ وہ بھی براہ راست نہیں۔ وہ اس وقت یونیورسٹی میں موجود نہیں

تھے۔ میں ان کا دعوت نامہ ڈاکٹر ابو الخیر عسکری کو دے آیا۔ عسکری صاحب کو بھی آنا تھا۔ میں نے سوچا اگر سچے آئے تو ڈاکٹر

صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں گے۔ اگر انہیں تقریر کرنی ہوتی تو وہ پابند ہو جاتے۔ اب اگر مناسب سمجھیں گے

تو آجائیں گے۔  
تقریب شروع ہونے ہی والی تھی۔ ڈاکٹر پیرزادہ

قاسم (جو بعد میں وائس چانسلر ہوئے) مظفری (اچھے سیکریٹری) کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ ابھی

مہمانوں کو آج پر آنے کی دعوت دے رہے تھے کہ ابوالخیر کشتی کے ہمراہ ڈاکٹر صاحب پنڈال میں داخل

ہوئے۔ ان پر نظر پڑتے ہی پیر زادہ قاسم نے ڈاکٹر صاحب کو اس طرح آنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر صاحب انکار کیے بغیر

بہ خصوصی اس پر اُٹھے۔ مجھ پر ہندوؤں مانی پڑ گیا۔ جب انہیں خیالات کے اظہار کے لیے دعوت کی گئی تو یہ دعوت بھی

بولی۔ یہ نہیں کہا کہ مقررین میں میرا دوست ہے۔ یہ ہوتی ہے بڑے لوگوں کی پہچان۔ میں نے بلیک میں معذرت

بھئی کی اور وضاحت بھی لی کہ میں نے انہیں غریب سمجھا۔ کیوں نہیں دی تھی۔ انہوں نے بڑے بڑے فرمایا۔

تعلق نہیں ہے کہ دعوتِ مائے میں نام لکھنے کی رسم نبھاتے۔

میں نے اچھا ہی لیا۔ اگر میں نہ آتا تو تمہارا ایک مقررہ ہو جاتا۔ میں آگیا میں نے کچھ الفاظ بول دیے۔ مجھ پر تمہارا حق تھا میں نے ان کو دیا۔

ایک میں ہی ان کا شکر و نہیں تھا کہ وہ اتنا خوش

ہور ہے تھے۔ ان کی نگرانی میں سینکڑوں لوگوں نے لی ایچ

ڈی کیا ہوگا۔ وہ ہر شاگرد سے اسی طرح پیش آتے تھے۔ وہ اس طرح ملتے تھے کہ طالب علم میں علم کا شوق پیدا ہو

جائے۔ یہ سلوک ان کی تربیت کا حصہ تھا۔ وہ چپکے چپکے طالب علم کی تربیت کرتے رہتے تھے۔ وہ اتنی نرم گردن کے

نہیں تھے۔ جس کے دوست نے اس کے دوست تھے لیکن جس سے ٹھن جاتی اس کو گھر تک چھوڑ کر آتے تھے۔ طبیعت

میں غصہ بہت تھا لیکن وہ اس کے اظہار میں بہت محتاط تھے۔ یہ غصہ اس وقت سراٹھاتا تھا جب ان کے کاموں میں کوئی

بے جا دخل اندازی کرتا تھا۔ ان کے مزاج سے واقف ہو جانے والا بہت فائدے میں رہتا تھا۔

☆.....☆

لخت کے مدیر اعلیٰ ہونے کے بعد اسی سال معتمد بن دیا گیا۔ گویا اس عہدے کے حصول کے بعد وہ بااختیار تھا۔

ابھی تک لغت کی ایک بھی جلد شائع نہیں ہو سکی تھی۔ حالانکہ  
چند سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کی وجوہات مختلف

تھیں۔ ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ الفاظ کے استعمال کے لاکھوں کارڈ ایسے افراد نے گھسے تھے جنہوں نے املا کی غلطیاں کی

تھیں اور اقتباسات میں اپنی مرضی کی تہہ پیلایاں کر دی تھیں۔  
 دوسری بڑی وجہ سلسلہ کثرت یا پر اکرت سے ماخوذ الفاظ کے

ماہر ناہید تھے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اور اختر حسین رائے

گزر گیا۔ ابولیت کی تقرری نہ ہوتی تو شاید یہ کام یونہی پڑا

مرہ جاتا لیکن ابو الیث صدیقی کی بے پناہ قوت ارادی نے اس کام کو ایک سال میں پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ شہرکرت کے

جتنے اشتقاق لکھے گئے تھے سب طبعاً رسم الخط میں لکھے گئے تھے جو نہایت غیر علمی صورت حال تھی۔ شکرت ٹائپ موجود نہیں

تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کوششیں بسیار کے بعد سنگرت نامی  
 مہیا کیا اور سنگرت کے کل اشتقاق جیسے مرے سے لکھے۔

ان کی محنت تھی کہ جو کام چند روزہ سال سے رکا ہوا تھا انہوں نے

نہایت میں مل کر کے لغت کی چکی جلد شائع کر دی۔  
نہایت میں شائع ابواللیث کا مقدمہ بذات خود ایک علمی

اس کے بعد ان کی ادارت میں پانچ جلدیں مزید



شائع ہوئیں۔ تنقید کرنے والے ہر چیز پر تنقید کرتے ہیں۔ اس لغت پر بھی تنقیدیں ہوئیں۔ یہ تنقید درست ہوں گی۔ اس جلد میں یا اگلی کئی جلدوں میں بہت سی خامیاں رہ گئی ہوں گی۔ تنقید کرنے والے ان مشکلات کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے جو ڈاکٹر صاحب کو پیش آ رہی تھیں۔ عرصہ تک بورڈ کی اپنی عمارت نہیں تھی۔ اپنا پریس نہیں تھا۔ سٹریکٹ ٹائپ کی سہولت تک موجود نہیں تھی۔

ٹکا لے والے تو خدا کی تخلیق میں بھی عیب نکال لیتے ہیں یہ تو ابواللیث کا کارنامہ تھا۔ انہوں نے آٹھ سال میں چھ جلدیں فراہم کر دیں۔ ان میں خامیاں بھی ہیں لیکن خوبیاں زیادہ ہیں۔ یہ ان ہی کا کارنامہ تھا جس نے بنیاد فراہم کر دی جس پر لغت کی عمارت کھڑی ہوئی اور اب تک بائیس ٹیکس جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

بورڈ کا کام تین لغت کے کام کو جاری رکھنا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب تو جہاں جاتے تھے چند کام ایسے ضرور انجام دیتے تھے جو ہمیشہ کے لیے یادگار رہ جاتے تھے۔ ان کاموں میں ایسے منہمک ہوتے کہ اسے پانی پینا تک پہنچا کر ہی دم لیتے۔ انہوں نے اردو بورڈ کے لیے ٹائپ مشین کے لیے کلیدی تختے (Key board) کی تیاری کا کام بھی سرانجام دیا جو منظور کر لیا گیا اور اس کے مطابق ٹائپ مشینیں تیار کی گئیں۔

بورڈ کا دفتر اب تک کراچی کے مختلف علاقوں میں کرائے کی عمارتوں میں چلا آ رہا تھا۔ اس طرح بہت سافٹ ویئر بھی ضائع ہوتا تھا اور ضروری نہیں کہ عمارت کی ساخت بورڈ کے کاموں کے عین مطابق ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں کوششیں شروع کر دیں کہ بورڈ کی اپنی عمارت ہو جو اپنے نقشے کے مطابق تعمیر کر دیا جائے۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے اور مئجسٹریٹ اہل انجینئرنگ کے نزدیک زمین حاصل کر لی گئی۔ تعمیر کا کام شروع ہوا تو خود کھڑے ہو کر نگرانی فرماتے تھے۔ ایسی دلچسپی لے رہے تھے جیسے اپنا ذاتی مکان بنوا رہے ہوں۔ دو منزلہ یہ عمارت تعمیر ہو گئی تو 1984ء میں بورڈ کا دفتر اس عمارت میں منتقل ہو گیا۔

انہوں نے اس عمارت کی تعمیر کے بعد محیط اردو اور پریس کے نام سے ایک بریس بھی لگوا دیا اور اس کے متعلق تمام معلومات خود حاصل کیں تاکہ اس کی کارکردگی پر نظر رکھی جاسکے اور ضرورت پڑنے پر چھوٹی بڑی خامیوں کو از خود رفع کیا جاسکے۔ اس قسم کی کوئی دوسری مثال کیا نظر آ سکتی ہے؟

یہ کام تو کوئی دیوانہ اردو ہی کر سکتا تھا۔

☆.....☆

”میاں، میں نے ایک خواب دیکھا ہے خواب ایسا ہے کہ آپ کو ستانے کو جی چاہتا ہے۔“  
”یہ چند کاپیاں ہاتھ میں ہیں۔ انہیں جانچ لوں تو پھر سنتا ہوں۔“

”آپ کی کاپیاں تو چلتی ہی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے انہیں ہاتھ سے رکھ دیں۔ پھر میں بھول جاؤں گی۔“

”اچھا ستاؤ۔“ ڈاکٹر صاحب نے کاپیاں ہاتھ سے رکھ دیں۔

”میاں میں نے دیکھا کہ میں عداوت کر رہی ہوں، سورۃ کے آخر میں ”کانا تو ابا“ ہے۔“ ابواللیث نے کہا۔  
”اذا جالہ اللہ“ کے آخر کا حصہ ہے۔“ قرآن اٹھا کر دیکھا۔

”اس میں تو اسی سورۃ پر نشانی کا ایک کاغذ رکھا ہے۔“

اس دن کے بعد سے ان کی اہلیہ نے اس کی عداوت کو درد بتا لیا۔ ایک ڈیڑھ مہینہ گزرا تھا کہ 24 فروری 1980ء کی رات گیارہ بجے ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ بستر پر ایک کاپی کھلی پڑی تھی جس پر فارسی کے کچھ اوصاف لکھے تھے۔ کچھ دن ہوئے انہوں نے فارسی سیکھنی شروع کی تھی۔ غالباً اسی کی مشق کر رہی تھیں۔ انتقال کے بعد ایک عزیز بزرگ کے یاد دلانے پر یاد آیا کہ جو صورت انہوں نے خواب میں دیکھی تھی وہ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کی بشارت تھی۔ ان بزرگ نے یہ بھی بتایا کہ اس سورۃ کے متعلق تفسیر میں صاف لکھا ہے۔ ”اب دنیا کا کام مکمل ہوا۔ سفر آخرت اختیار کرو۔“

غالباً خواب دیکھنے کے بعد درحمان فاطمہ نے تفسیر بھی دیکھی ہوگی۔ اسی لیے ان ڈیڑھ مہینوں میں وہ عبادت کی طرف شدت سے راغب ہو گئی تھیں۔

یوں تو کسی کی موت ہو مدے کا پہاڑ لے کر آتی ہے لیکن اہلیہ کی موت ان کے لیے قیامت سے کم نہیں تھی۔ اسے اپنی بیوی سے جتنی محبت تھی اس کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ وہ ہستی تھی جس نے شدید تنگ دستی میں حرف شکایت نہ اٹھائے بغیر ان کا ساتھ دیا تھا۔ وہ انظر میں تھے کہ ان کی شادی ہو گئی تھی۔ عرصے تک یونیورسٹی سے ملنے



والے وظیفے پر کمر بھی چلاتے رہے، تعلیمی اخراجات بھی پورے کرتے رہے۔ بیوی کی یہ قربانی انہیں ہمیشہ یاد رہی۔ وہ دل سے ان کی قدر کرتے رہے۔ بعد میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ الہیہ کو دنیا بھر کی سیراکرائی۔ رنج، عمرہ سب کرایا۔ اس اعزاز سے بھی آشنا کیا کہ وہ ممتاز ماہر تعلیم اور اہم ترین ادیب و نقاد و محقق کی بیوی ہیں۔ ابواللیث سے ان کی محبت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی گئی۔ اب جو اچانک ساتھ چھوٹا اور زوجہ کو یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن کیا تو قبر کی مٹی نے آواز دی۔ ”ہم آپ سے جدا ہو گئے ہیں ہماری محبت کو دل سے مت نکالنا۔“ اس دن کے بعد سے یہ معمول بنالیا کہ فجر کی نماز کے بعد الہیہ کی قبر پر چلے جاتے۔ فاتحہ خوانی کرتے۔ دل کی باتیں کرتے اور لوٹ آتے۔ بیوی کو گلاب کے پھولوں سے عشق تھا۔ گھر میں بھی گلاب کے پودے لگائے ہوئے تھے۔ عمری نماز کے بعد جاتے تو قبر پر گلاب کے پھول بکھیرتے۔ مغرب تک وہیں رہتے۔ پھول والوں سے بیٹے بھر کے پھول خرید کر فرج میں رکھ لیتے۔

”وفاداری بہ شرط استواری اصل ایمان ہے۔“

انہوں نے وفاداری ایسی نبھائی کہ جب تک زندہ رہے (تقریباً چودہ سال) آزمی ہو یا طوفانِ فجر کے بعد الہیہ کی قبر پر چلے جاتے۔ پھر عمر کے بعد جاتے۔ قبر پر پھول چڑھاتے مغرب تک وہیں رہتے۔ اپنی وفات سے ایک دن قبل تک بھی یہی معمول رہا۔

”پیدا کہاں ہیں ایسے پر اگندہ طبع لوگ“

کوئی اور ہوتا تو اس صدمے سے دل برداشتہ ہو کر ہاتھ پاؤں ڈال دیتا لیکن ان کی قوتِ ایمانی بھی جو موت کو برحق جانتی تھی۔ انہوں نے بھی ان کی محبت کا حق ان کے لیے دعائے مغفرت کر کے ادا کیا اور بہت جلد اپنے کاموں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

موت اک ماندگی کا وصف ہے

یعنی آگے چلیں گے دم لے لیں گے

☆.....☆

اردو بورڈ کی طرف مدد سے متوجہ ہوئے۔ اردو بورڈ کی نئی عمارت الہیہ کی وفات کے بعد ہی تعمیر کروائی۔ پریس لگوایا، الہیہ کی مگر پہنچنے کے بعد ہی زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ اس کا حل یہ نکالا کہ لکھنے پڑھنے کی طرف پہلے سے بھی زیادہ مشغول ہو گئے۔ وہ صرف مدرس نہیں تھے کہ کلاسوں تک محدود ہو جاتے۔ انہوں نے خود کو زیادہ سے

زیادہ مصروف رکھنے کے لیے قلم سنبھال لیا۔ یہ نہیں تھا کہ اس سے پہلے انہوں نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ جرات، مصحفی، نظیر جیسے شعرا پر مستقل تصانیف شائع ہو چکی تھیں۔ اقبال شناسی کے سلسلے میں ”ملفوظات اقبال“ اقبال اور مسلک تصوف جیسی کتب پڑھنے والوں کو دے چکے تھے۔ لاتعداد مضامین تھے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ یہ سلسلہ زمانہ طالب علمی ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ دو کتابیں لکھ کر ادبی مورخ کا درجہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ ”اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ“ اور ”تاریخ زبان و ادب اردو“ جیسی کتابیں انہیں ادبی مورخ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ”آج کا اردو ادب“ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ الہیہ کی وفات کے بعد مضامین کثرت سے شائع کروائے۔ اقبال اور علی گڑھ کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا جو رسالہ ”تصنیف“ میں قسط وار شائع ہوا۔ حضرت مجدد الف ثانی پر بھی دو مضامین ”تہذیب“ شائع ہوئے۔ ”تہذیب“ ہی میں ”لسان اور مطالعہ لسان میں مسلمانوں کی خدمات“ کے عنوان سے دو مضامین شائع ہوئے۔ ”فکار“ میں ناول فی نقطہ نظر سے شائع ہوا۔

اس وقت تک ان کی علمی خدمات اور کارنامے اس منزل تک پہنچ گئے تھے کہ ان کی سوانح شائع ہو جانی چاہیے تھی کہ لیگ اس عظیم ماہر تعلیم کی زندگی سے واقف ہوں۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے ہی قلم کو منتخب کیا۔ اپنی خود نوشت ”رفت و بود“ روزنامہ جسارت میں شائع کرانی شروع کی مگر یہ عمل نہ ہو سکی اور یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے اپنا ایک مجلہ نکالنے کا ارادہ کیا۔ ابواللیث مدد ملی بھی مجلس انتظامیہ میں شامل تھے۔ انہوں نے اس مجلے کا نام ”تہذیب“ تجویز کیا۔ انہیں اس مجلے کا مدیر اعلیٰ اعزازی مقرر کیا۔ عام طور پر مدیر اعزازی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا نام بچھتا رہے لیکن وہ تو جو کام کرتے تھے اس کا پورا حق ادا کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے ادارے بھی تحریر کیے اور اس کے بعد جتنے مضامین لکھے وہ ”تہذیب“ کے لیے لکھے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ یہ تجارتی پرچہ نہیں۔ اس کی سرکولیشن زیادہ نہیں ہو سکتی ایسے مقام پر تھے کہ وہ جس پرچے کے لیے لکھتے اس کی قیمت وصول کرتے لیکن انہوں نے اس پرچے کے لیے منت کا ہر کیا۔ انہوں نے اپنی خود نوشت بھی تہذیب میں شائع کرانی شروع کی اس کا سلسلہ ان کی وفات تک



جاری رہا۔ علمی کاموں سے وقت نکال کر وہ اسے پابندی سے شائع کراتے رہے۔

یہ خودنوشت صرف ان کی سوانح نہیں رہی بلکہ پڑھنے والے کو لگتا ہے جیسے وہ برصغیر کی علمی تاریخ پڑھ رہا ہے۔ بڑے بڑے مشاہیر اور علمی گڑھ کی عالم فاضل شخصیات کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے کہ یہ خودنوشت ایک اہم دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

ان کے تنقیدی نظریات کی ایک جھلک ان تحریروں میں ملتی ہے جو انہوں نے مختلف کتابوں پر ”فلیپ“ یا پیش لفظ کے طور پر لکھے ہیں۔ یہ تحریریں بغیر پڑھے نہیں لکھ دی گئی ہیں جیسا کہ اکثر لکھتے والے لکھ دیتے ہیں بلکہ وہ انہیں باقاعدہ پڑھتے تھے۔ انہوں نے خود ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا۔

”میں ان کتابوں پر اس لیے لکھتا قبول کر لیتا ہوں کہ اس بہانے ایک کتاب پڑھ لیتا ہوں۔“

یہی وجہ تھی کہ ان کا مطالعہ کلاسیکی کتب تک محدود نہیں تھا بلکہ عصر حاضر میں شائع ہونے والی کتب سے بلا واسطہ تعلق تھا۔ مبالغہ نہ ان کی فطرت میں تھا نہ اس قسم کی تحریروں میں ملتا ہے۔ بے جا تنقید کا بھی شوق نہیں اس لیے محض تعارف تک محدود رہتے ہیں۔ جب میرا شعری مجموعہ شائع ہونے لگا تو انہوں نے میری درخواست پر یہ فلیپ لکھ کر دیا۔

”.....ساجد امجد اس نئے دور کے نوجوان شاعر ہیں۔ انہوں نے اچھا ہی کیا کہ اپنے پہلے شعری مجموعے کی تدوین اشاعت سے پہلے اپنے دور کی رسمی تعلیم مکمل کر لی اور ادب کے طالب علم کی حیثیت سے اس راہ کی قیاد و فراز سے کچھ واقف ہو گئے۔ اس باضت سے ان کے فن میں نکھار اور اسلوب میں پختگی آئی اور انہوں نے اپنے لیے الگ ایک راہ متعین کر لی۔“

”یہ اشعار ساجد کے جذبات بھی ہیں اور ان کے ماحول کے رد عمل کے تاثرات بھی۔ یہ غزل کے اشعار ہیں اور ان کی سب سے بڑی خوبی غزلوں کی مدہوں کی برائی ایمانی روایت ہے۔ علامتوں اور استعاروں کے پردے اٹھائیں تو ان اشعار میں الفاظ کے تانے بانے سے آگے بھی کچھ اور ہے۔“

ایک مجھ پر ہی منحصر نہیں۔ انہوں نے جس کے لیے بھی لکھا صاف اور کھری باتیں ہی لکھیں۔ بے جا قدر دانی سے دور مبالغے سے پاک۔

”ارشادی بدایونی کسی نئی طرز کے بانی نہ تھے۔ وہ غزل کے شاعر تھے اور جس کا مزاج کلاسیکی غزل کا مزاج تھا اس میں داستانِ دل اور حکایتِ دروہی۔ غزل کے لیے نئی زبان کی تخلیق جس کا ہمارے اکثر نوجوان شاعروں کو سودا ہے ان کا دستور نہ تھا۔ ہاں زبان صاف اور مستند لکھتے تھے۔“

وہ رشید احمد صدیقی اور مولانا احسن مارہروی جیسے اساتذہ کے تربیت یافتہ تھے۔ ان میں ایک ادیب تھا ایک شاعر۔ اسی لیے ڈاکٹر صاحب بھی نثر و نظم کی چھان چھک میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ وہ خود شاعر نہیں تھے لیکن شاعری کے رموز سے خوب واقف تھے۔ وہ جس فن پارے پر رقم اٹھاتے تھے اس کا خوب اچھی طرح تجزیہ کرتے تھے۔ وہ محقق تھے ہذا تنقید کرتے ہوئے ہوائی باتیں نہیں کرتے تھے۔ نہ بے جا تعریف نہ جانب داری۔ ان کا ذہن کلاسیکی تھا لیکن عصر حاضر سے غافل نہیں تھا۔ پرانی تربیت نے مزاج میں شائستگی پیدا کر دی تھی۔ کسی فن پارے کی خامیوں کی نشاندہی بھی کرتے تو بڑی خوب صورتی سے۔

لسانیات سے خاص شغف تھا اس لیے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی لسانی خامیوں اور خوبیوں کا ضرور ذکر کرتے تھے۔ انہیں صرف دی تحریریں پسند آتی تھیں جو اردو کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں۔ ایسی تمام تحریروں پر بے باک تنقید کرتے تھے جو اردو زبان کے مزاج کے خلاف ہوں تاہم وہ رجعت پسند نہیں تھے۔ ہاں مشرق و مغرب کے توازن کے قائل تھے۔ ان کی تنقید میں مغربی دبستانوں کے اثرات بھی صاف نظر آتے ہیں۔ مثلاً جرأت کی شاعری پر لکھتے ہوئے انہوں نے فراڈ کے نفسیاتی دبستان سے مدد لی تھی۔ اسی طرح ان کی تحریروں میں مارکسی طرز تنقید کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ وہ تنقید کی جمالیاتی قدروں سے بھی کام لیتے ہیں۔ وہ زمانہ طالب علمی ہی سے ترقی پسند تحریک کے خلاف تھے۔ اس تحریک کے تحت لکھے جانے والے ادب پر تنقید کرتے ہوئے ان کی تحریروں میں قدرے غصہ آ جاتا تھا لیکن یہ غصہ صرف اس وقت آتا تھا جب اخلاقیات اور مذہب کا سوال آتا تھا۔ دراصل وہ انتہا پسندی کے خلاف تھے۔ کسی سیاسی نظریے کی تبلیغ کے لیے فن کی جمالیاتی قدروں کو قربان کر دینا ان کے نزدیک مستحسن نہیں تھا۔ ترقی پسند ادب کے خلاف ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ترقی پسند نیک اور اس کے نظریوں کو جگہ جگہ رد کرتے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر اشتراکی نظریاتی کے۔ مذہب



کے ساتھ ساتھ پاکستانی قومیت کا بھی انہیں شدید احساس تھا۔

ان کے تنقیدی کارناموں کی اصل اور بنیاد ان کا اسلوب نگارش تھا۔ لکھنؤ کے دبستان شاعری پر کام کرنے کے باوجود اور بچپن سے لکھنوی شعر کو پڑھنے کے باوجود ان کا اسلوب نگارش لکھنوی تکلف پسندی سے پاک رہا۔ ان کے اسلوب کو اگر ہم کسی مثال سے بیان کریں تو وہ ہے سرسید احمد خان۔ صاف سادہ جودل سے نکلے دل میں اتر جائے۔ لیکن یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے سرسید کی نقل کی۔ ان کی نثر سرسید کی طرح خشک اور بے مزہ نہیں۔ یہی ان کی انفرادیت ہے۔ ان کا تعلق سرسید کے مکثیہ فکر سے تھا۔ وہ زبان و بیان سے زیادہ مضمون پر توجہ صرف کرتے تھے۔ اس لیے بھی کہ وہ علی گڑھ کی محبت میں شراہور تھے اور اس لیے بھی کہ وہ محقق تھے افسانہ نگار نہیں۔ وہ فارسی پر عبور رکھتے تھے لیکن ان کی تحریروں کو مغرس نہیں کہا جاسکتا۔ وہ ایک منفرد صاحب اسلوب تھے۔ یہ اسلوب ان سے شروع ہوا اور ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

☆.....☆

ماہ نامہ ”تہذیب“ میں ان کی خودنوشت ”رفت و بود“ اشاعت کی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ لوگ اسے پسند بھی کر رہے تھے اور اس میں دلچسپی بھی لے رہے تھے۔ یہ احساس بھی تھا کہ لیٹ صاحب کی عمر بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کی صحت قابل رشک ہے لیکن عمر آخر ہوتی ہے۔ ان سے تقاضا کیا جائے کہ وہ اس خودنوشت کو جلد از جلد مکمل کریں۔ آدرش کونسل کو ادبی کے قریب ”انگل“ روڈ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا دفتر تھا۔ یہیں سے تہذیب شائع ہوتا تھا۔ جزل سیکریٹری ڈاکر علی خاں کے دفتر میں احباب جمع تھے۔ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب کی ملازمت آگئے علی گڑھ اور رام پور کی باتیں چھڑی ہوئی۔ ڈاکر علی خاں (سابق ایم ڈی واٹر بورڈ) کو خیال آیا اس وقت شائع اچھا ہے۔ قسطوں کا ذکر چھیڑا جائے۔

”ڈاکٹر صاحب آپ کی خودنوشت بے حد پسند کی جا رہی ہے۔ آپ اس کے صفحات بڑھادیں بلکہ اسے مکمل کر کے ہی دے دیں تاکہ ہم اسے چھاپتے رہیں۔ آپ مصروف آدمی ہیں کسی اور کام میں لگ گئے تو یہ ادموری رہ جائے گی۔ ایسے ایسے واقعات اس میں بیان ہو رہے ہیں جو اب کسی کی یادداشت میں محفوظ نہیں۔ محفوظ ہیں تو انہیں لکھنے

کے لیے وہ قلم کسے ملا ہے جو آپ کو عطا ہوا ہے۔“

”لکھ دوں۔“ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”مگر اس کے پڑھنے والے کہاں سے ملاؤ گے۔“

”آپ کو اندازہ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب پاکستان سے زیادہ اغریا میں اس کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ خدا بخش لاہوری پٹنا سے ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے کئی خط آچکے ہیں کہ اس خودنوشت کو کسی طرح بھی ڈاکٹر صاحب سے مکمل کر لیا جائے۔“

”فکرت کرو، ابھی میں مرنے والا نہیں۔“

”آپ کا سایہ تادیر ہمارے سردی پر قائم رہے۔ ہم سب تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ایک قسط بھیج کر اس کے چھپنے کا انتظار نہ کیا کریں بلکہ کئی کئی قسطیں لکھ کر بھیجتے رہیں تاکہ ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ مواد جمع ہو جائے۔ ہم صفحات بھی بڑھا دیں گے جو چیز پڑھی جا رہی ہے اسے شائع ہونا چاہیے۔“

انہوں نے وعدہ کر لیا کہ اب وہ کئی کئی قسطیں ایک ساتھ لکھ کر بھیجا کریں گے۔

وہ دفتر سے اٹھ کر گئے تو دیر تک انہی کی باتیں ہوتی رہیں۔

”ماشاء اللہ 78 سال کے ہو گئے ہیں لیکن نہ ہاتھ میں چھڑی ہے نہ کوئی سہارا دے کر لایا ہے۔ غالباً گاڑی بھی خود ہی چلا کر لائے ہوں گے۔“

”آواز میں بھی وہی گرج ہے جیسے علی گڑھ میں دوسو لڑکوں کی کھاس لے رہے ہوں۔“

”لسانیات کے طلبہ گھر پر آتے ہیں انہیں پڑھاتے ہیں۔ سینکڑوں بی ایچ ڈی کے مقالے آتے ہیں ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دل گھبراتا ہے تو شعبہ اردو میں چلے جاتے ہیں۔ تمام کام معمول کے مطابق کر رہے ہیں۔“

”سب سے بڑی بات یہ کہ پابندی سے بلاناغہ بیوی کی قبر پر جاتے ہیں۔“

”جی ہاں 80ء میں شاید ان کی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ ایک دن کی غیر حاضری نہیں ہوئی۔ پابندی سے قبر پر جاتے ہیں۔“

”ایسی وضع داریاں اب کہاں صاحب جس کے ہو گئے ہیں۔ موت بھی حائل نہیں ہونے پاتی۔“

”لکھا کام کیا ہے اس شخص نے۔“

”حکومت کی بجائے جی دیکھیے آج تک حکومتی سطح پر



انہیں سراہا نہیں ملا۔ کیسے کیسے لوگ حسن کارکردگی کے تمغوں اور تمغائے امتیاز سے نوازے جا رہے ہیں ڈاکٹر صاحب کو کسی نے پوچھا؟

”ان تمغوں سے کیا ہوتا ہے جناب۔“

”ہوتا تو کچھ نہیں لیکن کام کرنے والے کا حوصلہ

بڑھتا ہے۔“

”ڈاکٹر صاحب پر ان چونچلوں کا کوئی اثر نہیں۔ وہ برابر اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔“

”بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کوئی لابی نہیں۔ دربار داری ان کے مزاج میں نہیں۔ کھرے آدمی ہیں۔ جو بات ہوتی ہے منہ پر کہہ دیتے ہیں انہیں نوازاجائے تو کیسے۔“

”وجہ کوئی بھی ہو۔ ہے یہ حکومت کی بے بسی۔“

☆.....☆

سادگی نے کمرہٴ بست باندھی۔ پذیرائی کی خوشبو ذہن کے درپچوں کو مہکا نے تھی۔ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں جو باتیں ہوئی تھیں خودنوشت مکمل کرنے کا جو اصرار ہوا تھا وہ ابھی تک ذہن کو مہکا رہا تھا۔ رات ہوئی تو یادوں کا دفتر کھل گیا۔ قلم اٹھایا اور اگلی قسط لکھنا شروع کر دی۔ پھر یہ ہوا

راتوں میں جو چھڑ گئی ہیں باتیں

باتوں میں گزر گئی ہیں راتیں

جان کو کام استے لگے ہوئے تھے کہ فراغت کم ہی مل رہی تھی لیکن جب وقت ملتا تھا علی گڑھ کی سیر کونکل جاتے تھے۔ ماضی کو آواز دیتے تھے اور قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے تھے۔ شاید کچھ ہونے والا تھا کہ دل کہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو یہ کام نمٹا لیا جائے۔

6 ستمبر 1994ء کا دن طلوع ہوا تھا۔ وہ حسب معمول اہلیہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے بعد قبرستان سے واپس لوٹے تھے۔ لکھنے کی میز پر خودنوشت لکھ لکھے ہوئے صفحات رکھے ہوئے تھے۔ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ یہ کم از کم چھ قسطوں کا مواد تھا جو وہ لکھ چکے تھے۔ انہیں یاد آیا کہ اکتوبر کی قسط چھپنے کے لیے تہذیب کے دفتر میں بھیج دی ہے۔ اتفاق سے ایک صاحب ایسے بھی آگئے جن کے ذریعے یہ صفحات تہذیب کے دفتر بھیجے جاسکتے تھے۔ انہوں نے یہ صفحات ان کے حوالے کر دیے۔ ٹیلی فون بھی کر دیا کہ کم از کم چھ قسطوں کا مواد روانہ کر رہا ہوں۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ لسانیات کی تعلیم کے لیے آنے والے طلبہ آگئے۔ انہیں پڑھانے بیٹھ گئے۔

دو پہر تک بالکل ٹھیک تھے لیکن شام کو ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ انہیں میڈی کینسر اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے انہیں فوراً طبی امداد دی۔ یہ خوشخبری بھی دی کہ فکر کی بات نہیں البتہ احتیاط کے طور پر داخل کر لیا کہ رات بھر یہ آرام کریں گے اور صبح انہیں چھٹی دے دی جائے گی۔ وہ رات انہوں نے آرام سے بسر کی۔ 7 ستمبر کی صبح وہ سو کر اٹھے تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ خود اٹھ کر غسل خانے میں گئے۔ ہاتھ منہ دھویا۔ تروتازہ ہو کر باہر نکل آئے۔ چھٹی ہونے والی تھی۔ چھٹی سے پہلے ڈاکٹر معائنے کے لیے آیا اور ان سے بلڈ پریشر چیک کرنے کے لیے کہا۔ انہوں نے کروٹ بدلی لیکن یہ کروٹ آخری حرکت ثابت ہوئی۔ ان کی روح نفیس معصری سے پرواز کر چکی تھی۔ ایسی سہل موت نیک لوگوں کو ہی ملتی ہے۔

یہ خبر جیسے ہی جامعہ کچنی تمام دفاتر بند کر دیے گئے۔ اساتذہ، طلبہ و طالبات افسر اور ملازم تعزیت کے لیے ان کے گھر پہنچ گئے۔ ہر آنکھ اشکبار ہر چہرہ اداس تھا۔

ان کا جنازہ شام 5 بجے ان کی قیام گاہ سے اٹھایا گیا۔ جامعہ مسجد اسٹاف ٹاؤن میں عصر کی نماز کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی اور جامعہ کراچی کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہ وہی قبرستان تھا جہاں ان کی اہلیہ دفن تھیں۔ دونوں کی قبریں گلاب کے پھولوں سے چھپی ہوئی تھیں۔

دوسرے دن ملک بھر کے اخباروں نے ان کی تعزیت کی خبریں شائع کیں۔ کئی دن تک اداروں میں ان کی خدمات کو سراہا جاتا رہا۔ ان کی شخصیت پر مضامین شائع ہوتے رہے۔

محشر بدایونی نے ان کی وفات پر قطعہ تاریخ کہا۔ یہ قطعہ جنگ کراچی میں شائع ہوا۔

جہان ادب میں کہاں  
وہ دانش ور نکلتے داں  
یہی اب ہے دل کی صدا  
ہوئے لیٹ جنت نشاں

(7 ستمبر 1994ء)

### ماخذات

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی (علمی و ادبی خدمات)  
ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔ رفت و بود (خودنوشت)

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

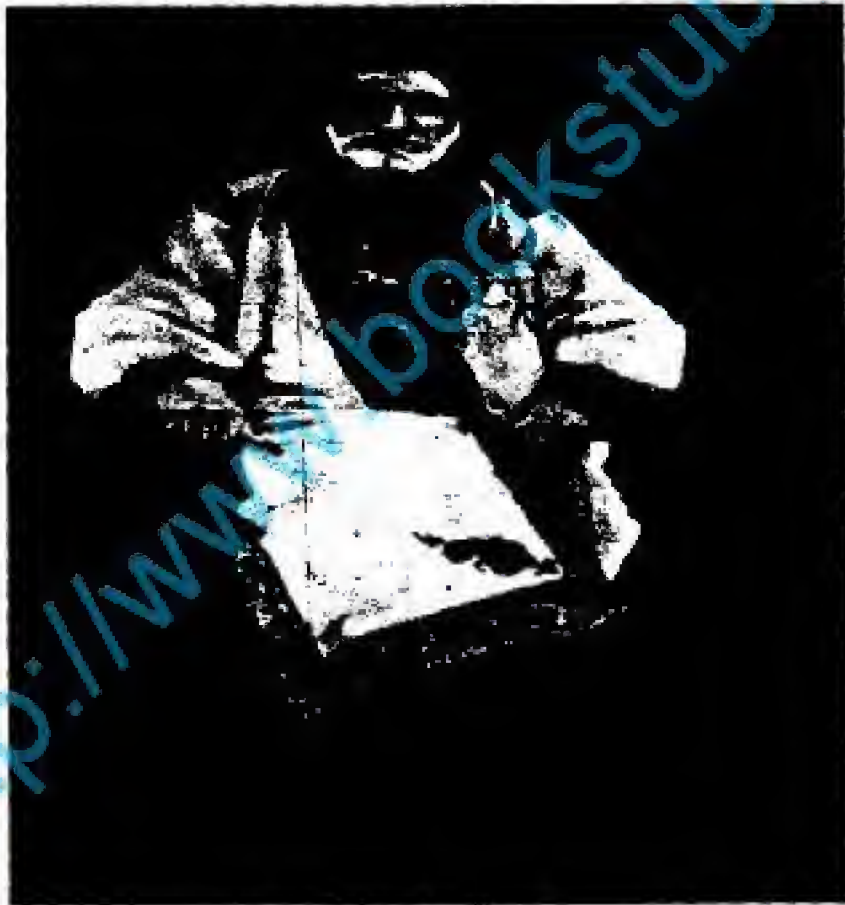


# شمس العلماء

ابن کبیر

ایک چھوٹے سے انتہائی پسماندہ علاقے میں جنم لینے والے نے اپنی تحریر اور لیاقت کی بدولت پورے برصغیر میں خود کو منوایا۔ اس نے سندھی ادب کو نئی زندگی دے کر اس کے خزانے کو لبالب بھر دیا۔

سندھ کے اس سپوت کا زندگی نامہ جس پر پورا پاکستان فخر کرتا ہے



سورج کی کرنیں نہر کنارے اتری آئیں۔ جاڑے کی دھند دھیرے دھیرے چھٹنے لگی مگر ابھی زمین خوابیدہ تھی۔ سکوت کے اس لمحے کچھ مکان میں قلعاری گونجی۔ وہ کسی ترانے کے مانند تھی۔ دہلیز پر کھڑے آدمی کا دل شکر سے بھر اٹھا۔ اس نے آسمان پر پھیلے نور پر نگاہ کی۔ مکان میں ایک سرگرمی ہوئی اور اس نے اپنے بیٹے کا نام پالیا۔ سچ... یعنی تلواری! یہ عجیب بے سبب نہیں تھا۔ اس کا ایک پس منظر تھا۔ دریا کے سندھ سے نکلنے والی پہلی نہر کے کنارے کھڑا وہ آدمی



نفظ پانچ عشروں میں کئی صدیاں جی چکا تھا۔ طویل جنگوں اور ہجرتوں پر محیط اس کی کہانی افسانوی لگتی تھی۔ اور اُس صبح جب مؤذن قلازع کی سمت پکار رہا تھا، تقاضا کر رہی تھی کہ وہ اپنے سپوت کا نام سنا کر رکھے۔

مرزا فریدوں بیگ گزر بسر کے لیے ٹوپیاں بناتا تھا۔ اُس کی ٹکھڑ پیوی سلائی کڑھائی کیا کرتی۔ بمشکل گزارہ ہوتا۔ مگر کمپرسی اس کا مقدر نہیں تھی۔ کچھ برس قبل وہ سندھ کا معزز ترین آدمی تھا۔ شاہی قلعے کا ایک با اختیار کلین۔ میروں کی حکومت کا ایک ستون۔۔۔ پر اب وہ ایک کچے مکان میں مقیم تھا۔ اور حالات کے جبر سے بچ جانے والے جواہرات فروخت کر کے اپنی اولاد کے لیے تعلیم خرید رہا تھا۔ یہی زیور نومولود کے ماتھے کا جھومر بننے والا تھا، جس کی قلعاری سے درختوں پر پھول کھل اٹھے تھے۔

اس کہانی کا آغاز کچھ عرصے قبل ہوا۔

اٹھارویں صدی کا آخری عشرہ تھا۔ ایرانی سلطنت کا چاری بادشاہ کے ہاتھ میں تھی۔ انگریزوں نے ابھی سندھ پر قبضہ نہیں کیا تھا۔ تب مرزا فریدوں بیگ یہاں سے میلوں دور۔۔۔ بھیرہ اسود کے کنارے اُس ریاست میں پیدا ہوا، جو آج جار جیا کہلاتی ہے۔ اس نے شہر کا ختی کے ایک متمول گھرانے میں آنکھ کھولی تھی، جس کے پاس انجیل کھولنے سے پہلے چوما کرتے اور ہر اتوار باقاعدگی سے گرجا جاتے۔

علاقے کے پادری نے اس کا نام سڈنی تجویز کیا۔ ابھی وہ کم سن تھا کہ بد بختی نے اس کے آبائی وطن پر حملہ کر دیا۔ فارسی اور ترک جب روسیوں کے خلاف صف آراء ہوئے، تو یہ خطہ میدان جنگ بن گیا۔ فارسی غالب آئے۔ اُس کا باپ جنگ میں کھیت رہا۔ جن لوگوں کو جنگی قیدی بنا کر ایران بھیجا گیا، ان میں چھ سالہ سڈنی بھی شامل تھا، جو ابھی خوف سے تازہ تازہ آشنا ہوا تھا اور ارد گرد کے واقعات کو حیرت سے دیکھا کرتا تھا۔

شاہی قید خانے میں کچھ عرصے قبل وہ صبر سے پرے بازاروں سے گزرا۔ آسمان کو چھوتے میناروں، پر شکوہ لہجہ والے شہر سائے تھے۔ پر یہ چمک دمک اُس کا خوف نہ نہ کر سکی۔ زنداں کے ادھر آسمان پیکا اور خاموش تھا۔ ایک چپ گئی، اداسی تھی کہ وہ حسین کا مہینا تھا۔

ایران کی سرحدیں سندھ سے ملتی تھیں جہاں کلہوڑوں کا دور ختم ہو چکا تھا۔ میر برسر اقتدار آگئے۔ اب ادھر میر کرم علی خان تالپور کا سکھ چلتا تھا۔ قاجاری بادشاہ محمد کریم خان زنداؤر

میروں کے روابط مضبوط تھے۔ تحائف کا تبادلہ معمول تھا۔ جار جیا پر غلبے کے بعد فارسیوں نے سندھ کو جو تحائف بھیجے، ان میں ایک نو سالہ بچہ بھی شامل تھا۔

سڈنی نے ایرانی سرحد عبور کی تو ایک نئی دنیا دیکھی۔ یہ وہ زمین تھی، جس کے بارے میں ہندوؤں کی مقدس کتاب ”رگ وید“ میں درج ہے ”تو کلہوڑوں کی دولت سے مالال ہے، رتھوں کے بیڑوں سے مالامال ہے، زر ق برقی کپڑوں کی فراوانی سے مالامال ہے۔“ اور اس کے دریاؤں کے بارے میں کہا گیا ہے ”اے سندھو، تو اپنی روانی میں آگے ہی آگے دوڑے چلا جاتا ہے کہ خوشی حالی کے دیوتائے دھرتی پر تیری گزرگاہ متعین کر دی ہے۔“

فارسی بولنے اور سمجھنے والے تو ادھر بھی تھے مگر طرز تعمیر اور رہن سہن خاصا مختلف۔ کشادہ اور ہوادار مکانات۔ دریا کنارے آباد شہروں میں شام اترتی تو ساتھ ٹھنڈی ہوا میں لاتی، جو مزارات کے گنبدوں سے ٹکرا کر بے رونق بازاروں میں گشت کرتی۔ بازار۔۔۔ جہاں خریداروں کا اجم ہوتا۔ بھاؤ تاؤ ہو رہا ہوتا تھا۔ اس زمانے کا سندھ معاشی طور پر مستحکم تھا۔ تجارت عروج پر تھی۔ یوں تو یہاں کے زیورات، کپڑوں، منسج ظروف کا چرچا تھا، مگر سب سے زیادہ مشہور تھے یہاں کے ہتھیار۔ موجودہ حیدرآباد کی کتنی اس وقت ہندوستان میں ہتھیاروں کی بڑی منڈیوں میں ہوا کرتی تھی۔ مورخصن لکھتے ہیں کہ یہاں مکانوں کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے بادگیر لگے ہوتے جو منگ کہلاتے تھے۔ جب انگریزوں نے شہر پر حملہ کیا تو وہ اُسے تو نہیں سمجھ سکیے۔

دانی کی پکار نے فریدوں بیگ کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ وہ اندر چلا گیا۔ سورج کی تازہ روشنی اب مکان کو بھرنے لگی تھی۔ دانی نے بچہ گود میں دے دیا۔ اس نے روشنی کے رخ پر بچے پر نظر ڈالی۔ بچے کی آنکھوں میں وہ چمک تھی، جو اس کے بوڑھے باپ کی آنکھوں میں ماند پڑنے لگی تھی۔ آدمی دھیرے سے مسکرایا۔

باہر بچہ ال رہے تھے۔ اندرونی کمرے میں بستر پر دراز اُس کی بیوی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ چراغ کی روشنی میں اس کی گندی رنگت اور مقامی خدوخال کے پیچھے ایک چمکی رنگ دکھائی دیتا تھا۔ ایسا رنگ جو ہزار میلوں دور واپس ایک سرسبز خطے سے عورت کے تعلق کی کہانی بیان کرتا۔ اُسی خطے سے۔۔۔ جہاں فریدوں بیگ نے آنکھ کھولی تھی۔ اور یہ تعلق کوئی راز نہیں تھا۔ وہ جس شخص کی بیٹی تھی، اس



نے بھی جوڑ چیا میں آنکھ کھولی تھی۔ اسے بھی جنگیں اور ہجرت  
دریاے سندھ کے کنارے پہنچ لائی تھی۔ وہ بھی شاہی قلعے  
میں پروان چڑھا تھا... اور اب فریدوں بیک کے مانند بے گھر  
ہو چکا تھا۔

خسرو بیک نے سندھ کے جہانی گھرانے کی ایک لڑکی  
سے شادی کی تھی۔ جب بیٹی جوان ہوئی، تو اپنے عزیز دوست  
فریدوں بیک کے نکاح میں دے دیا۔ یہ وہ دور تھا، جب ان  
دوستوں کو تالپور دربار میں شاہ کی خصوصی شفقت اور توجہ میسر  
تھی۔ جب وہ شہزادوں کی زندگی گزار رہے تھے، مگر اب... یہ  
دھرتی غیروں کے قبضے میں تھی۔

باورچی خانے میں کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔ فریدوں  
بیک نے بچہ والی کوسونپ کر خاندانی ملازم کو پکارا، جسے اس  
کچے مکان میں فقط وفاداری کے جذبے نے باندھ رکھا تھا۔  
گھر کے مالک کے پاس اتنے وسائل کہاں تھے کہ وہ ملازم  
رکھ سکے۔ گو اسے نئی سرکار نے متعدد بار ملازمت کی پیشکش  
کی، مگر اس وضع دار شخص نے بڑی نرمی سے انکار کر دیا۔

اپنا نام سن کر ملازم دوڑا چلا آیا۔ فریدوں بیک اُسے  
اپنے سر کے گھر بیچنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ انہیں خوش خبری پہنچا  
سکے، مگر کچھ سوچ کر خیال بدل دیا۔ ”میں خود ہوتا ہوں۔“  
وہ ان بازاروں، راستوں اور شہروں کے پاس سے  
ہوتا ہوا گزرا، جہاں کل زندگی چکا کرتی تھی مگر اب اداسی کا  
راج تھا۔ سب ہوتے ہوئے بھی ایک خلا تھا، غلامی کا  
پیدا کردہ خلا۔

خسرو بیک نے دروازے پر آکر اس کا استقبال  
کیا۔ یہ دونوں جو زمین باندھے ادھر کے باحول سے خوب  
کھل مل گئے تھے۔ یہاں کی بعدی باش اپنائی تھی، مگر لگوں میں  
وہ رنگ کچھ کچھ باقی تھا جو اُن کی عجیب و غریب کہانی کی  
جانب اشارہ کرتا۔

مبارک باو کے تادسے اور ایک دوسرے کا منہ بیٹھا  
کرانے کے بعد وہ اوطاق میں آن بیٹھے۔ خیر خیر، یہاں  
تو علم و ادب پر بات ہوئی جو انہیں چپکے سے سیاست پر لے  
یکدم اپنی ریاست پر قبضے اور قلعے سے بے دخلی کا غم  
تازہ ہو گیا اور ساتھ ہی وہ مشترکہ داستان بھی جس نے انہیں  
باہم جوڑ رکھا تھا۔

☆☆☆☆

چار عشروں قبل ایک غم بستہ صبح فریدوں نے پہلی بار

ہاہواہ سرگزشت

اس نوجوان کو دیکھا تھا جس سے اُس کی دوستی مرتے دم تک  
قائم رہنے والی تھی۔

اس وقت وہ نہیں جانتا تھا کہ معزز افراد میں جیسے نصیب  
لباس میں ملیں اس نوجوان میں آخر ایسا کیا تھا جو اسے اپنی  
طرف کھینچ رہا ہے۔ کیوں وہ اسے اپنا اپنا لگتا ہے۔ مگر جب  
اس نے سورج کی تیز روشنی میں اس پر دوسری بار نظر ڈالی تو فوراً  
سمجھ گیا کہ وہ بھی اس کی طرح غیر مقامی ہے۔ اہت یہ جاننے  
کے لیے کہ اس کا تعلق بھی گرجستان سے ہے، اسے چند روز  
انتظار کرنا پڑا، جب دونوں میں ابتدائی جملوں کا تبادلہ ہوا۔

خسرو بیک کے نام سے پکارے جانے والے نوجوان  
نے جب اس کی مادری زبان میں خیریت دریافت کی تو وہ  
بھونچکا رہ گیا۔ تاہم یہ پہلا موقع نہیں تھا جب حیرت کی لہر پوری  
قوت سے اُس سے ٹکرائی ہو۔ تھیر کا پہلا تجربہ اس روز ہوا تھا  
جب ننھے سڈنی کو میر کرم علی خان کے پڑھکھوہ دربار میں پیش کیا  
گیا تھا اور بادشاہ اُس سے پدرانہ شفقت سے پیش آیا تھا۔

ممکن ہے کہ شفقت کا جذبہ میر میں بہ درجہ تمام موجود ہو،  
مگر مورخین کے خیال میں اس کا بنیادی سبب بے اولادی کا بے  
انت کرب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ برس قبل جب قاجاری بادشاہ  
کی جانب سے بھیجے جانے والے جنگی قیدیوں میں اُس کی نظر  
نیل آنکھوں والے گرجستانی لڑکے پر پڑی تو یوں لگا جیسے وہ  
اپنے بیٹے کو دیکھ رہا ہے۔ اور ایسا ہی احساس کچھ برس بعد تب  
جاگا، جب اُس نے دس سالہ سڈنی کو اپنے رو بردار پایا۔

میر کرم علی نے نوجوان خسرو بیک کی مانند اس بچہ کی  
ذمہ داری بھی شاہی اساتذہ کو سونپ دی۔

نئی ثقافت، نئے مذہب سے ہم آہنگ ہونا، نئے طور  
طریقے سیکھنا یقینی طور پر بچے کے لیے مشکل ہوتا، مگر خسرو  
بیک کی موجودگی نے مشکل آسان کر دی جو اس نئی دنیا اور گرم  
موسموں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو چکا تھا۔ اسے سڈنی  
میں... جسے اب فریدوں بیک کہہ کر پکارا جاتا تھا، اپنا چھوٹا  
بھائی نظر آتا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فریدوں کی پرورش اور  
فصاحت سازی میں جہاں دربار کے جید اساتذہ کا ہاتھ تھا،  
وہیں خسرو بیک نے بھی کلیدی کردار ادا کیا۔

وہ برہمنوں کے ساتھ بیدار ہوتے۔ صبح ساتھ نماز ادا  
کرتے۔ کتب سے لوٹ کر خسرو اسے تلواری بازی سکھاتا۔  
باغبانی کے عمل و تقویٰ سے روشناس کرواتا کتب ان کے  
مطالعے میں راہیں۔ جو کسی کی سیر کو جاتے۔ دربار میں اٹھنے  
بیٹھنے کے آداب بھی وہ سیکھ جان گیا۔ فارسی سیکھنے میں تھوڑا



کھیل کود میں مصروف ہوتے، وہ محسن کے کونے میں بیٹھا انہیں ہلکاترہتا۔ اور جب دیگر بچے ضد کرتے، وہ خاموشی کو اپنا ہتھیار بناتا۔ ایک سہ پہر بڑوں کی ایک بڑی بی بی یہ جاننے کے لیے کہ فریدوں بیک کا لڑکا اکیلا بیٹھا کرتا کیا رہتا ہے، کئی گھنٹے نظریں گاڑے بیٹھی رہیں۔

اس تھا کا دینے والی جاسوسی کے بعد ان پر عقدہ کھلا کہ بچہ تنگ سے مٹی میں لکیریں بناتا ہے۔ جب یہ بات باپ کو پتا چلی تو ذہن کے پردے پر ماضی کے مناظر کھوٹنے لگے۔ اسے بھی تو بچپن میں ایسا ہی شوق تھا۔ وہ بھی زمین پر لکیریں بنایا کرتا۔ مگر پھر اس کی زمین بارود اور خون سے بھر گئی۔ لکیریں مٹ گئیں۔

فریدوں بیک نے سر جھٹک دیا۔ اپنے بیٹے کی سمت دیکھا، جس کے کشادہ ماتھے کے نیچے چھوٹی اور تیز... آنکھیں خوب جتنی تھیں۔

”یہ مصور بنے گا مصور۔“ آدمی نے تالی بجاتی۔ ”میں اس کے لیے رنگ لیے آتا ہوں۔ ان سے کھینا رہے گا۔“ رنگوں سے جلد ہی اس نے دوستی کر لی، مگر نئے بچے کو اصل عشق ان کہانیوں سے تھا جو اس کی ماں اور نانی سنایا کرتیں۔ جو اتنی پُر جھس ہوتیں کہ راتیں مہری ہوتی جاتیں اور وہ نیند کے جھوٹوں سے آزار کہانی سنے جاتا۔

یوں تو کتنی ہی کہانیاں تھیں... اولیاء کے قصے، نیک دل بادشاہوں کی داستانیں، جنات اور پریوں کی باتیں، مگر جس کہانی نے اس کے ذہن پر امنٹ نقوش چھوڑے تھے، اسے سناتے ہوئے نہ جانے کیوں غمور توں کی آواز رنہ جاتی اور محسن میں بھی باپ کی چار پائی سے سسکی بلند ہوتی۔

”ایک تھا بادشاہ۔ نیک اور رحم دل۔ علم و ادب کا دلدادہ۔“ تاروں بھرے آسمان تلے عورت کی آواز سنائی دیتی۔ ”اس کی سلطنت میں ہر سون چھین چھین ہی تھا۔ کئی کئی مکتب۔ امن و امان۔ بازار پر روشنی۔ تمام مذاہب کے لوگ، تمام قومیں مل جل کر رہتیں۔ کوئی کسی سے نہیں جھگڑتا۔ شہر کیا تھے، اسلامی طرز تعمیر کے شان دار نمونے تھے۔ بڑے بڑے روشن اور ہوادار گھر۔ بزرگوں کے محراب تھیں۔“

”سچ اور اس سے بڑے بھائی توجہ سے یہ کہانی سنا کرتے۔ فریدوں بیک کے کان بھی ادھر ہی لگے ہوتے۔“

”یوں تو خدا نے بادشاہ کو ہر نعمت سے نوازا، مگر ایک غم اسے کھائے جاتا۔ اس کی اولاد نہیں تھی۔ یہ قلق تھا کہ اس کی وسیع و عریض سلطنت کا کوئی وارث نہیں۔ بہت جتن کیے۔

وقت ضرور لگا، مگر اس کی ذہانت نے یہ پہاڑ بھی سر کر لیا۔ الغرض چند برسوں میں وہ اتنا بدل گیا کہ اگر اسے قاجاری بادشاہ کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ کبھی پہچان نہ پاتا کہ یہ وہی جنگی قیدی ہے جو اس نے اپنے دوست کو گتھے میں دیا تھا۔

کچھ روزوں اور آسموں کے اس دیس میں وہ ایسا ریح بس گیا کہ اپنی زمین سے جدائی کا غم ماند پڑ گیا۔ ہاں کبھی کبھی سینے میں ایک غلا کا احساس ہوتا مگر وقت بڑا نرم ہے۔

شاہی قلعے میں شہزادوں کے مانند رہنے والے ان دونوں غیر ملکوں نے اپنی قابلیت کے وسیلے سے جلد نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ دونوں میر کرم علی کے بے حد قریب تھے۔ انہیں مرزا کا خطاب دیا گیا۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد خسرو بیک نے سندھ کے ایک معزز قبیلے کی ایک دو شیزہ سے شادی کر لی۔ اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جب وہ جوان ہوگی، تو اسے اپنے عزیز دوست کو بیاہ دے گا۔

تو 1853 کی اس مختصر سی صبح خسرو اور فریدوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں جہاں کرب تک ماضی کی پرچھائیں تھیں وہیں ایک روشن کل کی آس بھی جھلکتی تھی... کیونکہ سچ پیدا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

فصل چک کر تیار کھڑی تھی۔ گندم کے کھیتوں میں لہریں ہی ڈوٹی ابھرتیں۔ کسان بھی کٹائی کو تیار ہو گئے تھے۔ کل تک درستی چلاتے ہوئے ان کے لبوں پر ایک لازوال شاعر کے گیت ہوتے:

ابھی بستیوں سے تو نہ موڑ  
آئے دن کا رونا دھونا چھوڑ  
جوگ لے آؤں کے گاؤں میں جا کر  
توڑ دنیا سے اپنے تاتے توڑ

پر اب پہلے سا جوش نہیں تھا۔ وہ خوف زدہ تھے۔ اپنے حق پر ڈاکے کا خیال انہیں کھائے جا رہا تھا۔ بلی ابھر رہی تھی۔

سندھ جہاں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ سکھ اور پارسی بھی آباد تھے، جہاں فارسی سرکاری زبان تھی، جہاں شاہ لطیف کے گیت گاؤں گاؤں گائے جاتے تھے... دھیرے دھیرے بدلنے لگا تھا۔ نئے حکمران نے نئے طور طریقوں کے ساتھ اپنی دھرتی پر اترے تھے۔ اور تبدیلی کی ان ہی ہوائیوں میں سچ نے شعور کی دہلیز پر قدم رکھا۔

وہ اور بچوں سے یکسر مختلف تھا۔ جب اس کے بھائی



بزرگوں سے دعا کروائی۔ چلے گئے، مگر خوشی پر یاس کا پہرہ رہا۔ پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ بڑی ملک سے کچھ جنگی قیدی آئے، جن میں ایک معصوم بچہ بھی تھا۔ بچے کو دیکھ کر بادشاہ کے دل میں...

فریدوں بیک مسکراتا۔ عورت بولے جاتی تارے بھی جھک کر سننے لگتے۔

تو کہانی آگے بڑھتی ہے۔ زندگی اپنی ڈگر پر جا رہی تھی کہ اچانک بدبختی کے بے انت سلسلے کا آغاز ہوا۔ ایک عفریت نے سلطنت پر حملہ کر دیا۔ اس کے ساتھ شیاہین کی فوج بھی اور اس کے ہتھیار آگ اٹھا کرتے تھے۔ اس عفریت نے پہلے ہی اردگرد کی ریاستوں پر قبضہ جمالیا تھا، مگر بادشاہ کی بہادر فوج کے خوف سے دشمن نے براہ راست حملہ کرنے کی بجائے سازشیں شروع کر دیں۔ تجارتی قافلوں کو لوٹا۔ اردگرد کے قصبوں میں کھراں مچایا۔ بالآخر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ 1843 میں انہوں نے قلعے کو جانے والی نہریں بند کر دیں اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ بادشاہ کی فوج نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، مگر عفریت کے پاس جہان بھر کا اسلحہ تھا۔ بالآخر بادشاہ کو شکست ہوئی۔ قلعے پر قبضہ کر لیا گیا۔ بادشاہ کو گرفتار کر لیا گیا اور کئی میل دور بنگال کے ایک شہر بھیج دیا گیا۔

عورت کی آواز یہاں پہنچ کر رندہ گئی۔ سامعین کی کشتی بھی غم کی لہروں میں الجھنے لگے۔ کہانی کے اس موڑ پر فریدوں کے دل میں اپنے محسن سے جدائی کا غم تازہ ہو جاتا ہے۔ جب میر کرم علی کو جلا وطن کر کے بنگال بھیجا جا رہا تھا، تب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اور خسر و بیک بھی ساتھ جائیں گے، مگر میر کرم علی کو یہ گوارا نہیں تھا۔ فریدوں کی ضد اپنے محسن کے حکم کے آگے ہار گئی۔ اسے تنہا رہتے ہوئے تالپور گھرانے کی دیکھ کر کچھ کی ذلت واری سوچیں گے، جواب نہر کے کنارے کچے مکانات میں آباد تھا۔ قلعے پر لاکھ بڑوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک عرصے سے سندھ کی دولت پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے۔

لنیرے وسائل پر قابض ہو گئے تھے۔ جاگیریں ضبط ہوئیں۔ شاہی گھرانے کے معززین کے پاس فقط شاہ کے مطا کردہ جو اہرات تھے، جنہیں فروخت کر کے وہ گزر بسر کا امکان پیدا کرتے، مگر فریدوں بیک کا تعاقب کرتی بد قسمتی اس بچے کچھے اٹاٹے پر بھی حملہ کرنے والی تھی۔ تقدیر اس جری شخص کا امتحان لے رہی تھی۔

ایک رات مکان میں چھائی تاریکی میں دو دہکتی

مرزا قلیچ بیک بلاشبہ جدید سندھی ادب کے بنیاد گزاروں میں سرفہرست نظر آتے ہیں۔ ان کی اکیلی شخصیت، محنت اور کام نے جدید سندھی ادب کو جتنا ثروت مند بنایا، اتنا ثروت مند بہت سے ادارے بھی نہیں کر سکے۔ سندھی کے نثری ادب کا قلیچ بیک کے بغیر تصور بھی ممکن نہیں۔

ادبی تاریخ میں کبھی کبھی ایسی حیثیتیں بھی پیدا ہوتی ہیں، جنہیں بیک وقت مختلف تخلیقی صلاحیتیں دوایت ہوتی ہیں، وہ بیک وقت نثر و نظم میں اپنے کمالات کے ایسے جادو جگا جاتے ہیں کہ قاری فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ اپنے ممدوح کا شمار بہ حیثیت شاعر کرے یا انہیں نثر نگار کی حیثیت سے یاد کیا جائے، اردو ادب میں مولانا الطاف حسین حالی اس کی بہترین مثال ہیں۔ بالکل اسی طرح کی شخصیت سندھ ادب میں مرزا قلیچ بیک کی ہے، جنہوں نے نثر کا دامن ڈھالی تین سو کتابوں کے ذخیرے سے پر مایہ بنا دیا ہے۔ ان کا بنیادی کام وراثت جدید سندھی ادب کو عالمی ادب کے منتخب شہ پاروں سے ملانا مل کر رہا۔

(جدید سندھی ادب از سید مظہر جمیل)

آنکھیں ظاہر ہوئیں۔ پہلے پہل جس نے دیکھا، خیال کیا کہ یہ کوئی ناگ ہے۔ حارم لاٹھی لے آیا۔ مگر پھر ان آنکھوں کی دہک بڑھتی گئی۔ مکان کے ایک کونے میں شعلے بجڑک اٹھے تھے۔ آگ نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے مکان کو لپیٹ میں لے لیا۔

نصیحت کی سماعتوں سے چھین کر آئیں تو وہ سمجھا کہ کوئی سہنا دیکھ رہا ہے۔ جب بڑے بھائی نے چٹخوڑ کر اٹھایا تو وہ متحیر رہ گیا کہ آخر رات اتنی روشن کیوں ہے اور یہ صدمت کیوں

بڑھ رہی ہے؟ اگر کوئی کھینچ کر نہ نکالتا، تو وہ گرتے شہتر کی زد میں آ جاتا۔ کچھ بریشان کن پلوں بعد وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ مہبوت تھا، حال اس کا مکان دھڑ دھڑ بھڑ رہا تھا۔ اردگرد کھراں مچ گیا۔ لوگ مانی لیے دوڑے۔ کچھ لوگ برتن اٹھائے نہر کی سمت گئے۔ پورا محلہ فریدوں بیک کی مدد کے لیے آگیا، مگر نقصان پر قابو پانہیں سکا۔ آگ نے بڑے جھمکے کو اپنی



چپے پر ان کے پیغامات ثبت ہیں۔ ان کا کلام یہاں کے  
باسیوں کے دل کا تار ہے۔ صوفیانہ گیتوں نے سازوں کو بھی  
قبولیت و مقبولیت بخشی۔ جب شامیں اترتیں تو کسی خاموش  
مرکان میں سارنگی کے تار چھڑتے، کہیں ستارنج رہا ہوتا۔ کہیں  
سے بانسری کی مدھر آواز سنائی دیتی۔ یہ وہ موسیقی وہ گیت  
تھے، جو انسان کو اپنے خالق کی سمت متوجہ کرتے۔ روح کی غذا  
ثابت ہوتے۔ جب اس سنگیت کی لہریں ننھے بچے کے دل سے  
نکراتیں تو وہاں جل ترنگ سا بچے لگتا اور وہ صوفیانہ کلام کی  
سمت کھنچا چلا جاتا۔

مستم خانے اور یہ ناقوس  
کاش بہت جاگیں تیری راہوں سے  
دیکھ ساجن تجھے بلاتا ہے  
اپنا دامن بچا گناہوں سے  
تو یہ شاہ لطیف کے جاودہ فیاض تھے جنہوں نے اوائلی  
عمری میں اس کے خیالات کو جلا بخشی۔ ان ہی انشوں کی تاثیر تھی  
کہ اس نے ستار سے ربط پیدا کیا اور اپنی انگلیوں کی معصومانہ  
حرکت سے تاروں میں چھپا سُر کھوج نکالا۔ ستار سے اس کی  
دوستی آگے گئی برس قائم رہی۔ جہاں تک شاہ لطیف سے عشق کا  
تعلق ہے، اس کے اختتام کے لیے خود موت کو حاضر ہونا پڑا۔  
مدرسے کے ماحول سے تو ہمارے بچے کی گاڑی چھٹی  
تھی مگر شہر بھر میں ہونے والی تبدیلیاں اسے متجربہ رکھتیں۔

دریائے سندھ کے پُر سکون پانیوں پر تیرتی کشتیوں  
کے درمیان پہلے بچاتے تیز رفتار اسٹیمر اس سمیت بہت سے  
مقاسیوں کو تعمیر کر دیتے تھے۔ وہ شور مچاتے ہوئے پانی پر  
اڑتے معلوم ہوتے۔ نئی عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ اس عمل  
میں جدت درآئی تھی۔ دریا عبور کرنے کے لیے قوی الجذب پلوں  
کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ ویرانے کھٹ پٹ سے گونجا کرتے کہ  
چھاپے خانے لگ رہے تھے۔ سرکاری دفاتر میں بھی جا بجا  
نئے آلات۔ زندگی کا پیہر یکدم تیزی سے گھومنے لگا تھا۔

یوں تو ہر نئی شے مقامیوں کی توجہ اپنی جانب مبذول  
راہ چلتے اسے مزہ مڑ کر دیکھتے مگر سب سے اہم تھے جا بجا کھلنے  
والے انگریزی اسکول جنہوں نے اقتدار سے محروم مسلمانوں  
کو آگ بگولا کر دیا۔ انہوں نے اُسے سازش گردانا۔ اوطاق،  
قبوے خانوں اور محفلوں میں وہ سائنس کی تعلیم اور نئے علوم  
سے متعلق کھلے عام اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔

مگر سب فریادیں بیک بھی کسی سطح پر اُن درمگاہوں  
کے بارے میں متذبذب ہو مگر ایک خاص واقعے نے اس

لیٹ میں لے لیا تھا۔  
جب آگ بجھی، تو چھپے لیے چھوڑ گئی۔ مکان تو کچا ہی  
تھا، اس کا تم نہیں، وہ تو محلہ داروں نے چند روز میں پھر تعمیر کر  
دیا، مگر میر کرم علی کے عطا کردہ جواہرات اس آتش زدگی نے  
نگل لیے۔ اصول موتی اور زیورات جل کر بے مول ہو گئے۔  
آسمان تک اٹھتے دھوئیں میں تمام اسباب خاکستر ہوا۔

کوئی اور ہوتا تو صدے سے ڈھے جاتا مگر اس تاریک  
جس زندہ رات فریدوں نے خود کو سنبھالے رکھا۔ صدے  
دیکھنے کی اسے عادت ہو گئی تھی شاید۔

سرکار نے ایک بار پھر ملازمت کی پیشکش کی مگر اس کا  
جواب نفی میں تھا۔ وہ غاصبوں کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔ ان  
لوگوں کا، جنہوں نے اسے بے گھر کیا۔ اس کی دھرتی پر قبضہ  
کیا۔ اسے کسمپرسی قبول تھی۔ نوپیاں بنانے میں وہ خوش تھا۔  
تاہم چھپا بیٹھے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے ایک منصوبہ تیار کر رکھا  
تھا۔ وہ اپنی اولاد کو ایک جدید ہتھیار سے لیس کرنے والا تھا۔  
ایسا ہتھیار، جس کی بابت کوئی نہیں جانتا تھا۔

مسلمان گھرانے میں آنکھ کھولنے والا بچہ خوش قسمتی  
ساتھ لیے پیدا ہوتا ہے کہ وہ بری تعلیم کے آغاز سے قبل ایک  
ایسی کتاب سے اکتساب فیض کرتا ہے، جو تمام علوم کا منبع ہے،  
کتاب، جو عظیم ترین انکشاف ہے۔

بچے نے سب سے پہلے قرآن پاک کی تعلیم حاصل  
کی۔ اس کی قرأت متاثر کن تھی۔ آیات کی ادائیگی کے سے  
اس کی توجہ دیکھنے کے لائق ہوتی۔ قرآن پاک پڑھنے کے  
..... بعد اس کے لیے اچھے استاد کی کھوج شروع ہوئی۔ اس  
زمانے میں اساتذہ کو معاشرے میں کلیدی درجہ حاصل تھا۔  
معززین بھی ان کے احوال کو کھڑے ہو جاتے۔ یوں تو کئی  
اساتذہ مشہور تھے، جن میں کچھ اپنا کتب چلاتے اور کچھ  
گھروں میں جا کر تعلیم دیتے، مگر بچوں کی نظر انتخاب آخوند  
محمد شفیع کی درس گاہ پر ٹھہری جس کی قابلیت کا ایک زمانہ  
معترف تھا۔

مدرسہ شہر کے شمالی سمت تھا۔ درختوں میں چھپا ہوا۔  
پُر سکون اور کشادہ۔ ماحول نیا تھا مگر ایسا بھی نہیں کہ کچا کوئی  
دقت ہوئی۔ فارسی اور عربی دونوں سے واقف تھا۔ جلد اس کی  
گنتی نمایاں طلبا میں ہونے لگی۔ جو دیکھتا ہی کہتا ہے کہ واقعی  
مرزا فریدوں بیک کا پسر ہے۔

سندھ کو صوفیاء کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ یہاں چپے



کے ذہن کی زمین پر تبدیلی کا بیج بویا۔

گو سندی اس کی مقامی زبان نہ تھی مگر وہ اس سے اتنی ہی محبت کرتا تھا، جتنا کسان اپنے کھیت سے کرتا ہے۔ سو وہ جین کہتے ہیں کہ اس زمانے میں سندی زبان کے بارہ رسم الخط رائج تھے۔ کوئی فارسی خط میں لکھتا تو کوئی دیوناگری میں۔ ہر بڑے شہر کا اپنا رسم الخط۔ اس کی وجہ سے یگانگت کی واضح کمی محسوس ہوتی۔

جب انگریزوں نے اعلان کیا کہ وہ ایک مشترکہ اور متحد رسم الخط لانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو سراسیمگی پھیل گئی اور کھیتوں پر اڑیٹے اتر آئے۔

بہت سوں نے اسے جدیدیت کی آڑ میں نئی سازش قرار دیا، مگر جب اس عمل کے لیے سندھ کے اسکالرز سے رابطہ کیا گیا اور ان کی تجاویز کی روشنی میں کام شروع ہوا، تو فریدوں، بیک جیسے کچھ باشعور افراد کا ذہن دھیرے دھیرے تبدیل ہونے لگا۔ اس نے بدلاؤ کے اس عمل کو بے حد قریب سے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سیکڑوں تختیوں پر اضافی نکتے لگائے گئے۔ زبان میں موجود تمام آوازوں کو الفاظ میں قید کیا گیا۔

غدر سے کچھ برس قبل یہ رسم الخط سندھ میں رائج ہونے کا اعلان کر دیا گیا تھا۔

اس کی پختلی اور افادیت نے جلد ہی اسے قبولیت کی سند ادا کر دی۔ انگریزوں سے ہونے والی میل ملاقاتوں نے سوچنے کی نئی جہتیں عطا کیں تاہم فریدوں، بیک، ہنوز متذبذب تھا۔ مگر پھر جون کی ایک جیسی زدہ دوپہر جب وہ برگد کے نیچے چار پانی ڈالے بیٹھا تھا اور کچھ چھاؤں کی آغوش میں نیند میں اتر چکا تھا، نہر کی سمت سے آنے والی ہوائیں غنوں کی کاصوت کالائیں۔ اس نے ایک بار پیش بزرگ کو دیکھا۔ نورانی چہرہ۔ لمبا پنچھ۔ سر پر ٹوپی۔ دو کھنڈی کے باوجود شناخت نہیں کر سکا کہ یہ شخص میر کرم علی ہے یا وہ سونی جسے اس نے کم سنی میں شاہ ایران کے دربار میں دیکھا تھا۔

”اصل غلام وہ ہے، جس کا ذہن غلام ہے، نہ کہ وہ جس کی سلطنت پر غیروں نے قبضہ کر لیا۔“

یہ الفاظ اسے غنوں کی سے یکدم باہر لے آئے۔ کچھ دیر وہ سکوت میں سانس لیتا رہا۔ شاید ان کی تعلیم میں کچھ اور وقت لگتا، اگر شام میں خسرو بیک کے ساتھ ہونے والی میٹھک میں ایک مصلح کا ذکر نہیں چھڑتا، جو برصغیر کے مسلمانوں کو جدید علوم کی جانب راغب کرنے کے لیے خود کو بیچ چکا تھا۔ وہ

سرسید کی تحریک کے آغاز کا زمانہ تھا۔ سندھ کے شہری علاقوں میں دھیرے دھیرے ان کا پیغام قبولیت حاصل کرنے لگا تھا۔ جب گریبا کی چنگلی دوپہر فریدوں، بیک نے اپنے لڑکوں کو انگریزی تعلیم دلانے کا اعلان کیا تو احباب نے بہت واویلا کیا۔ ”جناب، آپ خود ان ظالموں کا شکار بنے، اب ان کے بچھائے نئے جال میں کیوں چھٹنے ہیں؟“

جواب میں وہ مسکرایا۔ ”بھائیو، انگریز ظالم، ان کی غلامی لعنت، مگر ان کے علوم سے دشمنی کیسی۔ شیخ سدی کا قول ہے، علم شیطان سے جنگ میں بہترین ہتھیار ہے۔“

کسی اور نے اعتراض کیا، تو وہ گویا ہوا۔ ”عزیزو، سائنسی ایجادات اور ترقی تو انسانیت کی فلاح کے لیے ہے۔ انگریز ہمیشہ یہاں تھوڑی رہنے والے۔ چلے جائیں گے تو پھر ہم حکومت کریں گے۔“

شاید اس کے احباب دیگر باتیں نہ سمجھ سکے ہوں، مگر انگریزوں کے واپس چلے جانے کی پیشگوئی نے دھڑکن تیز کر دی۔ وہ خواب پھر چکا دیا، جسے وہ بھلا بیٹھے تھے۔

اور اگر ان دلائل سے بھی کوئی نہ مانا، تو اسے یوں قانع کیا۔ ”اب انگریزوں نے یہ علوم کچھ کس سے؟ ایک زمانے میں یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، مسلمان کیسا، طبعیات اور حیوانیات میں نئی نئی جہتیں کھوج رہے تھے۔ فلسفہ اور منطق بھی ہماری دین۔ ریاضی میں ہمارے کارناموں سے ایک عہد واقف۔ ہمارے ہی علم سے اب وہ لوگ استفادہ کر رہے ہیں جناب۔ اور علم تو مومن کی گمشدہ میراث ہے۔“

فریدوں کے دونوں بڑے لڑکوں نے انگریزی اسکولوں سے پڑھا۔ اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے بمبئی کا رخ کیا، مگر اس کے جس سپوت کو سندی ادب کو نئی صورت ادا کرنی تھی، اسے ابھی کچھ انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

”مالی حالت خست۔ بیوی سلائی کڑھائی کر رہے، خود ٹوپیاں بتائیں، ایسے میں کیا ضرورت تھی لڑکوں کو بمبئی بھیجنے کی۔ کیا قرآن، عربی اور فارسی کی تعلیم کافی نہیں تھی؟“

محافل میں تو معززین شہر اس قسم کی باتیں کرتے، مگر ذہنی دل میں اس کی ہمت کی بھی داد دیتے۔ اس کے حوصلے ٹھنک کرتے۔ ٹھنست خوردگی سے ابھر کر مالی دسائل کے باوجود اس کو اعلیٰ درس گاہوں میں تعلیم دلانا واقعی ایک بڑا کام تھا، جس پر فریدوں، بیک کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔



فریدوں بیک نے پیٹ کاٹ کر اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی تھی اور اس کا سب سے زیادہ احساس اس کے تیسرے لڑکے بیچ بیک کو تھا، جو احساس دل اور روشن ذہن لے کر پیدا ہوا تھا۔ گونو جوانی کی دہلیز پر تھا، پر لڑکا خرافات سے دور ہی رہا۔ جب اس کے ہم عمر میلوں ٹیلیوں میں دل بہلا رہے ہوتے، وہ شمع کی مدھم پڑتی روشنی میں مطالعے میں غرق ہوتا۔ جب اوروں کے ہاتھ میں غلیل ہوتی، اس کے ہاتھ میں قلم ہوتا۔

درمیانہ قد۔ صاف رنگت۔ کشادہ ہاتھ۔ روشن مسکراتی آنکھیں۔ لباس سادہ مگر بے داغ۔ باوقار چال۔ بیچ اپنے باپ کا عکس تھا اور اس کے مانند علم و ادب کا دلدادہ۔ اینگلو ورنیکیور اسکول میں اساتذہ کا چہیتا تھا وہ۔ ہاں، اپنے عمر کے لوگوں سے ہم آہنگ ہونا اس کے لیے تھوڑا مشکل تھا کہ اس کی پرورش دو بونصوں کے درمیان ہوئی تھی۔ ایک خسرو بیک اور دوسرا اس کا باپ فریدوں بیک۔

دونوں دوست جب شام میں بیٹھتے تو بیچ بھی بڑوں کی اس محفل میں شامل ہو جاتا۔ انہیں سیاسی اور علمی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے دیکھتا، جرات کر کے سوالات بھی کر لیتا۔ اسی صحبت نے شعر کہنے کی جوت جگائی۔ ابتدائی سامع اس کے نانا اور والد ہی تھے، جنہوں نے فقط حوصلہ افزائی نہیں کی، غلطیوں کی جانب بھی توجہ دلائی۔

یوں تو سب ہی لوگ دینی رجحان رکھتے تھے مگر انگریزوں کے ہاتھوں شکست نے انہیں مزید مذہبی بنادیا تھا۔ البتہ صوفیاء کے نقش قدم کا تعاقب کرنے والے سندھ کے بایسویں نے شدت پسندی سے ہمیشہ اپنا دامن پاک رکھا۔ شاہ لطیف کے محبت بھری حکایت ان کی زندگی کا جزو تھے۔ معززین شہر بھی موسیقی کے شغف رکھتے۔ خود بیچ بہت عمدہ ستار بجاتا تھا۔ ساز تھامتے ہی وہ خود کو بھول جاتا۔ انگلیاں تاروں سے مل جاتیں اور ماحول پر ظہم ظہم کی ہو جاتا۔

اس کی مہارت دیکھ کر ایک بڑی عمریت نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ کہیں لڑکا تعلیم وغیرہ چھوڑ کر سادہ عہدہ ہی نہ بن جائے۔ یہ اندیشے ماں کے دل پر کسی گھوٹے کی طرح لگے۔ وہ ضد کرنے لگی کہ لڑکا کافی الغور ستار چھوڑ دے۔

جب بات بڑی تو گھر کے سربراہ کو درمیان میں آنا پڑا۔ ”ایسا ہی ہوگا نیک بخت۔ بس صحیح وقت آنے دو۔“

اب بیچ میں تہدیلیاں آرہی تھیں۔ گزشتہ نسل تو انگریزوں سے اعلیٰ قائم کرنے میں متذبذب تھی، مگر بیچ

مطالعے کا حامل یہ نوجوان سمجھ چکا تھا کہ آنے والا زمانہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے۔ انگریزی ہی ابلاغ کی کلیدی زبان ہوگی۔ سو جہاں عربی اور فارسی پر دسترس حاصل کی۔ وہیں انگریزی بھی جم کر پڑھی۔

وہ مزید پڑھنا چاہتا تھا، مگر خزاں کی ایک شام جب تیز چھڑکھجور کے درختوں سے ٹکرا کر شور پیدا کرتے اور گھبوں میں دھول اڑ رہے تھے، اسے یکدم ادراک ہوا کہ ماں باپ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اس نے باپ کی سمت دیکھا تو ایک جھریوں زدہ چہرہ دکھائی دیا۔ ماں کے ہاتھوں میں رعشا تر رہا تھا۔ مکان کی دیواروں میں بھی دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ چھت بارش میں ٹپکنے لگی تھی۔

خزاں کی اس شام بیچ کے شعور نے چھٹاٹک لگائی۔ وہ اچانک سمجھ دار بن گیا۔ خرد غلامی سے آزاد ہو گئی۔

شام جب اس کے دوست میر خورشید نے دروازے پر دستک دی کہ ان کا ارادہ ایک مشاعرے میں شرکت کا تھا، تو اس نے بڑی محبت سے انکار کر دیا۔ ”مجھے کچھ ضروری کام ہے۔“ حیرت میں غلطاں اس کے دوست کے لیے یہ سمجھ پانا مشکل تھا کہ شاعری کے رسیا بیچ کو اچانک کیا ہوا۔

عشائیر کے بعد جب اس نے فریدوں بیک کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا، تو وہ چونکا ضرور مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

جب عورت اپنے شوہر کی پراسرار خاموشی سے پریشان دکھائی دی، تب اس سرد مخران نے کہا۔ ”نیک بخت اب وہ سیانا ہو گیا ہے۔“

فریدوں نے خود تو سرکاری ملازمت نہیں کی تھی، مگر جب بیٹے نے اپنی خواہش ظاہر کی تو اس کے پاس اعتراض کی کوئی وجہ معقول نہیں تھی۔ اگر اعتراض کرتا، تو لوگ پوچھتے، میاں پھر اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم کس لیے دلائی تھی، چھتی باڑی کرنے کے لیے۔

بیچ نے عملی زندگی میں قدم رکھنے کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے کسی سفارش کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی قابلیت اس کی عرضی تھی۔ یقین محکم اس کی سفارش تھا۔ تو شہر کے ہائی اسکول میں فارسی کا استاد لگنا خاصا سہل رہا۔ اور وہ ایک اچھا استاد ثابت ہوا کہ جہاں فارسی کے معتبر شعرا کا کلام ازبر، وہیں ان میں پنہاں معنی کا بھی ادراک۔ پھر اپنی زمینوں سے بھی گھبراہٹ کے طفیل پیغام مقامی مقامی مثالوں کے ساتھ طالب علموں کو پہنچاتا اور ان کے ذہنوں پر ثبت ہو جاتا۔ سعدی کی حکایات ان کی اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنیں اور حافظ کی شاعری



کلام کلچ کے چند نمونے  
پردہ اٹھے گا جب جدائی کا  
حال کھل جائے گا خدا کی

سے کدے میں میں میا تھا پاک دامن کی طرح  
اور لوٹا ہوں وہاں سے چاک دامن کی طرح

آہیں ہوئیں جو بند تو اشکوں کی جھڑی ہے  
بڑھ جائے اگر جس تو برسات کھڑی ہے

دریا کنارے جا کے بیٹھا اک دن تو کیا دیکھتا ہوں  
دریا کے اندر کشتی ہے اور کشتی کے اندر ہے دریا

بیٹھا ہوں پاس آ کے تو اس پر ہر انداز مان  
میں خار ہوں اور پہلوئے گل کا نصیب ہوں

(ترجمہ: مسلم شمیم)

کیا نہیں تھا وہاں۔ انگریزوں کی ترقی کے تمام رنگ  
اور بکھرے تھے۔ منظم ریل کا نظام! جہاز سازی کے بڑے  
بڑے کارخانے۔ درس گاہیں۔ نئے نئے اخبارات اور  
رسائل۔ بحیرہ عرب کی سب سے بڑی بندرگاہ تصور کیا جانے  
والا بمبئی تیزی سے مغربی طرز ثقافت اپنا رہا تھا۔ انگریزوں کی  
وہاں بھر مار تھی۔ البتہ ایسا نہیں تھا کہ مقامی زندگی کی دوڑ میں  
پچھڑے رہ گئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہی اس نظام کی روح تھے۔  
حاجی علی کی درگا... کی وجہ سے معروف اس شہر کی ترقی میں  
مقامیوں کا جذبہ اور خلوص شامل تھا۔

یہاں بمبئی پبلشنگ کا جنم تھا۔ ادھر ہی سے سندھی  
ادب کو نیاروپ عطا کرنے والے کلچر بیک کو اکسب فیض کرنا  
تھا۔ اس کے بڑے بھائیوں نے بھی ادھر ہی پڑھا تھا۔

وہ بحری جہاز کے ذریعے اس جادوئی بندرگاہ پر اترا  
تھا۔ بندرگاہ پر پھیلیوں کی ٹو سے زیادہ ان کھانوں کی میز تھیں  
رہی تھیں، جن کے مسالوں کی شہرت سمندر عبور کر چکی تھی۔ وہ  
بارہن کی چمپل پہل دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک نفیس بھی  
میں سوار اسے کالج پہنچا۔ وہاں قدم رکھتے ہی یوں لگا، جیسے وہ  
کہانیوں کی دنیا میں آگیا ہے۔ ایسی درس گاہوں کا تذکرہ تو فقط  
کتابوں میں ہوا کرتا تھا۔ ہرے بھرے درختوں کی اوٹ میں

ان کی تخیل کو پرواز عطا کرتی۔ شاہ لطیف کا تذکرہ یہاں  
ضروری نہیں، وہ تو اس خطے کی رگ رگ میں سویا ہوا تھا۔ شاہ  
جور سالوسن پسند کتاب تھی۔

فریدوں بیک اپنے ہونہار سپوت کو نئی نسل کی تربیت  
کرتا دیکھ کر جہاں جی ہی میں خوش ہوتا وہیں اسے یہ قلع  
بھی تھا کہ کلچر گھریلو ذائقے دار یوں میں الجھ کر اعلیٰ تعلیم سے  
محروم رہ گیا ہے۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ بھی بڑے  
بھائیوں کی طرح بمبئی جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔

یہ خواب پورا تو ہوا مگر اس کی تخیل وہ اپنی آنکھوں سے  
نہیں دیکھ سکا۔ 1873 میں رومی زار کے دورہ لندن کے چند  
روز بعد... جب مہراں پر سما کی اولین دھند چھائی تھی اور  
سندھ صوبہ رومی سے بہہ رہا تھا، فریدوں بیک نے دروازے  
پر موت کی دستک سنی اور اسے اندر آنے کی اجازت دے  
دی۔

یوں وہ باہمت شخص، جو بیڑوں میں اس خطے میں  
داخل ہوا، اپنی خدا داد صلاحیتوں کے ذریعے میروں کے دربار  
میں اہم ترین عہدے تک پہنچا اور بادشاہ کی معزوری کے بعد  
اس کے خاندان کی دیکھ کر تار پا... بڑی طمانیت کے ساتھ  
موت کے ہمراہ چلا گیا کہ وہ اپنا فرض ادا کر چکا تھا۔

وہ ایک حقیقی سورما تھا، جس نے شکست خوردہ شخص کی  
 بجائے ایک سچے سپہ سالار کی موت قبول کی۔

تدفین والے روز آسمان نے گرج کر فریدوں بیک کی  
بلند حوصلگی کو خراج تحسین پیش کیا، بارش نے زمین نرم کر دی  
اور وہ اپنی دھرتی کے سینے میں سما گیا۔

☆☆☆

کہانی کا یہ ٹکڑا سا حلوں چمکسا گیا تھا۔ اگر سترہویں  
صدی کے اواخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی اپنا دفتر سورت سے ادھر  
منتقل کر کے اسے پریزیڈنسی ہیڈ کوارٹر کا درجہ دے دیتی، تو نہ  
ہی 1845 میں تمام جزائر جوڑ کر اکائی بنانے کا منصوبہ پایے  
تخیل کو پہنچتا اور نہ ہی بیسویں صدی کے اوائل میں جارج  
جیمز کے استقبال کو ادھر گیٹ وے آف انڈیا کی تعمیر کا خیال  
سامنے آتا۔ تاہم آخر الذکر واقعہ ابھی چالیس برس دور تھا۔  
ابھی فضا صاف تھی۔

انیسویں صدی کی آخری چوتھائی کا بمبئی ایک بھرپور  
شہر تھا۔ بحر ہند کی لہریں اس کے ساحلوں سے ہم آغوش  
ہوئیں تو تباہیوں پر پرواز کرتے بچھی عالم سستی میں جست  
لگاتے اور سچ پر تیرتی پھلی دبوچ لیتے۔



بمبئی عمارتوں میں بے آواز چلتے اساتذہ۔ ٹولیوں کی صورت  
بٹھتے طالب علم۔ چھت تک کتابوں سے بھری لائبریریاں۔  
تقصیر علی۔

کچھ خوش ضرور تھا مگر مرعوب نہیں تھا۔ سندھ کی دھرتی  
اسے جو اعتماد عطا کر چکی تھی، اس میں لغزش لانا مشکل تھا، مگر  
بمبئی کو اس کی خواہش نہیں تھی۔ وہ پہلے بھی فریدوں بیگ کے  
دو بیٹوں پر اپنی محبت بٹھا کر چکا تھا اور اب اس مسلم نوجوان کا  
ہمسفر بننے والا تھا، جس کی مسکراتی آنکھوں میں غصہ کی  
قابلیت پوشیدہ تھی۔

کچھ مکان میں آنکھ کھولنے والے کچھ کے یہاں پہنچنے کا  
ایک سبب تو اہل خیال ٹھہرے، جن کا اصرار تھا کہ اسے بمبئی جا  
کر اپنے مرحوم باپ کی آخری خواہش ضروری پوری کرنی  
چاہیے۔ جب اس نے ارادہ باندھا لیا، تو پھر راستہ بھی نکل  
آیا۔ سیانے کچھ ہی کہتے ہیں، محنت کرنے والوں کی بھی ہار  
نہیں ہوتی۔

کالج نے اس کی قابلیت دیکھتے ہوئے بیس روپے کا  
وظیفہ جاری کر دیا، جو کہ ضرورت کے لیے کافی نہیں تھا۔ بمبئی  
مہنگا شہر تھا... مگر قناعت پسند کچھ مطمئن تھا۔

سوانح نگار لکھتے ہیں کہ کچھ نے جلد بارشوں کے شہر سے  
دوستی کر لی۔ چھتری لیے مون سون کی بارشوں میں گھومنے کا  
تجربہ اسے بھانپ گیا۔ نیا ماحول اس آگیا تھا۔ جب بیٹہ برستا  
اور وہ ستار کے تار چمکتا، تو ایک طلسمانی لمحے کا جنم ہوتا اور  
ہاسٹل میں اس کے کمرے کے باہر طالب علموں کا ہتھکھا لگ  
جاتا، جو حیرت اور احترام کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس  
انجینی کو نکلتے تھے۔ اس کی فطری دانش اور بے ساختگی نے  
اساتذہ کے دلوں میں جگہ بنانے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔  
مرامی اور مگرانی بھی اس نے ادھر ہی دیکھی۔ اس روانی سے  
بولتا کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔

چند مورخین محبت کے بے چون تجربے کا بھی ذکر کرتے  
ہیں۔ اور یہ قابل فہم ہے۔ محبت ایک فطری جذبہ جو ہے۔  
وجہ کچھ کا دل کسی دوشیزہ کی سمت مائل ہونا نہیں امر کا فی ہے  
کہ آخر وہ بمبئی میں تھا، جو آج کے ماتند اس زمانے میں بھی  
سپنوں کی مگر تھی۔ لیکن یہ جاو ایسا بھی نہ تھا کہ کچھ کو آرام  
زیست سے بھٹکا دے۔ دل پر دستک ضرور ہوئی ہوگی، مگر  
دروازہ نہیں کھولا گیا۔ بس کھڑکی ہی سے سلام دعا ہوگی۔ کوئی  
دوشیزہ ٹپ ہوگی، تو جاں نثار اختر والا لہجہ اٹھائے ہوگا:  
تو بھی اک دولت نایاب ہے، پر کیا کیے

ملہنامہ سرگزشت

زندگی اور بھی کچھ تیرے سوا مانگتے ہے

ماں نے شاہ لطیف کے اشعار کے سائے میں اس لیے  
رخصت تھوڑی کیا تھا کہ وہ کسی کی زلف کا اسیر ہو کر تعلیم سے  
غافل ہو جائے۔ ادھر بمبئی میں جو اساتذہ میسر آئے، ان میں  
حیرت دہلوی نمایاں ترین، عالم فاضل آدمی۔ وضع دار،  
بااخلاق۔ مون سون کی ایک سہ پہر جب نئی وضع قطع کے ایک  
نوجوان کو انہوں نے اپنی کلاس میں دیکھا تو گہری نظروں  
سے جائزہ لیا۔ تجربے کا رانکھوں نے پرکھ لیا کہ ماتھا ذہانت  
کی گواہی دیتا ہے۔ ایک پُر پیچ سوال اس کی سمت پھینکا، جب  
اس نے بڑے اعتماد سے جواب پیش کیا، تو جان گئے کہ شاگرد  
مل گیا ہے۔

حیرت دہلوی کی توجہ نے نوجوان کی صلاحیتیں نکھارنے  
میں بڑا کام کیا۔ اس کا نقطہ نظر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ قلم  
کی قوت حقیقی معنوں میں آشکار ہوئی اور کتابوں سے عشق گہرا  
ہونے لگا۔ یہ خیال بھی راسخ ہونے لگا تھا کہ غلامی مستقل  
نہیں۔ آج نہیں تو کل... انگریزوں کو یہاں سے جانا پڑے  
گا۔ مایوسی کا کرب جلد چھوٹ جائے گا۔ وہ احساسات سینے  
میں تھے، جنہیں کئی برس بعد سرور بارہ ہنگوی نے الفاظ دیے۔

رات کا انجام بھی معلوم ہے، مجھ کو سُرور

لاکھا اپنی حد سے گزرے تا سحر، جائے گی رات

کچھ فارسی اور عربی پر تو خوب گرفت رکھتا تھا، انگریزی  
سے بھی اچھی نہیں تھی، تو استاد نے اسے ترکی زبان سکھانے کی  
ٹھانی۔ استاد سیر تو شاگرد سوا سیر۔ ترک گھوڑے پر سواری میں  
زیادہ وقت نہیں لگا۔ کچھ ہی روز میں کچھ کے تاج میں ایک اور  
پرکا اضافہ ہو چکا تھا۔

نوجوان کا زیادہ وقت اونچے ستونوں والی لائبریری  
میں گزرا کرتا۔ وہاں کا سکوت اسے لطافت کے احساس سے  
بھر دیتا۔ اپنے وطن سے دوری کا غم کچھ کم ہو جاتا۔ لائبریری  
میں جہان بھر کے موضوعات پر کتابیں تھیں۔ دریائے سندھ  
کے کنارے سے آئے نوجوان نے جم کر مطالعہ کیا۔ اور اسی  
بے انت مطالعے کے دوران وہ خیال اس پر اثر آجس نے  
اس کی زندگی کو نئی تہ تیغ عطا کی۔

ہوایوں کہ کچھ جب بین الاقوامی شعرا کو پڑھتا، تو جہاں  
ان کی تخلیقی جہت اور ادبی گرفت پر عرش عرش کراٹھتا، وہیں یہ  
کچھ بھی اسے تجسس رکھتا کہ ایسا ہی پیغام وہ کہیں اور بھی پڑھ  
چکا ہوگا... ایسے ہی احساسات کسی اور نے بھی اس میں  
اجاگر کیے تھے۔



اب قاصد نامہ کوئی آیا نہ پیغام

کوئی تو دیس سے آیا ہوتا، نامہ میرے نام

قید کے ہیں ایام، کون سند بے لائے

یہ شاہ لطیف کا تذکرہ ہے، جس کی شاعری کے آفاقی رنگوں سے مماثل رنگ اسے بین الاقوامی ادب میں جا بجا نظر آتے تھے۔ اسی تجربے نے پہلے پہل یہ خواہش جنم لی کہ وہ اپنے دیس کے اس بظلم جلیل کو دنیا کے سامنے متعارف کروائے۔

اپور پھر ایک واقعہ ہوا۔

سچ کے علمیت نے اسے جن معززین کی قربت عطا کی، ان میں سر آغا خان دوم کا گھرانہ بھی شامل تھا، جن کے بیٹے آغا اکبر شاہ سے اس کی گاڑی چھٹی تھی۔ اس دوستی کا ایک سبب جہاں مشترکہ عالمی مشاغل ٹھہرے، وہیں یہ وجہ بھی تھی کہ آغا اکبر حیرت دہلوی کی شاگردی میں شامل تھے۔

تو ایک روز علی اکبر کے ساتھ سچ نے ایک اعلیٰ سطح کی تقریب میں شرکت کی، جہاں آکسفورڈ سے آئے کچھ طلباء بھی موجود تھے۔ چائے کے بعد گفتگو شروع ہوئی تو شاعری کا موضوع نکل آیا۔ ہر کوئی اپنے من پسند شاعر کا کلام پیش کرنے لگا۔ سچ کی باری آئی تو اس نے بھٹ شاہ کے درویش کے اشعار کا ترجمہ پیش کیا۔

روز اول سے روزِ ابد تک سب ہی پر وہ قادر ہے

جلوے بھی ہیں سارے اس کے اور وہ خود ہی ناظر ہے

سننے والے جھوم اٹھے۔ پوچھا کیے، یہ شاعر کون ہے

جناب؟

جب لڑکے نے صوفی کی زندگی کے چند گوشوں پر روشنی ڈالی، تو فرمائش ہوئی کہ کچھ اور اشعار سنائے۔ اس نے گیت چھیڑ دیے۔

گرن چک اور جھوم کے آئے بدداغ کی بار

چم چم چمکے ٹھن ٹھن کرے بر سے میکھ سداغ

میراثِ الفاظ سامعین کے دلوں میں اترنے لگے۔

ہر موضوع چھوڑ کر سندھ دھرتی کے اس شاعر پر مکالمہ شروع ہوا۔ کسی نے کہا ”آج کا فلاں انگریز شاعر بھی یہی کہہ رہا ہے۔“ دوسرا بولا، جناب آج کی کیا بات کرتے ہیں، شیکسپیر نے بھی فلاں فلاں بند میں یہی بات کہی۔ چند نے غلطی کا ذکر کیا، چند نے کشیش کا۔ ولیم ورڈز تھ کا بھی نام لیا گیا۔

اپنے معشوق کے دالہا تذکرے نے اس پر سرشاری

طاری کر دی۔ لوٹتے سے جیسے ہوا میں اڑ رہا تھا۔ آغا اکبر نے خوشی دیکھی، تو ٹھوکا دیا۔ ”دوست، آج تو محفل لوٹ لی۔“ پھر کچھ سوچ کر کہا۔ ”تم شاہ لطیف کا انگریزی میں ترجمہ کیوں نہیں کرتے؟“

وقت جیسے یکدم ٹھہر گیا۔ ہوا ختم مٹی اور بلند یوں میں پرواز کرتے پرندے بجمد معلوم ہونے لگے۔

”کون میں؟“ وہ ہلکایا۔

”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ تم سے بہتر بھلا کون کر سکتا

ہے۔“ دوست نے دوست کا حوصلہ بڑھایا۔

والجی کا سفر کیسے طے ہوا، دیا خاموش تھا یا متہ زور، ناٹکے یکدم غائب کیوں ہو گئے تھے، موسم خشک تھا یا جس زور... یہ سب باتیں غیر متعلقہ ہو گئیں۔ وہ اپنے خیال میں دست بستہ کھڑا تھا، ٹیلی پرور رویش موجود تھا، ہاتھ میں طنبورہ، جس کے تاروں پر کائناتی ساز چھڑے تھے۔

وہ رات بے حد انوکھی تھی۔ ایک ایک کر کے مقاصد زندگی خود کو منکشف کرنے لگے۔ کلام لطیف کو انگریزی میں ڈھالنا... دنیا بھر کے ادب کا اپنی مادری زبان میں ترجمہ... سندھی ادب کی صورت گری۔

اسے اپنا مقصد مل گیا تھا۔ مگر پھر... ایک حادثہ ہوا۔

☆☆☆

صد یوں قبل، جس زمانے میں فرعون کی فوجیں نیل میں غرق ہوئیں، ہندوستان کی دھرتی پر ایک گیانی نے جنم لیا تھا، جو کہا کرتا تھا ”بھکشو، واسنکی سے یا جہنم نکلتی ہے اور یاد سے خواہش۔ اور خواہش دکھ ہے۔“

گوتم بدھ کے ان سادہ سچے الفاظ میں کتنی گہری حقیقت پنہاں ہے، اس کا مطلب سچ نے تب جاننا، جب ایک گرد آلود صبح اسے وطن سے ایک تار موصول ہوا۔ بری خبر کا جھٹکا اس کے دل سے گرایا اور روح میں اتر گیا۔

اس کی ماں... وہ مہذب اور ذہین عورت، جس نے کنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنے بچوں کی پرورش شہرِ ادوں کی طرح کی، شدید غلیل تھی۔ وہ آواز جس نے سندھو دریا کے کنارے اسے دعاؤں میں رخصت کیا تھا، اب کمزور پڑ گئی تھی۔

کالج کے آخری سال کا وہ طالب علم سب چھوڑ چھوڑ کر اپنے محبوت کیا، تا کہ وہ شفیق چہرہ دکھ سکے، جس نے کم سنی کے خواب میں اس پر سایہ کیا اور زندگی کی سیاد تاریک راتوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔

تار موصول ہونے کے بعد جس خطرے نے دل پر

ماہِ مایہ 2015ء

75

ماہنامہ مسرگزشت



زلزلہ طاری کر دیا تھا، وہ سامان باندھتے ہوئے، بحری جہاز میں سوار ہوتے ہوئے اور طوفانی بارشوں میں سفر کرتے ہوئے قائم رہا، پر جب کراچی کی بندرگاہ قریب آئی... یکدم پھر اہوا سمندر خاموش ہو گیا۔ ہر طرف اداسی چھا گئی۔

سچ نے سسکی لی۔ حادثہ ہو چکا تھا۔ جس روز اس نے اپنے آبائی وطن میں قدم رکھا، ماں کی تدفین کو تیسرا روز تھا۔ قبر کی سنی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی اور اس کا امکان بھی نہیں تھا۔ آنسو اس کی نمی میں اضافہ کر رہے تھے۔ ایک بیٹے کے آنسو، جس کے ماتھے کی کشادگی کچھ ماند پڑ گئی اور آنکھ کی روشنی دھیمی پڑنے لگی۔ یوں لگتا تھا، جیسے کسی نے اُس کا خون نچھڑ لیا ہو۔

آنے والے دن منہ بست ہوا نہیں ساتھ لائے۔ اتنا پالا پڑا کہ زندگی ٹھنڈی اور تندی جم گئی۔ رات چاندنی دھندلی سی ہوتی۔ چھٹی ہجرت کر گئے اور شہر پر ویرانی اتر آئی۔

سچ بیمار پڑ گیا تھا۔ بیمار داروں کی کوششیں کام نہ آئیں۔ حکیموں کے نسخے بے کار گئے۔ افسردگی نے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے وہ زندگی سے ناتا توڑنا چاہتا ہے۔ بمبئی سے دوستوں کے خط آئے۔ اساتذہ نے بھی خیریت پوچھی، مگر وہ کسی مکتوب کا جواب دینے کی حالت میں نہیں تھا۔

گمراہوں کا خیال تھا کہ اگر وہ بمبئی رہا، تو بیماری اور اس کے جسم کے سچ انٹوٹ رشتہ بن جائے گا اور راتوں کو چھاپا رہنے والا غبار اُس کا نصیب ہوگا۔ تو انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ بمبئی لوٹ کر تعلیم پھر شروع کرے۔

وہ بمبئی لوٹا ضرور، مگر اب اس شہر کے پاس نوجوان کے درد کی دوا نہیں تھی۔ بحر ہند کی لہریں اپنی موسیقیت سے محروم ہو چکی تھیں۔ ساحلوں پر ہوا وز کرتے۔ اکٹاہٹ کا شکار نظر آتے۔ ریل کی چٹک چٹک کا طلسم ماند پڑ گیا۔ بازاروں کا شور اپنا جادو کھو بیٹھا۔

سچ تو یہ ہے کہ بمبئی پہنچ کر اس کی حالت مزید بگڑ گئی۔ یوں لگتا، جیسے ہر منظر دیز دھند میں گم ہو گیا ہے۔ وہ کئی کئی روز اپنے بستر پر پڑا رہا۔ اداسی کی ایسی ہی ایک رات اس نے خواب میں وہ منظر دیکھا، جو اس نے اپنی ماں کی موت سے ایک رات قبل دیکھا تھا۔

وہ ہونا ک طوفان میں گمراہ تھا۔ بھید بھری تاریکی۔ ہاتھ کو ہاتھ بچائی نہیں دیتا۔ ایسے میں ایک آواز اُسے اپنی سمت پکار رہی تھی۔ وہ آواز کی جانب دوڑتا چلا گیا۔ بہت دیر

تک دوڑتا رہا۔ یہاں تک کہ ہاپنے لگا۔ جب دھند چھٹی تو اس نے خود کو ایک ریگستان میں پایا۔ دور ایک ٹیلا تھا، جہاں ایک درویش کھڑا تھا، جس کے ہاتھ میں ساز محبت تھا۔ ہرن وادیوں میں رقص کرتے تھے۔

جب وہ پسینے میں شرابور اپنے بستر سے اٹھا، تو جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ اسی شام وہ سامان باندھ کر بندرگاہ کی سمت چل دیا۔

سندھ اپنے سپوت کو پکار رہا تھا۔

☆☆☆

کوٹھ کو بندرگاہ کا درجہ حاصل کیے ایک صدی بیت چکی تھی۔ افتخار خان آف قلات کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے پاس آئے ہوئے بھی خاصا وقت گزر گیا تھا۔ 1857 کی جنگ آزادی کے موقع پر ایک بغاوت ضرور ہوئی، مگر اُسے کچل دیا گیا۔ جس سے سچ نے اس شہر میں قدم رکھا... برصغیر کی سیاست میں مرکزی کردار ادا کرنے والے محمد علی جناح کی پیدائش ہو چکی تھی۔

ساحلی شہر میں نئے جیون کا آغاز کرنے والے مرزا قلیج بیگ نے ابتدا میں بڑے بھائی کے ہاں قیام کیا۔ کراچی کے معتدل موسم نے طبیعت کو سنبھالا دیا۔ اکٹاہٹ کچھ ٹوٹی تو شعر کہنے شروع کیے۔ گلستان و بوستان حفظ تھی، تو اظہار فارسی ہی میں کیا، پر انداز صوفیوں سا رہا۔ موضوع آفاقیت۔ زبان سادہ اور رواں۔ الہیت ہیست تھی۔

شاعری ادبی ذوق کی تسکین کا تو سبب بنی، مگر ماں کے غم سے ابھرنے کا امکان اس وقت پیدا ہوا، جب فریدوں بیگ کا یہ سپوت بھی بدل کر شہر کی گلیوں میں گھومنے لگا۔ کبھی مزدور، کبھی ماہی گیر، کبھی درویش... وہ نئے نئے لوگوں سے ملا کرتا۔ ان کی مینٹھ میں جاتا۔ سچ ان کے مسائل سمجھنے لگا، تو دھیرے دھیرے اپنا غم بھی بھولنے لگا۔

دلاور بھائی کے بچے کی نشدگی کا کرب لیے وہ شہر کی گلیوں میں کئی راتوں گھومتا رہا۔ زلیخا کے جنگ میں کام آنے والے شوہر کی چتا سننے ہوئے دنیا چپکے سے رات میں ڈھل گیا اور بھوک کا احساس مٹ گیا۔ گلشن کے گھوڑے کی چوری کی رپورٹ لکھوانے کی کوششوں میں کتنے ہی روز خوار ہوا۔

وہ اپنے دوست میراٹھ سے کہا کرتا۔ ”برادر۔ ان گلیوں میں تو غم کی کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ آہ شرم کی منہ پر میرے دل میں کھب گئی۔ کیا میرے یہ زخم بھر سکیں گے برادر۔“



کے فوائد سے واقف ہیں؟

[www.pdfbooksfree.pk](http://www.pdfbooksfree.pk)



”جی بالکل۔ کس نے نہیں پڑھی ہوں گے۔“ اس نے چائے کی چٹکی لی۔

”تو طے پایا کہ جناب ہمارے لیے سر آر تھر کوئن کے تراجم کریں گے۔ دام کے معاملے میں بے فکر رہیں۔ رام قسم، ہم سے اچھا جواب دہری نہیں ملے گا۔“

سر آر تھر کوئن کا وہ مداح تھا، مگر جب ترجمہ کرنے بیٹھا، ایک ایک سطر کو اپنی زبان میں ڈھالنا شروع کیا تب جانتا کہ وہ شخص کیسا فحش لکھتا تھا۔ یکتا اور انوکھا۔ کتنے ہی مقامات پر وہ جھوم اٹھا۔

تکمیل کے بعد مسودہ لیے ناشر کے پاس پہنچا، تو اس نے غریب چند کتابیں تھما دیں۔ ایک تو ڈکٹر ہوگیو کا ناول تھا، فرانسیسی زبان اور گوگول کی کہانیاں تھیں۔ سب ہی اس نے پڑھ رکھی تھیں۔

ان کتب کی اشاعت نے قلم کار اتوں رات مشہور کر دیا۔ یوں تو شہر کی معزز شخصیات اس کی عظمت کی قائل تھیں اس کا احترام کرتی تھیں لیکن اب عوام الناس بھی اس کے نام سے آگاہ ہو گئے۔ اگلی بار وہ ایک انوکھے خیال کے ساتھ ناشر سے ملا۔

”کیوں ناں دنیا کی مختلف زبانوں میں موجود یکساں الفاظ پر ایک کتاب مرتب کی جائے۔“

ناشر اچھل پڑا۔ ”کیا خیال سوچا ہے جناب۔ ذرا انتظار مت کیجیے، کام پر لگ جائیں۔“

قلم کار چپ رہا۔ کام شروع ہوئے تو کئی ماہ ہو چکے تھے۔ پورا موسم گرما کتب خانوں میں گزرا تھا۔ کتنی ہی زبانوں کی کتب وہ کنگال چکا تھا۔ وہ متعدد زبانوں پر گرفت رکھتا تھا اور یہ قابلیت خوب کام آ رہی تھی۔

فارسی اور ہندی کا تو ذکر ہی کیا، اسے تو مراٹھی اور گجراتی پر بھی عبور تھا، حیرت انگیز سیجے استاد نے ترک زبان بھی سکھا لی تھی۔ اور سننے، وہ تو پشتو اور بلوچی بھی جانتا تھا۔ سندھی اور انگریزی پر گرفت کا تو پہلے ہی تذکرہ ہو گیا۔ تو اس نے بڑی مہارت سے ادب، مذاہب، طب، اخلاقیات، سائنس اور تاریخ پر لکھی معروف کتب کو اپنی لادری زبان کا خرقہ عطا کیا۔ اس کے علاوہ خود بھی کئی کتابیں لکھیں۔

نئی صدی کے آغاز سے قبل مرزا قلیچ بیگ نے تحصیل واری کا امتحان پاس کر کے سرکاری ملازمت حاصل کر لی تھی۔ اس ملازمت نے اسے خاصا مصروف رکھا مگر تحقیق و تصنیف کے لیے وہ وقت نکال ہی لیتا۔ اس کام کے لیے اس

نے اپنی نیند قربان کر دی تھی۔ بھوک پیاس سے مایوس ہو گیا۔ راتیں جاگتے ہوئے گزاریں۔ دیگر مشاغل بھی ترک کر دیے۔ دوستوں سے بھی کم ہی ملاقات ہوتی۔

جب حلقہ یاروں نے شکایت کی، اس کی سبب انت مصروفیات پر ناں بھوں چڑھائیں، تو ان میں موجود ایک معزز صاحب نے قلم کار کا دفاع کیا۔ ”سبب اپنے مقصد کے لیے سب کچھ کر دیتا ہے۔ ہمارے مرزا قلیچ بیگ بھی اپنا سب کچھ کر چکے ہیں۔ ان سے شکوہ کیسا۔“

یہ صاحب حسن علی آفندی تھے۔ وہی جنہوں نے سندھ میں پہلا مسلم اسکول سندھ مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کی قیادت کرنے والے محمد علی جناح نے بھی اسی درس گاہ سے کتب فیض کیا تھا۔

تو قلم کار کا گھوڑا علمی و ادبی وادیوں میں سر پٹ دوڑ رہا تھا۔ پیشہ دارانہ ذمے داریوں کی وجہ سے اسے اکثر سفر کرنا پڑتا۔ کبھی بلوچوں کی دھرتی کی سمت، کبھی پشتونوں کے وطن کی طرف۔ اور ہر سفر میں سب سے زیادہ بوجھ کتابوں کا ہوتا۔

اسے اندازہ تھا کہ اگر سندھ کو جدید دنیا سے روشناس کروانا ہے، تو اسے نئی نسل پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ اسی خیال سے بچوں کے لیے لکھنے کی تحریک دی۔ اس نے کہانیاں لکھیں۔ ضرب المثال اکٹھی کیں۔ ساتھ ہی سندھی صرف و نحو پر ایک ایسی کتاب تیار کی، جس کی اثر انگیزی دیکھ کر بڑے بڑے باہر لسانیات اعلیٰ تعلیمت پندار رہ گئے۔

قلم کار نے عادت بنالی تھی۔ جس موضوع کا بھی سیر ہو کر مطالعہ کرتا، اس پر اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک معیاری کتاب لکھ ڈالتا۔

ملنے والے کہتے۔ ”میاں شعر بھی کہتے ہو۔۔۔ کہانیاں بھی لکھتے ہوئے، تراجم بھی، تحقیق بھی۔ کیوں خود کو ہلکان کرتے ہو۔ کچھ اپنے بارے میں بھی سوچو۔“ وہ ہنس دیتا۔ ”یہ کام میں نے اپنی وجہ کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔“

1888 کے موسم خزاں میں قلم کار سندھ کے ایک معزز گھرانے کی لڑکی کو اپنے کتابوں سے بھرے گھر لے آیا تھا۔ لڑکی مغل تھی۔ اردو اور سندھی پر اچھی گرفت رکھتی تھی۔ قلم کار کو اندازہ تھا کہ تہذیب یافتہ نسل کے لیے ایک تعلیم یافتہ ماں ضروری ہے۔ سو اس نے اپنی بیوی کو فارسی اور انگریزی کی تعلیم دی۔ اس کی بیگم ذہین اور کمزور تھی۔ خوب جانتی تھی



کہ اس کا شوہر ایک عظیم متعبد کا تعاقب کر رہا ہے۔  
 سچ نے کتنے ہی علوم حاصل کیے مگر ایک موضوع ایسا  
 تھا، جس بابت مطالعہ تو جم کر کیا، تجربات بھی کیے... مگر قلم نہیں  
 اٹھایا۔ اور یہ تھا موسیقی کا کیان۔

وہ اکثر آسمان کی سمت دیکھ کر خدا سے سوال کرتا کہ  
 اسے یہ صلاحیت کیوں ودیعت کی تھی۔ پر ادھر سے کوئی جواب  
 نہیں آتا۔ آسمان خاموش رہتا۔ دراصل اس منصوبے کے  
 آغاز کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔

نئی صدی کے آغاز سے کچھ عرصے قبل... جب وہ منتخب  
 شدہ لکھو آتا تو سچ کے اس کشادہ مکان میں کتنے ہی پراسرار  
 واقعات ہوئے۔

ایک صبح اُسے اپنی لائبریری کی ترتیب میں کچھ بدلاؤ  
 محسوس ہوا۔ خیال گزرا کہ ملازمہ نے صفائی کرتے ہوئے  
 کتابوں کا مقام بدل دیا ہوگا، مگر پوچھنے پر عورت نے صاف  
 انکار کر دیا۔ دو روز بعد اُسے میز پر کچھ ایسی کتابیں نظر آئیں،  
 جنہیں اُس نے وہاں نہیں رکھا تھا۔ پہلے بیگم سے دریافت کیا،  
 بچوں سے سوال کیا۔ مگر سب نے نفی میں گردن ہلا دی۔

سوموار کی صبح محلے میں درویشوں کی ٹولیاں نظر آئیں  
 جو ساز ہاتھ میں لیے سمندر کی سمت جا رہے تھے۔ اگلے روز  
 اس نے دواست غائب پائی۔

دیگر علوم کے ساتھ وہ تصوف کا بھی درک رکھتا تھا۔  
 پریشان ہونے کی بجائے مراقبے میں بیٹھ گیا۔ کتب خانے کی  
 بدلی ہوئی ترتیب پر نگاہ کرنے کا اشارہ ہوا۔ اور جب وہ اُس  
 سمت گیا، تو ششدر رہ گیا۔

اس لیے نہیں کہ وہاں ایک پرانی یاد بکھر تھی، بلکہ اس  
 لیے کہ وہ اچھے برسوں تک اسے بھول گیا تھا۔

نئی ترتیب... شاہ جو رسالہ اور سندھی میں اس پر لکھی  
 کتب کو یکدم سامنے لے آئی تھی۔ مگر قلم اور دواست بھی  
 ادھر ہی ملے۔ کچھ روز قبل لکھنے کی میز پر جوئی کتب ملی تھیں، وہ  
 ساری لغات نکلیں۔

کلام درویش کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا وقت اب  
 پہنچا تھا۔

☆☆☆

تخیل نے جست و گئی۔ حروف آسمان سے اترے۔  
 قلم سر پٹ دوڑ رہا تھا۔ دن اور رات اپنی ترتیب کھو بیٹھے۔

جب شہر کو خبر ہوئی کہ فریدوں بیگ کا بیٹا کس کام میں  
 مصروف ہے تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے۔ شرفاء کے درمیان

جب یہ موضوع زیر بحث آتا تو وہ اپنی آواز دھمی کر لیتے۔ اعلیٰ  
 عہدے دار سرگوشیوں میں بات کرتے۔ جب انگریزوں تک  
 خبر پہنچی تو وہ بھی حیران رہ گئے۔

تو سب شہر تھے، مگر کوئی شبہات کا شکار نہیں تھا، بلکہ  
 ایک خاص قسم کی طمانیت تھی۔

سچ بیگ ایک دشوار گھائی میں اتر چکا تھا۔ تاہم اس  
 کے قدر دان خوش تھے کہ انہیں علم تھا، یہ شخص ہماری سابلند حوصلہ  
 رکھتا ہے۔ دھن کا پکا ہے۔ جو ٹھکان لے، کر گزرتا ہے۔

سچ نے انہیں باپوس نہیں کیا۔ اس نے شاہ لطیف کے  
 ہمہ جہت کلام کو بڑی گرفت اور مہارت سے شستہ انگریزی  
 میں ڈھال دیا۔

جب انگریزوں نے اُسے پڑھا تو سر دھٹا۔ ان کے  
 دل محبت اور عقیدت سے بھر گئے۔ ایسا پڑاثر کلام انہوں نے  
 پہلے بھی نہیں پڑھا تھا۔ جہاں سچ کے مارچ تھے، وہیں کچھ  
 ناقد بھی تھے۔ ابتدا میں ان کا خیال تھا کہ اس ترجمے میں  
 کاسطیت کی کمی ہوگی۔ شاہ کے وسعت کو گرفت میں لانا  
 آسان کہاں۔

مگر کتاب دیکھتے ہی ان کے اندیشے جھاگ کی طرح  
 بیٹھ گئے، بلکہ اس کی جگہ مسرت نے لے لی۔ دنیا کے سامنے  
 سندھ کا حقیقی اور روشن چہرہ پیش کرنے کے لیے وہ سچ کے  
 شکر گزار تھے۔

یہ اس کی موسیقی پر گرفت ہی تھی، جس نے کتاب کوئی  
 جہت عطا کی۔ وہ سُرور میں جیسے بھید جانتا تھا، راگوں کے  
 اسرار سے واقف تھی۔ عربی پر گرفت کی وجہ اس کی بھی خبر تھی  
 کہ کہاں شاہ لطیف نے قرآن کا حوالہ دیا ہے، کہاں احادیث  
 کا تذکرہ ہے۔ فارسی اور ترکی زبان و تاریخ پر عبور کی وجہ سے  
 علم تھا کہ کہاں وہ قادر الکلام شاعر اپنے بزرگوں کا تذکرہ کرتا  
 ہے اور کہاں مستقبل کی خبر دیتا ہے۔

جس زمانے میں اس ترجمے کی شہرت نے سندھ کی  
 سرحد عبور کی، سچ اُس شہر میں تعینات تھا، جو ایران اور وسط  
 ایشیا سے براستہ قندھار آنے والے تاجروں کا پڑاؤ ہوا کرتا تھا  
 اور اپنے اچاروں کے لیے پورے ملک میں مشہور تھا۔

یہ شکار پور کا ذکر ہو رہا ہے۔ پوت کے پاؤں پالنے ہی  
 میں مشغول ہاتھ ہیں۔ لوگ ابتدا سے جانتے تھے کہ جگمگ  
 محصولات میں خصلت دار لگنے والا یہ شخص اعلیٰ عہدے تک  
 جائے گا مگر کسی نے یہ نہیں سوچا کہ وہ ڈپٹی کلکٹر لگ جائے گا۔  
 ڈپٹی کلکٹر ہندوستان میں سب سے بڑا سرکاری منصب تھا۔



ایک زمانے تک انگریز افسر ہی اس عہدے پر فائز رہے۔  
کچھ مورخین کا دعویٰ ہے کہ وہ سندھ میں یہ عہدہ پانے والا پہلا  
ہندوستانی تھا۔

اور اگر ایسا تھا بھی تو اس میں حیرت کیسی؟ اس کے سوا  
اس اعزاز کا بھلا کون حق دار ہو سکتا تھا۔ مگر ان کامیابیوں کے  
پیچھے جدوجہد اور قربانیوں کی طویل داستان تھی۔ انہوں کی  
قربانی کی داستان۔

☆☆☆

دہاڑتی جواؤں نے حملہ کیا۔ چوہے اور پسو نکل آئے۔  
انسانوں کے بدن سوچ گئے۔ گھٹنیاں پڑ گئیں اور موت کے  
پردوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا۔

طاہمون دہشت کا دوسرا نام ہے۔ ایک دیبا جس پر قابو  
پانے کے دعویٰ ہمیشہ باطل ثابت ہوئے۔ جب بھی یہ ناسور  
پھیلا تو بستیوں کی بستریاں چاٹ گیا۔

1855 میں چین کے شہروں سے اٹھتی خوف کی  
ابتدائی چیخوں کو دبانے کی سرٹوڑ کوششیں کی گئیں، مگر طاہمون کا  
جراثیم بندرگاہوں کے ذریعے پھیلتا چلا گیا۔ کچھ روز خاموش  
رہنے کے بعد پھر یہ کسی نئی جگہ ظاہر ہونا اور لاشیں بچھ جاتیں۔  
یہ نئی صدی کے آغاز تک دہشت پھیلاتا رہا۔ چین کے پڑوسی  
ممالک بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے، جن میں ہندوستان بھی  
شامل تھا۔ اس دبانے اتنے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانی کہ  
آج تاریخ دان اسے طاہمون کی تیسری عالمگیر لہر کے طور پر یاد  
کرتے ہیں۔

اسی مرض نے 1903 میں قلعہ کو اس کی بیوی سے  
محروم کر دیا۔ یہ ایک بھاری صدمہ تھا۔ زندگی تپٹ  
ہوئی۔ حویلی میں چپ غم رہی۔ اور درختوں کے پتے گر گئے۔  
وہ اپنے دونوں بیٹوں کو دیکھتا۔ وہ معصوم منسا کا سایہ  
بہتے ہی صحرایہ دھوپ میں گم ہو جاتے تھے۔ اس کا دل کٹ جاتا۔

کرب کے طوفان تھمنے کے بعد ان بچوں کی وجہ سے  
وہ زندگی کی سٹ لوٹنے کے قابل ہو کر بھول کر دفتر جانا  
شروع کر دیا۔ تحقیقی کاموں کا بھی آغاز ہوا تھا، مگر ایک غلا  
تھا۔ جسے زندگی کی چمیل پہل بھرنے میں ناکامی دیتی تھی۔ ایک  
کی کا احساس تھا۔

احباب اس پر دوسری شادی کرنے کے لیے زور  
ڈالنے لگے۔ جب وہ خود سے سوال کرتا کہ کیا وہ اپنی بیوی کی  
موتی صورت کی جگہ کوئی نیا چہرہ قبول کر لے گا۔ تو جواب نفی  
میں آتا، مگر جب جس زندہ و پیر اپنے لڑکوں کو درخت کے

نیچے خاموش بیٹھا پاتا، تو آئین میں چھایا سکوت اُسے توڑ  
دیتا۔

اپنے بچوں کو ماں دینے کے لیے اس نے دوسری  
شادی کا فیصلہ کر لیا، مگر قدرت مزید امتحان لینا چاہتی تھی۔  
دوسری بیوی کو بھی موت کا مغربیت لے گیا۔ مگر یہ واقعہ کچھ  
برس بعد ہوا۔ اس دوران بچے کچھ بڑے ہو گئے تھے اور قلعہ  
نے عظمت کی سمت جانے والے اور کتنے ہی زینے طے کر  
ڈالے تھے۔

کلام لطیف کے انگریزی ترجمے کے بعد قلعہ کے جس  
کام نے علمی و ادبی حلقوں میں تہلکہ مچایا، وہ سندھ سے متعلق  
عربی میں لکھی ایک معروف کتاب تھی، جسے سوہو صدی  
میں علی بن حامد کوئی نے فارسی کے قالب بھی ڈھالا۔ اگلی تین  
صدیوں تک محقق اور علماء اسی نسخہ سے استفادہ کرتے رہے،  
جو سندھ کے قدیم ہندو راجاؤں سے اسلام کی اس خطے میں  
آمد تک کی کہانی تفصیل سے بیان کرتا تھا۔

اس کے کچھ ٹکڑوں کا انگریزی میں ترجمہ ہوا تھا، جو  
سندھ کے سنے کشنراج ای ایم تھمس کی نظر سے گزرے۔ وہ  
ایک علم دوست آدمی تھا۔ کتاب کی اہمیت فوراً بھانپ گیا۔  
ارادہ باندھا کہ اس کا مکمل ترجمہ کروائے، مگر یہ سہل نہ تھا۔ یہ  
مفروضہ عام تھا کہ عربی سے فارسی میں منتقل کرتے ہوئے  
کتاب میں کئی قسم پیدا ہو گئے ہیں۔

کتنے ہی روز وہ پریشان رہا۔ پھر کسی نے مرزا قليچ بیگ  
سے متعلق بتایا۔ سیانا آدمی تھا۔ فوراً چائے کی دعوت دے  
ڈالی۔

درختوں پر بور آ گیا تھا اور شام کے بعد ہی کھلی فضا میں  
بیٹھنا ناگوار نہیں گزرتا۔ قلعہ کی کھٹی کا دروازہ ایک باوردی  
ملازم نے کھولا۔ لان میں بیٹھے کشنراج کے بڑھ کر ملا۔

چائے کے بعد جب اس نے قلعہ کے سامنے اپنی  
خواہش کا اظہار کیا، تو مغربی افق پر چند ہی کرنیں ہنسی  
تھیں۔ قلعہ نے آسمان کی سمت دیکھا۔ کشنراج خیال تھا کہ وہ  
فیصلہ کرنے کے لیے کچھ وقت لے رہا ہے، مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ  
قدرت کے حسین چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا جس نے اسے  
جنم لیا تھا، ناممکن کو ممکن کر دکھانے کے لیے۔

سون سون کا زمانہ لاہوری میں گزرا۔ جہاں کچھ برس  
قلعہ کی جب قدرت اُسے کلام لطیف کے ترجمہ کا اشارے دے  
رہی تھی، عجیب و غریب واقعات پیش آئے تھے۔  
ان دنوں مصر و فیات کے پختہ ریلوں سے رینگے



تھے۔ شمعیں پھلتی گئیں۔ چراغ سیاہ ہوئے۔ کتنی ہی کتابیں کھنکالی گئیں۔ میکڑوں، ورق پھاڑے گئے۔ اس کی بھی نے شہر کے کتنے ہی چکر لگائے۔ بارشوں میں اس کے پیچھے کچڑ میں پھنس پھنس جاتے۔ فریونوں سے بھی سفر کیے۔ پھرے ہوئے سمندر میں اترنا پڑا۔ عربی کے علماء کے ساتھ قہوؤں کے کتنے ہی دور چلے۔ فارسی کے ماہر لسانیات کے ساتھ نشستیں ہوئیں، جو کتنی ہی دوپہریں ساتھ لے گئیں۔ انگریزی کے عالموں سے بھی تواتر سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ایران کا بھی سفر کیا۔ اور یوں کئی دن کی کڑی تپسیا کے وسیلے عزم سے ذرا پہلے چچ نامہ کا انگریزی میں ترجمہ مکمل ہوا۔

جب اس کا علمی و ادبی حلقوں میں چرچا ہوا، تو قلیچ نے وہی خوشی محسوس کی، جو اصل نکلنے کے بعد کسان محسوس کرتا ہے، جس نے ہل چلا کر مٹی نرم کی ہو اور اس میں بیج بویا ہو۔ اور پھر کوئل پھونسنے کا انتظار کیا ہو۔

☆☆☆

مرزا قلیچ بیگ نامی اس نابغہ روزگار نے بطور محقق اور قلم کار اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑا کہ تذکرے کے لیے الگ دفتر درکار ہے۔ اجمالی جائزہ لیا جائے تو سندھ کے اس سہولت کے تراجم اور تصانیف کی تعداد ساڑھے چار سو کے قریب ہے۔ بیشتر کتب سندھی میں۔ اس کے علاوہ ستر کے قریب انگریزی کتابوں کو اپنی مادری زبان کی صورت دی۔ مذہب اور فلسفے کے موضوعات پر لگ بھگ سو کے قریب تصانیف۔ علمی اور درسی کتب کا وسیع ذخیرہ۔ بلوچی، اردو، عربی اور فارسی میں بھی لکھا۔ انگریزی میں تحریر کردہ کتابوں کی تعداد چالیس بتائی جاتی ہے۔ بچوں اور خواتین کے لیے سچ بیگ کے قلم سے نکلے کتابوں کا تذکرہ از حد ضروری ہے کہ اس نے وہ زمین تیار کی، جس پر جدید سندھی ادب کی بنیاد رکھی جاتی تھی۔

شاعر وہ باکمال تھا۔ کتنی ہی رمز تھے ان کے مصرعوں میں۔ کیسی گہرائی تھی شہدوں میں۔ خیال یوں لگا، جیسے غیب سے اتر آتے ہوں۔ محققین کے نزدیک شعری مجموعوں کی تعداد میں کے لگ بھگ ہے۔

جہاں وہ پختہ شاعر تھا، وہیں فکشن پر بھی خوب گرفت رکھتا تھا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ جدید سندھی فکشن کی بنیاد فریدوں بیگ کے بیٹے ہی نے رکھی۔ سندھ اور یہاں بسنے والوں سے متعلق اس کا ناول ”زینت“ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناقدین اسے رجحان ساز قرار دیتے ہیں۔ ایک عربی تک یہ مقبولیت کے افق پر بھجنا کا رہا۔ کچھ تجزیہ کاروں کے مطابق

سندھی خاندانوں پر تحریر کردہ یہ قصہ سندھی زبان کا پہلا ناول ہے۔ بغیر فیک والی کرسی پر بیٹھ کر لکھنے والا قلیچ بیگ وقت کی کتابوں پر کام کیا کرتا تھا۔ البتہ جب وہ ”زینت“ لکھ رہا تھا، جب اس نے اپنی کل توجہ اس ناول پر مرکوز کر لی۔

شاید قلیچ جیسی اور بھی چند مثالیں ہوں، مگر ایک فرق ہے۔ ان صاحبان علم نے یقینی طور پر خود کو علم و تحقیق کے لیے وقف کر دیا ہوگا، پر اس شخص کا معاملہ الگ تھا۔ وہ سرکار کے انتہائی اہم عہدے پر فائز تھا، جہاں مصروفیات ہمہ وقت تعاقب میں رہیں۔ پھر گھر لو ڈتے داریاں کہ دونوں بیویاں داغ مفارقت دے گئیں اور اسے اپنے بچوں کی پرورش اور گھر کی دیکھ رکھ کے لیے تیسری شادی کرنی پڑی۔ ان تین شادیوں سے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔

الغرض مصروفیت رکاوٹ نہیں بنی۔ یا پھر یہ کہہ لیں کہ اس نے ہر رکاوٹ کو شکست دے دی۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ زمانہ تجزی سے بدل رہا تھا۔ ہندوستان جتنی غلامی کی کھٹن سے نکل آیا تھا۔ وہ سیاسی طور پر دھیرے دھیرے مستحکم ہونے لگا۔

اس دھرتی کے ہنرمندوں نے غاصبوں کے تعصب پر غلبہ پالیا تھا۔ ان کی خدمات کا اعتراف کیا جانے لگا۔ ادھر اقبال اور ٹیگور کا جنڈا لہرایا تو ادھر سندھ میں بلوچ نے ایک بلند ستون کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کون سا سر ہوگا، جو اس کے سامنے احترام سے نہ جھکتا ہو۔ چھٹی جموں پڑی میں آنکھ کھولنے والا یہ شخص سندھ کے ماتھے کا مجموعہ بن چکا تھا۔

اور سندھ ہی کیا، جب بنگال سے لوٹنے انعام یافتہ ٹیگور نے جسے شائقِ علمیت میں سب گردید کہہ کر پکارتے، سندھ کا رخ کیا تو سفیدے کے درخت تلے عام سی کرسیوں پر بیٹھ کر انہوں نے ان ندیوں کا بہاؤ بازیافت کیا، جوان کے بچپن کی سب سے حسین یاد تھی۔ بدلتے ہندوستان سے متعلق بھی بات ہوئی۔ قلیچ کے ذہن میں یہ خیال پنپنے لگا تھا کہ انگریز یہ زمین، جسے وہ پچھروں کا گھر کہتے ہیں، چھوڑنے کے بجائے میں سوچنے لگے ہیں۔ آفاقی پیغام کو گیتوں کی شکل دینے والا ٹیگور یہ بات سن کر مراقباتی خاموشی میں اتر گیا۔ اس کیالی کی خاموشی ہی مکمل جواب تھی۔

ٹیگور کے قلم سے سندھ میں ایک ڈراما سوسائٹی ہوا کرتی تھی۔ مرزا قلیچ بیگ کا ایک بیٹا بھی ٹھیڑ کرتا تھا۔ اس عمل میں اس نے ڈرامے لکھ کر اپنا حصہ ڈالا۔



انگریزی ادب کے ولداؤں جیسے برن سنڈھ کی کشمیری سنبھالنے سے کل مسز جیس سے سچ کا تذکرہ سن چکا تھا۔ چونکہ خود بھی قلم کار تھا، اس لیے خوب جانتا تھا کہ سچ نے جو کتابیں لکھیں، ان کے لیے کتنا پتا مارنا پڑا ہوگا۔

اسی نے عہدہ سنبھالنے کے جوابدہائی فیصلے کیے، ان میں مرزا سچ بیگ کو جس العلماء کے خطاب سے نوازنے کا ارادہ بھی تھا۔ سچ بلاشبہ اس کا حقدار تھا۔ اس نے نہ صرف تصنیف و تالیف کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے، بلکہ پیغام صوفیاء کے فروغ اور سندھ میں بسنے والی مختلف قومیتوں کو قریب لانے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اپنے عقائد پر اسے کامل یقین تھا، مگر وہ دوسرے کے مذاہب کا بھی احترام کرتا تھا۔ جہاں اپنی روایات سے جڑا رہا۔ وہیں نئے علوم اور افکار بھی قبول کئے۔ نہ ہی مغرب پرست بنا، نہ ہی مشرق کی ستائش میں زمین و آسمان کے غلابے ملائے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس جھنجھٹ میں پڑا ہی نہیں۔ بس سر پہ سوارے کام میں لگا رہا۔ کام... جو اسے زندہ رکھنے والا تھا۔

سچ نامہ کے انگریزی ترجمے نے انگریزوں کو سندھ اور ہندوستان کی قدیم اور زرخیز تاریخ سے آگاہ کیا۔ احباب کے اصرار پر اس کا ترجمہ سندھی میں بھی کر ڈالا کہ جس خطے کی تاریخ ہے، وہاں کے باسی بھی اسے پڑھ سکیں۔

سچ کا کمال یہ تھا کہ اس نے ادبی اور علمی سرگرمیوں کے ساتھ پیشہ وارانہ ذمے داریوں سے بھی مکمل انصاف کیا۔ ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے ایک بڑا علاقہ اس کے زیر نگرانی تھا۔ اب شہروں میں تو موٹریں اور لاریاں مل جاتیں، مگر دور افتادہ علاقوں کا سفر کھوڑا دل اور لادانوں سے طے ہوتا، جس سے لوگ گھبراتے تھے۔ ایک تو سبکی مشکلات، پھر ڈاکوؤں کا خطرہ۔ مگر سچ کا معاملہ کچھ اور تھا۔ وہ رکھ رکھاؤ میں نہیں پڑتا تھا۔ اس نے شہر کنارے ایک کچے مکان میں آنکھ کھولی تھی۔ عسرت میں پلا بڑھا۔ حقیقی مسلمان کی طرح تکلفات سے اجتناب کیا کرتا تھا۔ صحرانپہاڑی سلسلہ یا پھر دلدلی علاقہ جہاں نہیں جانا ہوتا اللہ کا نام لے کر نکل جاتا اور اپنی ذمے داریاں پوری کر کے لوٹا۔ کچھ کتابوں میں ایسے قصبے بھی ملتے ہیں کہ وہاں سفر اس کے پاؤں تلے کوڑا کوڑے آئے لیکن جب انہیں پتا چلا کہ وہ مرزا سچ بیگ ہے، تو احترام سے سلام کیا اور پلٹ گئے۔

کوئی مشکل، کوئی پریشانی اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بن

سکی مگر پھر... بڑھتی عمر صحت کو متاثر کرنے لگی۔ وہ بیمار رہنے لگا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ہر کوشش ناکام تھی۔ ہاں، بذلہ سخی قائم رہی۔ جب کوئی صحت پر چھتا، تو وہ کھٹ سے کہتا "پروردگار کا کرم ہے۔ آپ سنائیں، کبھی طبیعت ہے۔ ہاں بچے کیسے ہیں؟"

مگر بذلہ سخی وقت کے فیصلوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حویلی اب چپ رہنے لگی تھی۔ اور چراغوں کا دھواں کتب خانے سے غائب ہو گیا۔ جو کتاب پڑھنی ہوتی، بستر کے سر ہانے دھری رہتی۔ مگر اب مطالعہ بھی کم ہو گیا تھا۔ نظر جو کمزور ہو گئی تھی۔

سرا کی ایک صبح جب سورج کی پہلی کرن نے دھند کو منور کیا اور نہر کے مشرقی کنارے پر واقع مسجد کا موزن اذان اذان دینے لگا، ہوا، بستر پر پڑے بوڑھے کے کان میں سرگوشی ہوئی۔ "سچ۔"

بخار کا بوجھ پرے کرتے ہوئے اس نے آنکھیں کھولیں۔ ادھر دروازے پر روشنی ابھر رہی تھی۔ وہاں کوئی کھڑا تھا۔ کون تھا وہ؟

اس کا باپ؟ یا پھر اس کا بھائی یا پھر...  
"سچ۔" سرگوشی ہوئی۔

اس نے سنہری نور پر نگاہ کی اور جان گیا کہ دریا اس کے لیے گارہا ہے۔ لہراتے درخت سلاخی دیتے ہیں۔ اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ گلہ پڑھا۔

دروازے پر ظاہر ہوتی روشنی کچھ دکی اور دھرتی کا یہ عظیم پوت ایک ایسے سفر پر روانہ ہو گیا، جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

مدریہ کی ٹھکانے آئے اور بریڈمین کی پہلی ٹیسٹ سنچری کے چند ماہ بعد 1929ء کے وسط میں ایک ستارہ ٹوٹا۔ درویش نے آنکھیں موند لیں۔

اب وہ اس دریا کے گیتوں کی طرح اسر ہو گیا تھا جن کے سفید جھلک اڑاتے شفاف پانی کرشماتی کھوڑوں کی طرح تیز و تند تھے۔

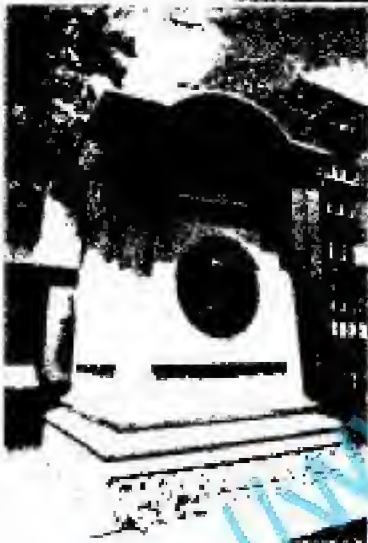
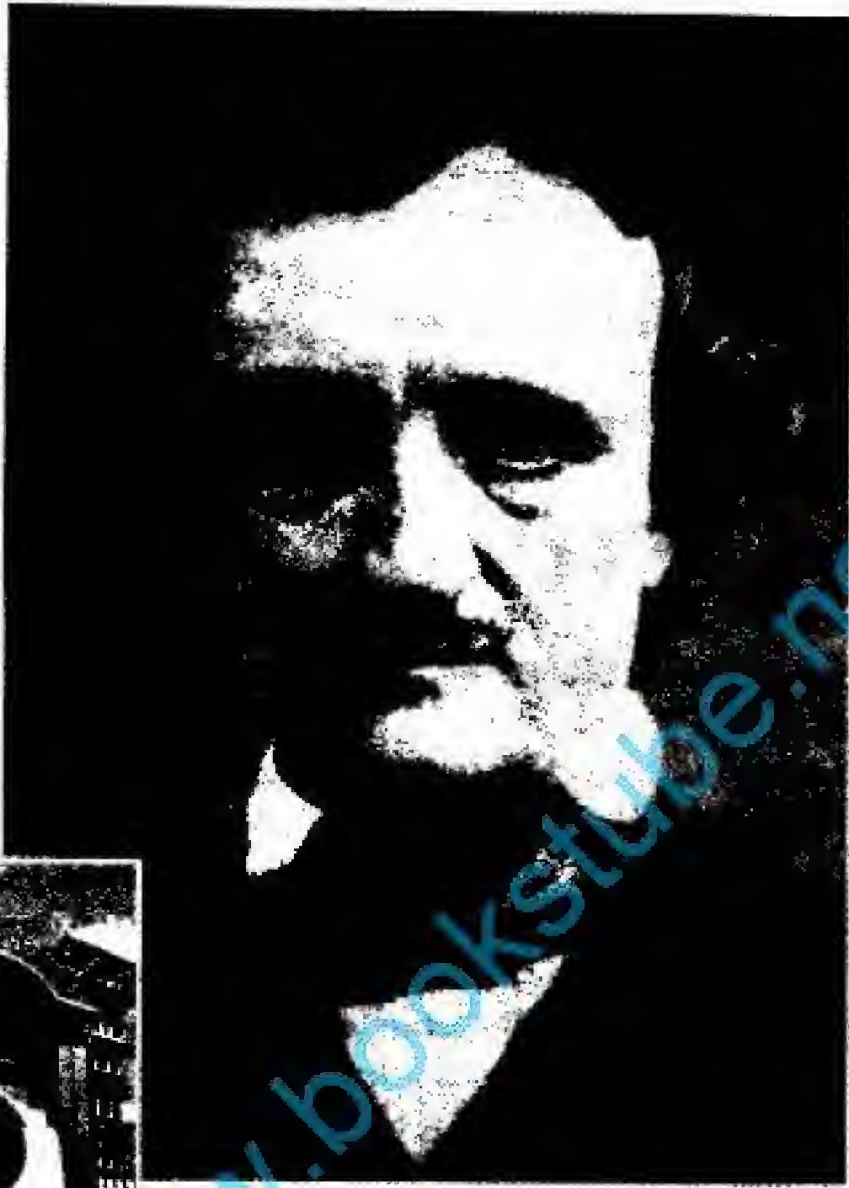
اس کے انتقال کے اٹھارہ برس بعد اس کی بیٹھلوکی درست ثابت ہوئی... انگریز ہندوستان سے لوٹ گئے۔

### ماخذات

وکیپیڈیا، مرزا قلیچ بیگ از شہناز شورو،

مرزا قلیچ بیگ از فہمیدہ ریاض





## پراسرار قلم کار

مریم کے خاتم

اس کے قلم میں پچھلے بہر جیسی گداز و کیف سحر آفرینی ہوتی۔ ہر سطر پر گمان ہوتا کہ پلکوں پر سجے اشکوں کے شبنمی تار جھللا رہے ہیں جن میں سحر آفرینی قاری کو دم بخود کیے رکھتی اور اختتام پر قاری چونکر چونک جاتا۔ اس کی یہیں جادو بیانی اسے عالمی شہرت کے معراج پر پہنچانے کا سبب بنی۔

### عالمی شہرت کے حامل قلم کار کا زندگی نامہ

13 اکتوبر 1849 کو پالنی مور، میری لینڈ، پارک کی اس بچ پر مچ کے ابتدائی وقت میں بیٹھا ہوا وہ شخص یوں لرز رہا تھا جیسے اسے سخت سردی لگ رہی ہو۔ حالانکہ اس نے گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے اور موسم بہت زیادہ سرد بھی نہیں

تھا۔ وہ سیدھا بیٹھا ہوا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے تھے۔ صبح کا کبر اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ پارک کے دیگر درخت خزاں کے ہاتھوں اپنے پتوں سے محروم ہو چکے تھے اور ان کی ٹیڈ منڈ شاخوں پر حرکت

ماہ 2015ء

83

رہا ہوا سرد گزشت



آوازوں والے کو بے ایمان تھے۔ کچھ کو بے اثرے اور انہوں نے کراہتی آوازیں نکالیں تو اس نے سراٹھا کر اوپر دیکھا۔ اس کے سر کے مین اوپر پورا چاند تھا اور یہ سنہری کی بجائے چاندی جیسا ہو رہا تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا مگر وہ چاند دیکھتا رہا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی رگوں میں سبز بست پانی ہو اور اس کے ہاتھ پیروں کی جان نکل رہی ہو۔ وہ شدید اذیت میں تھا۔ مگر وہ کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ وہ اس بیچ تک کیسے آیا اسے یہ بھی یاد نہیں تھا۔ مگر اسے ایک چیز بہت واضح محسوس ہو رہی تھی کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ ابھی ایک بوڑھا آدمی پارک میں داخل ہوا۔ اس نے گرم کوٹ کے ساتھ منظر لے رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں چاندی کے منہ والی چٹری تھی۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتا ہوا بیچ تک آیا اور پھر اسے ساکت بیٹھا دیکھ کر ٹھک گیا۔ وہ چند لمبے اپنی بوڑھی آنکھوں پر زور دیتا رہا اور پھر اس نے حیرت سے کہا۔ "مسٹر ایڈگر ایلن پو۔۔۔۔۔ یہ تم ہو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بوڑھا گھبرا اٹھا اور مدد کے لیے پکارتا ہوا پارک سے باہر دوڑ گیا۔

ایلن پو تھا کون اگر آپ نے اس کا نام نہیں سنا ہے تو آئیے اس کے بچپن کی یادیں تازہ کرتے ہیں۔

وہ مختلف قسم کا بچہ تھا، اسے بچوں والے کہیں، کھلونوں اور چیزوں سے دل چسپی نہیں تھی۔ وہ ایسی چیزوں میں دل چسپی لیتا تھا جن میں عام طور سے بڑے بھی دل چسپی نہیں لیتے ہیں۔ اسے کوڑوں سے دل چسپی تھی۔ وہ تھنوں یاغ کی بیچ پر بیٹھا آس پاس اڑتے اور درختوں پر بیٹھے کوؤں کو نکتا رہتا تھا۔ وہ گھاس اور پودوں میں ریچنے والے چھوٹے چھوٹے کیڑوں کا کچھا کرتا تھا اور دیکھتا تھا کہ وہ کہاں سے آتے ہیں اور ان کا طرز زندگی کیا ہے؟ اسے سر جری کے اوزار اچھے لگتے تھے۔ اس نے ایک دور بین، ایک خرد بین اور کپاس رکھا ہوا تھا۔ یہ اس کے کھلونے تھے۔ جاسوسی ادب کے بانی کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا مگر جان اور فرانسس ایلن سمجھتے تھے کہ اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ وہ مشکل سے ایک سال کا تھا جب انہوں نے اسے پیدا کیا۔ اس کا باپ خاندان کو چھوڑ کر کہیں چلا چکا تھا اور اس کی ماں سانس اور دل کی بیماری میں زندگی ہار گئی تھی۔

جان ایلن رچمونت درجینیا کا ایک دولت مند اسکالرش نژاد امریکی تاجر تھا۔ وہ بہت سی اشیاء کی تجارت کرتا تھا جیسے تمباکو، کپڑے، گندم اور غلام۔ اس کے پاس ایک عالی شان

گھر تھا اور اس گھر میں سہولت کی ہر چیز تھی۔ مگر وہ اولاد سے محروم تھا۔ اس لیے وہ اور اس کی بیوی کسی بچے کی تلاش میں تھے جسے وہ گود لے سکیں اور انہیں ایڈگر مل گیا۔ ایڈگر کا تعلق ایک آئرش خاندان سے تھا۔ اس کا دادا ڈیوڈ پوسٹنر کا ولان آئر لینڈ سے 1750 کے آس پاس میں ترک وطن کر کے امریکا آ بسا تھا۔ اس وقت آئر لینڈ برطانیہ کے زیر تسلط تھا اور آئرش بڑی تیزی سے ترک وطن کر رہے تھے۔ وہ ریاست میساچوسٹس کے شہر بوسٹن میں آ بسا۔ اس نے یہیں شادی کی اور اس کے بیٹے ڈیوڈ پوسٹنر نے یہیں جنم لیا۔ اس وقت بوسٹن ایک ترقی کرتا ہوا اور ابھرتا ہوا صنعتی شہر تھا۔ کارخانوں کی چیمپیاں سراٹھا رہی تھیں اور چاروں طرف سے مزدور روزگار کی تلاش میں یہاں کا رخ کر رہے تھے۔

مگر ڈیوڈ پوسٹنر نے مزدور یا طرک کی بجائے اداکار بننا پسند کیا اور اس نے شادی بھی ایک اداکارہ الزبتھ آرٹلڈ ہو چکنو سے کی۔ محبت کی شادی کے باوجود ان کی زندگی خوشگوار نہیں تھی۔ ان میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے تھے اور پہلے بچے کی پیدائش نے انہیں فوری طور پر الگ ہونے سے روکا تھا۔ اس بیٹے کا نام انہوں نے ولیم ہنری لیونارڈ پو رکھا تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے دونوں میاں بیوی ولیم شیکسپیر کے مداح تھے۔ جب ان کا دوسرا بیٹا ہوا تو ممکنہ طور پر اسے شیکسپیر کے ایک ڈرامے "کنگ لیئر" کے کردار ایڈگر سے متاثر ہو کر یہ نام دیا گیا۔ اس وقت اس کا نام ایڈگر پو تھا۔ مگر جب اسے جان ایلن نے گود لیا تو اس نے رواج کے مطابق اس کے نام میں اپنے خاندانی نام ایلن کا اضافہ کر دیا اور یوں وہ ایڈگر ایلن پو ہو گیا۔ آج دنیا اس عظیم مصنف کو اسی نام سے جانتی ہے۔

تقریباً ہر بڑے آدمی نے بہت مصائب کے ساتھ زندگی کا آغاز کیا اور پھر کامیابی نے ان کے قدم چومے لیکن کچھ بڑے آدمی ایسے بھی گزرے جن کی ساری زندگی ہی مصائب کے ساتھ گزری۔ وہ پیدائش سے لے کر مرتے دم تک جدوجہد کرتے رہے تھے۔ ایڈگر بھی ایسے افراد میں سے ایک تھا۔ وہ 19 جنوری 1809 کو بوسٹن میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد اگلے سال اس کی چھوٹی اور واحد بہن روزلی دنیا میں آئی اور اسی سال اس کا باپ ڈیوڈ پوسٹنر اپنے خاندان کو چھوڑ کر چلا گیا۔ یقیناً یہ خود غرضانہ سقا کی تھی کہ وہ اپنے بہن بچے، ایک بیمار بیوی کے پاس چھوڑ کر خود کہیں غائب ہو گیا اور پھر ایڈگر یا اس کے بہن بھائی نے کبھی



اپنے باپ کو نہیں دیکھا۔ اگرچہ سانس کی مرید تھی اور اسے دل کا عارضہ بھی لاحق تھا۔ اگرچہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر بیماری نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ مشکل سے تیس سال کی عمر میں دنیا سے گزر گئی تھی۔ ایڈگر کو اپنی ماں اور باپ بالکل یاد نہیں تھے۔ اس نے صرف تصویروں میں انہیں دیکھا۔

الزبتھ کے مرنے کے بعد اس کے سچے بٹ گئے تھے اور انہیں مختلف گھرانوں نے گمبولے لیا۔ اس وقت آئرش کیونٹی کے طور پر منظم ہو گئے تھے اور وہ اپنی کیونٹی کے غریب اور مصیبت زدہ لوگوں کا خیال کرتے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ایڈگر خوش قسمت تھا کہ اس نے ایک دولت مند گھرانے میں ہوش سنبھالا۔ اگرچہ وہ جان اور فرانسس کی اولاد نہیں تھا مگر اس گھر میں اسے اولاد کی حیثیت حاصل تھی۔ جان ایلن کا تعلق اسکاٹ لینڈ سے ضرور تھا مگر اس کی رگوں میں آئرش خون بھی تھا اس لیے وہ آئرش کیونٹی کا حصہ بھی تھا۔ 1812 میں اسے اس خاندان کے امیں کوپل چرچ میں چھم دے کر ایڈگر ایلن پوکا نام دیا گیا۔ بہترین رہائش، لباس اور خوراک کے ساتھ اسے اچھا اسکول بھی میسر آئے۔ مگر حیرت انگیز طور پر یہ اسکول امریکا نہیں بلکہ برطانیہ میں تھے۔ ایلن خاندان 1815 میں تجارت اور سیاست کے غرض سے برطانیہ گیا۔ پہلے ان کا مقصد قیام کا ارادہ تھا مگر بعض معاملات ایسے سامنے آئے کہ ان کا قیام طویل ہوتا چلا گیا۔

اسکاٹ لینڈ کے شہر ارون کا مگر امر اسکول ایڈگر کا پہلا اسکول تھا۔ یہاں اس نے پرائمری کلاس پڑھی۔ اتفاق سے اسی اسکول میں جان نے بھی اولین تعلیم حاصل کی تھی۔ اگلے سال ایڈگر لندن بلا گیا کیونکہ جان اور فرانسس وہیں مقیم تھے۔ اس بار اسے پیمپلی کے ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کرایا گیا جہاں وہ آئے بعد کے دو سال تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔ یہاں بھی وہ ایلن خاندان سے دور تھا۔ آخر میں اسے برطانیہ کے چند اعلیٰ ترین اسکولوں میں سے ایک اسکول ریورنڈ جان برسبائے میئر ہاؤس اسکول میں داخل کرایا گیا اور ایڈگر خاندان کی امریکا واپسی تک یہیں رہتا رہا تھا۔ یہ اسکول بھی لندن سے ذرا دور ایک نواحی گاؤں کے پاس واقع تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کی پرائمری تعلیم برطانیہ میں ہوئی اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں اور شخصیت میں برطانوی رنگ ہمیشہ غالب رہا۔ وہ 1820 میں امریکا واپس آ گئے تھے۔

امریکا واپسی پر اسے رچمونڈ ہائی اسکول میں داخلہ ملا اور اسکول کی باقی تعلیم اس نے یہیں مکمل کی۔ جب وہ بارہ سال کا ہوا تو پہلی بار اس کے منہ بولے باپ جان سے اختلافات شروع ہوئے۔ ایڈگر لاواہالی اور اپنے آپ میں گمن رہنے والا شخص تھا۔ ایک اعلیٰ اور دولت مند گھرانے میں پرورش پانے کے باوجود اس کی شخصیت میں گھر دراہن تھا اور وہ ادب و آداب کی زیادہ پروا نہیں کرتا تھا۔ یعنی خالص امریکی تھا۔ بعد میں آنے والے امریکی نوجوانوں نے اس کی پیروی کی تھی۔ انیسویں صدی کے خاتمے تک شمال مشرقی ریاستوں میں پو اسٹائل معروف ہو گیا تھا۔ مگر اسے روایات کا باغی نہیں کہہ سکتے ہیں۔ جان چاہتا تھا کہ وہ پرنس بھی سکھے لیکن ایڈگر کو پرنس سے ذرا بھی دل چسپی نہیں تھی اور بعد میں بھی جب اس نے حالات سے مجبور ہو کر کاروبار میں ہاتھ ڈالا تو خسارہ ہی کمایا۔

1824 میں پندرہ سال کی عمر میں اسے لازمی فوجی خدمات کے تحت فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ چھ مہینے تربیت کے بعد اسے فوجی ملازمت کی بجائے اعزازی گارڈ کے طور پر کام کرنے کی پیشکش ہوئی مگر ایڈگر نے یہ پیشکش ٹھکرا دی اور اس نے یونیورسٹی آف ورجینیا میں داخلہ لے لیا۔ اسکول کی تعلیم کے دوران ایڈگر نے بھی بہت اچھا گریڈ نہیں پایا۔ اس کے ٹیچرز کے خیال میں وہ خیالوں میں گم رہنے والا لڑکا تھا جسے عملی زندگی سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ ایڈگر کو روایتی تعلیم سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی وہ شاید بے کوز زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ البتہ اسے مطالعے کا بے پناہ شوق تھا۔ اس نے چند سال میں اسکول کی ساری لائبریری چاٹ لی تھیں جس میں ہزاروں کی تعداد میں کتابیں تھیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ شہر کی دوسری لائبریریوں کے چکر لگاتا رہتا اور اسے جو چیب خرچ ملتا اس کا بڑا حصہ بھی کتابوں کی خرید پر لگ جاتا تھا۔ مگر فوجی تربیت کے دوران اسے ایک لت اور لگ گئی تھی جو اس کی چیب کو ہمیشہ خالی رکھنے کی سب سے بڑی بھی ثابت ہوئی تھی۔ یہ عادت جوئے کی تھی۔

یہ ظاہر تو ایڈگر کی زندگی بڑے عیش و آرام سے گزر چکی تھی۔ کیونکہ اس کا باپ ہوا باپ جان ذاتی طور پر تو دولت مند تھا ہی۔ ساتھ اسے اپنے اکل و لیم گالٹ نے ورثے میں اس کے لیے ہزاروں ایکڑ زمین چھوڑی جس کی مالیت اس زمانے میں لاکھوں ڈالروں کے برابر تھی۔ جان نے



اب تم اپنے وقت کو دولت میں بدل سکتے ہو۔“  
”میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔“ ایڈگر نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے اس صورت میں تم اپنی تعلیم کے اخراجات خود برداشت کرو گے۔“

ایڈگر کا خیال تھا کہ جان عارضی ناراض تھا اور جلد وہ مان جائے گا اور اس کی تعلیم کے اخراجات برداشت کر لے گا۔ اس نے اپنی جمع پونجی سے یونیورسٹی آف ورچینیا میں داخلہ لیا۔ یہ یونیورسٹی امریکی صدر تھامس جیفرسن نے قائم کی تھی اور یہاں طلباء کے لیے خاصے سخت رول تھے۔ یہاں جوا، گھوڑے اور تھیٹر تباہ کن اور انکو حلال ممنوع تھی۔ مگر ساتھ ہی جیفرسن نے ایک عجیب قانون بنایا تھا کہ طلباء کو پکڑنے کا اختیار انتظامیہ کے پاس نہیں تھا بلکہ ہر طالب علم اپنے بارے میں خود رپورٹ کرتا کہ اس نے مذکورہ قوانین کی کب کب خلاف ورزی کی اور پھر اسے سزا ملتی تھی۔ مزے کی بات ہے اپنے بارے میں رپورٹ کرنے والے طلباء کا تناسب بہت زیادہ تھا اور یہ قانون آج بھی برقرار ہے۔ ایڈگر کو یونیورسٹی سے پہلے ہی شراب اور جوئے کی لت لگ چکی تھی۔ یونیورسٹی میں داخلے کے بعد بھی اس کے یہ مشاغل جاری رہے۔ مگر اسے اپنے بارے میں رپورٹ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کیونکہ پہلے سمسٹر کے بعد اسے مالی مشکلات کے سبب یونیورسٹی چھوڑنا پڑی تھی۔

جان کا خیال تھا کہ ایڈگر واپس آ جائے گا اور اب اس کے ساتھ کام کرے گا۔ مگر وہ ایڈگر کی ضدی طبیعت کا درست اندازہ نہیں کر پایا تھا۔ ایڈگر نے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے انوکھا فیصلہ کیا اور اس نے فوج میں ملازمت کر لی۔ ہوا یوں کہ یونیورسٹی میں پڑھنے کے دوران اس کا زور غیر فصالی سرگرمیوں پر رہا اور خاص طور سے جوئے کے شوق نے اسے خاصا مقروض کر دیا۔ بعد میں ایڈگر نے اس کا الزام اپنے منہ بولے باپ کو دیا جس نے اسے اتنی رقم نہیں دی جس سے وہ نہیں ادا کرتا، کتابیں اور کپڑے خرید سکتا۔ اس لیے اس نے رقم کی خاطر جوا کھیلنا اور بد قسمتی سے مزید قرض چڑھا جینا۔ اسے اتارنے کے لیے اس نے فوجی ملازمت کی اور یہاں اس نے ایڈگر اسے بھری کے نام سے رجسٹریشن کرائی۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے قرض خواہوں کو علم ہو کہ وہ فوج میں ہے اور وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں چلے آئیں۔ اس نے عمر بھی غلط

اپنی دولت مندی کا جشن منانے کے لیے ایک برک مینشن خریدا اور اسے مولد او یا مینشن کا نام دیا۔ ایڈگر بھی خاندان کے ہمراہ اس مینشن میں منتقل کیا اور یہیں یونیورسٹی جانے سے پہلے اس کی منگنی سارہ الیمیر روسٹر سے ہو گئی۔ لڑکی کا باپ ایرکسن روسٹر بالٹی مور کا ایک معروف بزنس مین اور دولت مند تھا۔ اس نے ایڈگر کو کبھی پسند نہیں کیا اور اس کی پیش گوئی تھی کہ یہ لڑکا ناکام رہے گا اور لوگ اس کا نام تک بھول جائیں گے۔ مگر قسمت کا کھیل دیکھیں۔ ایرکسن کی پیش گوئی اس لحاظ سے درست ثابت ہوئی کہ ایڈگر ہمیشہ ناکام رہا۔ مگر آج لوگ ایرکسن روسٹر کا نام صرف اس کی وجہ سے جانتے ہیں۔

ایڈگر جوانی میں بھرے بالوں اور بے پروا صلیب والا ایک خوش شکل نوجوان تھا اور اس میں صنف مخالف کے لیے ایک خاص کشش تھی۔ اس کی گفتگو جارحانہ اور کھردری ہونے کے باوجود ایک خاص قسم کی کشش رکھتی تھی۔ اسے الفاظ اور انداز پر عبور تھا۔ لیکن اسے اعلیٰ ترین طرز زندگی رکھنے کے بعد وہ اب اس کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ بہترین لباس پہنتا۔ اسے کھانے کا زیادہ شوق نہیں تھا مگر ابتدا سے جوانی سے اسے شراب کی لت لگ گئی تھی اور وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر یہ ایسی کوئی خرابی نہیں بلکہ اس کے طبقے کا خاصہ تھا۔ یہاں نوجوان چندرہ سولہ سال کی عمر تک عادی شرابی ہو جاتے تھے۔ ایڈگر نے اسکول کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس نہیں کیا تھا مگر اس کی معلومات اور علمیت اپنی عمر کے نوجوانوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے دنیا جہان کا ادب چاٹ ڈالا تھا جو کتاب اس کی دسترس میں آئی وہ اسے پڑھے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔ لٹنے والا کوئی فرد اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ جان کے بعد یہ سب ایڈگر کا ہو گا۔ مگر اس موقع پر اس کی افتادہ طبیعت کا مکمل کر سامنے آئی۔ اس نے جان کے بزنس میں شراکت کی بجائے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پڑھنے اور کوئی علمی کام کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ حالانکہ جان کے خیال میں اس نے جتنی تعلیم حاصل کر لی تھی کر لی تھی اور اب اسے عملی زندگی میں آ جانا چاہیے تھا۔ دراصل جان اپنی ساری دولت مندی کے باوجود ایک سنجوس شخص تھا اور اسے ایڈگر کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات مکمل رہے تھے۔ اس نے ایڈگر سے کہا۔ ”تم کیوں رقم خرچ کرنا چاہتے ہو جب کہ



کے لیے بنایا گیا تھا اور یہاں ایڈگر کی تنخواہ دو مہنی ہو گئی۔

تقریباً سوا دو سال بعد ایڈگر نے فوج سے نکلنے کا فیصلہ کیا حالانکہ اس وقت وہ سارجنٹ۔ مگر کے عہدے پر پہنچ گیا تھا جو فوج میں ٹان کیشنڈا افسران کے بعد سب سے اونچا رینک تھا۔ اس کی تنخواہ پچیس ڈالرز ماہانہ ہو گئی تھی۔ اس کا بیشتر قرض اتر گیا تھا۔ مگر وہ فوجی ملازمت سے اکتا گیا تھا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ادب کے میدان میں طبع آزمائی کرے گا۔ لیکن فوج چھوڑنے کی وجہ صرف یہی نہیں تھی۔ شراب اور جوئے سے متعلق اس کی بے اعتدالیاں فوج میں بھی جاری رہیں اور بالآخر اس کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹننٹ ہاورڈ نے اس کے سامنے دو آپشن رکھے کہ یا تو وہ عزت سے استعفا دے دے یا پھر احتساب کے لیے تیار ہو جائے۔ لیکن اس صورت میں اسے نہ تو واجبات ملتے اور نہ ہی وہ آئندہ کسی سرکاری ملازمت کا اہل رہتا کیونکہ اس نے فوجی ملازمت کی لازمی مدت پوری نہیں کی تھی۔ ایڈگر نے پہلا آپشن اختیار کیا اور فوج سے نکل گیا۔ اس وقت فوج کی ملازمت عزت اور ناموری حاصل کرنے کا سب سے آسان ذریعہ بھی جاتی تھی اور فوج سے نکالنا بے عزتی کے

تکصواری۔ وہ اٹھارہ سال کا تھا مگر اس نے بتایا کہ وہ پانچ سال کا ہے۔

فوجی ملازمت ایڈگر کا ایک غلط فیصلہ ثابت ہوئی۔ وہ کسی طرح بھی فوجی ملازمت کا اہل نہیں تھا۔ اس کی صحت اچھی تھی۔ مگر وہ نازک مزاج ہونے کے ساتھ لا اوپالی طبیعت کا آدمی تھا جس کے لیے نظام الاوقات سے زندگی گزارنا جہنم میں رہنے کے مترادف تھا پھر یہاں شراب اور جوئے پر پابندی تھی۔ یہ دونوں کام چھپ چھپا کر ہی ممکن تھے۔ اس وقت فوجی ملازمت کرنے والوں کو کم سے کم پانچ سال ملازمت کرنا پڑتی تھی۔ اس کی آئینین پوشنگ بوسٹن کے پاس فورٹ اینڈی پیڈنٹس میں ہوئی اور اسے یہاں کارپول سارجنٹ کے طور پر تعینات کیا گیا۔ اس کی تنخواہ کل پانچ ڈالرز ماہانہ بنتی تھی۔ یہیں اس نے اپنی اپنی کتاب شائع کر رکھی۔ یہ نظموں کا مجموعہ ”تیمورنگ ایڈ آدر پوکس“ تھی۔ چالیس صفحات کی اس کتاب کی کل پچاس کاپیاں شائع ہوئیں اور اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ آج اس کی صرف ایک کاپی دستیاب ہے۔ اسی سال اس کا جاولہ جنوبی کیرولینا کے فورٹ ملر یا میں کر دیا گیا۔ یہاں اسے آرٹی آفیسر کے عہدے کی پیشکش ہوئی۔ یہ عہدہ خاص طور سے جدید آرٹری

موسم بہار کی محراب دہنیں  
مارچ کے شمارے کی اندر تھیں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

اولین صفحات ● ذہن وپراسرار لڑکی کی پرتحسں کہانی... کاشف زبیدی کی زبانی

● آوارہ گرد ● دکھ سکھ کے شہر کے قاصد کی ایک زلی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ہر ایک کو اپنی تلاش کا سہارا پیش تھا۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بھٹو کی شہریت

● جواہری ● احمد اقبال کے شہر باد قلم سے ایک جواہری کے کھیل کے شہر باد قلم

● مغرب کے نوالے انداز ● مغربی دنیا کی تہذیبی حوال کی مکا جیم اور محبت کی پورہ ناقل فرسٹ ہائیڈ

● ضرور ق کی کہانیاں ●

● نیلی موت ● ملک کے ہر مہنگی کی معنیات کی دلالت و استعمال کا گھناؤنا احوال

● بل صراط ● سکون کی خاطر شہر کے بل صراط گزرا جا سکتا ہے زندگی کے بل کھاتی آجی تحریر



آپ کے تہرے...  
شہرے... محبتیں...  
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں



مترادف ہوتا تھا۔

فوج میں ملازمت کے دوران اس میں خاصی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ اول اس کی منگیت سارہ سے منگنی ٹوٹ گئی تھی کیونکہ وہ کسی فوجی کی بیوی نہیں بننا چاہتی تھی۔ پھر اس کے قرضوں کی وجہ سے جان اور فرانسس سے اس کے تعلقات بھی خراب ہوئے تھے اور وہ اس دوران میں صرف دو بارر چھوڑ گیا تھا۔ دونوں بار اسے جان اور فرانسس کا رویہ روکھا لگا۔ فرانسس اس سے محبت کرتی تھی۔ مگر وہ اس کے بچے پر وار و سیہ کو پسند نہیں کرتی تھی۔ دوسری بار اسے معلوم ہوا کہ اس کی سابق منگیت کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ انہیں خط لکھتا تھا مگر اسے جواب نہیں ملتا۔ پھر فرانسس بیمار ہو گئی اور ڈاکٹروں نے اسے جواب دے دیا۔ ایڈگر نے خط لکھ کر جان سے اس کے بارے میں پوچھا تب بھی اسے جواب نہیں ملا اور جب اسے علم ہوا کہ فرانسس آخری دموں پر ہے تب وہ فوج چھوڑ کر رہوڑ جا رہا تھا۔ وہ گھر پہنچا تو فرانسس کی تدفین ایک دن پہلے ہو چکی تھی۔ ایڈگر کے لیے یہ صدمہ تھا کیونکہ وہ جان کی نسبت فرانسس سے کہیں قریب تھا۔ اس نے شکوہ کرنا بیکار سمجھا۔

بیوی کی موت نے جان کا دل نرم کر دیا تھا اور پھر یہ خاندان کی عزت کا معاملہ تھا۔ جان نے ایڈگر کو موقع دیا کہ وہ فوج سے باعزت مستعفی ہو سکے۔ اس کے لیے اسے بقیہ مدت پوری کرنے کے لیے ویسٹ پوائنٹ بھیجا۔ ویسٹ پوائنٹ فوجی تربیت کا بنیادی ادارہ ہے۔ جان نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور ایڈگر کی مالی ضمانت دی یوں بالآخر وہ 15 اپریل 1829 کے دن دوبارہ فوج میں شامل ہوا۔ اس بار اسے کیپٹن آفیسر کی تربیت حاصل کرنی تھی۔ ایڈگر ویسٹ پوائنٹ جانے سے پہلے وہ بالٹی مور گیا جہاں اس کی بیوہ خالہ ماریا لین، کنٹن ور جینیا، اس کا بھائی ولیم اور خالہ کی ساس رہتے تھے۔ اس دوران میں ایڈگر نے اپنی دوسری کتاب ”ال آراف، تیمور لنگ ایڈگر در پوائنٹس“ چھپوائی۔ مگر اس کا حشر بھی سابق کتاب سے کم نہیں ہوا۔ ایڈگر کی شاعری سے کسی کو دل چسپی نہیں تھی۔ وہ نیم رجات کے تحت شاعری کرتا تھا اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کی نظموں کا مرکز مشرق کے کردار تھے جن سے امریکیوں کو بہت کم دل چسپی تھی۔

جب وہ ویسٹ پوائنٹ میں تھا تو اسے پتا چلا کہ جان لین نے دوسری شادی کر لی ہے اور کچھ عرصے بعد اس کی

دوسری بیوی لوئیس نے اس کے بچے کو ختم دیا تو ایڈگر کا جان سے رہا سہا تعلق بھی ختم ہو گیا اور اس نے ایڈگر کو باقاعدہ الگ کر دیا۔ اب وہ اس کا لے پاگ نہیں رہا تھا اور نہ ہی اس کی دولت سے ایڈگر کا کوئی واسطہ رہا تھا۔ ایڈگر ایلن پو کے لیے یہ ایک دھچکا تھا کیونکہ فی الحال اس کا کوئی خاص روزگار نہیں تھا۔ فوجی تربیت کے دوران جو وظیفہ ملتا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ قرض میں چلا جاتا اور باقی اس کے اخراجات کے لیے ناکافی تھا۔ جان کا سہارا بھی ختم ہو گیا تھا اس لیے ایڈگر کے لیے فوجی ملازمت اب ایک بوجھ بن گئی تھی۔ جیسے ہی اس کا قرض اتر اس نے فوج سے نکلنے کی تگ و دو شروع کر دی۔ وہ استعفا نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے ڈیوٹی سے غیر حاضر رہنا اور سینٹر کی حکم عدولی کرنا شروع کر دی۔ ساتھ ہی اس نے طبیعت خرابی کا بیانا کر کے کلامز، چرچ اور مشقوں میں جانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ ایک بار پھر فوج سے اس کی برخداشتی کی صورت میں سامنے آیا۔

اگلے سال اس نے نیویارک کا سفر کیا اور یہاں اس نے ایلم ٹیس پبلشر سے اپنی تیسری کتاب شائع کرائی۔ یہ بھی نظموں کا مجموعہ تھی اور اس کا خرچ ایڈگر کے ساتھی کیڈٹس نے اٹھایا تھا انہوں نے فی کس پچھتر سینٹ اس مقصد کے لیے دیئے اور کل ایک سو ستر ڈالر جمع ہوئے۔ اس چندے سے کتاب شائع ہوئی اور حسب سابق ناکام ہوئی۔ شاید اس لیے کہ اس میں بھی تیمور لنگ اور ال آراف کی نقیصیں موجود تھیں۔ مگر ساتھ ہی اس میں ایڈگر کی جدید نقیصیں بھی تھیں جو پہلی دو کتابوں میں شائع نہیں ہوئی تھیں۔ کتاب کے اولین حصے میں ویسٹ پوائنٹ کے ان کیڈٹس کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا جنہوں نے اس کتاب کے لیے چندہ دیا تھا۔ دراصل ایڈگر اپنی ان نظموں کی وجہ سے زیر تربیت کیڈٹس میں نہایت مقبول تھا جو اس نے کمانڈنگ آفیسر کے بارے میں کہیں نہیں ظاہر ہے اس نے ان کی جھوکی تھی۔

ناکامی کی ہیبت ٹرک کر کے دل برداشتہ ایڈگر نے ایک بار پھر خالہ کے پاس بالٹی مور کا رخ کیا۔ یہ وقت اس کے لیے نہایت مشکل تھا۔ کیونکہ ان ہی دنوں ایڈگر کا بڑا بھائی ولیم الکوحل کے بے اعتدال استعمال کی وجہ سے صحت مند بنا بیٹھا تھا اور آخری دموں پر تھا۔ وہ بالٹی مور کے سنی نو بچے میں داخل تھا اور ایڈگر کے سامنے اس نے آخری سانس لے کر موت ایڈگر کے لیے نئی چیز نہیں تھی اگرچہ اس نے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا مگر اپنے کئی ساتھیوں کو



مختلف حادثات اور بیماریوں میں مرتے دیکھا تھا۔ البتہ اپنے کسی رشتے کو پہلی بار موت کے گھاٹ اترتے دیکھا۔ ایڈگر کی ولیم سے جوانی تک چند ہی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ بالٹی مور میں آدھین قیام کے دوران وہ پہلی بار تفصیل سے ملے اور ایڈگر اپنے بھائی سے قریب ہوا تھا۔ جب وہ واپس مینیا جب بھی انہوں نے خط پر رابطہ رکھا تھا۔ اس وقت ایڈگر کو خیال نہیں آیا تھا کہ وہ اتنی جلدی بھائی سے محروم ہو جائے گا۔ اب دنیا میں اس کا خون کا واحد رشتہ اس کی بہن رہ گئی تھی۔

ولیم میں بھی لکھنے کے جراثیم تھے اور اس نے بہت اچھی شاعری کی تھی مگر اس نے کبھی اسے شائع کرائے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی شاعری دیکھ کر ایڈگر نے سوچا کہ اگر کبھی اسے مالی فراغت نصیب ہوئی تو وہ اپنے بھائی کی شاعری شائع کرائے گا۔ مگر اسے یہ فراغت کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ بھائی کی موت کے بعد اس نے زیادہ شہود سے بہ حیثیت ادیب اپنا کیریئر بنانے کی سعی شروع کر دی۔ جس وقت لکھنا اور ادیب ہونا یورپ میں نفع بخش پیشہ بن گیا تھا اس وقت امریکا میں اسے صرف ایک جزوقتی پیشے کی حیثیت حاصل تھی۔ کوئی امریکی مصنف صرف تحریر کے بل بوتے پر زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی ایک بہن ملک میں کاہنی رائٹ کے قوانین کا نہ ہونا بھی تھا۔ امریکی پبلشر اور رسائل کے مالکان نہایت ڈھٹائی سے یورپ کے نامور ادیبوں کی تخلیقات نہ صرف کتابی شکل میں بلکہ رسالوں میں بھی شائع کر رہے تھے۔ اس لیے انہیں نیا امریکی مصنف شائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی جسے کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ ایسے میں کون لکھ کر کیسی لڑتا تھا جو صرف لکھنے کو پیشہ بناتا۔ یہ جرأت سب سے پہلے ایڈواہن پورنے کی تھی۔

1837 میں آنے والا معاشی بحران بھی بڑی حد تک اس کا ذمے دار تھا۔ اگرچہ پبلشنگ کی صنعت تیزی سے ترقی کر رہی تھی اور اس میں نئی ٹیکنالوجی کا اضافہ ہوا تھا مگر دیگر معاشی حالات کی وجہ سے پبلشر نے مصنفوں کو معاوضہ دینے یا وہ معاوضہ دینے سے انکار کر دیا جس کا وہ وعدہ کر چکے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود اس دور میں نئے لکھنے والے امریکی نوجوانوں کی ایک کمیپ پرورش پا رہی تھی۔ ان میں سے بیشتر نے آنے والے وقتوں میں خاصی کامیابی حاصل کی اور بہت سارے تو آسودگی اور دولت مندی کی منزل تک پہنچے تھے۔ مگر جس شخص نے سب

سے پہلے یہ کام کیا وہ ساری عمر مالی پریشانیوں کا شکار رہا اور اسے گزارا کرنے کے لیے قرض ادا ہمارے لے کر دے دیا گئے۔ تک بہت سارے طریقے اپنانے پڑے تھے۔ اکثر پبلشر اس سے لکھواتے ہوئے جو وعدے کرتے تھے وہ وفا نہیں ہوتے تھے۔

شاعری کے میدان میں لگا ہوا ناکامیوں کے بعد ایڈگر نے نثر کی طرف توجہ دی۔ اس نے شاعری جاری رکھی تھی۔ مگر اپنی آخری کتاب کی ناکامی کے بعد فیصلہ کر چکا تھا کہ اب شاعری کی کوئی کتاب شائع نہیں کرائے گا۔ اسے نثر کی طرف آنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ اس نے فلاڈلفیا پہلی کیشنز کے ساتھ مل کر مختصر کہانیاں لکھنا شروع کیں اور ان ہی دنوں اس نے اپنا واحد ڈراما ”دی پولی ٹیشن“ (سیاست دان) لکھا۔ 1833 میں اس کی ایک چھوٹی کہانی ”مس فاؤنڈ ان بوس“ کو انعام ملا اور اس کہانی نے ایک معروف دولت مند جان پی کینڈی کو متوجہ کر لیا۔ کینڈی مطالعے کا شوقین تھا اور نئے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اس نے ایڈگر کو ملاقات کے لیے بلایا اور اسے تھامس ڈبلیو وائٹ سے متعارف کرایا۔ تھامس رچمونڈ کے رسالے ساؤدرن لٹریٹری سیسٹجر کا ایڈیٹر تھا۔ کینڈی کی وجہ سے ایڈگر کو یہاں اسٹنٹ ایڈیٹر کی ملازمت مل گئی جو چند ہفتے سے زیادہ جاری نہ رہ سکی اور اسے نکال دیا گیا کیونکہ وہ اپنے باس کی شراب چرا کر چپا ہوا پکڑا گیا تھا۔

دل برداشتہ ایڈگر بالٹی مور واپس چلا گیا اور وہاں اس نے اپنی کزن ورجینیا سے شادی کر لی۔ اس وقت وہ چھبیس برس کا تھا اور ورجینیا صرف تیرہ برس کی تھی لیکن شادی کے سرٹیفکیٹ پر اس کی عمر اکیس برس لکھی تھی۔ امریکا میں شادی کی قانونی عمر لڑکیوں کی سولہ سال تھی۔ قانون کی خلاف ورزی اور سزا سے بچنے کے لیے ایڈگر اور اس کی خالہ نے یہ جھوٹ بولا۔ اس کے تین سال بعد ایڈگر نے رچمونڈ میں دوبارہ ورجینیا سے شادی کی اور اس بار یہ تقریب عوامی پیمانے پر ہوئی۔ جب تک لوگ بچی جانتے تھے کہ ایڈگر اپنی بے سہارا خالہ اور کزن کو ساتھ رکھے ہوئے ہے۔ شادی کرتے ہی اس کے حالات میں کسی قدر بہتری آئی تھی۔ معاشی طلب کرنے کے بعد وائٹ نے اسے واپس رسالے میں بلا لیا اور اسی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ سری ادب لکھے کیونکہ اس میں اپنی کی صلاحیت تھی۔ ایڈگر نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور وہاں آنے والے چار سالوں تک کام



کرتا رہا۔ یہ سب سے طویل عرصہ تھا جو اس نے کسی ایک جگہ کام کرتے ہوئے گزارا۔ ایڈگر کا دعویٰ تھا کہ اس کے آنے سے رسالے کی اشاعت سات سو سے بڑھ کر ساڑھے تین ہزار ہو گئی تھی۔

ان چار سالوں میں اس نے رسالے میں بے شمار نظمیں، کہانیاں، پرتھرے، تنقیدیں اور اپنی کہانیاں شائع کیں۔ رسالے کی ملازمت ترک کرنے کے بعد اس نے اپنی اولین نثری کتاب ”دی نیریو آف آر تھر گورڈن پائن آف نان ٹکٹ“ شائع کرائی اور اسے وسیع پیمانے پر پڑھا اور پسند کیا گیا۔ اس زمانے میں کتابوں کے طویل نام رکھنے کا رواج تھا۔ مگر اس کتاب سے ایڈگر زیادہ مالی فائدہ حاصل نہیں کر سکا تھا۔ اس سے کئی گنا زیادہ اس پبلشر نے کمایا جس نے یہ کتاب شائع کی تھی مجبوراً ایڈگر کو واپس ملازمت کی طرف آنا پڑا اور اس بار اسے ایک فلٹن میگزین ”بورٹن جنٹل مین میگزین“ میں نائب مدیر کی نوکری ملی۔ یہاں بھی اس نے بے شمار کہانیاں، پرتھرے اور تنقیدیں لکھیں۔ اس کی کاٹ دار تنقید کی وجہ سے اسے مصنف سے زیادہ تنقید نگار کے طور پر جانا جاتا تھا۔ حالانکہ اس نے بورٹن جنٹل مین میں اس معیار کی تنقید نہیں کی تھی۔ جو ساؤڈرن لٹری میگزین میں اس کا خاصا رہنما تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسروں پر تنقید کرنے سے زیادہ وہ لکھنے میں مصروف رہا تھا۔ کیونکہ اگلے سال 1839 میں اس کی کہانیوں کا مجموعہ ”نیلو آف گر وکس اینڈ عربکس“ دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ شاید اس کتاب سے اسے کچھ رقم حاصل ہوئی تھی۔ مگر اسے پہلی کتاب جیسی پسندیدگی حاصل نہیں ہوئی اور اس پر خاصی تنقید بھی ہوئی تھی۔

ایڈگر کے دور میں سری ایوب سے مراد ماروھاڑ ہوتی تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ اسے جاوہری گلشن کی بجائے جاسوی ایکشن کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ کہانیاں میں ہیرو سراغ رسانی سے زیادہ مجرموں کی بدادہ راست چوکی کرتا تھا اور اس قسم کی کہانیاں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ اگرچہ یہ طریقہ طور پر سری ایوب کا بانی سر آر تھر کائن ڈائل کو کہا جاتا ہے جنہوں نے شر لاک ہو مز جیسا شہرہ آفاق کردار تخلیق کیا۔ مگر صرف انہیں سری ایوب کا بانی قرار دینا ایڈگر ایلن پو کے ساتھ زیادتی ہوگی کیونکہ اس نے بے شمار چھوٹی اور بڑی ایسی کہانیاں لکھیں جن میں سراغ رسانی کے سائنسی پہلوؤں کو مد نظر رکھا گیا اور اس کی کہانیاں منطق اور حقیقت نگاری کے

معیار پر پورا اترتی تھیں۔ بد قسمتی سے وہ کوئی خاص کردار تخلیق کرنے میں ناکام رہا اور مزید یہ کہ وہ ناول بھی نہ لکھ سکا۔ شاید وہ زندہ رہتا تو یہ دونوں کام کر جاتا۔ ادب میں زندہ رہنے کے لیے ناول نگاری اور کردار نگاری لازمی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے باوجود ایڈگر ایلن پو نے جو لکھا وہ اسے یاد رکھنے کے لیے کافی ہے۔

ہر معروف ہو جانے والے مصنف کی طرح ایڈگر ایلن پو کے دماغ میں بھی ذاتی پبلشنگ کا سودا سما یا۔ یہ فطری خیال ہے۔ مصنف سوچتے ہیں کہ پبلشر ان کی وجہ سے کما رہے ہیں اگر وہ نہ لکھیں تو پبلشر خود سے کما نہیں سکتا اس لیے وہ پبلشر بھی بن سکتے ہیں۔ حالانکہ پبلشنگ ایک الگ میدان ہے اور ضروری نہیں ہے کہ کوئی کامیاب مصنف کامیاب پبلشر بھی بن جائے۔ اگرچہ ایسی مثالیں ہیں جب مصنفین نے اپنی کہانیاں اور کتابیں خود شائع کیں اور کمایا لیکن ایسی مثالوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جب مصنف نے پبلشر بننے کی کوشش کی اور اسے ناکامی ملی۔ بہت سے تو تحریر کے حوالے سے حاصل کی ہوئی دولت اور مقام بھی گنوا بیٹھے۔ ایڈگر نے اعلان کیا کہ وہ ”عقرب“ ”اسٹارکس“ نامی رسالہ نکالنے والا ہے۔ جون 1840 میں فلاڈلفیا کے معروف اخبار سیٹرفٹس اپونٹک پوسٹ میں اس کا اشتہار بھی چھپا مگر اس میں رسالے کا نام تبدیل کر کے ”پائن میگزین“ کر دیا گیا۔ اشتہار کچھ یوں تھا ”ایک شاندار ماہنامہ جسے معروف مصنف اور شاعر ایڈگر اسے پو کی زیر اہانت اور زیر سرستی شائع کیا جائے گا۔“

مگر ایڈگر کی موت تک یہ رسالہ نہ شائع ہو سکا۔ ایک طرف تو ایڈگر ایلن پو پبلشر بننے کی کوشش کر رہا تھا دوسری طرف سرکاری حلقوں سے قربت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ صدر ٹیلر سے کوئی سرکاری عہدہ حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اسے امید تھی کہ وگ پارٹی کا ممبر بن سکے گا۔ وگ پارٹی سے مراد صدر کے قریبی حلقے کے لوگ تھے جنہیں اس نے مشاورت اور معاونت کے لیے جمع کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ صدر ٹیلر کے بیٹے رابرٹ کی دوستی کو استعمال کر رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ اگر وہ وگ پارٹی کا صدر بن سکا تو کم سے کم فلاڈلفیا کسٹم ہاؤس میں کوئی نہ کوئی منصب حاصل کر لے گا۔ کسٹم ہاؤس کی اصطلاح ثقافتی مرکز کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ کسٹم ہاؤس کی صدارت پر متمکن فریڈرک کسٹم سے اس کی اولین ملاقات نہ ہو سکی



حالانکہ اس ملاقات کے نتیجے میں اسے کوئی عہدہ ملنے کا پورا امکان تھا۔ اس نے بیماری کا بھانہ بنایا مگر تھامس کو یقین تھا کہ وہ نقشے میں دھت ہوئے کی وجہ سے نہیں آسکا تھا۔ اس کے بعد بھی ہونے والے کئی اپائنٹمنٹ تکمیل تک نہ پہنچ سکے اور یوں سرکاری عہدہ حاصل کرنے کا خواب خواب ہی رہ گیا۔

درجینیا سے شادی بہت کامیاب رہی تھی حالانکہ ایڈگر بہت غیر ذمے دار شخص تھا۔ وہ شراب پیتا تھا اور اکثر راتوں کو دیر سے آتا تھا۔ درجینیا اس کی حرکتوں پر مہم کرتی تھی کیونکہ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ خود ایڈگر بھی اس سے محبت کرتا تھا۔ 1842 میں اسے گلے اور سینے میں تکلیف ہوئی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد تشخیص کیا کہ پیانو پر بیٹھنے اور گانے سے اسے یہ تکلیف ہوئی تھی کیونکہ اس کے گلے کی ایک شریان متاثر ہوئی تھی۔ علاج ہوا اور درجینیا کو افاقہ بھی ہوا تھا مگر اس کی صحت بہت کمزور تھی۔ اس کی فکر کی وجہ سے ایڈگر نے حد سے زیادہ شراب پینا شروع کر دی۔ اس کی اپنی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ ایسے میں درجینیا نے اسے مشورہ دیا۔

”تم کہیں اور چلے جاؤ اگر تم میرے سامنے رہے تو فکر مند ہو کر خود کو بھی بیمار کر لو گے۔“

درجینیا کا مشورہ اس کے دل کو لگا۔ ان دنوں وہ گراہم میکنزین کی ادارت کر رہا تھا۔ یہ بھی فلاڈلفیا سے شائع ہونے والا ایک ادبی رسالہ تھا مگر اس میں سیاست پر بھی لکھا جاتا تھا۔ ایڈگر کی طبیعت اس سے بیزار ہو چکی تھی اس لیے اس نے میکنزین کی نوکری چھوڑ دی اور نیویارک جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے سرکاری منصب کی پیشکش ہوئی اور اس نے قبول کر لی۔ مگر مسئلہ وہی تھا جب تک وہ یہاں رہتا درجینیا کی وجہ سے حد سے زیادہ شراب پیتی کرتا رہتا۔ اس لیے بالآخر اس نے یہ نوکری بھی چھوڑ دی اور نیویارک روانہ ہو گیا۔ یہاں اس نے پہلے ایوننگ مرمر میں کچھ عربی لکھا اور پھر وہ براڈ وے جرنل میں ایڈیٹر بن گیا۔ اس نے پہلے اس میں مالی شراکت کی اور کچھ عرصے بعد باقی شراکت داروں کے دستبردار ہونے کے بعد وہ اس رسالے کا اکیلا مالک بن گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسالے کا مستقبل تاریک تھا اور اس پر قرض بڑھتا جا رہا تھا۔ رسالے کا مالک بنتے ہی اس کے ہاتھ میں گویا ایک ہتھیار آ گیا اور اس نے معاصر ادبوں پر کھل کر تنقید شروع کر دی۔ خاص طور سے ہنری

وڈ سورتھ لائٹ فیلو اس کا نشانہ بنا اس نے اس کی تصنیف ”ہیگنیر یزم“ پر بے تحاشہ تنقید کی اور اسے ادب پر دھت قرار دیا۔ مگر لائٹ فیلو نے اسے بھی جواب نہیں دیا۔

1845 میں اس کی شہرہ آفاق نظم ”دی ریوان“ شائع ہوئی۔ مگر یہ نظم براڈ وے جرنل کی بجائے ایوننگ مرمر میں شائع ہوئی اور اس کے بدلے اسے صرف نو ڈالرز ملے تھے۔ اسی نے ایڈگر ایلن پوکا نام سارے امریکا میں پھیلا دیا۔ بعد میں اسے نام بدل کر اور کسی قدر تبدیلی کے ساتھ ”دی امریکن ریویو“ اسے ”گج جرنل“ میں شائع کیا۔ اس بار اسے ”کواریٹس“ کا نام دیا گیا تھا۔ براڈ وے جرنل زیادہ عرصہ شائع نہ ہو سکا اور مالی مشکلات کی وجہ سے اسے بند کرنا پڑا تھا۔ دل برداشتہ ہو کر ایڈگر بروکس نیویارک کے ایک کالج میں منتقل ہو گیا۔ اس وقت یہاں جنگل تھا اور یہ جگہ کنکشن برج کے پاس ہے۔ اس نے درجینیا کو نیویارک بلا لیا تھا۔ اس جگہ سے قریب ہی سینٹ جانس میڈیکل کالج تھا جو اب فورڈ ہام یونیورسٹی بن چکا ہے۔ اسی کالج کے اسپتال میں درجینیا نے اپنی زندگی کے آخری سانس لیے۔

عورتوں کے معاملے میں ایڈگر بد قسمت رہا۔ اس کی اولین محبت تیر سارہ اس سے چھن گئی پھر اس نے کئی معاشقے کیے اور سب ناکام رہے۔ پھر درجینیا اس کی زندگی میں آئی مگر وہ بھی چند سال بعد اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ ایڈگر اس سے محبت کرتا تھا اور اس نے اپنی مشہور نظم ”ڈیجھ آف اے ہیوٹی گل دو مین“ میں درجینیا کو مرکزی کردار بنایا تھا۔ وہ پھر بہت زیادہ پیسے لگا اور بعض اوقات صرف شراب نوشی کا قرض ادا کرنے کے لیے وہ چند ڈالرز کے عوض کھانی دے دیتا تھا۔

درجینیا کے بعد ایڈگر نے شاعرہ سارہ ہیلن وائٹ مین سے شادی کی کوشش کی اور ان کی منگنی بھی ہو گئی تھی مگر بعض وجوہات کی بنا پر یہ منگنی برقرار نہ رہ سکی۔ ایڈگر کو یقین تھا کہ اس منگنی کے خاتمے میں سارہ کی ماں کا ہاتھ تھا جو اپنی خوب صورت اور دولت مند بیٹی کی شادی مفلس اور بے پروا ایڈگر سے کرنا نہیں چاہتی تھی۔ دل برداشتہ ہو کر اس نے اپنے غم کا رخ کیا اور اپنی اولین محبت سارہ رومر سے پھر سے تعلقات کا آغاز کیا۔ سارہ کی شادی ختم ہو گئی تھی اور وہ دوبارہ ایرلینڈ کے پاس آ گئی تھی۔ فی الحال وہ رچمونڈ میں ہی مقیم تھی۔ اس کا پاس ایرلینڈ رومر نیویارک منتقل ہو گیا تھا اور وہ مزید دولت مند ہو گیا تھا۔ ایڈگر واپس آیا اور اس نے



سارہ سے ملاقات شروع کی تو یہ خبر ایرکسن رومر سے زیادہ دیر چھپی نہیں رہی اور وہ آکر سارہ کو اپنے ساتھ نیویارک لے گیا۔

ایڈگر کی ساری زندگی شمال مشرقی امریکا کی ان ریاستوں میں گزری جو بحر اوقیانوس کے ساتھ آباد ہیں۔ وہ یوشن میں پیدا ہوا، چوٹ میں پلا بڑھا اور اس کا ادنیٰ گیریز فلاڈلفیا، نیویارک اور پالٹی مور میں آگے بڑھا تھا پالٹی مور میں ایڈگر کے لیے کچھ خاص نہیں تھا، سوائے اخبار پالٹی مور ہیئر یاٹک کے اور اس کے ایڈیٹر ہنری سے اس کے اچھے تعلقات بھی تھے۔ وہ گزشتہ دس سال سے اس اخبار کے لیے لکھ رہا تھا۔ وہ مارچ 1849 میں پالٹی مور منتقل ہوا اور اس نے یہاں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا۔ مکان کیا یہ اس کا گھر بھی تھا اور دفتر بھی کیونکہ یہیں وہ کام کرتا تھا۔ اب وہ امریکی ادب کا ایک جانا پہچانا نام تھا اور یہاں اس کے بے شمار مداح تھے۔

ان میں ایک ایسلی ہملٹن بھی تھی جو پالٹی مور کے ایک نامور سیاست دان اور صنعتکار کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پہلے وہ اس سے ادب کے حوالے سے ملی لیکن جلد محبت نے انہیں ایک اور رشتے میں جوڑ دیا۔ مگر یہاں بھی وہی مسئلہ ہوا۔ چارلس ہملٹن کو ایڈگر ایک آنکھ نہیں بھایا اور اس نے اسے دھکیل دی کہ وہ اس کی بیٹی سے دور رہے ورنہ وہ اسے شوٹ کر دے گا۔ اس کے باوجود وہ دونوں چسپ کر ملتے رہے۔ ان کی ملاقاتیں ایڈگر کے دفتر نما مکان میں ہوتی تھیں۔ ایسلی چپکے سے آتی اور چپکے سے ہی چلی جاتی تھی۔ یہاں سے ایڈگر کی زندگی کا آخری بڑا سہارہ دور شروع ہوا جو بالآخر اس کی پراسرار موت پر ختم ہوا۔ تاریخ کے صفحوں میں ایڈگر ایلن پو کے حوالے سے ان واقعات کا ذکر نہیں ملے گا۔ مگر بعض دوسرے واقعات اور حالات کو ایسی دیتے ہیں کہ اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔

☆☆☆

پالٹی مور ہیئر یاٹک کا تازہ شمارہ دفتر میں موجود نہیں تھا۔ اس میں ایڈگر کی تازہ ترین کہانی تھی۔ اولین قسط شائع ہوئی تھی۔ ایڈگر پریس میں داخل ہوا تو پریس کے انچارج آفیسر نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے گرم جوشی سے کہا۔ ”مسٹر ایڈگر دیکھو اپنی کہانی۔“ ایڈگر نے اپنی کہانی دیکھی اور اس کا چہرہ بکڑ گیا۔ وہ دغنا ہوا ہنری کے کمرے میں پہنچا اور اخبار پھاڑ کر اس

کے سامنے ڈال دیا۔ ”یہ کیا بکواس ہے؟“ ”جو تم نے لکھی ہے۔“ ”یہ بکواس میں نے نہیں لکھی۔“

ہنری نے گہری سانس لی اور سمجھانے کے انداز میں بولا۔ ”دیکھو ایڈگر لوگ جرم بڑھتا جا رہے ہیں انہیں خون سے دل چھٹی ہے۔ انہیں اس قسم کی ابھی کہانیاں.....“ ”تمہاری جرات کیسے ہوئی کہ تم میری تحریر کو تہہ مل کرو۔“

”کیونکہ میں اس اخبار کا مدیر ہوں۔“ ہنری کا لہجہ بھی بلند ہو گیا۔ ”میں اس کا مجاز ہوں۔“ ”اب تم اس کے مجاز نہیں ہو گے۔“ ایڈگر نے انگلی اٹھا کر کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مگر ہنری مطمئن تھا اسے معلوم تھا کہ کل ایڈگر اگلی قسط لے آئے گا جب اسے شراب کے لیے رقم کی ضرورت ہوگی۔

☆☆☆

پالٹی مور کے ڈاؤن ٹاؤن کی ایک کئی منزلہ عمارت کے سامنے کئی افراد جمع تھے۔ اوپر سے کسی عورت کے چپٹے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سامنے سڑک پر پولیس کی وین نمودار ہوئی اور رکے ہی اس سے نصف درجن پولیس والے باہر آئے۔ ایک بوڑھے آدمی نے کہا۔ ”اوپر چڑھتے فلور پر فلیٹ نمبر چار میں کچھ ہو رہا ہے۔“

پولیس کپتان نے دو آدمی نیچے چھوڑے اور اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ اوپر روانہ ہوا۔ مگر ابھی وہ راستے میں تھے کہ انہیں اوپر سے عورت کی ایسی چیخ سنائی دی جس میں موت کا کرب رچا ہوا تھا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ پولیس والے ایک لمحے کو رکے تھے پھر تیزی سے میڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔ فلیٹ نمبر چار کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کپتان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے ایک ساتھ لات مار کر دروازہ کھول دیا۔ اندر تاریکی تھی اور وہ لاشیں آگے کیے اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک کمرے کا فلیٹ تھا جس میں داخل ہونے کا ایک دروازہ اور صرف ایک کمرہ تھی جس کا پتہ محسوس تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک ادھڑ عمر عورت کی لاش پڑی تھی اور اس کا گلا کاٹ دیا گیا تھا۔ کپتان نے جبکہ کر چپک کیا وہ مر چکی تھی مگر اسے مرے زیادہ جو نہیں گزری تھی یقیناً اس نے آخری چیخ ماری تھی جب قاتل نے اس کا گلا کاٹا تھا۔ مگر قاتل کہاں تھا؟ وہ اس کمرے میں کب نظر نہیں آ رہا تھا اور یہاں سے باہر جانے کا



کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ ان کی توجہ آتش دان کی طرف مئی اس سے کچھ گزر رہا تھا وہ آگے آئے اور سب نے اپنے ہتھیار آتش دان کی طرف کر لیے تھے اس سے اوپر سے ریت یا راکھ گر رہی تھی مگر جب وہ نزدیک آئے تو اچانک ایک انسانی ہاتھ گر کر جموں لگے۔

ایک گھنٹے بعد ڈی فیکٹو ریمنڈ گرین فیلڈ وہاں پہنچا اور اس نے دونوں لاشوں کا معائنہ کیا۔ دوسری لاش جو آتش دان سے ملی تھی ایک بارہ سال بچی کی تھی جسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا اور اس کی لاش آتش دان میں ٹھونس دی گئی تھی۔ پڑوسیوں کے مطابق وہ دونوں ماں بیٹی تھیں اور گزشتہ کچھ عرصے سے ان کے ساتھ ایک لمبے کوٹ والا شخص آکر رہ رہا تھا مگر اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ عورت ریمنڈ گرین فرسٹ تھی۔ گرین فیلڈ کی توجہ لاشوں سے زیادہ اس بات پر مرکوز تھی کہ قاتل کہاں غائب ہو گیا۔ اس نے کھڑکی کا معائنہ کیا اور اسے چاقو سے کریدتا ہوا اسے ایک خفیہ کھکا لیا جسے دہاتے ہی بہ ظاہر یہ بالکل فکس کھڑکی کھل جاتی تھی۔ قاتل اسی سے فرار ہوا تھا۔ یہ ظاہر قاتل کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ ریمنڈ غافل عورت تھی اس کے پاس سوائے ایک بی بی کے اور کچھ نہیں تھا۔ پھر قاتل نے پہلے عورت کو موقع دیا کہ وہ چیخ چلا کر اس پاس والوں کو بتا دے کہ اس کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے اور عین اس وقت جب پولیس آئی تو قاتل اس کا گلا کاٹ کر اس کھڑکی سے فرار ہو گیا۔ وہ یہ کام پہلے بھی کر سکتا تھا۔ پولیس کو پیچھے آنے سے روکنے کے لیے اس نے کھڑکی میں خفیہ کھکا لگا دیا تھا جسے دبائے بغیر کھڑکی کا پت نہیں کھل سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایڈگر ایلن پو بالٹی مور ٹیمپل کے ایک چھوٹے ہال میں اس وقت پچاس ساٹھ خواتین کے سامنے ایک مشہور نظم دی ریوان سنا رہا تھا۔ اس کا پڑا اثر لہجہ اور الفاظ کی دلچسپی اور حسن بیان نے ان خواتین کو مسحور کر رکھا تھا۔ یہ سب بیگمیں اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ سب پانچ پانچ ڈالرز میں دے کر ایڈگر کا لیکچر سننے اور اپنی شاعری پر اس کی اصلاح لینے آئی تھیں۔ تیسری قطار میں ایملی موجود تھی مگر وہ اصلاح لینے نہیں آئی تھی وہ صرف ایڈگر سے ملنے اور اسے دیکھنے کے لیے آئی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا اور بالٹی مور پولیس اندر داخل ہوئی سب سے آگے کپتان جوزف تھا اس نے ایڈگر سے کہا۔ ”مسٹر ایڈگر ایلن پو.....؟“

”ہاں میں ہوں۔“

”تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“

نصف گھنٹے بعد ایڈگر ڈی فیکٹو گرین فیلڈ کے دفتر میں اس کے سامنے تھا اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔ ”کیا مجھے گرفتار کیا گیا ہے؟“

”بیشو مسٹر پو۔“ گرین فیلڈ نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں نے تمہاری کچھ کہانیاں پڑھی ہیں۔“

”اوہ تو تم میرے مداح ہو۔“

”میں نے کہا میں نے تمہاری کچھ کہانیاں پڑھی ہیں۔“ گرین فیلڈ نے صبح کی۔

”لیکن عین لیکچر کے دوران پولیس کے دستے کی مدد سے مجھے یہاں بلوانے کا مطلب؟“

گرین فیلڈ نے سامنے رکھا بالٹی مور پوسٹ کا تازہ شمارہ اٹھایا اور بولا۔ ”ایک طوائف اپنی نو عمر بیٹی کے ساتھ قتل کر دی جاتی ہے۔ قاتل لڑکی کی لاش آتش دان میں چھپا کر کمرے کی کھڑکی سے فرار ہوتا ہے لیکن کھڑکی بہ ظاہر فکس ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں ایک خفیہ کھکا تھا۔ قاتل طوائف کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ کیا تم کو کچھ یاد آیا مسٹر پو؟“

”مجھے کیا یاد آنا چاہیے؟“ ایڈگر نے خشک لہجے میں پوچھا۔ پھر وہ چونکا اور بولا۔ ”میرے خدا یہ تو میری ایک کہانی ہے، لیکن یہ خیل تھا۔“

”مجھے شک ہے ایسا نہیں ہے۔“ گرین فیلڈ نے اخبار اس کے سامنے ڈال دیا۔ ”اب یہ حقیقت بن چکا ہے۔“

ایڈگر نے خبر دیکھی اور ہونٹوں پر زبان بھیر کر بولا۔ ”یہ گزشتہ رات کا واقعہ ہے؟“

”رات گیارہ بجے تم کہاں تھے؟“

”مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔ میں شام کے وقت بندرگاہ کی طرف گیا تھا۔ میں نے پی رکھی تھی اور جب میں جاگا تو اپنے گھر میں تھا مجھے نہیں یاد کہ میں کب اور کس طرح وہاں پہنچا۔“

اسی لمحے دروازہ کھلا اور کپتان جوزف اندر آیا۔ اس نے گرین فیلڈ سے کہا۔ ”سر مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ وہ کہہ کر اجلاس کا انتظار کیے بغیر آگے آیا اور جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا اور گرین فیلڈ نے سن کر جس طرح ایڈگر کی طرف دیکھا اسے وہی اس سے متعلق کوئی نئی بات سامنے آنے والی ہے۔ اس نے کہا۔



”مسٹر ایڈگر ایسا لگ رہا ہے کہ تمہاری ایک اور کہانی حقیقت کا روپ دھار چکی ہے۔“

کچھ دیر بعد ایڈگر دوسروں کے ساتھ فولاد کے اس متردک کارخانے میں تھا۔ ہنری وہاں پہلے سے موجود تھا اور اٹلیاں کر رہا تھا۔ گرین فیلڈ نے ایڈگر کو دروازے پر روک دیا اور خود اندر آیا تھا۔ اس نے رومال سے منہ صاف کرتے ہنری سے کہا۔ ”تم نے اطلاع دی ہے؟“

”ہاں میں بالائی سوراہے پر یا تک کلمہ پر ہنری ہوں۔“

”میں تمہیں جانتا ہوں۔ یہ کون ہے؟“ اس نے میز پر پڑے شخص کی لاش دیکھی۔ چھت سے لٹکے فولادی پنڈولیم کے سرے پر موجود بڑے سے تیز دھار آلے نے اسے کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

”ہر بریڈ ریگان۔“ ہنری نے تھوک نکل کر کہا۔

”میں اسے جانتا ہوں یہ برسوں سے میرے اخبار کے لیے لکھ رہا ہے۔“

”کیا لکھتا ہے؟“

”کہاں، تبصرے، تنقید۔“

”اس کی دشمنی بھی ہوگی۔“

”ممکن ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ کوئی دشمنی میں اس حد تک آگے جاسکتا ہے۔“

”ایڈگر ایلن پو کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

”ان میں تعلقات نہایت خراب تھے۔“ ہنری نے

کہا۔ ”دونوں ایک دوسرے کی صورت بھی دیکھنے کے روا دار نہیں تھے کیونکہ ایڈگر نے اس پر شدید تنقید کی تھی۔“

”تب تمہارا کیا خیال ہے وہ ایسا کر سکتا ہے۔“

”ایڈگر بہت اچھا مصنف ہے اس کا تخیل بہت

شاندار ہے۔ وہ تحریر میں بھی کر سکتا ہے وہ براٹری کے گلاس میں پورا طوفان بیان کر سکتا ہے لیکن جہاں تک عملی فن کا تعلق ہے تو وہ ایک چڑیا کا بچہ بھی نہیں کر سکتا۔“

گرین فیلڈ نے ایڈگر کو اندر بلا لیا۔ ہنری اسے دیکھ کر چونکا۔ گرین فیلڈ نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم اسے پہچانتے ہو؟“

ایڈگر نے سر ہلایا۔ ”ریگان۔“

”تمہاری ایک کہانی میں اسی طرح ایک مصنف.....؟“

”سروڈان دی آئی۔“ ایڈگر نے آہستہ سے کہا۔

گرین فیلڈ ہنری کی طرف آیا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا

کہ یہاں کچھ ہوا ہے؟“

”مجھے ایک رقعہ ملا تھا۔“ ہنری نے اپنی جیب سے رقعہ نکال کر دیا جس میں بڑی خوب صورت لکھائی میں تحریر تھا۔

”مسٹر ہنری تمہارا ایک کارکن اس وقت فولاد کے متردک کارخانے میں موجود ہے اور مجھے خدشہ ہے کہ وہ اخبار کی سرکاری بن چکا ہے۔“

”تحریر.....؟“ گرین فیلڈ نے کہنا چاہا تو ہنری نے

اس کی بات کاٹی۔

”ایڈگر سے ملتی ہے لیکن یہ اس کی تحریر نہیں ہے۔“

تازہ خون اور لاش کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے مرے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت نہیں ہوا تھا۔ گرین فیلڈ دوبارہ ایڈگر کی طرف آیا۔ ”گزشتہ دو گھنٹے میں تمہاری مصروفیات کیا ہیں؟“

”سوا گھنٹے سے تو میں تمہارے ساتھ ہوں اور اس سے پہلے دو گھنٹے تک پھر روم میں رہا تھا۔“ ایڈگر نے جواب دیا۔ ”آفسر کیا تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟“

گرین فیلڈ چند لمحوں سے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ”نہیں میرا خیال ہے کوئی جنونی اور ماہر قاتل ان واقعات کے پیچھے ہے اور وہ تمہاری کہانوں کو حقیقت کا روپ دے رہا ہے۔“

ایڈگر داپس گھر آتے فکر مند تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ گرین فیلڈ کو اس پر شک نہیں تھا لیکن جلد یا بدیر یہ خبر پھیل جانی۔ ہنری کو غالباً اسی لیے رقعہ لکھ کر اطلاع دی گئی تھی کہ خبر لازمی آئے۔ اس کے بعد اس کی ساکھ تو خراب ہوتی مگر ساتھ ہی اس کے بے شمار مخالفین جنہیں اس نے تنقید کے نشتر سے مشتعل کیا تھا اس کے خلاف میدان میں آ جاتے۔ ایڈگر کو ان لوگوں کی پروا بھی نہیں تھی۔ اسے اصل میں ایملی کی پروا تھی کہ وہ اس بارے میں کیا سوچے گی اور اس کا باپ اسے مزید نہیں کرے گا۔ ایملی کا خیال آتا تو اس نے رخ بدلا اور ہملٹن ہاؤس کی طرف روانہ ہو گیا جو شہر کے پوش ترین علاقے میں عالی شان محل نما عمارت تھی۔ کچھ دیر بعد بھی میں چارلس ہملٹن ایملی کو لے کر نکلا تو ایڈگر نے بھی کا ہملٹن ہاؤس میں سوار ہو گیا۔ ہملٹن ہاؤس سے دیکھتے ہی مجھ گیا اور اس نے غرا کر کہا۔

”کیا وہی خوات کیسے ہوئی؟“

”میں ہملٹن سے کچھ کہنے آیا ہوں۔“ ایڈگر نے کہا۔



”کیسی سے اتر جاؤ۔“ چارلس غرایا مگر ایڈگر نے اس کی پروا کیے بغیر ایسلی سے کہا۔  
 ”تم نے بہت شاعرانہ نظم پڑھی مگر اس کا آخری مصرع اتکا اچھا نہیں تھا۔ میری شام ہوتی ہے ساتھ، اسے یوں کر لو کہ میری آج شام ہوتی ہے ساتھ۔“  
 چارلس نے بہت سول نکال لیا۔ ”مگر اب تم یہاں سے دفع نہیں ہوئے تو میں تمہارا بھیجا نکال دوں گا۔“  
 ایڈگر نے بے پروائی سے کہا۔ ”تمہیں اپنی خوب صورت بنی کے خوب صورت لباس کی فکر نہیں ہے میرے جیسے اور خون سے وہ خراب ہو جائے گا۔“  
 ”ڈیڈی؟“ ایسلی نے کہا۔

”کوئی بات نہیں میں نے برا نہیں مانا۔“ ایڈگر نے کہا اور ایسلی کو پیار کر کے پیچھے اتر گیا۔ وہ ایسلی کو پیغام دینے آیا تھا اور جانے سے پہلے ایسلی نے کیسی سے سر نکال کر اسے اشارہ کیا کہ وہ آج شام آئے گی۔ وہ خوب صورت نقوش اور سنہری بالوں والی حسین لڑکی تھی۔ اس کی عمر چوبیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ عمر میں ایڈگر سے سولہ سال چھوٹی تھی۔ وہ نہایت دولت مند طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور ایڈگر کو یہ کسی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اسے اگلے وقت کا کھانا ملے گا یا نہیں۔ اس کے باوجود وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ ایڈگر کو آیا تو اس کا پالتو بولے قراری سے اس کا خطرہ تھا۔ وہ بھوکا تھا۔ ایڈگر نے اسے گوشت کے چند ٹکڑے دیے اور میز پر آگیا۔ ایسلی آئی تو وہ لکھ رہا تھا۔ وہ خود دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ ایڈگر گھر کا دروازہ کبھی لاک نہیں رکھتا تھا۔ وہ کہیں جاتا جب بھی اس کے گھر کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ ایسلی نے اندر آ کر کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔  
 ”آج تم نے مجھے حیران کر دیا۔“

”میں ایسا ہی آدمی ہوں۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”مجھے تم سے بہر صورت بات کرنی کی تھی۔“  
 ایسلی اس کے پاس آئی۔ ”کیا بات کرنی ہے؟“  
 ”تمہارے گھر کا سٹیوم پارٹی ہونے والی ہے۔“  
 ”ہاں دو دن بعد ہے۔“  
 ”میں ایک مشکل میں پڑ گیا ہوں۔“ ایڈگر نے کہا اور پھر اسے سب بتا دیا۔ ایسلی نے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے لیا۔

”تم سمجھتے ہو کہ میں اس بات پر یقین کر لوں گی کہ تم کوئی غلط کام کر سکتے ہو؟“

”نہیں مجھے ہمارے مستقبل کے حوالے سے فکر ہے۔“  
 ”تم کیا سمجھتی ہو سٹیو چارلس اس خبر کو استعمال نہیں کریں گے؟“  
 ایسلی بھی فکر مند ہو گئی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“  
 ”اس سے زیادہ مجھے تمہاری فکر ہے؟“  
 ”میری فکر؟“ ایسلی چونکی۔ ”کیسی فکر؟“  
 ”قاتل میری کہانیوں سے پلاٹ لے کر یہ سب کر رہا ہے اور میں نے حال ہی میں ایک دولت مند آدمی کی کہانی لکھی تھی جس کی بیٹی ایک غریب معصوم سے محبت کرنے لگتی ہے۔“

”سچ میں؟“ ایسلی نے کہا۔  
 ”ہاں اور پھر ایک نفسیاتی شخص دولت مند آدمی کی بیٹی کو اغوا کر لیتا ہے اور اسے کسی جگہ قید کر دیتا ہے۔“  
 ”پھر کیا ہوتا ہے؟“

”ابھی اس کی ایک قسط چھپی ہے اور اس میں لڑکی کو کاسٹیوم پارٹی میں اغوا کیا جاتا ہے۔“  
 ”میرے خدا۔۔۔۔۔۔“

”اب تمہیں پتا چلا کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے۔“  
 ”لیکن یہ ممکن نہیں ہے ہمارے گھر کی سیکورٹی بہت سخت ہے۔“

”نفسیاتی کاسٹیوم میں چھپ کر آتا ہے اور لڑکی کو اغوا کر کے لے جاتا ہے۔“

”میں ڈیڈی سے بات کرتی ہوں۔“  
 ”نہیں مجھے کریمن فیلڈ سے بات کرنی ہوگی۔ وہ ذہن اور اچھا پولیس آفیسر ہے، وہ زیادہ بہتر طریقے سے اس معاملے کو دیکھ سکے گا۔“ ایڈگر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اس پارٹی کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک خیال اور بھی ہے؟“

”وہ کیا؟“  
 ایڈگر نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ ”ایسلی میں تمہیں پروپوز کرنا چاہتا ہوں۔“

”تمہارا مطلب ہے شادی؟“  
 ”ہاں اب میں ہر پل تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔“  
 ایسلی کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے تھے۔

☆☆☆  
 کریمن فیلڈ بالائی مور پتھر یا ٹک کے اس شمارے



”لیکن ایڈگر.....“

”آپ بتائیں آپ پولیس کو کاسٹیوم پارٹی میں آنے کی اجازت دے رہے ہیں یا نہیں۔“

چارلس چند لمحے اسے غور تار رہا پھر اس نے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے لیکن اس صورت میں ذمے دار تم ہو گے۔“

”مجھے منظور ہے مسٹر ہملٹن۔“

چارلس ہملٹن کی خواہش تھی کہ ایسلی اس پارٹی میں اپنی زندگی کے ساتھی کو منتخب کر لے۔ اس نے بالنی مور کے آس پاس سے تمام ہی اعلیٰ خاندانوں کو مدعو کیا تھا اور ان میں بڑی تعداد نو جوانوں کی تھی۔ اسے اُمید تھی کہ ایک بار ایسلی نے کسی اور کو پسند کر لیا تو پھر وہ اس مظلوم الحال مصنف سے منہ پھیر لے گی۔ چارلس ہملٹن سخت مزاج اور غصہ ور شخص تھا۔ بہت سے لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے اور وہ ان کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اسے صرف ایڈگر ایلن پو کی پروا تھی کیونکہ وہ اس سے نفرت کرتا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ نگہیں ایڈگر کا جادو ایسلی کے سر اتانہ چڑھ جائے کہ وہ اس سے شادی پر تمل جائے۔ اس لیے وہ جلد از جلد ایسلی کی شادی کر دینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

”کہانی کے مطابق مجرم ٹھیک بارہ بجے لڑکی کو اغوا کر کے لے جائے گا۔“ گرین فیلڈ نے ایڈگر سے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے مجرم اس حد تک کہانی پر عمل کرے گا؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر وہ نفسیاتی بھی ہے اس لیے ہو سکتا ہے وہ ایسا ہی کرے۔“ ایڈگر نے جواب دیا۔ وہ کبھی میں ہملٹن ہاؤس کی طرف جا رہے تھے۔ رات کے دس بج چکے تھے۔

”میں نے تحریر کے باہرین کو مجرم کی تحریر دکھائی ہے جو اس نے ہنری کو لکھی تھی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ مذکورہ شخص فرانسیسی نژاد ہے۔ وہ بعض حروف جس طرح لکھ رہا ہے ایسا صرف فرانسیسی ہی لکھتے ہیں۔ کیا تمہارے حلقے میں کوئی فرانسیسی ہے؟“

”نہیں، میرے جاننے والوں میں کوئی فرانسیسی نہیں ہے۔“ ایڈگر نے کہا۔ ”تم جانتے ہو فرانسیسی وہ یورپی قوم ہے جو سب سے کم ترک وطن کر کے امریکا آئی ہے۔ چھوٹی یورپی ملکوں سے تعلق رکھنے والی افراد کی کیونٹی بھی فرانسیسی کیونٹی سے بڑی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی انگریزوں اور امریکیوں سے نفرت ہے۔ وہ یہاں آئیں گے

سمیت چارلس ہملٹن کے دفتر میں اس کے سامنے موجود تھا اور اسے کہانی پڑھ کر سنا رہا تھا۔ چارلس کو کہانیوں سے کوئی دل چسپی نہیں تھی اس لیے وہ بار بار اپنے خادم کو جھڑک رہا تھا جو اس کے لیے کاک ٹیل ٹھیک سے کس نہیں کر رہا تھا۔ گرین فیلڈ محل سے اس مداخلت کو نظر انداز کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے محل چھوڑا یا جس میں نفسیاتی شخص دولت مند آدمی کی بیٹی کو اغوا کر لیتا ہے۔ چارلس نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”یہ کواں سنانے کا مقصد۔“

”مسٹر ہملٹن، سچ کچ کا ایک نفسیاتی قاتل مسٹر پو کی کہانیوں کو حقیقت کا روپ دے رہا ہے وہ قاتل بالکل اسی طرح کر چکا ہے جیسے مسٹر پو نے اپنی کہانیوں میں بیان کیے ہیں اور اس تنازعہ ترین کہانی میں نفسیاتی شخص دولت مند آدمی کی خوب صورت بیٹی کو اغوا کر کے کہیں قید کر دیتا ہے۔ لڑکی ایک غریب مصنف سے محبت کرتی ہے۔“

چارلس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے ایڈگر کا تذکرہ برداشت کر رہا تھا۔ اس نے حقارت سے کہا۔ ”میرا تو خیال ہے وہ خود ہی قاتل ہے اور اب اپنی کہانیوں کے پلاٹ پر عمل کر رہا ہے۔“

”ایڈگر کے بارے میں ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ایک قاتل کے وقت نیچر روم میں تھا اور دوسرے قاتل کے وقت ہمارے ساتھ تھا۔ اس لیے وہ قاتل نہیں ہو سکتا ہے۔ دوسرے مجھے یقین ہے قاتل کاسٹیوم پارٹی میں آئے گا جیسا کہ کہانی میں بیان کیا گیا ہے۔“

”ایسا ممکن نہیں ہے۔“

”امکان ہے اور پولیس کے پاس موقع ہے کہ قاتل کو پکڑ سکے۔“

چارلس آگے جھکا اور سرور لہجے میں بولا۔ ”یہ میری پارٹی ہے اور میں پولیس کے کسی فرد کو اپنے گھر میں دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔“

”لیکن سیکورٹی.....؟“

”اس کے لیے میرے پاس بہترین اسٹاف ہے جو پوری سیکورٹی کر سکتا ہے کوئی غیر متعلقہ شخص میرے گھر میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔“

”مگر وہ مشہد مجرم ہے اور اس سے پولیس ہی بہتر نشت سکتی ہے۔“ گرین فیلڈ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”مسٹر ہملٹن سوچ لیں معاملہ آپ کی بیٹی کی حفاظت کا ہے۔“



تو لازمی کچھ نسلوں بعد وہ فرانسیسی کی بجائے انگریزی بولنا شروع کر دیں گے اور انگریزی بولنا انہیں کسی صورت گوارہ نہیں ہے۔“

گرین فیلڈ کو اس سے کوئی دل چسپی نہیں تھی کہ فرانسیسی کیوں ترک وطن کر کے امریکا نہیں آئے؟ اسے دل چسپی تھی کہ قافلہ چکڑا جائے۔ سوا دس بجے وہ ہملٹن ہاؤس میں داخل ہوئے تھے کہ چارلس ہملٹن ایڈگر کو اس کے ساتھ دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا اور بولا۔ ”یہ شخص یہاں کیوں آیا ہے؟“

”مسٹر ہملٹن، یہ اس معاملے کا اہم ترین کردار ہے۔“ گرین فیلڈ نے کہا۔ ”مسٹر پو کی یہاں موجودگی لازمی ہے۔“

چارلس اپنے ہونٹ کانٹے لگا تھا پھر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے لیکن کل کے بعد مجھے یہ اپنے گھر میں نظر نہ آئے۔ اور ہاں یہ میری بیٹی سے بھی دور رہے گا۔“

چارلس مڑ کر چلا گیا۔ گرین فیلڈ کے آدمی پہلے ہی آچکے تھے اور ان کا انچارج نو جوان مار جٹ جان سینٹرل تھا۔ گرین فیلڈ ان کو ہدایات دینے لگا۔ ایک درجن پولیس والے پورے ہملٹن ہاؤس کی نگرانی کرتے اور گرین فیلڈ بذات خود تقریب والے ہال میں موجود رہتا۔ جان سینٹرل داخلی دروازے پر تھا اور ہر آنے والے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے گرین فیلڈ کو بتایا کہ اب تک صرف نامور اور جانے پہچانے افراد آئے ہیں جن کی شناخت ہملٹن ہاؤس کے عملے نے کی ہے۔ ایک بھی اجنبی فرد اس وقت تقریب میں موجود نہیں ہے۔ ایڈگر ہال کے چاروں طرف نئی اوپری منزل کی راہداری میں آ گیا۔ یہاں سے وہ ہر طرف دیکھ سکتا تھا۔ اسے ایسی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ شاید اندر تیار ہو رہی تھی۔ ساڑھے دس بجتے ہی پارٹی شروع ہوئی اور خواتین و حضرات نے مختلف قسم کے نقاب پہن لیے۔ بہت سے کاسٹیوم لباس میں بھی تھے۔ سازندے سامنے جانے لگے اور جوڑے وسط ہال میں آ گئے۔ رقص کا آغاز ہو گیا تھا۔

ایسی اندر اپنے بیڈروم میں تیار ہو رہی تھی اور اس کی خادمہ اس کی مدد کر رہی تھی۔ ایسی کا ذہن منتشر تھا کیونکہ ایک طرف تو اسے ہال باپ نے بتا دیا تھا کہ اس پارٹی میں اسے لازمی اپنا جیون ساٹی جن لینا تھا ورنہ وہ خود اس کے لیے کوئی مناسب شوہر دیکھیں گے اور دوسرے نفسیاتی قاتل کا خوف تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایڈگر کے ساتھ رہے گی۔ جب رات بارہ بجے تک کا وقت خیریت سے گزر

لگوں میں رنگ بھرے بادلوں بھار چلے  
میں شامل ایک شعر کے بارے میں یہ غلط فہمی  
پیدا ہو گئی ہے کہ فیض احمد فیض نے یہ غزل 29 جنوری  
1954ء کو شہری جیل (ساہیوال) میں لکھی تھی،  
بعد میں یہ غزل مہدی حسن صاحب نے فلم سرفروش  
کے لئے ریکارڈ کروائی اس غزل کو علاؤ الدین مرحوم پر  
قلما کیا گیا اسی فلم سے یہ غزل اتنی مشہور ہوئی کہ مہدی  
حسن صاحب کی پہچان بن گئی۔ کنور مہندر سنگھ بیدی شعر  
نے جو فیض کے چاہنے والوں میں سے تھے انہوں  
ہی غزل پر پوری ایک نئی غزل لکھی اور اور دو شعر بطور  
خاص مہدی حسن صاحب کو دیئے جنہوں نے یہ شعر  
فیض صاحب کی لگوں میں رنگ بھرے بادلوں بھار چلے  
میں شامل کر لئے جس کا ایک شعر بہت مشہور ہوا،  
ہوا جو تیر نظر نیم کش تو کیا حاصل  
مرا تو جب ہے کہ سینے کے آ رہا رہے  
باد جو اس کے کہ خود مہدی حسن صاحب نے  
کئی دفعہ وضاحت کی کہ یہ شعر کنور مہندر سنگھ بیدی  
شعر کا ہے فیض صاحب کا نہیں، کئی قابل احترام  
ادیب، دانشور، اس شعر کو فیض احمد فیض سے منسوب  
کرتے ہیں۔  
(ذرا حیدر آبادی کے مضمون سے اقتباس)

جائے گا تو وہ ایڈگر سے کہے گی کہ اسے پروپوز کرے اور وہ  
سب کے سامنے اس کا پروپوزل قبول کر لے گی۔ اس کے  
بعد اس کے ہاں باپ کچھ نہیں کر سکیں گے۔ تیار ہو کر وہ باہر  
آئی اور اس نے چہرے پر ایک نقاب لگایا تھا جو چاندی سے  
بنا ہوا تھا اور تاج کی طرح اس کے سر تک جا رہا تھا۔ ہال کی  
سیڑھیوں پر اس کی بچپن کی سیکلی مارنا اس کی خنجر تھی اور وہ  
اس سے بات کرتی نیچے آئی تھی کہ ایک سیاہ انسانی چہرے  
کے خول میں چھپے شخص نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ایسی  
نے دیکھے بغیر کہا۔

”سوری میں کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔“

مگر ہاتھ اس کی طرف دراز ہی رہا تو اس نے دیکھا  
اور حیران رہ گئی۔ اس نے ہاتھ تمام لیا اور اس کی ہاتھوں میں  
آگئی۔ وہ ایڈگر تھا۔ دونوں رقص کرتے ہوئے ہال کے وسط  
کی طرف جانے لگے۔ ایسی نے سرگوشی میں کہا۔ ”تم آگئے  
مجھے تمہارا انتظار تھا۔“







پھر اس کی نظر ایڈگر پر پڑی اور وہ غرا کر اس کی طرف بڑھا۔ ”یہ ذلیل شخص یہاں کیا کر رہا ہے؟“

اس سے پہلے کہ کوئی اسے روکتا اس نے آگے بڑھ کر ایڈگر کو گھونسا مارا اور وہ پیچھے سے نیچے گر گیا۔ وار بہت قوت والا تھا اور ایڈگر بے خبر تھا اس لیے چند لمحوں کے لیے اس کے حواس گم ہو گئے۔ جب وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا تو چارلس کو دو پولیس والوں نے جکڑ رکھا تھا اور گرین فیلڈ اس پر گرج برس رہا تھا۔ چارلس بک جھکتا وہاں سے رخصت ہو گیا اور گرین فیلڈ نے اس سے معذرت کی لیکن ایڈگر نے ہاتھ اٹھایا۔ ”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے اور مسٹر چارلس کا غصہ بھی بجا ہے۔ وہ متاثر آدمی ہیں۔“

گرین فیلڈ نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا وہ سب وہاں سے چلے گئے۔ اس نے کہا۔ ”اب تم کیا کرو گے؟“

”مجھے سوچنا پڑے گا۔“ ایڈگر نے کہا۔ ”یہ پیچھے صرف میرے لیے نہیں ہے۔ اس وقت ایسلی کی زندگی بھی داؤ پر لگی ہے۔“ ایڈگر نے اپنی ٹوپی پھینکی۔ ”مجھے سوچنا ہو گا کہ وہ کہاں ہو سکتی ہے؟“

☆☆☆

ایسلی کو ہوش آیا تو وہ کسی جھگ و تار یک جگہ تھی۔ بالکل کسی تابوت کی طرح جھگ اور تار یک۔ اس کا دل خوف اور بے چینی سے بھر گیا۔ اس نے بے تابی سے ہاتھ مارے اور چلاتے لگی۔ ”کوئی ہے مجھے یہاں سے نکالو، میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

وہ بار بار اوپری تختے پر ہاتھ مارتی رہی اور چلاتی رہی۔ اسے جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ تابوت کے سائز کا لکڑی کا بکس تھا۔ اچانک بکس پر رکھا ہوا دوسرا تختہ سر کا اور اس کی اوپری درازوں سے روشنی جھلکنے لگی۔ پھر اس سے ایک آنکھ ظاہر ہوئی اور کسی نے سرگوشی میں کہا۔ ”اپنا منہ بند کر لو ورنہ مجھے بند کرنا ہو گا۔“

ایسلی کی آواز رک گئی پھر اس نے یہ مشکل کہا۔ ”پلیز میں اب نہیں چیخوں گی۔“

”اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“ آدمی نے کہا اور اچانک ہی بکس سر کا، وہ ترجیم ہوا نیچے گیا اور پھر سیدھا ہو گیا۔ ایسلی اندر بٹ کر رہ گئی مگر اس بند بکس میں اتنے پلٹنے کی جگہ نہیں تھی۔ بکس سیدھا ہوا اور پھر اس پر دوسرا تختہ آن گرا اور تھوڑے سے کیل ٹھونکنے کی آواز آنے لگی۔ ایسلی پھر ہاتھ مارنے لگی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ مگر آدمی رکا

نہیں۔ کیلیں ٹھونکنے کے بعد اس نے اوپر سے بکس پر مٹی گرانی شروع کی تھی۔ سائیڈوں کے رختوں سے مٹی اندر آ رہی تھی۔ چند منٹ میں وہ زمین میں دفن کر دی گئی تھی۔ وہ خوف سے کانپنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ اس بند جگہ وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکے گی۔ دم گھٹ کر مر جائے گی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ شخص کون ہے۔ مگر اسے یقین تھا یہ وہی جنونی قاتل تھا جو ایڈگر کی کہانیوں کو عملی صورت دے رہا تھا۔ اب اس نے اسے زندہ دفن کر دیا تھا۔

ایسلی اپنے خیال میں ایڈگر کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔ جب کھڑکی توڑ کر نقاب پوش اندر آیا تو ایڈگر اسے کھینچ کر وہاں سے لے جانے لگا اور ایسلی نے بھی اس خیال سے اس کا پورا ساتھ دیا کہ شاید نقاب پوش وہی قاتل تھا۔ وہ دونوں بھاگتے ہوئے ہلٹن ہاؤس کے عقی حصے میں آئے اور جب ایڈگر اسے لے کر جنگل میں داخل ہوا تو ایسلی نے پوچھا۔ ”ایڈگر تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“

”کیونکہ میں ایڈگر نہیں ہوں۔“ اس نے کہا تو ایسلی اچھل پڑی تھی اور پھر اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر نقاب پوش نے اسے جکڑ لیا اور اس نے چلانے کی کوشش کی تو اس کے چہرے پر ایک رومال آکر جم گیا۔ اس سے اٹھتی تیز بو ایسلی کے دماغ پر چڑھنے لگی اور ایک منٹ سے بھی پہلے وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ایڈگر کا غم قلم لے کر بیٹھا ہوا تھا اور اس کا ذہن اس مسمے کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی کہانیوں کو اتنی صفائی سے عملی صورت دینے والا شخص صرف نفسیاتی مریض نہیں تھا بلکہ وہ ایک الگ طرح کی ذہانت اور جسمانی صلاحیتوں کا حامل بھی تھا۔ ایڈگر سوچوں میں اس کا شخص تجزیہ کر رہا تھا۔ اس کے خیال میں ایسا شخص جو اپنے میدان میں نظر انداز کیا گیا ہو اور یہ ظاہر وہ معمولی سا دکھائی دیتا ہو۔ اس کی محرومی نے اسے نفسیاتی بنایا اور جن لوگوں کو وہ اس کا ذمے دار سمجھتا تھا وہ ان کے خلاف معروف عمل ہو گیا۔ اس کے فکار ہونے والے تئوں افراد غیر متعلق تھے۔ وہ صرف ایڈگر کی کہانیوں کو عملی شکل دینے کی وجہ سے اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ البتہ ایسلی اس سے تعلق رکھتی تھی۔ ایڈگر نے خود سے پوچھا۔ ”مجھ سے کیا پرغاش ہو سکتی ہے۔“

ایڈگر کے خیال میں اب اس میں ایک ہی صلاحیت تھی جس سے کوئی دوسرا فرد حسد کر سکتا تھا۔ اس کے لکھنے کی



نے کہتے ہوئے آئیوان کو آواز دی اور بولا۔ ”لیکن اس قصہ کا عنوان.....“

”کہانی کا ایک نقطہ بھی تبدیل نہیں ہوگا۔“ ایڈگر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”اوکے۔“ ہنری نے ٹھنڈی سانس لی اور لمبا سانس کاغذ آئیوان کو پکڑا دیا۔ ایڈگر کی عادت تھی کہ وہ ایک صفحے پر لکھتا تھا اور اسے رول کرتا جاتا۔ یعنی وہ اصل میں رول پر لکھتا تھا جہاں تک پہنچ کر کہانی ختم ہو جاتی وہاں کاغذ رول سے کاٹ کر اس کی نگلی سی بنالیتا تھا۔ یہ اس کا منفرد اور مخصوص انداز تھا۔ اس کے علاوہ شاذ ہی کسی مصنف نے اس طریقہ لکھا ہو۔ ایڈگر آئیوان کے ساتھ پریس والے حصے میں آج کیونکہ یہاں اس کی پسندیدہ چیز کا اسٹاک تھا اس نے میز کے نیچے سے پوئل نکالی اور آئیوان سے کہا۔

”اسے سب سے اوپر والے حصے میں ذرا نمایاں کر کے لگاتا۔“

”آپ بے فکر رہیں مسٹر پو، میں آپ کی تحریر ہمیشہ نمایاں کر کے لگاتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں میں آپ کا مدارج ہوں۔“

ایڈگر نے اس کی بات غور سے نہیں سنی تھی۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا کہ آخر وہ نامعلوم قاتل اس سے کیا چاہتا تھا۔ یہ تو سچ تھا کہ وہ ایسلی کو آزاد نہیں کرے گا کیونکہ اس طریقہ خود اس کی شخصیت کھل جائے گی پھر وہ اسے خلیج بھی کر رہا تھا کہ وہ ایسلی کو آزاد کرالے۔ اگلے دن بالٹی مور پشیریا تک میں اس کی کہانی کی اگلی قسط نمایاں طور پر شائع ہوئی جس میں اس نے بیان کیا تھا کہ ایسلی نے آزاد ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی اور پھر سے پکڑی گئی۔ اس دوران میں گرین فیلڈ کے آدمی شہر بھر میں ایسی دیران ہنگاموں کو کھو۔ پھر رہے تھے جہاں کسی کو خفیہ طور پر چھایا جاسکتا تھا۔ دن مصروف رہنے کے بعد گرین فیلڈ واپس گھر آیا تو خانا نے اسے ایک چھوٹا سا بکس دیا۔ گرین فیلڈ نے پوچھا۔ ”کہاں سے آیا؟“

”ہا نہیں سر، میں نے اسے دروازے کے سامنے میز پر رکھے پایا۔ کوئی شام چھ بجے کے بعد نہ کر گیا ہے۔“

گرین فیلڈ نے بکس ذرا سا کھول کر دیکھا اور بند کرتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایڈگر کے پاس اس کے سامنے تھا۔ اس نے بکس میز پر رکھا۔

مصلحت۔ گرین فیلڈ کے پولیس ماہرین نے اس کی دوسری تحریر پر بھی کام کیا تھا اور ان کے خیال میں مذکورہ شخص نہ صرف اعلیٰ تخیلاتی صلاحیت رکھتا تھا بلکہ ادب اور دوسرے علوم پر اس کی معلومات بھی بہت زیادہ تھیں۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے ایڈگر کو خیال آیا کہ وہ اب ایسلی کی قید کا احوال بیان کرے گا۔ اس نے قلم اٹھایا ایک میں ڈبویا اور لکھنے لگا۔ وہ کہانی کی تکمیل میں اتنا متنب ہو گیا کہ اسے دروازے پر ہونے والی دستک بھی سنائی نہیں دی اور جب اندر سے جواب نہیں ملا تو گرین فیلڈ اپنا پستول نکال کر اندر آ گیا۔ اس نے ایڈگر کو صحیح سلامت میز کے دوسری طرف پا کر اطمینان کا سانس لیا اور پستول واپس کوٹ میں رکھ لیا۔

”سوری مسٹر پو میں نے تم کو پریشان کیا لیکن میں نے سوچا کہ تم سے بات کروں۔“

”کسی بات؟“ ایڈگر نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”کیا تم نے بھی کسی ملارج کی کہانی لکھی ہے؟“

”نہیں؟“

”کسی کہانی میں ملارج کا ذکر ہے؟“

ایڈگر اٹھ کر بیٹھنے لگا پھر اس نے بے بسی سے گرین فیلڈ کی طرف دیکھا۔ ”مجھے یاد نہیں، شاید میں نے ایسا کیا ہو لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”قاتل نے جو قہہ لکھا ہے وہ کاغذ عام طور سے ملارج استعمال کرتے ہیں۔ یہ کسی قدر چمکنا ہوتا ہے جو پانی سے جلدی مٹا نہیں ہوتا۔“

”اگر اس نے ایسا کاغذ استعمال کیا ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ ملارج ہے؟“

”مصلحت کچھ نہیں ہوتا ہم مفروضوں پر آگے بڑھ سکتے ہیں۔“ گرین فیلڈ نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”کیا تم نے اپنے تخیل کو استعمال کیا؟“

”میں بھی کوشش کر رہا ہوں۔“ ایڈگر نے کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔

ایڈگر بالٹی مور پشیریا تک کے دفتر میں ہنری کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور ہنری اس کی کہانی پڑھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا اس کے چہرے پر جوش کے علامات بڑھ رہے تھے آخر میں اس نے میز پر ہاتھ مارا۔ ”یہ میں نہیں چاہتا ہوں کہ تم قارئین کو جکڑ لینے والے انداز میں لکھو ان کو حقائق میں الجھاؤ بہ نسبت جاسوسی طریقوں کے۔“ ہنری

☆ ☆ ☆



”وہ نہیں ہے۔“ گرین فیلڈ نے کہا۔ ”اس کا لباس دیکھو، ایملی نے ایسا لباس نہیں پہنا تھا۔ قاتل یہیں ہے میں اسے دیکھتا ہوں۔“

گرین فیلڈ تیزی سے آگے آیا۔ وہ سرنگوں میں دیکھ رہا تھا۔ ایک سرنگ کے سرے پر اسے کسی کا سایا نظر آیا اور اس نے آواز دی۔ ”کون ہے۔“

اس پر سایا تیزی سے آگے بڑھا تو گرین فیلڈ بھی اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ سائے نے لمبا کوٹ پہنا ہوا تھا اور گرین فیلڈ کو یاد آیا کہ ریٹین کے پڑوسیوں نے قاتل کا حلیہ جو بیان کیا تھا اس میں لمبا کوٹ نمایاں تھا۔ گرین فیلڈ نے سیٹی بجائی اور اس کے پیچھے لگا رہا۔ ایک جگہ وہ صاف دکھائی دیا اور گرین فیلڈ نے اس پر فائر کیا مگر وہ بچ گیا۔ پھر وہ اچانک ہی غائب ہو گیا اور جب گرین فیلڈ اس جگہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ میز حیاں اوپر جا رہی ہیں اور کوٹ والا باہر نکل گیا تھا بس اس کی آخری جھلک دکھائی دی تھی۔ گرین فیلڈ بھی تیزی سے میز حیاں چڑھ کر اوپر آیا اور اس نے سر باہر نکالا تھا کہ سائے سے ایک بھی آئی دکھائی دی۔ سورخ عین سڑک کے درمیان میں نکل رہا تھا۔ وہ بے ساختہ نیچے ہوا اور اس کے ہاتھ سے میز می نکل گئی وہ تقریباً پندرہ فٹ کی بلندی سے نیچے آگرا۔ چند لمحوں بعد وہ کراہتا ہوا اٹھا تو اسے چوٹ خاص تھیں آئی تھی مگر قاتل اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اسی لمحے اس کے آدمی آگئے اور انہوں نے بتایا کہ نکالی جانے والی لاش ایملی کی نہیں تھی بلکہ کسی اور لڑکی کی تھی۔

☆☆☆☆

بالٹی مور اسپتال کے مردہ خانے کی میز پر لڑکی کی لاش پڑی تھی اور گرین فیلڈ اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ لڑکی کے ہونٹ چوہوں نے کھا لیے تھے مگر اس کے دانت سلامت تھے۔ لڑکی کی موت گلے میں رسی کا پھندا پڑنے سے ہوئی تھی۔ گرین فیلڈ نے ایڈگر کی طرف دیکھا۔

”یہ بھی تمہاری کوئی کہانی ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”دی گرل مسٹک ان شیدوز۔“  
گرین فیلڈ نے گلے میں پھنسی رسی کا ٹکڑا کرا لگ کر ایڈگر کے مے ہلاختہ کہا۔ ”کو پرائٹ۔۔۔۔۔ میں نے کہانی میں اسی گروہ کا ذکر کیا ہے۔“

”کتنا کا بچہ۔۔۔۔۔“ گرین فیلڈ نے غصے سے کہا۔ ”وہ بہت مکار اور تیز آدمی ہے۔ بہت بھی اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ وہ میرے سائے سے نکل گیا۔“

ایڈگر نے کھول کر دیکھا اور چونک گیا۔ بکس میں ایک گوشت کا ٹکڑا رکھا تھا اور یہ کسی انسان کی زبان تھی۔ اس نے چٹنی سے اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”یہ کم سے کم دو دن پرانی ہے۔“

”ایملی کو غائب ہوئے اتنا ہی وقت ہو گیا ہے۔“  
گرین فیلڈ نے کہا۔ ”بکس کے نیچے ایک چھوٹا سا رقعہ تھا اس پر ایڈگر کی ایک نظم کے دو مصرعے تحریر تھے۔“

وہ جو تار یک سرنگوں میں رہتے ہیں  
وہ جنہوں نے روشنی کبھی نہیں دیکھی

گرین فیلڈ ایڈگر سے ملا اور اس کے سائے رقعہ رکھ دیا۔ ایڈگر نے رقعہ دیکھا اور گرین فیلڈ سے پوچھا۔ ”کیا شہر میں کہیں سرنگیں ہیں؟“

”بالکل نئے شہر کے نیچے سرنگیں ہیں جو کسی زمانے میں پرانے شہر کی گلیاں ہوتی تھیں پھر ان کو کا کر کے اور ان پر چھت تعمیر کر کے انہیں بارش کے پانی کی نکاسی کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔“

”ایملی وہیں کہیں ہے۔“ ایڈگر بولا۔ ”اپنے آدمیوں کو بلا لو اور کھدائی کے اوزار بھی منگوا لو۔“

شام ہونے سے پہلے وہ ان سرنگوں میں پہنچ گئے تھے جو نصف مربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں اور انہیں سرخ اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ وہ سب ان سرنگوں میں پھیل گئے اور کسی ایسی جگہ کو تلاش کرنے لگے جہاں کسی کو چھپایا جا سکتا ہو۔ ساتھ ہی وہ چلا چلا کر ایملی کو آواز دے رہے تھے۔ ایڈگر الگ تھا وہ ایک کھدال کے ساتھ سرنگوں کی دیوار چیک کر رہا تھا۔ وہ کھدال کا دستہ مار کر دیکھ رہا تھا کہ دیوار ٹھوس ہے یا اس کے پیچھے کوئی خلا ہے؟ ایک جگہ اسے محسوس ہوا کہ دوسری طرف خلا ہے اور اس نے اس پر کھدال چلائی شروع کر دی۔ چند منٹ میں اس نے پہلی اینٹ نکال دی اور اس کے بعد کام آسان ہو گیا۔ چند اینٹیں نکال کر اس نے لائٹن کی روشنی میں اندر جھانکا تو اسے ایک بہت پرانا خستہ حال فرنیچر والا کمرہ نظر آیا۔ ایملی یہاں نہیں تھی۔ اسی لمحے اسے کہیں دور کھدال چلنے کی آواز آئی۔ وہ لائٹن اٹھا کر اس طرف دوڑا اور جب وہاں پہنچا تو گرین فیلڈ ٹوٹی دیوار سے اینٹیں نکال رہا تھا۔ اس جگہ کی نشان دہی جان نے کی تھی کہ یہاں دیوار پر اینٹوں کا رنگ ملکا تھا۔ جیسے ہی خلا ذرا بڑا ہوا انہوں نے لائٹن اٹھا کر اندر دیکھا اور انہیں شہرے بالوں کی جھلک دکھائی۔ ایڈگر نے بے تاب سے کہا۔

”ایملی۔۔۔۔۔“



ایڈگر نے اس کا منہ کھولا تو اندر سے زبان غائب تھی مگر اس کی جگہ ایک زنجیر والی گھڑی تھی۔ اس کے ساتھ سونے کی چین بھی منسلک تھی۔ گھڑی کی سوئیاں سات بج کر بیالیس منٹ پر رکی ہوئی تھیں۔ ایڈگر چونکا۔  
 ”یہ نشان دہی ہے؟“  
 ”کس کی؟“

”شاید جگہ کی، یہ ارض البلد اور طول البلد کی چھوٹی اکائیاں ہیں۔ ہمیں اس علاقے کے تفصیلی نقشے کی ضرورت ہے۔“  
 ”ایسا نقشہ کہاں ملے گا؟“

”میں جانتا ہوں کہاں ملے گا میرے ساتھ آؤ۔“  
 کچھ دیر بعد وہ ہمیشہ ہاؤس میں تھے۔ چارلس ہلٹن سابق جہاز راں تھا اور وہ بحری جہازوں پر کپتان بھی رہا تھا۔ اس کے پاس بہترین اور تفصیلی نقشے تھے۔ حسب معمول اسے دیکھ کر چارلس کا چہرہ بگڑا تھا مگر جب اسے بتا چلا کہ وہ ایسلی کے جائے قید کے بارے میں مدد کے لیے اس کے پاس آئے ہیں تو وہ فوراً تیار ہو گیا اور انہیں اپنی اسٹڈی میں لے آیا۔ ایڈگر اسے نقشوں کے بارے میں بتانے لگا اور چارلس حیران ہوا۔ ”تم نقشوں کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟“

”میں مصنف ہوں میرا کام ہی جانتا ہے۔ ورنہ میں لکھوں گا کیسے؟“  
 ”کون سا نقشہ چاہیے؟“

چارلس کے پاس دو بانی دو فٹ سائز میں عرض البلد اور طول البلد کے تفصیلی نقشے تھے۔ ایڈگر نے بالٹی مور کا نقشہ لیا اور اس کے سات بیالیس تلاش کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک جگہ اٹلی دہلی۔ ”یہ ہے۔“

”یہاں قبرستان ہے۔“ گرین فیلڈ نے کہا۔  
 ”ہمیں فوراً جانا ہو گا۔“ چارلس نے بے چینی سے کہا۔

گرین فیلڈ اور جان کے ساتھ ایڈگر، چارلس اور اس کے آدمی بھی تھے۔ وہ قبرستان پہنچے تو موسم ابر آلود تھا اور جنگل کی طرف سے دھند نمودار ہو رہی تھی۔ قبرستان کا ایک حصہ بالٹی مور کے نامور مارشل خاندان کے لیے مخصوص تھا اور انہوں نے یہاں ایک بہت بڑی عمارت بنوائی تھی۔ ان کے مردے اسی عمارت میں رکھے یا دفن کیے جاتے تھے۔ یہی ایک جگہ ہو سکتی تھی جہاں کسی زندہ انسان کو چھپایا جا سکتا تھا۔ وہ اس عمارت کے چاروں طرف پھیل گئے۔ ایڈگر

دروازوں کو دیکھ رہا تھا۔ جان ایک طرف عمارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اسے ایک دروازے کی طرف سے ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا اور وہ پستول سیدھا کیے اس کی طرف آیا کہ اسے اوپر سے آہٹ سنائی دی اور جب اس نے اوپر دیکھا تو ایک سایا سا اس کی طرف جھپٹ رہا تھا۔ دھات کی چمک لہرائی اور جان کا گلا کٹ گیا۔ اس نے فائر کیا مگر گولی نہیں ادر گئی تھی۔ وہ گلا تمام کر بیچے مگر کیا اور جب اس نے قاتل کا چہرہ دیکھا تھا۔ قاتل نے آرام سے جھک کر اس کے ہاتھ سے پستول نکالا اور ایک طرف غائب ہو گیا۔ اسی لمحے فائر کی آواز سن کر گرین فیلڈ دوڑتا ہوا وہاں آیا اور جان کو دم توڑتے دیکھ کر اس نے جلدی سے اپنا مفلتر اتار کر اس کے گلے پر رکھا اور بولا۔

”جان یہ کیا ہوا ہے؟“

جان نے لڑتے ہاتھوں سے اس سمت اشارہ کیا جس طرف قاتل گیا تھا اور اسی لمحے جنگل کی طرف سے چلائی جانے والی گولی آکر گرین فیلڈ کے سینے میں اتر گئی۔ وہ چیخ مار کر گر گیا تھا۔ ایڈگر بھی دوڑتا ہوا وہاں آیا اس کے پیچھے چارلس اور اس کے آدمی تھے۔ گرین فیلڈ نے اپنا پستول ایڈگر کی طرف بڑھایا۔ ”اس کے پیچھے جاؤ میرا گھوڑا لے جاؤ۔“

ایڈگر نے گرین فیلڈ کا گھوڑا پکڑا اور آگے بڑھا دیا۔ جنگل سے ٹاپوں کی آواز بتا رہی تھی کہ قاتل فرار ہو رہا ہے۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے ایڈگر گھوڑے کی ٹاپوں پر بچھا کرنے لگا مگر چند فرلانگ آگے نکلنے کے بعد ٹاپوں کی آواز رک گئی۔ ایڈگر بھی رک گیا تھا۔ اچانک سامنے سے گولی آئی اور گھوڑے کی گردن میں اتر گئی۔ اس نے جھینا کر اگلے پاؤں اٹھائے تو ایڈگر الٹ کر پیچھے گرا اور گھوڑا بھاگ نکلا۔ ایڈگر ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا اور اس نے پستول نکال لیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ قاتل کہاں ہو سکتا ہے۔ اچانک سامنے سے پھر فائر ہوا اور اس بار ایڈگر نے سمت دیکھ لی اور نے لگا تار دو فائر کیے اور چلا کر بولا۔

”بزدل سامنے آؤ۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

جواب میں ایک قہقہہ سنائی دیا اور پھر گھوڑوں ٹاپوں کو غنچے لگیں۔ قاتل فرار ہو رہا تھا۔ ایڈگر نے اس سے پیستول کی باقی ساری گولیاں چلا دیں مگر وہ قاتل کا نہیں پکڑ سکا تھا۔ جب وہ واپس پہنچا تو قبرستان بچھڑا



شائع نہ کی۔“

ہنری نے کہانی کا رد اس کے منہ پر دے مارا۔ ”اسے لو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

اگر آئیوان نہ پکڑتا تو ایڈگر پھر ہنری کا گھار بوجھ لیتا۔ وہ اسے سمجھ کر باہر لے گیا اور اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے شراب کا گلاس پیش کیا۔ یہ ایسی چیز تھی جس سے ایڈگر کسی صورت انکار نہیں کر سکتا تھا اس نے ایک سانس میں گلاس خالی کیا اور آئیوان سے کہا۔ ”تم دیکھ لیتا اگر میں لکھتا بند کر دوں تو یہ جتنی اکوئی ردی کے بھاؤ بھی نہ لے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مسٹر پو۔“ آئیوان نے ادب سے کہا۔ ”آپ اور مسٹر ہنری دونوں غصے میں ہیں آپ کل آئیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ہنری کے کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور ہنری نے جھانک کر کہا۔ ”اسے کہو اب یہاں آنے کی زحمت نہ کرے۔ یہ اخبار اس کے بغیر بھی چل سکتا ہے۔ جلد اسے اپنی اوقات کا پتا چل جائے گا۔“

اس نے کہہ کر دروازہ بند کر لیا۔ ایڈگر وہاں سے روانہ ہوا۔ وہ سارا دن پالٹی مور کی سڑکیں ناچار ہا اور جب شام کے وقت گھر پہنچا تو اس کا گھر گھلے اگل رہا تھا۔ فائر بریک کا ٹبلہ، ہنڈ پمپ اور بالٹیوں میں پانی کی مدد سے آگ بجھا رہا تھا مگر شعلوں سے لگ رہا تھا اس کا سارا اثاثہ راکھ ہو گیا تھا۔ اس میں اس کے ہاتھ سے لکھے مسودے بھی شامل تھے۔ فائر فائٹر چیف نے اسے بتایا کہ کسی نے کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر آگ لگائی۔ امکان تھا کہ شراب کی بوتل کے منہ پر کپڑا ٹھونس کر اسے آگ دکھا کر اندر پھینکا گیا تھا اسی لیے آگ اتنی تیزی سے پھیلی کہ جب تک فائر بریک نہ والے آتے اندر سب راکھ ہو چکا تھا اب وہ صرف آگ بجھا رہے تھے۔ بچنے والی واحد چیز ایڈگر کا نیولا تھا جو بچرے میں بند تھا۔ وہ ایڈگر کے حوالے کر دیا گیا۔ آج اس کے لیے ہمدیوں کا دن تھا۔ ایڈگر کی زندگی کی اُمید ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ہنری نے اس کی کہانی شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اب اس کی ساری کہانیاں اور کتابیں جل گئی تھیں۔ اگرچہ یہ کہانیاں رسالوں، اخبارات اور کتابوں کی صورت میں موجود نہیں تھیں مگر ہاتھ کی تحریر میں اب باقی نہیں رہی تھیں۔ وہ نچو لے گا جس لیے شعلہ قدموں سے وہاں سے رخصت ہوا۔ بہت دیر بعد اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو گرین فیلڈ کے گھر کے سامنے پایا۔ دستک کے جواب میں

دالوں سے بھرا ہوا تھا۔ جان کی لاش اور زخمی گرین فیلڈ کو لے جایا گیا تھا۔ چارلس وہاں موجود تھا اور کبلی بار ایڈگر کو اس میں نرمی نظر آئی۔ وہ تھکا اور ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے ایڈگر سے اپنے رویے پر مخدرت کی تھی۔ ایڈگر گرین فیلڈ کے گھر پہنچا جہاں ڈاکٹر نے اس کا آپریشن کر کے گولی نکال دی تھی اور اس کی حالت بہتر تھی۔ مگر جان کے مارے جانے کا دکھ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ اس نے ایڈگر سے کہا۔

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہ میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔“

”ابھی تو وہ بہت چالاک اور ہر موقع پر ہم سے تیز ثابت ہو رہا ہے۔ وہ ہمیں کٹھنچلیوں کی طرح اپنے اشاروں پر نچا رہا ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے اور ہمارے سامنے سے نکل جاتا ہے۔“

”اتفاقات اسے بچارے ہیں۔“

”نہیں یہ اس کے اندر کی شیطانی قوت ہے۔“ ایڈگر نے کہا۔ ”وہ شیطان کا پرتو ہے۔ وہ عام بھرم نہیں ہے۔“

”وہ ایک انسان ہے۔“ گرین فیلڈ نے نرمی سے کہا۔ ”نہیں وہ شیطان ہے۔“ ایڈگر نے یقین سے کہا اور

وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اب اسے اس کہانی کا اگلا حصہ لکھنا تھا۔ اس نے ساری رات جاگ کر اس کا اگلا حصہ لکھا اور اسے لے کر ہنری کے پاس گیا۔ اس میں اس نے بیان کیا کہ قاتل نے غلطی کی اور ایڈگر کی قید سے نکل گئی۔ اس کے بعد قاتل نے زہر پی کر خودکشی کر لی کیونکہ اس کا راز فاش ہونے والا تھا اور اسے قانون کے ساتھ ذلت کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔ ہنری نے یہ قسط دیکھی اور اسے میز پر چھینک دیا۔

”کہو اس نے نہیں چلے گی۔“

”کیوں؟“ ایڈگر نے بے قابو ہو کر کہا۔

”کیونکہ اب میں جان گیا ہوں تم میرے اجازت کے لیے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہو۔“

”میں یہ کام رقم کے لیے نہیں کر رہا ہوں۔ تمہیں اسے شائع کرنا ہو گا۔“ ایڈگر نے اس کا گلا پکڑ لیا۔ آئیوان درمیان میں آیا اور اس نے بہ مشکل ہنری کو ایڈگر سے چھڑایا۔ ہنری ہانپنے لگا تھا اس نے چلا کر کہا۔

”تمہاری جرات کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی میں تمہیں جیل بھجوا دوں گا۔“

”اور میں تمہیں جہنم بھیج دوں گا اگر تم نے میری کہانی



اس کی ملازمہ نے دروازہ کھولا اور بولی۔

”مسٹر گرین فیلڈ سورہے ہیں؟“

”میں اسے ڈسٹرب نہیں کروں گا۔“ ایڈگر نے آہستہ سے کہا۔ ”میں صرف یہ رکھوانے آیا ہوں۔“ اس نے خنجر سے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ میرا پالتو بولا ہے۔“

”ضرور مسٹر پو۔“ خادمہ نے خنجر ہلے لیا۔ ایڈگر جانے لگا تھا کہ خادمہ نے کہا۔ ”ایک منٹ مسٹر پو آپ کے لیے ایک لفافہ آیا ہے۔“

اس نے لفافہ لا کر دیا اور ایڈگر نے کھولا تو اس میں ہنری کی تحریر میں لکھا تھا۔ ”تم ہار گئے ایڈگر۔۔۔۔۔ ہنری۔“

ایڈگر نے کاغذ توڑ مروڑ کر نیچے پھینک دیا۔ وہ مڑا اور روانہ ہو گئے۔ جب وہ بالٹی مور پتھر یا ٹک کی عمارت میں داخل ہوا تو رات کا آخری پہر تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد صبح ہو جاتی۔ ایڈگر اندر آیا اور ہنری کے کمرے میں داخل ہوا۔

وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایڈگر نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا اور بولا۔ ”ایمیلی کہاں ہے؟“

ہنری نے کوئی جواب نہیں دیا اس کے جسم میں حرکت بھی نہیں ہوئی تھی۔ ایڈگر غصے سے بے قابو ہو کر آگے آیا تھا۔ ”ڈیلیل فیض جواب دو ایمیلی کہاں ہے؟“

پھر ایڈگر رک گیا۔ کیونکہ ہنری کے دونوں ہاتھ میز پر کیلوں سے بٹھکے ہوئے تھے اور اس کی گردن کٹی ہوئی تھی۔

وہ مر چکا تھا۔ ایڈگر چونکا ہوا گیا۔ قاتل نے ایک بار پھر اسے چکرا دیا تھا۔ وہ ہنری کو قاتل سمجھ کر آیا تھا اور وہ خود قاتل کا شکار نکلا تھا۔ اچانک ایڈگر کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ وہ جان گیا کہ قاتل کون تھا۔ وہ پرہیز والے حصے میں آیا جہاں آئیوان موجود تھا۔ ایڈگر نے عقب سے اس پر پستول تان لیا۔ ”آئیوان؟“

آئیوان نے پستول ہاتھ اوپر کیے اور پھر اس کی طرف مڑا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بالکل بدل گئے تھے اور وہ نہایت شاطرائہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ”حیران ہوئے۔۔۔۔۔ ہے تا مسٹر پو؟“

”ایمیلی کہاں ہے؟“

”وہ مرنے والی ہے۔“ اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ”میری توقع سے زیادہ تیزی سے۔ بہر حال وہ جان گئے ہو کہ میں تمہارا سب سے بڑا فین ہوں۔“

”فین۔۔۔۔۔؟“

”ڈرنک۔“ آئیوان نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔

اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ”میری توقع سے زیادہ تیزی سے۔ بہر حال وہ جان گئے ہو کہ میں تمہارا سب سے بڑا فین ہوں۔“

”فین۔۔۔۔۔؟“

”ڈرنک۔“ آئیوان نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔

کر کے کہا اور میز کے دوسری طرف آیا اور اس نے نیچے سے بوتل اور دو گلاس نکال کر میز پر رکھے پھر بوتل کھول کر دونوں گلاسوں میں شراب ڈالی۔ ”کوئی ماسک نہیں ہے اور کوئی پردہ نہیں ہے۔ دو فن کار آئے سانسے بات کریں گے۔“

”دو فنکار؟“

”ہاں کیونکہ اس کہانی کا آخری باب مجھے لکھنا ہے۔“

اس نے ایک گلاس ایڈگر کی طرف سرکا دیا۔ ایڈگر کو لگا کہ اس کا سر چکر رہا ہے اسے شراب کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

”تم دیوانے ہو۔“

”سچ سچ مسٹر پو؟ تم ایک دیوانے سے بات کرنا چاہتے تھے۔“

”ایمیلی کہاں ہے؟“ آئیوان نے اس کی بات دہرائی۔ ”کوئی جیسا جملہ نہیں۔۔۔۔۔ کوئی مصرع نہیں۔۔۔۔۔ ایسا معصف جو تار کیوں کا مزاج شناس ہے جو چہروں تلے موجود اصرار جانتا ہے۔۔۔۔۔ اس سے اس سادہ جملے کی توقع نہیں تھی۔“

ایڈگر نے اچانک پستول اس کے کان کے پاس کرتے ہوئے فائر کیا اور چلا کر بولا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

دھماکے نے آئیوان کا کان سن کر دیا تھا اور وہ اسے ہاتھ سے دبائے ہوئے تھا۔ اس نے چند لمحے بعد کہا۔ ”تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے مسٹر پو، حقیقت فلکشن سے کہیں زیادہ سچ ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے تم ایمیلی کے بارے میں جانتا چاہتے ہو تو پستول مجھے دے دو۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔

ایڈگر کا پستول والا ہاتھ کاٹنے لگا تھا اسے لگا جیسے اس کے اندر کچھ کٹ رہا ہو۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ آئیوان اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ”مسٹر پو تم تاخیر کر رہے ہو تم جانتے ہو آگے کیا ہوگا؟۔۔۔۔۔ تم ٹریگر دباؤ گے۔ مجھے اور ایمیلی کو قتل کر دو گے یا پھر تم مجھے پستول دے رہے ہو؟“

”وہ زندہ رہے گی؟“

”یہی ایک حل ہے۔“

ایڈگر نے سوچا اور پستول اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس کی حالت خراب ہو رہی تھی اور اندر اذیت بڑھ رہی تھی۔ آئیوان نے پستول لے کر نیچے رکھا اور ایک چھوٹی شیشی نکالتے ہوئے بولا۔ ”مسٹر پو تمہارے تاثرات سے لگ رہا ہے تم کسی ننھے بچے کی طرح رونا چاہتے ہو۔“ اس نے چھوٹی شیشی اٹھ کر کو دکھائی۔ ”یہ تریاق ہے۔ تم جانتے ہو تریاق

”یہی ایک حل ہے۔“

ایڈگر نے سوچا اور پستول اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس کی حالت خراب ہو رہی تھی اور اندر اذیت بڑھ رہی تھی۔ آئیوان نے پستول لے کر نیچے رکھا اور ایک چھوٹی شیشی نکالتے ہوئے بولا۔ ”مسٹر پو تمہارے تاثرات سے لگ رہا ہے تم کسی ننھے بچے کی طرح رونا چاہتے ہو۔“ اس نے چھوٹی شیشی اٹھ کر کو دکھائی۔ ”یہ تریاق ہے۔ تم جانتے ہو تریاق

”یہی ایک حل ہے۔“



میرے باپ کی ایجاد ہے۔ ہرگز ہر کا توڑ ہے۔“

”زہر۔“ ایڈگر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں میرے باپ نے مجھے نصیحت کی تھی کہ جب کہیں کچھ کھانے پینے جاؤ تو اسے ہمیشہ ساتھ رکھا کرو۔ ممکن ہے کہیں تمہیں زہر دے دیا جائے۔“ اس نے کہتے ہوئے چھوٹی شیشی ایڈگر کے گلاس میں اڈیل دی۔ ”میں یہ تریاق اپنے وقت کے عظیم ترین مصنف کو پیش کر رہا ہوں۔ جس کے ساتھ کام کرنا میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔“

”میرے ساتھ کام؟“

”ہاں میں نے تمہارے بعض آئیڈیاز کو عملی صورت

دی ہے مسٹر یو۔“

”نہیں مسٹر آئیوان، تم نے صرف ایک نفسیاتی قاتل کا کردار ادا کیا ہے۔ یہ کوئی تخلیق نہیں ہے۔ کسی کو قتل کر دینا کوئی تخلیق نہیں ہے۔“

آئیوان کا چہرہ سخت ہو گیا۔ ”میں تم سے متفق نہیں ہوں۔ میں تمہارے ماسٹر جیس کا ایک حصہ ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اسے کون کھل کرے گا میں یا تم۔۔۔۔۔ لیکن یہ ہو گا ماسٹر جیس ہی۔“ اس نے تریاق کا گلاس ایڈگر کی طرف سرکایا۔ ”ممکن ہے یہ تریاق ہو یا ممکن ہے یہ مہلک زہر ہو جو ایک لمحے میں تمہارا کام تمام کر دے۔ مگر ایک بات یقینی ہے کہ تم ایک خطرناک زہر بی پختہ ہو۔“

یہ بات ایڈگر بھی محسوس کر رہا تھا اسے لگ رہا تھا کہ اس کا جگر اندر سے کٹ رہا ہو۔ اس نے سوچا اور گلاس اٹھا کر حلق میں اڈیل لیا۔ اسے لگا جیسے اس کے حلق سے آگ کی ایک لکیر اندر تک چلی گئی ہو۔ آئیوان نے اس کا لکھا ہوا صفحہ اٹھا یا اور اس کا آخری حصہ پڑھا۔

”ایہیلی سبے سدھ اور بے حرکت تھی میں نے اسے سینے سے لگا یا۔ اس سے التجا کی، وہ آنکھیں کھولے اور مجھے دیکھے۔“ آئیوان نے کاغذ واپس رکھ دیا۔ ”خوب صورت لائیں ہیں۔“

”وہ کہاں ہے؟“

”میں بتا چکا ہوں مسٹر یو۔“ آئیوان نے اپنا کوٹ پہنا۔ ”ممکن ہے تم زندہ رہو اور ممکن ہے نہ رہو لیکن یہ بات یقینی ہے میں یہاں نہیں ہوں۔“

”مسٹر ریٹلڈ بھی آگئی ہے۔“ باہر سے کسی نے پکار کر کہا۔

”میں آرہا ہوں۔“ آئیوان نے کہا اور اپنا بیگ

اٹھاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ ایڈگر کا سر چکر رہا تھا اس میں اتنی امت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر آئیوان کا راستہ روک سکتا۔ اسے ایہیلی کی فکر تھی کہ وہ کہاں تھی۔ ایڈگر نے اپنا سر تمام لیا۔ اچانک اسے آئیوان کی ایک بات یاد آئی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور پیچھے گر گیا۔ اس نے اٹھنے کی بجائے فرش ٹوٹنا شروع کیا اور پھر میز کے پیچھے لگے اوزاروں والے تختے سے ایک ہتھوڑی اٹھا کر فرش بجانے لگا۔ ایک جگہ اسے کھوکھلی آواز آئی تو وہ اس پر ہتھوڑی چلانے لگا۔ یہ جگہ میز کے پیچھے تھی۔ اس نے بھاری میز سرکا کر چاہی مگر یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے دیوار سے پشت لگا کر دونوں پاؤں میز کے سرے پر جمائے اور زور لگا کر اسے الٹ دیا۔ پھر اس نے ہتھوڑی سے اوپری پلائی توڑ دی اور پھر نیچے موجود تختے کی بلایاں توڑیں۔ یہاں فرش میں ایک تختہ الگ سے تھا اس نے اسے اٹھایا تو میٹر حیاں ظاہر ہوئیں۔

اس نے لائین اٹھائی اور پیچھے اتر گیا۔ عمارت کے نیچے پرانے کمرے تھے جو اب چھپ گئے تھے وہاں مٹی اور جالے تھے وہ ایک سرنگ سے گزر کر ایک کمرے تک آیا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ ہو بہو اس کے گھر کا سیٹ تھا۔ بالکل ویسی ہی میز، کرسی، فرش، فیلف جن میں کتا نہیں اور اس کے ہاتھ کے لکھے مسودے تریب سے رول کی صورت میں رکھے تھے۔ یہ سب وہی چیزیں تھیں جو اس کے جل جانے والے گھر میں تھیں۔ ایڈگر کو لگا کہ اس کی عقل خبط ہو جائے گی۔ آئیوان کس قسم کا آدمی تھا۔ پھر اسے ایہیلی کا خیال آیا اور وہ اسے تلاش کرنے لگا۔ اس کی نظر ایک طرف موجود کچے فرش پر گئی اور اس نے بے تابی سے اس کی مٹی ہٹائی۔ نیچے ایک تختہ ظاہر ہوا۔ اس نے ہتھوڑی سے اس کی بلایاں توڑ دیں اور اسے کھولا تو اندر ایہیلی ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے بے تابی سے اسے بکس سے نکالا اور گود میں لے کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”ایہیلی آنکھیں کھولو، پلیز آنکھیں کھولو۔“

وہ اسے مسلسل پکارتا رہا اور بالآخر ایہیلی کی پلکوں میں روشنی ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ”ایڈگر یہ خواب ہے یا مجھ سے سامنے ہو؟“

”یہ کچھ نہیں جیسا ہے پاس ہوں۔“ ایڈگر نے اسے سینے سے لگایا پھر وہ اسے اٹھائے اور پر کی طرف بڑھا تھا۔

☆☆☆

گرین فیلڈ کی آنکھ کھلی تو اسے ایڈگر اور ایہیلی کا خیال



آیا وہ بے ہوش کیا اور اس نے خادمہ کو آواز دی۔ وہ فوراً آگئی۔ ”نہیں ماسٹر؟“

”کیا مسٹر پو یہاں آئے تھے؟“

”نہیں ماسٹر وہ اپنا ٹوٹا رکھا کر گئے ہیں اور ان کے لیے ایک خط آیا تھا جو میں نے ان کو دے دیا۔“

”خط کیسا خط؟“

”وہ اسے سہیلیں بھیج کر کہیں چلے۔“ خادمہ نے لباس سے رقعہ نکال کر گرین فیلڈ کی طرف بڑھایا۔ گرین فیلڈ نے اسے لے کر پڑھا اور بستر سے اتر آیا۔ خادمہ نے پریشان ہو کر اسے روکنا چاہا مگر وہ کپڑے پہن کر باہر نکل گیا۔ اس کی بھی کارخ بالٹی مور پیئر یا ٹیک کے دفتر کی طرف تھا اور جب وہاں پہنچا تو صبح کی روشنی نمودار ہو چکی تھی۔ ایسوی لینس کے ساتھ طبی عملہ وہاں آپکا تھا اور چارلس ہملٹن اسٹریچر پر بھی ایسلی کے ساتھ باہر آ رہا تھا۔ گرین فیلڈ نے چارلس سے پوچھا۔

”ماسٹر پو کہاں ہیں؟“

”چاہ نہیں۔“ چارلس نے جواب دیا۔ اسے ایسلی کو ایسوی لینس تک پہنچانے کی جلدی تھی تاکہ اسے اسپتال لے جایا جاسکے۔ تین دن تک مسلسل بھوکے پیاسے رہنے سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اسے خوراک اور پانی کے ساتھ باقاعدہ علاج کی ضرورت تھی۔ گرین فیلڈ دیوانوں کی طرح ان کو کھٹاش کرنے لگا۔ مگر وہ وہاں کہیں بھی نہیں تھا۔ پولیس آچلی تھی اور ہنری کی لاش کا معاملہ ہو رہا تھا۔ اپنی اشاعت کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب بالٹی پیئر یا ٹیک شائع نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

تین دن بعد گرین فیلڈ اسپتال میں ڈاکٹر کالبرٹ کے سامنے تھا۔ وہ گرین فیلڈ سے کہہ رہا تھا۔ ”موت کی ممکنہ وجہ برین ہیمریج، دل کی بیماریوں کا کام چھوڑ دینا اور جگر کی خرابی ہو سکتی ہے۔“

”اسے ہوش نہیں آیا؟“

”تین دن سے وہ نیم غشی کی کیفیت میں تھا اور اس دوران میں اس نے کئی بار ایک ہی جملہ کہا کہ اس کا آخری نام ریٹالڈ تھا۔“

”ریٹالڈ؟“ گرین فیلڈ نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے ڈاکٹر کہ وہ ہندیائی کیفیت میں تھا۔“

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہندیائی کیفیت میں آدمی

لا یعنی اور مختلف باتیں کرتا ہے وہ ایک ہی بات بار بار نہیں کرتا۔“ گرین فیلڈ نے ایڈ گرائلین پو کی لاش کی طرف دیکھ جس کا آج صبح ہی انتقال ہوا تھا۔ مرنے کے بعد اس کے چہرے پر سکون تھا۔ گرین فیلڈ غیر جذباتی آدمی تھا اور بے شمار لاشیں دیکھ چکا تھا مگر اس وقت اس کے چہرے پر دکھ کے تاثرات تھے۔ پھر اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

”تمہارے تعاون کا شکریہ ڈاکٹر۔“

ڈاکٹر کے جانے کے بعد گرین فیلڈ نے ایڈ گرائلین پو کی لاش کے پاس آ کر آہستہ سے کہا۔ ”دوست میں نے تم سے وعدہ کیا تھا میں اسے ضرور پورا کروں گا۔“ ایڈ گرائلین پو کی تدفین بالٹی مور کے قبرستان میں کی گئی۔ جس میں اس کی بہن کے ساتھ ہملٹن خاندان اور اس کے کچھ دوست و واقف کار شریک تھے۔ بعد میں اس کی قبر پر چوکور کتبہ لگایا گیا جس کے وسط میں اس کی شبیہ بھی ہے۔ اس پر تحریر ہے۔ ”یہاں معصفت اور شاعر ایڈ گرائلین پو محو خواب ہے۔ اس کی زندگی کی طرح اس کی موت بھی پُر اسرار تھی۔“

☆☆☆

تین مہینے بعد جرس کے مرکزی ریلوے اسٹیشن پر ٹرین سے آنیوان اتر۔ اس کا اصل نام آر تھر ریٹالڈ تھا۔ ایک پورٹر نے اس کا سامان اٹھایا اور وہ باہر موجود اپنے لیے گھنٹہ گھنٹی تک آیا۔ مگر جیسے ہی وہ اندر گھسا اس نے دیکھا ایک ہسٹول کی ٹال اس کی طرف مرکوز ہے اور اس کے پیچھے گرین فیلڈ موجود تھا اس نے مسکرا کر کہا۔ ”ہیلو مسٹر ریٹالڈ۔“

آر تھر ریٹالڈ نے اس پر جھٹکنے کی کوشش کی اور ایک فائر کی آواز نے اسے اسے داندہ چھپتے کیوتروں کو اڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کہانی کا آخری کردار بھی انجام کو پہنچا تھا آر تھر ریٹالڈ کے مرنے کے بعد گرین فیلڈ کو اس کے سامان سے کئی مسودے اور ایک ڈائری ملی جس میں اس نے کیا کے انداز میں یہ سارے واقعات تفصیل سے لکھے تھے۔ وہ اس وقت آنیوان روز بگ تھا۔ جب کہ اس کا اصل آر تھر ریٹالڈ تھا۔ اس نے اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھپا تھا اس لیے گرین فیلڈ اور بالٹی مور کی پولیس یہ کیس کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ایڈ گرائلین پو کی موت کا تمام ریکارڈ ضائع ہو چکا ہے اور آج کی دنیا میں کوئی واضح طور پر نہیں جانتا کہ آخری چند دنوں میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟



# شہرِ ستم گراں

شیرازِ خات

دنیا بھر میں ایسے لاتعداد شہر ہیں جو سیاحوں کو اپنی جانب کھینچتے ہیں مگر سیاحوں کے لیے وہاں ہر گلی ہر کوچے میں سیاح بھی دام پھیلانے منتظر رہتے ہیں۔ ایسے شہر کہاں کہاں واقع ہیں اور کن وجوہات کی بنا پر بدنام ہیں اس پر ایک ہلکی سی نظر۔

دنیا بھر کے بدنام شہروں کا ذکر

شہر کسی بھی ملک کی ترقی کی نشانیاں ہوتے ہیں۔ پوری دنیا میں ایسے بے شمار شہر ہیں جو سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں جب کہ ایسے شہروں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جنہیں دنیا کے خراب ترین شہروں میں رکھا گیا ہے۔

ان کی خرابی کی رینٹنگ، ٹریفک کے خراب نظام، جرائم، صحت اور صفائی کے ناقص انتظامات اور اسی قسم کی دیگر خرابیوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ پوری دنیا میں سروے کے ذریعے اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے تو انہیں ایسے چند





شہروں کے بارے میں جانتے ہیں۔

آبد جان۔ کوٹ ڈی ویلورے کا شہر۔ دسویں نمبر پر دنیا کا خراب ترین شہر ہے۔ (کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہم اس سے متفق بھی ہوں لیکن یہ ذیلی گراف کی رپورٹنگ ہے)۔

کیمرون کا شہر ڈاولا۔ انتہائی خراب، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، جگہ جگہ گندگی، امن و امان کی ناقص صورت حال، بے ہنگم ٹریفک۔ یہ سب مل کر اس شہر کو دنیا کے خراب ترین شہروں میں شامل کر رہی ہیں۔

لیبیا کا شہر ٹریپولی۔ یہ شہر بھی بہت خراب ہے۔ یہاں زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔

ذیلی ٹیلی گراف کی رپورٹنگ کے مطابق ہمارا کراچی بھی اس فہرست میں شامل ہے اور کراچی میں جو کچھ بھی ہے وہ آپ کے سامنے ہی ہے۔

الجزیرہ کا شہر الجیرس بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ یہاں بھی زندگی عذاب بنی رہتی ہے۔

زمبابوے کا شہر ہرارے۔ دیکھنے میں خوب صورت لیکن برتنے میں بہت مشکل۔

ناجیبریا کا شہر لاگوس بھی۔ اسی فہرست میں شامل ہے۔

پاپوانیو گنی کا شہر پورٹ ماروش۔ دنیا بھر میں خراب ترین شہروں کی فہرست میں دوسرے نمبر پر ہے۔

بنگلہ دیش کے شہر ڈھاکا کو دنیا کا سب سے خراب شہر بتایا گیا ہے۔ اس کی وجہ وہاں کی بے ہنگم آبادی ہے۔ ہر جگہ جھونپڑیاں نظر آتی ہیں اور ٹریفک کا نظام بھی بہت بدتر ہے۔

کویت اور سرورے بھی کیا گیا ہے جس کے مطابق دنیا میں بہت سے ایسے شہر ہیں جو سیاحوں کے لیے خطرناک ہیں۔ ان کا خطرہ ہوتا ہے شمار و جوہات کی وجہ سے ہے

جیسے گینگ وار۔ منشیات کا گڑھ، فرقہ وارانہ فسادات، اسٹیٹ کرائم، دھوکا دہی، ملوث مارا اور نارگٹ کلنگ وغیرہ۔

آئیں ان شہروں کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔

ہنڈراس کا شہر San pedro sula اس شہر کو بہت خطرناک قرار دیا گیا ہے۔ اسے نی اسٹنگ ایک

عام سی بات ہے۔ شہر پر قبضے کے لیے کئی کئی گھنٹوں جو آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ خون ریزی ایک عام سی بات ہے۔

منشیات کا بھی یہ ایک بڑا گڑھ ہے۔

سیاسی بد امنی اور فرقہ واریت کی وجہ سے کراچی بھی

ماہنامہ سرگزنٹ

اس فہرست میں شامل ہے۔ نارگٹ کلنگ، بم دھماکے، گینگ وارز، اسلئے اور منشیات کی وجہ سے ہمارا یہ شہر خطرناک شہروں کی فہرست میں آ گیا ہے۔ (خداوند دن بھی دکھائے جب یہ شہر دنیا کے پرسکون شہروں کی فہرست میں اول نمبر پر ہو)۔

کاٹل۔ خطرناک شہروں میں اس شہر کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ بم دھماکے عام سی بات ہیں۔ اس کے علاوہ سیاسی بد امنی اور بے چینی بھی بہت زیادہ ہے۔

سیاحوں کو منع کیا جاتا ہے کہ اول تو نہ جائیں اگر کسی سبب سے جانا بھی پڑ جائے تو اپنے ہوٹل سے باہر نہ نکلیں۔

بد قسمتی سے کسی زمانے میں اس شہر کو علم کا شہر کہا جاتا تھا۔ کیا کیا نہیں تھا یہاں۔ بڑے بڑے مدرسے، دانش گاہیں، فلاسفرز اور اس شہر بے مثال برکی داستانیں۔ یعنی

ذکر ہے بغداد کا جواب بد امنی اور خانہ جنگی کا شہر بن کر رہ گیا ہے۔ آئے دن بم دھماکے ہوتے رہتے ہیں۔ فرقہ وارانہ

فسادات بھی انتہا کو ہیں۔ سینکڑوں لوگ مارے جا چکے ہیں۔ اسی لیے یہ شہر سیاحوں کے لیے خطرناک سمجھا جاتا ہے۔

میکسیکو کا شہر Aca pulko۔ انتہائی خطرناک، اس شہر میں مرڈر، ٹینگ دنیا کے بہت سے شہروں سے نہیں

زیادہ ہے۔ اس کی وجہ منشیات کا گڑھ، گینگ وارز اور اسلئے کی بھرمار ہے۔ یہاں سے اسلئے کی اسمگلنگ بھی ہوا کرتی ہے۔

یہاں آنے والے سیاحوں کو بے شمار ہدایات دی جاتی ہیں۔ کہاں چائیں کہاں نہ جائیں۔ شام کے وقت ہوٹلز سے باہر نہ جائیں۔ زیادہ تر وارداتیں شہر کے مضافات میں

ہوا کرتی ہیں۔

گوئٹے مالاٹھی۔ حالانکہ پورا ملک بہت خوب صورت ہے۔ سیاحوں کے لیے قابل دید مقامات ہیں لیکن کیا کیا جائے اس شہر میں ہونے والے جرائم نے اس شہر کو غیر محفوظ

کر دیا ہے۔ سیاحوں سے کہا جاتا ہے کہ اگر آپ نے گوئٹے مالا کا پروگرام بنا ہی لیا ہے تو اس ملک کے کسی اور شہر چلے جائیں گوئٹے مالاٹھی نہ جائیں تو بہتر ہے۔

ریو ڈی جزو۔ برازیل کا خوب صورت شہر، حالانکہ یہ شہر سیاحوں کو بہت متاثر کرتا ہے۔ لاکھوں سیاح یہاں آتے

رہتے ہیں۔ اس کے باوجود اس شہر میں جرائم کی شرح اتنی زیادہ ہے کہ سیاحوں سے کہا جاتا ہے کہ آپ جاتے ہیں لیکن اپنے رسک پر جائیں۔

کیپ ٹاؤن۔ جنوبی افریقا کا مشہور شہر، ایک جدید شہر سیاحوں کی بھرمار رہتی ہے اس کے باوجود یہ ایک

مقام



خطرناک شہر ہے۔

Ciudad jaurez۔ میکسیکو کا شہر، یہ شہر لوٹ مار اور تشدد کے لیے بہت مشہور ہے۔ سیاحوں کو اغوا کر کے ان سے بھاری رقومات وصول کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی خطرناک گینگو ہیں جو شہر میں دندناتے پھرتے ہیں۔

صومالیہ کا شہر موغادیشو۔ القاعدہ نے یہاں قدم جما رکھے ہیں۔ اس شہر میں مختلف فرقوں کے درمیان گھسان کی جنگ چھڑی رہتی ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس میں بچوں کو بھی جنگ کے میدان میں گھسیٹ لیا گیا ہے۔ اس شہر سے یو این او اور اس قسم کی دیگر تنظیموں کے دفاتر ہٹا دیے گئے ہیں۔

یمن کا شہر صنعا بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ یہاں بھی القاعدہ کا اثر ہے۔ اس شہر میں بھی بم دھماکے عام ہیں۔ خود یہاں کے رہنے والے بھی شہر چھوڑ کر فرار ہو رہے ہیں۔

پاکستان کے شہر پشاور کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہاں ہونے والے آئے دن کے بم دھماکوں نے اس شہر کو غیر محفوظ کر دیا ہے۔ (پچھلے دنوں ہونے والے اسکول کے حادثے نے اس کی ساکھ اور خراب کر دی ہے)۔

نیروبی۔ ساحل جتنے اس شہر میں بھی موجود ہیں اور یہ شہر مسلسل ہنگاموں کی زد پر رہتا ہے۔

اب ذرا ان شہروں کی طرف آئیں جو سیاحوں کی جنت کہے جاتے ہیں۔ جی ہاں اس فہرست میں دنیا کے مشہور اور خوب صورت ترین شہر شامل ہیں۔

ان شہروں میں تشدد اور ہنگامے وغیرہ تو نہیں ہوتے لیکن یہاں ایک دوسری قسم کا خطرہ ہر دن رہنڈا تار ہوتا ہے اور وہ ہے جیب کتروں کا۔ بس نگاہ چلی اور سال دوسروں کا۔ دنیا کے انتہائی شاطر قسم کے جیب کتر ہے ان شہروں میں اپنے ہنر دکھاتے رہتے ہیں۔ سیاحوں کو بہت کچھ کی جاتی ہے کہ وہ ہوشیار رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ جب کوئی تاریخی عمارت دیکھ رہے ہوں تو اس دوران آپ خود تماشا بن کر رہ جائیں۔

آئیں ذرا ان شہروں کو بھی دیکھ لیں۔  
ایتھنز۔ دنیا بھر میں پیش بہا تاریخی اٹاٹر رکھنے والا واحد شہر۔ جس کے ہر کونچے میں تاریخ دکھائی دیتی ہے۔  
قدیم یونان اپنی پوری جلوہ گری اور شان کے ساتھ آپ کے سامنے آ جاتا ہے۔

## منفرد شہر و منفرد الفاظ

شہر ہتراز دی وزارت برٹش  
شو ہمرہ بلبل بلبل ہر مہوش  
فارسی کا یہ شعر، سلطان اشعرا حضرت امیر خسرو کا ہے اور اس شعر کی انفرادیت یہ ہے کہ اسے سیدھا پڑھیں یا الٹا۔ دونوں طرف سے وہی الفاظ بنتے ہیں۔ دونوں مصرعوں میں یہ خورنی ہے اور یہ کوئی عام بات نہیں اور ہر شاعر کے بس کی بھی بات نہیں ہے۔ ذیل میں اردو کے وہ الفاظ لکھے جا رہے ہیں جو سیدھے اور الٹے دونوں طرف سے یکساں لفظ بنتے ہوں۔

آبا۔ ادا۔ اڈا۔ آنا (اگر عدد کو شمار میں نہ لائیں تو یہ الفاظ بھی شمار کیے جاسکتے ہیں۔ آنا، آبا۔ آرا، آغا، آقا، آہا، آیا) باب، باب، باب، پاپ، پیپ، تخت، تخت، ناٹ، چھاچھ، درد، دیدہ، درد، ساس، داماد، کاک، کوک، کیک، کرک، کلک، کلک، گھاگھ، لال، لعل، لیل، مام، میم، موم، مادام، نان، نین، نون، ایشیا، شایاش، جج، جبت، ہم۔

مرسلہ: ششی محمد عزیز سے لندن

سیاح یہاں آتے ہیں اور تاریخ کو دیکھ کر بے خود ہو جاتے ہیں اور یہاں کے جیب کترے آپ کی اسی بے خودی کا فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ یہ جیب کترے ہر اس مقام پر ہوتے ہیں جہاں سیاحوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔ کندھے سے کندھا چھلتا ہے اور اسی دوران آپ کی جیب بھی چھل جاتی ہے۔

دیت نام کا ہنوتی۔ یہ شہر دیت نام کا تخیل بھی ہے اور ایشیا بھر میں جیب کتروں کی جنت بھی۔ اس شہر میں ہر وقت شور ہوتا رہتا ہے۔ ہزاروں ٹیکسیاں، گاڑیاں، رکشے، موٹر سائیکلیں۔ اس پر سے لوگوں کا بے تحاشا جھوم۔ ان لوگوں نے مل کر اس شہر کو جیب کتروں کے دھندے کے لیے بہت آسان بنا دیا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا سیاح ہو جو بے چارہ نہ بنے یا سپورٹ اور نقدی کی شکایت لے کر پولیس اسٹیشن نہ گیا ہو۔

بائینڈ کا شہر ایم۔ جی ہاں، ایک طرف تو یہ شہر سیاحوں کے لیے بہت دلکش رہتا ہے۔ یہاں کے خوب



صورت مگر جاگم اور پورے شہر کی مجموعی خوب صورتی آپ کو خوش آمدید کہنے کے لیے بے تاب رہتی ہے۔ وہیں دوسری طرف اس شہر کے شاطر چور بھی آپ کو وہیلم کہنے کے لیے بے چین ہیں۔ آپ ذرا ایک بار جا کر تو دیکھیں۔

فلورنس۔ آٹلی کا بے مثال شہر، جس نے پوری دنیا کو نہ جانے کتنے باکمال مصور، سنگ تراش اور شاعر دیتے ہیں۔ دوسری طرف یہی شہر آپ کو باکمال جیب کترے بھی دے رہا ہے، یہ اور بات ہے کہ بے چارے اتنے مشہور نہ ہوں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کام تو چل رہا ہے۔

پیوس آئرش۔ ساؤتھ امریکا کا سب سے دولت مند شہر اور یہی دولت لیروں اور جیب کتروں کو یہاں کھینچ لاتی ہے۔ اس شہر میں ٹھک بھی ہیں۔ گروہ کا کوئی آدمی آپ کو کسی بڑی مصیبت میں ڈال دیتا ہے۔ آپ تو سیاح ہیں۔ آپ کے ہاتھ پاؤں بھول جاتے ہیں۔ اسی وقت گروہ کا دوسرا آدمی آپ کا امداد۔ بن کر آپ کو اس پرانے سے نجات دلاتا ہے اور آپ بری طرح لٹ جاتے ہیں۔

پیرس۔ رنگوں، خوشبوؤں، بیار اور گیتوں کا سب سے دلکش شہر۔ یہ شہر اتنی دلچسپیاں رکھتا ہے کہ سیاح یہاں آ کر سحر زدہ ہو جاتے ہیں اور یہاں کے جیب کترے آپ کی اسی کیفیت کا فائدہ اٹھائیے ہیں۔ یہاں کی ٹرین اتنی بھری ہوئی ہوتی ہے اور لوگ اس طرح ایک دوسرے سے چپک کر کھڑے ہوتے ہیں کہ کچھ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ کس کا ہاتھ کس کی جیب میں ہے۔

میڈرڈ۔ اسپین کا شہر میڈرڈ، جو مل فائننگ کی وجہ سے دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔ خود اندازہ لگا لیں کہ جب اس شہر کو دیکھنے کے شوقین ایک دوسرے پر گر پڑ رہے ہیں تو ایسا کون سا بد قسمت جیب کترہ ہوگا جو اس موقع کو ہاتھ سے جانے دے گا۔ لہذا یہ شہر بھی جیب کتروں کی کمانی کا بہت بڑا مرکز ہے۔

روم۔ اب آجائیں روم کی طرف، کیا شہر ہے اور کیا تاریخ ہے اس کی اور کیسے جیب کترے ہیں جو اپنے ہنر میں مہارت رکھتے ہیں۔ آپ اپنی جیب کو کھینچتے رہ جاتے ہیں اور آپ کا اثاثہ ان کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

پراگو۔ یورپ کے خوب صورت ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اس شہر کا بد صورت پہلو اس کے جیب کترے ہیں۔

اسپین کے شہر بارسلونا کی بھی ایسی ہی شہرت ہے۔

ماہنامہ سرگزشت

ایسا نہیں ہے کہ سروے کرنے والوں نے دنیا کے صرف ان شہروں کا سروے کیا ہو جہاں جرائم ہیں۔ بد امنی ہے۔ لوٹ مار ہے بلکہ ان ملکوں کا بھی سروے کیا ہے جو دنیا کے محفوظ ترین اور امن پسند ممالک سمجھے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب پورا ملک ہی امن پسند ہوگا تو اس کے شہر بھی ایسے ہی ہوں گے۔ آئیں ان ممالک کی فہرست کا جائزہ لے لیں۔

ماریشس۔ افریقا کا ایک امن پسند ملک۔ جی پی آئی کی سروے رپورٹ کے مطابق یہ ملک اپنی ایک امن پسندانہ شہرت رکھتا ہے۔

گلوبل پیس انڈیکس (جی پی آئی) کے مطابق قطر مشرق وسطیٰ کا سب سے زیادہ امن پسند ملک ہے۔ یہاں تشدد کے واقعات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اسی طرح یہاں جرائم کی شرح بھی بہت کم ہے۔ یہ ملک اسی لیے بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔

برنگال۔ یورپ کا خوب صورت اور امن پسند پرسکون ملک ہے۔ یہاں بھی جرائم کی شرح کم ہے۔ اسی لیے سیاح یہاں جانا پسند کرتے ہیں۔

بھوٹان۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ دولت ہی سکون اور خوشی کی ضمانت ہو۔ بلکہ ذہنی اور روحانی سکون بھی خوشی دیتا ہے۔ بھوٹان انڈیا اور چین کے درمیان ہمالیہ کے دامن میں ایک چھوٹا سا ملک ہے اور یہاں سکون اور اطمینان کی شرح بہت زیادہ ہے۔

سنگاپور۔ سیاحوں کی جنت کے ساتھ ساتھ دنیا کے منظم ترین ملکوں کی فہرست میں اول نمبر پر ہے۔ ماحولیات، تعلیم اور صحت کی سہولیات کے ساتھ ساتھ یہ اتنا پرسکون ہے کہ آپ بے آسانی جاسکتے ہیں۔

آسٹریلیا۔ یہاں کیا نہیں ہے؟ خوب صورت شہر، ہرے بھرے میدان، آگکھوں کو موہ لینے والے مناظر، صاف شفاف ہوائیں۔ اسی لیے اس ملک میں اوسط عمر بہت زیادہ ہوتی ہے۔ تعلیم و ترقی کا ایک مضبوط سسٹم اور اس کے ساتھ جرائم کی شرح بہت کم اور جینے کو کیا چاہیے۔

جرمنی۔ دنیا کا ترقی یافتہ ترین ملک۔ بے مثال شہر، گڑیوں کے گھروں جیسے گھر، تعلیم اور صحت کے وسائل کی فراوانی ان سب کے ساتھ امن اور سکون جس نے جرمنی کو اسے محفوظ ترین ملک بنا دیا ہے۔ آپ وہاں چلے جائیں تو پھر یہ جانے کو دل چاہتا ہے۔



زیچ رپبلک۔ موسیقی کے رسا لوگ، پیار کرنے والے، مصوری پر جان دینے والے اور اس کے ساتھ بے انتہا پرامن نگ۔ اسی لیے اس کو دنیا کے پرسکون ملکوں میں شمار کیا گیا۔

سلووینیا۔ یورپ کا ایک خوب صورت ملک۔ زندگی یہاں بھی بہت آرام اور اطمینان سے گزر جاتی ہے اسی سے اندازہ کر لیں کہ یہاں کی جیلوں میں مشکل سے ہزار کے قریب قیدی ہوں گے۔

آئر لینڈ۔ ایک خوب صورت ملک، یہاں کے رہنے والوں کی جس مزاج بہت زیادہ ہے۔ یہاں آپ کو دنیا کے بہترین گولف کورس کے ساتھ لا جواب کھانے بھی ملیں گے اس کے ساتھ سکون بھی۔ جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک فلاحی ریاست ہے۔ تعلیم اور صحت کی سہولیات، بہترین حکومتی انتظامات، جس کی وجہ سے جیل میں آپ کو بہت کم لوگ ملیں گے۔ یہاں کا سلوک یہ ہے کہ آپ ملک کے جس حصے میں جائیں وہاں آپ کو سکون ملے گا۔

سینٹیم۔ کیا خوب صورتی ہے، کیا روایات ہیں، قدیم طرز تعمیر کے شہر، پل، اینٹوں سے بنی عمارتیں، اس کے عجائب گھر دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے پرسکون حالات۔ جرائم کی شرح بہت کم۔ آپ بے دھڑک نہیں بھی جاسکتے ہیں، رہ سکتے ہیں۔ اگر آپ بارشوں کا لطف لینے والوں میں سے ہیں تو یہ آپ کے لیے اور بھی زبردست ہے۔

اسکٹھ۔ نیوین ملکوں کا ایک اور ملک سوئیڈن۔ بلاشبہ ایک فلاحی ریاست، موسم سرما یہاں اپنے عروج پر اور بہت طویل ہوتا ہے۔ حکومت اپنی عوام کا بہت خیال رکھتی ہے کیوں کہ یہاں کا سسٹم ہی ایسا ہے۔

کینیڈا۔ دنیا کے بہت سے ملک ایسے بھی ہیں جہاں سالانہ اوسط آمدنی صرف پچاس یا ساٹھ ڈالر ہے۔ جب کہ کینیڈا کا اندازہ لگائیں یہاں کی آمدنی ہزار ڈالر کی ہے۔ آنکھوں کو موہ لینے والے مناظر اور میرٹ کی بنیاد پر ترقی کے مواقع دینے والا یہ ملک دنیا کے پرسکون ملکوں کی فہرست میں بہت بلند درجے پر ہے۔

فن لینڈ۔ اگر آپ طویل ترین موسم سرما سے پریشان نہیں ہوتے ہیں تو یہ ملک بے مثال ہے۔ دنیا کا بہترین تعلیمی نظام اس ملک میں قائم ہے۔

جاپان۔ اگر آپ جاپان جائیں تو آپ کو یہ فکر کرنے

کی ضرورت نہیں ہے کہ فلاں ہوٹل میں صفائی وغیرہ کا کیسا انتظام ہے۔ بلاشبہ پورا جاپان بے داغ ہے۔ اس کے علاوہ بلند معیار تعلیم، لوگوں کے رویے، لا جواب معاشی ترقی۔ ان سب کے ساتھ جرائم کی بہت کم شرح۔ ان سب نے مل کر اس ملک کو دیکھنے اور رہنے کے قابل بنا دیا ہے۔

سوئیٹزر لینڈ۔ قدرتی مناظر میں بے مثال، اس ملک کو دنیا کی جنت کہا جاتا ہے۔ تو کوئی نہ کوئی سبب تو ہوگا۔ صحت مند اور خوش باش لوگوں کا ملک۔ جہاں ہر طرح کی سہولیات حاصل ہیں۔ صحت، صفائی، تعلیم اور عدل کا نظام۔ اسی لیے یہاں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ معاشی لحاظ سے بہت مضبوط۔ اس ملک کا بینکنگ سسٹم سب سے زیادہ محفوظ ہے۔

آسٹریا۔ اس ملک میں صرف سولہ برس میں ووٹ دینے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن شراب نہیں خرید سکتے۔ جب تک عمر کے ایک خاص معیار تک نہ پہنچ جائیں۔ جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بہت خوب صورت مناظر سے بھرا ہوا ہے۔ ٹرانسپورٹ کا لا جواب نظام۔ یہ سب آپ کو اس ملک میں ملے گا۔

نوروی لینڈ۔ دنیا کے بہت کم آبادی والے ملکوں میں سے ایک۔ گردوغبار اور کثافت سے بہت حد تک محفوظ ملک یہاں بہت بڑی تعداد میں مہاجر آباد ہیں۔ اس کے باوجود یہ ایک انتہائی پرسکون ملک ہے۔ یہاں کے باشندے ایک پرامن زندگی گزار رہے ہیں۔

ڈنمارک۔ کہا جاتا ہے کہ اس ملک میں رہنے والے دنیا کے خوش قسمت ترین لوگوں میں سے ہیں۔ صاف ستھرا ماحول، زندگی کی بہترین سہولیات اور ایک فلاحی ریاست۔ وہ سب کچھ جس کی خواہش کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی حسین مناظر۔ سب کچھ اس ملک میں موجود ہے۔

آئس لینڈ۔ یہاں کے نظارے قدرت کے شاہکار ہیں۔ ایک تو یہ وجہ ہے اور دوسری بات یہاں کی پرسکون زندگی ہے۔ اسی لیے اس ملک کو دنیا کا سب سے پرسکون ملک کہا جاتا ہے۔ آبادی بہت کم لیکن شرح خواندگی سو فیصد یعنی سب کے سب پڑھے لکھے۔ اسی لیے جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔

یہ تھا ایک جائزہ دنیا کے ملکوں اور شہروں کا۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اپنے ملک کو کیسا دیکھنا یا بنانا چاہتے ہیں۔





## آہ علی سفیان آفاقی

علی سفیان آفاقی ایک نابذ روزگار شخصیت، سرگزشت کی جان سمجھے جانے والے 27 جنوری 2015ء کو ہم سب سے جدا ہو گئے۔ وہ 22 اگست 1933ء کو بھارتی صوبہ مدھیہ پردیش کے شہر بھوپال میں پیدا ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور آ گئے اور ماڈل ٹاؤن میں رہائش اختیار کی۔ (لیکن چھ سات سال قبل انہوں نے یہ مکان چھوڑ دیا اور دوسرے مکان میں آ گئے تھے) حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ جس مکان میں رہتے تھے اس کی سن تعمیر بھی 1933ء ہے۔ گویا اپنے ہم عمر مکان میں رہ رہے تھے۔ اس مکان کے سیدھے ہاتھ پر واقع ایک کمرے میں بیٹھ کر وہ لکھائی بڑھائی کرتے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصے تک ان کے قلم کی حکمرانی رہی۔ اسی کمرے میں بیٹھ کر انہوں نے بہت فلموں کی کہانیاں لکھیں، مقبول عام مضامین تصنیف ہوئیں۔ اسی کمرے میں بیٹھ کر معراج رسول صاحب کی فرمائش پر فلمی الف لیلہ شروع کی جو جلد ہی مقبولیت کے معراج پر نظر آنے لگی۔ اس لیے کہ پاکستانی فلموں کی تاریخ میں کسی ایسی شخصیت نے جو فلمی صنعت میں بھی مقام رکھتا ہو فلموں یا فلمی شخصیت پر یا خود اپنی روداد نہیں لکھی۔ فلمی الف لیلہ نہ صرف ان کی آپ بیتی تھی بلکہ جگہ بیتی بھی تھی۔ اسی میں ہائی ووڈ، بانی ووڈ اور لالی ووڈ کے بے شمار فلمی ادبی اور سیاسی شخصیات کی سرگزشت شامل ہوئی تھیں۔ ماہنامہ سرگزشت سے ان کا رشتہ 1990ء میں جڑا۔ ابتدا میں یہ طے پایا تھا کہ سفر نامہ وہ اپنے نام سے اور فلمی شخصیات کے قصے فرضی نام سے لکھیں گے۔ فرضی نام ”آشنا کے قلم سے“ تجویز ہوا۔ سرگزشت کا پہلا شمارہ دسمبر 1990ء میں آیا۔ اس میں انہوں نے اداکارہ رانی کی روداد کروادوں کے نام بدل کر لکھی۔ مثلاً رانی کا نام شہزادی رکھا لیکن بعد میں وہ ہر ایک کی روداد پر اصل نام دینے لگے۔ بنیادی طور پر وہ ایک شفیق ہستی تھے۔ نئے لکھنے والوں کو بھی یہ احساس نہیں ہونے دیتے کہ وہ ایک سینئر لکھاری ہیں جس کی وجہ سے نئے لکھنے والے کا قلم رواں ہو جاتا۔ وہ مذہبی سوچ کے حامل تھے۔ شیخ وقار غازی، محبت وطن پاکستانی تھے۔ گو کہ انہوں نے صحافتی کیریئر کا آغاز جماعت اسلامی کے پرچے ”ترجمان القرآن“ سے کیا تھا لیکن یہ دانشمندی بہت مختصر عرصے پر محیط رہی اور 1951ء میں وہ روزنامہ چٹان سے منسلک ہو گئے۔ یہاں وہ بھی کران کی تحریر میں بھی کبھی شورش کاٹھیری کی گرم لہر در آئی۔ آفاقی شورش کاٹھیری کے بارے میں انہوں نے سرگزشت میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ پھر وہ چٹان سے روزنامہ نوائے وقت میں آ گئے۔ حمید نظامی، مجید نظامی اور رمیز نظامی کے ساتھ کام کیا۔ مرحوم حمید نظامی کے چاہنے کے باوجود وہ نوائے وقت میں زیادہ عرصہ نہ رہ سکے اور روزنامہ آفاقی میں چلے گئے۔ روزنامہ آفاق اس زمانے کا پہلا اخبار تھا جس میں باقاعدہ فلمی سفر شروع کیا گیا تھا اور اس کی ابتدا انہوں نے ہی کی تھی۔ فلمی صنعت کی ادارت نے انہیں فلمی دنیا سے قریب کر دیا۔ فلمی دنیا کی چکا چوند انہیں اس وقت بھی بھارتی تھیں جب وہ کم سن تھے اور میرٹھ میں رہائش تھی۔ اسی وجہ سے وہ فلمی دنیا سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔

1957ء میں انہوں نے شباب کیرانوی کی شراکت میں فلم ”ٹھنڈی سڑک“ بنائی اور پہلی بار فلم کی کہانی، مکالمے اور اسکرین پلے لکھا۔ فلمی دنیا انہیں اتنی پسند آئی کہ 1958ء میں وہ کل وقتی طور پر فلم سے وابستہ ہو گئے اور فلم جنگی کا منظر نامہ لکھا۔ 1965ء میں فلم ٹھنڈی کی ابتداء کی اور فلم کثیر بنادی۔ اس فلم نے کئی ریکارڈ توڑ دیے۔ 1972ء میں فلم سازی کے ساتھ ہدایت کاری میں بھی اپنا ہنر دکھایا اور فلم آس بنائی۔ مزید کئی کامیاب فلمیں بنا کر پوری طرح ثابت کر دیا کہ نہ صرف وہ ایک بہترین لکھاری ہیں بلکہ کامیاب ہدایت کار بھی ہیں۔ اسی دوران میں انہوں نے ایک شام کا اخبار بھی نکالا۔ گو کہ ”نوروز“ نے صرف ایک سال کی عمر پائی مگر اس کے کئی ادارے ان میں لوگوں کو یاد ہیں۔ 1990ء میں وہ دوبارہ ادارہ نوائے وقت میں لوٹ آئے۔ اس بار انہوں نے نہایت روزہ فیلمی کی ادارت سنبھال لی تھی۔ سفر آخرت پر روانہ ہونے تک وہ اس پرچے کے مدیر رہے۔ الف لیلہ بھی 1990ء میں سرگزشت کے لیے لکھن شروع کی تھی جس کی آخری قسط اس ماہ شامل ہے۔ کہتے ہیں فلمی دنیا کو طے کی کوٹھری ہے۔ پھر بھی ان کے دامن پر کبھی کوئی داغ نہ لگا۔ کبھی کوئی اسٹیل بال ساٹھنے نہیں آیا۔ کیوں کہ انہیں ادب اور صحافت سے عشق تھا۔ فلم سازی، ہدایت کار اور کہانی نویسی پر نگار ایوارڈز، گریجویٹ ایوارڈز، فلم کریٹکس ایوارڈز، نگار ملتینیم ایوارڈز سمیت کئی قومی ایوارڈز بھی حاصل کیے۔ الف کیرنٹ فلم ایوارڈ کی جیوری کے رکن رہے۔ ایف ایف ایف ویسٹ انٹرنیشنل ٹیوٹ امریکا ہوائی کے رکن رہے۔ پاکستان فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے چیئرمین رہے۔ پاکستان فلم پروڈیوسر ایسوسی ایشن کے وائس چیئرمین رہے۔ پاکستان فلم جرنلس ایسوسی ایشن، پاکستان ڈائریکٹر ایسوسی ایشن اور لاہور پریس کلب کے حیات رکن رہے۔ اسی کی 30 کے قریب تصانیف ہیں۔ ایک ایسے ہمہ جہت شخص کو دینے کا غم ہم سب کے لیے ناقابل برداشت ہے مگر مشیت ایزدی سے شرم نہیں آئے۔ سب مل کر دعا کریں کہ دب انعت جملہ مسلمہ مرحومین کے ساتھ آفاقی صاحب کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔





قسط نمبر: 237

## قلمی اقلیت

علی نقی خان افغانی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتاں کی یاد  
تجائزوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!  
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول  
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے ناد ر روزگار حال حال ہیں شطرنج آہ ہیں جو نصف  
ہندی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل  
ہوں اور اپنے روزاؤل کی طرح تیار دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی  
پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی ٹھکن کا شکار نظر  
آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ  
ہیں وہ جس شخص سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی  
نشان اس کی پشمانی پر ثبت کر دیتے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے  
وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت  
سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید و شنید  
اور مہل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل  
رہنمائی ہے۔ آج بھی ہم ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور  
شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج  
خواب معلوم ہو جائے۔

ادب و صحافت کے علمی و نیا تک دراز ایک داستان و داستان سرگزشت



چوچھلے دنوں ہم کراچی گئے تو سڑکوں پر ایک نیا منظر  
دیکھا ایک ٹرک یا ٹرک نما گاڑی یا کرین نما چیز ایک کار کو  
ناک سے پکڑے کھینچنے لیے جارہی ہے اور وہ بے زبان  
خاموشی سے ”میں نے عہد ت“ کی چپ چاپ غلی جارہی  
ہے۔ پوچھنے سے پتا چلا کہ کراچی بھی اب ماشاء اللہ دنیا کے  
ترقی یافتہ اور ماڈرن شہروں میں شمار ہونے لگا ہے۔ کم از کم

جولائی 2015ء

113

ماہنامہ سرگزشت



اب لاہور اور دوسرے ماڈرن شہروں میں بھی یہی طریقہ رائج ہو چکا ہے، ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنے ملک میں ہر ماڈرن رواج پر بہت خوش ہوتے ہیں بلکہ فخر کرتے ہیں کہ ہمارے ملک میں خدا کے فضل سے جدید ترقی کا ایک اور نمونہ آگیا۔

مگر ہوا یہ کہ دوسرے ہی دن ہم کراچی کے ایک فیشن ایبل علاقے سے گزر رہے تھے کہ ہمیں ”مزمہ کار“ نظر آگئی جسے ایک ٹرک کے ساتھ آگئی زنجیروں سے باندھ دیا گیا تھا اور بے چاری کار خاصی بے آرام اور بیکل پوزیشن میں تھی۔ ہمارے سامنے ایک غیر ملکی بھی کھڑے دیکھ رہے تھے چند لمحے انہوں نے یہ منظر دیکھا اور پھر ہم سے انگریزی میں پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟ کوئی انگریزی فیشن وغیرہ کی ریہرسل ہو رہی ہے؟“

ہم نے ان کی لاعلمی پر حقارت سے انہیں گھورا اور کہا ”آپ نہیں جانتے؟ یہ کار ہے جسے Tow کر کے لے جایا جا رہا ہے۔“

”اس طرح؟ مگر کس جرم کی پاداش میں؟“ انہوں نے در یافت کیا۔

ہم حیران رہ گئے کہ کوئی انگریز اتنا بے خبر اور علم سے کور بھی ہو سکتا ہے۔ لہذا اپنی قابلیت بھانسنے کے لیے کہا۔ ”دیکھیے جب کوئی شخص غلط پارکنگ کرتا ہے تو محکمہ سڑک کے طور پر اس کی کار کو Tow کر کے لے جاتا ہے۔ یورپ، امریکا میں تو یہ بات عام ہے؟ کیا آپ بھی ان ملکوں میں نہیں رہے؟“

وہ مسکرائے اور بولے۔ ”میں پیدا ہی ملک کو میں ہوا تھا۔“

”اچھا۔“ ہم نے کہا۔ ”تو کیا وہاں کاروں کو Tow نہیں کیا جاتا؟“

”کیوں نہیں؟ مگر کوئی وجہ بھی تو ہو۔“

ہم سمجھ گئے کہ کسی انتہائی سڑیل اور جرح کرنے والے امریکی سے پالا پڑ گیا ہے۔ چنانچہ طرہ یہ انداز میں کہا۔ ”وجہ یہ کم ہے کہ اس نے ٹریفک رولز کی خلاف ورزی کی ہے؟“

”اچھا تمہارے ہاں ٹریفک رولز بھی ہوتے ہیں؟“

اس نے مصیبت سے سوال کیا۔ مارے غصے کے ہمارے کان لال ہو گئے۔ یہ کسی قسم کے امریکی سے واسطہ پڑ گیا؟ ہمارے ملک کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا؟ ہم ”جواب

ٹریفک کے محکمے نے یہ ضرور تہیہ کر لیا ہے کہ کراچی کو غلط پارکنگ کے جرائم کی حد تک یورپ اور امریکا کا ہم پلہ ضرور بنائیں گے۔ دوسرے ملکوں میں ہوتا یہ ہے کہ سڑکوں پر، بازاروں میں، شاہینگ سینٹرز پر، سینما گھروں کے سامنے، پارکوں میں۔ غرض یہ کہ ہر جگہ کاروں کو پارک کرنے کے لیے وسیع اور کشادہ جگہیں مخصوص ہوتی ہیں۔ مصروف اور گنجان آباد شہروں میں پارکنگ کے لیے زیر زمین جگہ حاصل کی جاتی ہے۔ کئی کئی منزلہ سر بہ فلک عمارتیں بھی کار پارکنگ کے لیے بنائی گئی ہیں۔ دفاتر میں یہ سہولت دفتر کی طرف سے مہیا کی جاتی ہے۔ عمارتوں میں رہنے والوں کے لیے عمارت کے مالک یہ آسانی فراہم کرتے ہیں۔

شاہینگ سینٹرز میں دکانوں والے اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ سڑکوں پر بلند یہ کی جانب سے نشانات لگائے گئے ہیں جن کے سوا کسی اور جگہ کار پارک نہیں کی جاسکتی۔ کاروں کو مناسب مقام پر کھڑا کرنے کے لیے پرائیویٹ پارکنگ ادارے بھی مصروف عمل ہیں۔ بڑے بڑے مصروف شہروں میں جا بجا پارکنگ کا بندوبست ہے جہاں فیس ادا کرنے کے بعد کوئی بھی اپنی کار کھڑی کر سکتا ہے۔ مصروف شاہراہوں پر تو سڑے سے پارکنگ کی اجازت ہی نہیں ہے لیکن دوسری سڑکوں پر بھی پارکنگ کے لیے مخصوص مقامات مقرر ہیں اور ان جگہوں پر مقررہ اوقات ہی میں کار کھڑی کی جاسکتی ہے۔ ورنہ ”ٹکٹ“ مل جاتا ہے۔ یعنی پولیس جرمانے کی پرچی کار پر لگا جاتی ہے جس کی ادائیگی ایک لاکھ امر ہے۔ کاروں کو باندھ کر اور تھپٹ کر لے جانے والی سزا شاذ و نادر ہی دی جاتی ہے اور وہ بھی ایسی صورت میں جب کہ بائیکل ممنوعہ علاقے میں آپ کار پارک کر دیں یا بعض مخصوص مقامات پر وقت مقررہ کے بعد کار پارک کر دیں۔ ان حالات میں ”جرم کار“ کو ایک سزا ست اور معقول شکل کی گاڑی نہایت احتیاط سے اٹھا کر اپنے ساتھ منسلک کر لیتی ہے اور کار کو اپنے ساتھ باندھ کر لے جاتی ہے۔ اس کو Tow کرنا کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ری وغیرہ سے باندھ کر کھینچا۔ کئی کوری سے باندھ کر کھینچنے کو بھی Tow کہتے ہیں۔

Tow کرنا ایسی سزا ہے جو کسی کار کو انتہائی ”جرم“ پر دی جاتی ہے لیکن ہم نے دیکھا کہ کراچی میں معمولی سے ”جرم“ میں ملوث کاریں بھی ٹرک کے ساتھ جھکڑی لگا کر لے جاتی جارہی تھیں۔ کراچی کی دیکھا دیکھی



جاہلاں باشندہ خوشی“ کے مطابق خاموش رہے اور آگے چل پڑے۔

وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اچانک بولا۔ ”پارکنگ کی جگہ کہاں ہے؟ مجھے تو کہیں نظر نہیں آتی۔ نہ کوئی پارکنگ لائٹ نظر آیا، نہ ہی سڑکوں پر پارکنگ میٹر ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ پارکنگ کے لیے جو نشانات ہوتے ہیں وہ بھی نہیں ہیں۔ تو پھر غلط پارکنگ کہاں ہوتی ہے۔“

اب ہم اس کی باتوں میں چھپا ہوا اظہار سمجھ چکے تھے اس لیے دوبارہ خاموشی اختیار کی۔ دراصل اب اس کے مزید سوالات کا جواب دینے کے لیے کم از کم ڈی آئی جی ٹریفک کے رینک کے کسی شخص کی ضرورت تھی جو فی الحال میسر نہیں آ سکتا تھا۔ شکاگو میں پیدا ہونے والا امریکی تو چلا گیا مگر ہمیں اس انجمن کا شکار کر گیا کہ واقعی جب پارکنگ کا مناسب بندوبست ہی نہیں نہیں ہے تو پھر غلط پارکنگ پر جرمانہ اور سزا کیسی؟ ابھی ہم یہ معاملہ نہیں کر پائے تھے کہ لاہور کے اخباروں میں ایک خبر نظر سے گزری جس میں بتایا گیا ہے کہ پنجاب کی صوبائی حکومت نے کمپیوٹر کے ذریعے ٹریفک چالانوں کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک ”ٹریفک ٹوکن فائن اسکیم“ کا منصوبہ بنایا ہے۔ یہ طریقہ دنیا کے جدید ترین شہروں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جب ”بھرم کار“ پر ٹوکن لگا یا جائے گا تو ہاتھ کے ہاتھ نقد جرمانہ بھی وصول کر لیا جائے گا۔ جرمانہ ادا نہ کرنے والوں کے کاغذات پولیس اپنے قبضے میں لے لی اور وہ دفتر جا کر جرمانہ ادا کرنے کے بعد ہی کاغذات واپس لے سکیں گے۔ گویا جرمانہ ادا کرنے والا تو کیا کام سے۔ جب تک وہ غریب دو چار دن دھکے نہیں کھائے گا کاغذات اس کے ہاتھ نہیں لگیں گے۔ واقعی اتنا جدید ترین اور ”ایڈوانسڈ ترین“ طریقہ بھلا دنیا کے کسی اور شہر میں کہاں ملے گا؟

اخبار میں ٹریفک کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے جرمانے کے ریٹ بھی لکھے ہوئے ہیں۔ یہ تو ابھی تاکہ جرمانہ آگے چل کر ان میں کتنا اضافہ ہوگا؟ یہ اندازہ آپ نے بخوبی لگا سکتے ہیں۔ فی الحال بھٹی کے طور پر ٹریفک لائسنس کی خلاف ورزی کرنے کا جرمانہ ڈیڑھ سو روپے ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہر قسم کی سواری کے لیے جرمانے کی رقم مختلف ہے۔ اسی طرح خلاف ورزیوں کی سنگینی کے مطابق جرمانے کے بھاد بھی چڑھے ہوئے ہیں۔

## فلسفہ

جب زندگی کو اپنے دل کے گیت سنائے کے لیے گائے والا نہیں ملتا تو وہ اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لیے فلسفی پیدا کر دیتی ہے۔ (ظلیل جبران)

فلسفہ کا مقصد زندگی کی تشریح کرنا نہیں بلکہ اسے بدلنا ہے۔ (رادھا کرشن)

تھوڑا سا فلسفہ انسان کو دہریت کی طرف لے جاتا ہے لیکن فلسفہ کی اتھاہ گہرائی اسے مذہب کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ (ہینکسن)

ہم ایسے فلسفی ہیں کہ ایک دوسرے کی ہر بادی ہی میں اپنی خوش حالی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ (لوئس بلاک)

مرسلہ: اولیں شیخ۔ نو بہ نیک سنگھ

یہ خبر پڑھ کر ہمیں یہ خیال آیا کہ ہماری ٹریفک پولیس آج تک لوگوں کو ٹریفک اصولوں کی الف۔ب تک تو سکھا نہیں سکی مگر جرمانے وصول کرنے کے لیے اس نے کمپیوٹر کی خدمات حاصل کر لیں۔ واقعی کیا مستعدی اور کارکردگی ہے کہ جو ٹریفک پولیس جنکی اور رکشا کے میٹر درست نہ کرا سکی۔ ٹریفک کی لائسنس درست نہیں رکھ سکی۔ سڑکوں پر ٹریفک کے رکنے کے لیے نشانات نہیں لگوا سکی۔ کاروں کو فٹ لائٹ سے بغیر چلانا نہ سکھا سکی۔ سائیکل، ٹائٹے اور ریڑھے میں ٹھنڈی بارن لائسنس، روشنی یہاں تک کہ رات کو چمکنے والی کوئی شے تک نہیں لگوا سکی۔ جو ٹریفک پولیس ون دے پر دو طرفہ چلنے والوں کی روک ٹوک نہ کر سکی۔ ویکوں اور بسوں کو مویشیوں کی طرح بھرنے سے نہیں روک سکی۔ قانون کی موجودگی کے باوجود ویکوں اور بسوں میں بے ہودہ ریکارڈنگ بند نہ کر سکی۔ انہیں سڑک پر جب اور جس جگہ چاہیں اچانک ایسا رو دے بغیر کھڑے ہو جانے سے نہیں روک سکی۔ غلطی دھواں پھرنے والی گاڑیوں کا زہر اور بغیر سائیکلسروں والی موٹر سائیکلوں اور کاروں کا شور کم نہ کر سکی۔ پیدل چلنے والوں کو سڑک چھوڑنے کا طریقہ اور بسوں، ٹرک اور موٹروں والوں کو پیدل چلنے والوں کے حقوق کا احساس نہ



دلا سکی۔ غرض یہ کہ ٹریفک کے ابتدائی اصول و ضوابط تک نافذ نہ کر سکی اگر وہ لوگوں سے جرمانے وصول کرنے کے لیے کمپیوٹر استعمال کرنے لگے تو پھر اسے انجم ہم سے چوہا مارنے کا تجربہ کرنے کے سوا اور کیا قرار دیا جاسکتا ہے۔

دراصل اگر آپ غور فرمائیں تو ہمارا چاہے کوئی حکمہ ہو اس کے طرز عمل اور کارکردگی کے بارے میں ایک قدر مشترک آپ کو نظر آئے گی اور وہ یہ ہے کہ عوام کو سزا نہیں دیتا۔ ان پر جرمانے کرتا۔ ان کے استعمال کی اشیا کی قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ کرتا۔ ان پر کسی نہ کسی بہانے ٹیکس عائد کرتا اور پھر لطف یہ کہ ان سب جرمانوں اور گرانٹوں کے باوجود عوام بے چاروں کی کسی سہولت، آسائش اور ضرورت کا مطلق خیال نہ کرتا۔ محض پولیس اور ٹریفک کے جھگمکے ہی تک محدود نہیں ہے۔ یہ انداز فکر ہر جگہ اور ہر جگہ میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اس پر طرہ و فتری کارروائیوں کی طوالت اور سرخ فیتے کی کارستانیوں جس کے سامنے خود پیرو کریش بھی مہربان نظر آتے ہیں۔ یعنی اگر آپ کسی بہت بڑے افسر سے شکایت کریں کہ دفتری کارروائی بہت طویل اور اذیت رساں ہے تو جواب میں وہ بھی بے بسی سے گاندھے اچکا کر کہیں گے۔ ”ارے صاحب! کیا کریں؟ سسٹم ہی ایسا ہے، دراصل یہ سارا دفتری نظام ہی تبدیل کرنے والا ہے، فی الحال تو یوں ہی کام چلے گا۔“ گویا وہ خود بھی اس کی خامیوں اور کوتاہیوں بلکہ ضرر رسانوں سے آگاہ ہیں۔ وہ واقعہ تو آپ نے ضرور سن رکھا ہو گا جب ہائی کورٹ کے ایک جج (انگریزی حکومت کے عہد میں) اپنے تمام جاہ و جلال اور اختیارات کے باوجود ایک پنواری سے ہار مان کر سرنیزر کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ انگریزی عہد کا واقعہ ہے آج کل کیا عالم ہو گا یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پرانہم یہ ہے کہ ہمارے بار باب انتظام آج تک یہ معمولی سی بنیادی حقیقت نہیں سمجھ سکے کہ سارے جھگمکے اور سارے حکومت کے نظام دراصل لوگوں کی خدمت، سہولت اور فائدے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ اس جھگمکے پر حکمہ جو قائم کیا جا رہا ہے اس کا مقصد محض کچھ لوگوں کو دھمکی اور باقی کو نوکریاں دینا نہیں ہے بلکہ یہ سب کچھ اس غرض کے لیے جا رہا ہے کہ لوگوں کے لیے زیادہ سہولت فراہم کی جائے۔

لیکن اگر عملی طور پر دیکھیے تو معاملہ بالکل برعکس ہے۔ جیتنے جگمکے، افسر اور دفتر بڑھ رہے ہیں اسی قدر لوگوں کی مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر نیا حکمہ اور ہر نیا افسران

کے لیے ایک نیا عذاب اور اذیت بن کر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ٹریفک پولیس ہی کو دیکھ لیجیے۔ آپ ساری دنیا میں پھرتے آئیے۔ اس قدر ناموس ٹریفک کا نظام کہیں نظر نہیں آئے گا۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ ہمارے شہروں میں تو شاید ٹریفک کا کوئی قانون سرے سے ہے ہی نہیں۔ تو پھر اتنے درجنوں ڈی آئی جی، ایس پی، ڈی ایس پی اور درجہ بدرجہ دوسرے افسر اور ہزاروں ٹریفک کے سپاہی آخر کس مرض کی دوا ہیں؟ بقول غالب

وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں  
یعنی ہماری ٹریفک پولیس ایک زمانے میں سہولتوں کی شکایت کیا کرتی تھی مگر اب دیکھیے تو قریب قریب تمام جدید ذرائع انہیں میسر ہیں۔ پیٹرول کاریں بھی ہیں۔ سائرن بجاتی ہوئی اور روشنیاں چمکاتی ہوئی غی کاریں بھی ہیں۔ خوب صورت وردیاں بھی ہیں اور امریکی طرز کی موٹر سائیکلیں بھی ہیں جو وائریس سے مزین ہیں۔ دفاتروں میں جا کر دیکھیے تو انٹرکٹڈیشن ہیں۔ افسروں کو دیکھیے تو مطمئن ہیں۔ سپاہیوں کو دیکھیے تو آسودہ حال ہیں۔ تو پھر ٹریفک کا یہ حال کیوں ہے اور بے چارے عوام بد حال بلکہ حال سے بے حال کیوں ہیں؟

☆.....☆

”ہماری ایک ہی زبان ہونی چاہیے۔ بس اس کے بغیر ہم ایک قوم نہیں بن سکتے۔“

ایک پڑھے لکھے پروفیسر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ایم مسعود کھد کھد پوش کو بہت حیرت ہوئی اور انہوں نے کہا۔ ”یہ آپ بہت فطرتاً بات کہہ رہے ہیں اگر ایسا ہی ہے تو ہم اقوام متحدہ کے رکن کیسے بن سکتے ہیں؟“ ایم مسعود صاحب کی اس حیرت پر ہمیں حیرت اس لیے ہو رہی ہے کہ اول تو اقوام متحدہ کا رکن بننے کے لیے کسی ملک یا قوم کی زبان ”مشروط“ نہیں ہے۔ دوسرے ایم مسعود صاحب شاید یہ بھول رہے تھے کہ جس وقت پاکستان اقوام متحدہ کا رکن بنا تھا اس وقت پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان ایک اور صرف ایک تھی کیوں کہ قیام پاکستان سے قبل ہی قائد اعظم نے اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان صرف اردو ہوگی۔ یہی زبان ہے جسے متحدہ ہندوستان کے ہندوؤں نے مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اچھوت اور نیچے قرار دے دیا تھا اور آج تک ان کی یہ نفرت قائم ہے۔ حالانکہ یہ وہ زبان ہے جس میں ہندی اور برصغیر کی مختلف





مسعود کھدر پوش

ہندی کی نہایت خبیث اور مشکل سنگرت آمیز شکل کو سارے ملک میں رائج کر دیا۔ جنوبی ہند میں احتجاجی مظاہرے ہوئے، توڑ پھوڑ بھی ہوئی مگر یہ ملک آج بھی قائم ہے اور ہندی سارے ملک کی واحد اور قومی زبان ہے۔ یہ مت بھولے کہ بھارت میں 22 سے زیادہ زبانیں موجود ہیں۔ ان میں بھارتی، مرہٹی، بنگالی، تیلگو، تامل اور گودکھی پنجابی جیسی انتہائی ترقی یافتہ زبانیں بھی موجود ہیں اور وسیع علاقوں میں بولی جاتی ہیں ان زبانوں کا لٹریچر انتہائی ترقی یافتہ اور علوم و فنون کے ذخیروں سے بالامال ہے۔ اس کے باوجود ہندی جیسی غیر معروف اور غیر ترقی یافتہ زبان کو بھارت کی قومی زبان کا درجہ دیا گیا آخر کیوں؟

ایم مسعود صاحب نے دنیا کے لگ بھگ ڈیڑھ سو سے زائد ملکوں کی فہرست میں سے چند ملکوں کے نام بھی گنوائے ہیں جہاں ایک سے زائد قومی زبانیں رائج ہیں مثلاً سوئٹزر لینڈ، کینیڈا، سری لنکا، افغانستان اور لبنان وغیرہ۔ میں تو لوگ اپنے موقف کی تائید میں قرآن حکیم اور احادیث سے بھی مطلب کی دلیلیں لے آتے ہیں لیکن اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو مذکورہ بالا مثالیں ایم مسعود صاحب کے موقف کو تقویت نہیں پہنچاتیں۔ اسے کمزور کرتی ہیں۔ سوئٹزر لینڈ کی مثال بھارت سے دانشور ہر سائنس کے ساتھ پیش کرتے ہیں مگر وہ یہ فراموش کر رہے ہیں کہ یہ ملک دنیا کا انوکھا اور

علاقائی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں لیکن ہندوؤں کو اس زبان سے اس لیے دشمنی تھی کہ  
1۔ یہ اس کماری سے کشمیر تک تمام مسلمان بولتے تھے۔

2۔ ہندی اور علاقائی زبانوں کی بھرمار کے باوجود اس میں مسلمانوں کی عربی اور فارسی زبان کی آمیزش تھی اور یہ اسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔

اور وہ کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ یہی وہ زبان ہے جس میں تحریک پاکستان کی جنگ لڑی گئی۔ کانگریس اور مہا سبھا کی اختلافات جو پاکستان کے شدید مخالف تھے وہ بھی پاکستان کی مخالفت کرنے کے لیے اسی ہندوستان گیر زبان کا سہارا لینے کے محتاج تھے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ زبان جس پر آج بھی بھارت میں مسلمانوں کی زبان کا ٹھپا لگا ہوا ہے اور اسی بت پر اس کو برادری سے خارج کر دیا گیا خود پاکستان میں اپنا مقام حاصل نہیں کر سکی۔

ایم مسعود صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک قوم ایک زبان کا ”گمراہ کن نظریہ“ مشرقی پاکستان پر مسلط کرنے کی کوشش کی۔ بنگالیوں نے اس کے خلاف مزاحمت کی اور بالآخر قوم کو 1971ء میں ایک قوم ایک زبان جیسے ”گمراہ کن نظریے“ کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ ایم مسعود صاحب کی اس منطق کی رد سے دیکھا جائے تو پھر سرے سے پاکستان ہی کو ”گمراہ کن نظریہ“ قرار دے دینے میں کیا قباحت ہے۔ پاکستان کا تو قیام ہی ایک قوم اور ایک زبان کے نام پر عمل میں آیا تھا۔ بنگالیوں نے ”ایک زبان“ کے ”گمراہ کن نظریے“ کے خلاف جنگ نہیں کی تھی۔ اس لیے کہ تحریک پاکستان کی جدوجہد میں وہ اسی نعرے کو اپنا کر پاکستان کی جنگ لڑ چکے تھے۔ جو قوم ملک کے ایک حصے کو ہٹوانے کے بعد بھی آج تک یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکی کہ ہم نے یہ بھاری قیمت کس وجہ سے اور کس کی وجہ سے ادا کی ہے۔ اس کے دانشوروں اور اہل سیاست کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی حماقت کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے؟ ہمارے ان دانشوروں کو شاید یاد نہیں کہ ہمسایہ ملک بھارت نے جب آزادی کی جنگ کا آغاز کیا تھا تو ہندو قوم کو کسی لیڈر نے یہ نہیں بتایا تھا کہ آزاد بھارت کی صرف ایک قومی اور سرکاری زبان ہوگی اور وہ ”ہندی“ ہوگی لیکن آزادی کے بعد بھارت کے رہنماؤں نے ایک شامی صوبے میں محدود پیمانے پر بولی جانے والی زبان کو قومی اور سرکاری زبان بنانے کا اعلان کر دیا اور



محیب ملک ہے۔ یہ فرانس، اٹلی اور جرمنی کی نسلوں پر مشتمل ہے۔ ان تین ممالک کے حصے کاٹ کر سوئٹزر لینڈ کا قیام عمل میں آیا ہے اور نسلی اور لسانی طور تینوں علیحدہ اور مختلف اقوام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے ہر قوم نے اپنی قومی زبان کو اپنانے پر اصرار کیا اور یہ تمام زبانیں سوئٹزر لینڈ کی قومی زبان میں قرار دے دی گئیں لیکن یہ بھی نہ بھولیں کہ ہر اعتبار سے سوئٹزر لینڈ دنیا کا انتہائی ترقی یافتہ ملک ہے۔ تعلیم اور تکنیکی علوم میں وہ پاکستان تو کیا دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ ملکوں سے بھی آگے ہے۔ لوگوں میں رواداری بھی ہے اور قوت برداشت بھی ہے۔ سوئٹزر لینڈ کے لوگوں میں جو شعور اور آگہی پائی جاتی ہے اس کا عشرِ شیر بھی ترقی پذیر ملکوں میں نہیں ہے۔ کوئی مثال پیش کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ وہاں کے حالات، تمدن، تہذیب، مزاج اور پس منظر کے ساتھ ساتھ قومی اور انفرادی شعور کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ یہ وہ ملک ہے جو انتہائی مختصر اور محدود ہونے کے باوجود دوسری عالمگیر جنگ کی آگ سے محفوظ رہا۔ اس چھوٹے سے ملک میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ اس نے اپنی غیر جانب دار حیثیت متحارب طاقتوں سے منوائی اور اس کا احترام کرایا۔ پاکستان کے مسائل کا تقابل اور موازنہ سوئٹزر لینڈ جیسے ملک سے کرنا انتہائی مستحکم فیصلہ ہے۔ کیا ایسے ملک سے ہم اپنے پسماندہ اور ہر اعتبار سے ترقی پذیر ملک کا موازنہ کر سکتے ہیں؟

دوسرا ملک کینیڈا ہے۔ امریکا کی طرح یہ بھی ایک نیا ملک ہے مگر ہوا یہ کہ جب گوری اقوام نے کینیڈا میں آباد ہونا شروع کیا تو آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ جو فرانس کے باشندوں پر مشتمل خاص طور پر کیوبیک میں آباد ہو گیا۔ فرانسیسی زبان اور پھر کے مواصلے میں انتہائی متعصب ہیں اور انگریزوں اور انگریزی سے انہیں خدا واسطے کا بھر ہے چنانچہ ان مخصوص حالات کے تحت انہوں نے فرانسیسی کو بھی قومی زبان بنانے پر اصرار کیا۔ خود ان کے صوبے کیوبیک سے انہوں نے انگریزی (اور انگریزوں کو) بھڑکایا جلا وطن کر دیا ہے۔ یہ وہ صوبہ ہے جو سو لہا سال سے فرانس سے الحاق کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اور صدرِ امریکا کے دورِ حکومت میں تو جب انہوں نے کیوبیک کا دورہ کیا تو کینیڈا نے رکھی طور پر بھی فرانس کی حکومت سے ان کی فرانس نواز سرگرمیوں پر احتجاج کیا تھا۔ گویا کینیڈا جیسے ترقی یافتہ اور ہاشور ملک میں بھی زبان اور پھر کے اس مسئلے نے ایک

مسلل آویزش اور کشمکش کی فضا پیدا کر رکھی ہے اور سیاسی مبصرین کا اندازہ ہے کہ زرد یا بدیر یہ صوبہ کینیڈا سے علیحدہ ہو جائے گا۔ یاد رہے کہ انگریزی اور فرانسیسی اس ملک کی علاقائی زبانیں نہیں ہیں۔ یہ دو علیحدہ اقوام کی زبانیں ہیں اور اس ملک میں دو مسلمہ مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ پاکستان کے حالات سے ان حالات کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔

اب سری لنکا کی بھی بن لیجیے۔ یہاں سنہالی اور تامل دو زبانیں قومی زبانیں ہیں۔ نسلی لسانی اور تمدنی اعتبار سے یہ دونوں یکسر مختلف اقوام ہیں اور ان کی باہمی آویزش اور کشیدگی گزشتہ دنوں جس انتہا کو پہنچ گئی تھی اس کا تماشا ساری دنیا دیکھ چکی ہے۔ یہ دو مختلف اقوام آج بھی برسرِ پیکار ہیں اور عام خیال یہی ہے کہ سری لنکا کے تامل اکثریت کے علاقے بھارت کے ساتھ الحاق کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ انہیں بھارتی حکومت اور رہنماؤں کی آشیرداد بھی حاصل ہے اس پس منظر میں سری لنکا کی مثال ہمارے لیے باعثِ عبرت ہے، تاکہ قاتلِ تقلید۔

اس کے بعد ذرا اسرائیل کی طرف نظر ڈالیں۔ یہ ملک دنیا بھر کی اقوام کا مغلوبہ ہے۔ یورپ اور ایشیا کے ہر ملک سے یہودی نقل و وطن کر کے اپنے نئے ملک میں آباد ہوئے ہیں۔ پاکستان کے بعد یہ دوسرا ملک ہے جو مذہب کے نام پر قائم ہوا ہے، جس ملک اور قوم کے لوگ اسرائیل بننے والے اپنی زبان اور پھر ساتھ لے کر گئے مگر اسرائیل نے اپنی قومی اور سرکاری زبان کے طور پر ”عبرانی“ کو منتخب کیا جو موجودہ عہد میں ایک ”مردہ“ زبان ہے۔ کتب خانوں اور مذہبی محیضوں کے سوا اس زبان کا نہیں وجود نہیں ہے۔ یہ انتہائی مشکل اور ناقابلِ فہم زبان ہے مگر اس کو اسرائیل بھی ترقی یافتہ اور جدید مملکت کی قومی اور سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔ اس کے باوجود اسرائیل گلے گلے نہیں ہوا۔ بلکہ اپنے ہمسایوں کے گلے گلے کر کے اپنی جغرافیائی سرحدیں بڑھا رہا ہے۔

افغانستان میں پشتو اور فارسی بولنے والوں کی آبادی ہے لیکن عملی طور پر (اور سرکاری طور پر بھی) فارسی زبان کو قومی زبان کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ حالانکہ پشتو بذاتِ خود ایک ترقی یافتہ زبان ہے اور آبادی کی بہت بڑی تعداد پشتو بولتی ہے۔ لبنان کی مثال بھی ایم مسعود صاحب نے پیش کی ہے مگر یہ فراموش کر بیٹھے کہ لبنان میں قومی زبانیں





ہوتا۔ انگلستان ہمارے دانشوروں کے لیے ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے مگر اسکاٹ لینڈ، آئر لینڈ اور ویلز کی زبانوں کی موجودگی میں وہاں انگریزی کو قومی زبان قرار دیا گیا اور آج بھی انگریزی ہی وہاں کی قومی اور سرکاری زبان ہے مگر اس کے باوجود یہ ملک آج بھی ”یونائیٹڈ کنگڈم“ ہے اور ایک زبان ٹھونسنے کے باوجود اس کے ٹکڑے نہیں ہوئے۔ نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور جنوبی افریقا میں یورپ کی تمام اقوام نے ڈیرہ جمایا مگر وہاں کی قومی زبان محض ایک ہے۔ انگریزی مگر کیا بات ہے کہ دوسری اقوام اور دوسری زبانیں بولنے والوں کو ان ملکوں میں احساس محرومی پیدا نہیں ہوا؟ سب سے زیادہ حیرت امریکا کے رہنے والوں پر ہے۔ ہسپانوی کو غیر رسمی طور پر امریکا کی دوسری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ جنوبی امریکا کی زبانیں بولنے والے بھی بہت بڑی تعداد میں یہاں آباد ہیں۔ وہ آج بھی اپنی زبان بولتے ہیں۔ اپنے پھر پر خر کرتے ہیں۔ اپنی رسوم پر کار بند ہیں۔ شادی بیاہ بھی اپنے آبائی ملکوں میں جا کر کرتے ہیں مگر قومی زبان کے طور پر انگریزی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ میں امریکا میں ایسے ہسپانوی اور اطالوی لوگوں سے بھی ملا ہوں جو بیس بائیس سال سے امریکی ہیں مگر انگریزی زبان سے بالکل ان کی نئی نسلیں انگریزی بولتی ہیں اور اپنے بزرگوں کے لیے ترجمے کے طور پر فرانسیسی ادا کرتی ہیں۔ اس میں منظر میں یہ دلیل کہ ان کی زبان ترک کر کے کسی اور مشترک زبان کو اپنانے کا مطالبہ کیا جائے زمین پر اتارنے کی ناکام کوشش کے مترادف ہے ”غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ ایک قومی زبان

ایک سے زائد ہیں مگر اقوام اور نسلیں بھی ایک سے زائد ہیں اور ان کے اختلافات اور تضادات جس انتہا کو پہنچ چکے ہیں ان کا ثبوت ساری دنیا کے سامنے ہے۔ یہ بد قسمت ملک آگ اور خون کے سمندر میں غرق ہے۔ حالانکہ بقول مسعود صاحب، یہاں کے داناؤں نے ایک قومی زبان رائج کرنے کی غلطی نہیں کی ہے۔ مسعود صاحب نے یہ دلیل دی ہے کہ محض جغرافیائی تقسیم کی بنا پر زبان مختلف نہیں ہو سکتی۔ مثلاً عرب ممالک کی سرحدیں علیحدہ ہیں مگر زبان ایک ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ عرب ممالک کی یہ تقسیم مصنوعی ہے جو سامراجی طاقتوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کی تھی ورنہ درحقیقت عرب ایک ہی قوم ہیں اس لیے ان کی زبان اور تہذیب بھی بنیادی طور پر ایک ہی تھی ہے۔

اب ذرا اس کے برعکس چہرے مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ امریکا کی نئی دنیا دریافت ہوئی تو یورپ اور دنیا کے گوشے گوشے سے لوگوں نے وہاں کا رخ کیا۔ ہسپانوی، اطالوی، فرانسیسی، جرمن، انگریز، ڈچ غرض یہ کہ ہر ملک کے لوگ وہاں آباد ہوئے۔ اس کے باوجود وہاں کی قومی زبان ایک ہے جب کہ تہذیبیں اور اقوام مختلف ہیں لیکن شاید اہم ترین نکتہ اور چارج واشٹن اسٹن بڑے دانشور نہیں تھے کہ مختلف قومی زبانیں اختیار کرنے کا فیصلہ کرتے۔ ہسپانوی دنیا کی عظیم ترین زبانوں میں سے ہے، اطالوی بھی ساری دنیا میں بولی اور بھی جاتی ہے۔ اس کے باوجود امریکا کی قومی زبان صرف ایک ہے یعنی انگریزی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید یہ ملک ریاست ہائے متحدہ نہ رہتا اور اس کا شیرازہ بکھر چکا



اختیار کرنے سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ علاقائی زبانوں کا وجود ختم کر دیا جائے۔ اس کے برعکس علاقائی زبانوں کی ترویج اور ترقی کے لیے موثر اور منظم کوشش کرنی چاہیے، جو لوگ یہ شکوہ کرتے ہیں کہ پاکستان میں علاقائی زبانوں کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک روا رکھا گیا ہے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ پاکستان میں تو حکمرانوں نے آج تک قومی اور سرکاری زبان اردو کے ساتھ بھی وہی بلکہ اس سے بدتر سلوک روا رکھا ہے۔ احساس محرومی کسی ایک زبان کو رائج کرنے کی وجہ سے نہیں پیدا ہوتا (جب کہ اس زبان کو باقاعدہ، باضابطہ اور موثر طور پر رائج بھی نہیں کیا گیا) یہ رہنماؤں کی سبے عملی، حکمرانوں کی سبے تدبیری اور دانشوروں کی خود غرضی کے سبب نشوونما پاتا ہے۔ ہاں جو لوگ پاکستان کو مختلف قوموں کا ملک سمجھتے اور قرار دیتے ہیں انہیں چاہیے کہ زبان اور تہذیب کے پردے میں اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ لوگ ماضی قریب میں تحریک پاکستان کے مقاصد کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ نہ یاد ہو مگر تاریخ کے صفحات میں ابھی یہ غریب و حسد کی نہیں ہوئی ہے کہ قیام پاکستان کے لیے دیل سی سی پیس کی کتنی تھی کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم دونوں آباد ہیں اور مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں جن کا مذہب، تہذیب، تمدن اور زبان ایک ہے۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی اکثریت نے اس مطالبے کی تائید کی تھی یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور پاکستان حاصل کر لیا، اگر یہ فلسفہ اور نظریہ درست نہیں تھا تو پھر مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پنجابی، بلوچی، سندھی اور پختون تو غیر منقسم ہندوستان میں بھی تھے۔ انگلستان میں قومی زبان اردو نہیں ہے اگر کوئی چوتھی یا پانچویں جماعت کا بچہ آپ سے غالب اور میر کے بارے میں گفتگو کرنے لگے تو آپ کیا سوچیں گے؟ غالب اردو ادب میں کلاسیکی حیثیت رکھتے ہیں مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے اسکولوں کے نصاب میں غالب کو پڑھانے پر وہ زور نہیں دیا جاتا جو شکسپیر کو پڑھانے پر دیا جاتا ہے۔ کولمبو میں ایک پانچویں جماعت کی بچی نے جھنجھلا کر اپنی ہوم ورک کی کاپی سے سرائیہ اور پوچھنے لگی۔

”انگل! کیا آپ کے ملک میں بھی شکسپیر ہوتا ہے؟“

غالباً مراد اس کی یہ تھی کہ کیا آپ کے ملک میں بھی

نصاب میں شکسپیر پڑھایا جاتا ہے؟ چنانچہ ہم نے فخریہ انداز میں کہا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ہمارے ہاں تو بچے شکسپیر کا نام جانتا ہے۔ دیکھو بیٹے، ولیم شکسپیر بہت بڑا ڈراما نگار تھا۔ اس کی عظمت میں تو کلام ہی نہیں ہے۔“

”واقعی آپ سچ کہتے ہیں۔ اگر اتنا بڑا ڈراما نگار نہ ہوتا تو ہماری چھٹی کلاس کے سکسٹھس میں نہ شامل ہوتا۔“ پھر ایک لمحہ اس نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”انگل آپ نے شکسپیر کو پڑھا ہے؟“

”بھئی جو شخص انگریزی پڑھتا ہے وہ شکسپیر کو ضرور پڑھتا ہے۔“

”تو پھر بتائیے! کیا وہ آپ کو اچھا لگتا تھا۔ آپ شوق سے اس کے ڈرامے پڑھا کرتے تھے؟“

یہ سوال ذرا ٹیڑھا تھا۔ سچ پوچھیے تو دل بہلاوے کی خاطر پڑھنے کی غرض سے ہمیں بھی شکسپیر اچھا نہیں لگا مگر اس کے بارے میں لکھوائے گئے نوٹس ہمیں بڑی پابندی اور دلجمعی سے یاد کرنے پڑتے تھے۔ بہر حال لڑکی کا دل بہلانے کے لیے ہم نے مختصر سا جواب دے دیا۔ ”ہاں! ہمیں اچھا لگتا تھا اور تمہیں؟“

چھوٹی لڑکی نے برا سا منہ بنایا۔ تاک سیکڑی اور شانے اچکا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ اس ایک واقعے نے ہمیں شکسپیر کے بارے میں بدگمانی میں مبتلا کر دیا۔ آخر شکسپیر میں وہ کیا خاص بات ہے کہ ہم تیسری دنیا کے ایشیائی ملکوں میں شکسپیر کو گھوٹ کر ملا دیا جاتا ہے مگر کیا اس سے کوئی فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے؟ شکسپیر کے ڈرامے، شکسپیر کے کردار، شکسپیر کی تریجیڈیز، یہ سب آگے چل کر ہماری روزمرہ کی زندگی پر کیا اثر ڈالتی ہیں؟

ہم والپس لا ہو ر آئے تو ہماری بیٹی ساتویں جماعت کا کورس لیے بیٹھی تھی اور سامنے پیلیے ہوئے کاغذات کو دیکھ دیکھ کر برسے برسے منہ بنارہی تھی۔

”کیا کوئی سوال سمجھ میں نہیں آتا؟“ ہم نے اخلاقی ہمدردی کے خیال سے پوچھا۔

”نہیں بابا! وہ بیزاری سے بولی۔“ ہم شکسپیر کے بارے میں نوٹس یاد کر رہے ہیں۔

”کیجیے پھر وہی شکسپیر یہاں بھی آگیا۔ تیسری دنیا کے وہ تلامذہ ملک جہاں انگریزوں کا رائج رہا ہے وہاں آج بھی شکسپیر کا نام کاغذ کاغذ رہا ہے۔ ان میں خواہ پاکستان ہو،



”پاپا ناراض نہ ہوں۔ چند بچہ رز کے سوا اسے کوئی نہیں سمجھتا۔ پھر بھی اس کا کیا بگڑتا ہے، وہ ہر کورس کی کتاب میں موجود ہے۔“

”یہی اس کی بڑائی کی دلیل ہے۔“ ہم نے کہا۔ ”یہ بتاؤ تمہیں شیکسپیر کے بارے میں کیا نوٹس لکھوائے گئے ہیں۔“

”شیکسپیر کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے۔ ابھی تو مس ہمیں اس زمانے کے انگلستان کے بارے میں نوٹس لکھوا رہی ہیں جن دنوں شیکسپیر لکھا کرتا تھا۔ اس زمانے کے طور طریقے، لباس، رہن سہن، انگریزوں کی عادتیں اور خصلتیں۔ پاپا کیا ایک شیکسپیر کو پڑھنے کے لیے سادہ انگلش ہسٹری پڑھنی ضروری ہے؟“

ہمارے ماہرین تعلیم تو خیر بھی ان مسائل پر کیا سوچتے ہوں گے مگر بچے اور ان کے والدین یقیناً اس بات پر غور کرنے پر مجبور ہیں کہ اسکول کی چھوٹی جماعتوں سے لے کر یونیورسٹی کی اونچی کلاس تک ہمارے ہاں نصاب کے ذریعے شیکسپیر محول کر طلبہ کو پلایا جاتا ہے۔ اس کی عظمت ان کے ذہنوں پر بٹھائی جاتی ہے تو آخر عملی زندگی میں انہیں اس سے حاصل کیا ہوتا ہے؟ صرف شیکسپیر ہی نہیں۔ دوسرے انگریزی کے کھنے والوں کے بارے میں ہماری نسل جو کچھ سمجھتی اور پڑھتی ہے۔ اسکول اور کالج سے باہر نکلتے ہی اسے فراموش کر دیتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں روزمرہ کی زندگی میں ان کے لیے بے کار ہیں۔ سیزر، ہیلٹھ، میکھ، ایئر ان سب کا تعلق کے پاکستانی نوجوان کی زندگی سے کیا تعلق اور واسطہ ہے لوہا ان کو پڑھ کر ہماری نئی نسل آخر کیا

بھارت ہو، سری لنکا ہو یا بنگلہ دیش۔ ہر ملک کے طالب علموں کو ابتدائی کلاسوں ہی سے شیکسپیر رٹانا شروع کر دیا جاتا ہے پھر آگے چل کر وہ دور آتا ہے جب انہیں اسٹیج پر شیکسپیر کے ڈرامے قدیم زمانے کے فرسودہ لباس پہن کر قدیم انداز کے لب و لہجہ میں انگریزی بول کر پیش کرنے پڑتے ہیں۔ یہ ڈرامے محض برائے ڈراما ہوتے ہیں۔ نہ ان میں کام کرنے والے ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور نہ دیکھنے والے۔ ہاں ان معدودے چند ”ڈانشوروں“ کی بات

اور ہے جو شیکسپیر کا نام سنتے ہی آنکھیں موند کر کسی ماورائی دنیا میں چلے جاتے ہیں۔

میں نے کچھ معلومات اپنی بچی سے حاصل کرنی چاہئیں۔ ”یہ بتاؤ۔ شیکسپیر تمہیں کیسا لگتا ہے؟“

اس نے خاموشی سے شانے پلا دیے۔

”تم نے پہلی بار شیکسپیر کب پڑھا تھا؟“

جواب ملا۔ ”پانچویں جماعت میں شیکسپیر کی تین کہانیاں ہمارے کورس میں شامل تھیں۔“

”وہ کہانیاں تمہیں اچھی لگی تھیں؟“

”بالکل نہیں۔“ پھر اس نے مزید معلومات فراہم

کیں۔ ”پاپا شیکسپیر کے ڈرامے اور ٹریجڈیز کے بارے میں ہمیں اتنا کچھ بتایا جاتا ہے مگر ہمارے دل پر ان کا کوئی اثر

نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے تو اس زمانے کے رسم و رواج اور آداب بتائے جاتے ہیں۔ ہمیں ان سے کیا واسطہ؟ پھر وہ

زبان پڑھائی جاتی ہے جو اب دنیا میں کسی نہیں بولی جاتی۔

خود شیکسپیر بھی آج زندہ ہوتا تو یہ زبان استعمال نہ کرتا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ شیکسپیر تو انسانی جذبات کا نقشہ

پیش کرتا ہے۔ انسانیت کا چہرہ ہے اس کی ٹریجڈیز۔“

”ٹریجڈیز؟“ وہ بات کاٹ کر بولی۔ ”کونکے لیے؟“

بھی کوئی ٹریجڈی ہے۔ ہمیں تو اس پر ذرا بھی روتا نہیں آج اور پاپا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ لوگوں کو مار مار کر ٹریجڈی پیدا

کرو۔ ہمیں تو ان کہانیوں پر ہنسی آتی ہے نہ روتا۔“

”افسوس خیالات کا اظہار مست کرد۔ جانتی ہو کہ شیکسپیر اپنی دنیا تک باقی رہنے والی شخصیت ہے۔ تمہارے

ذہن سے اس کا کیا بگڑ سکتا ہے؟“



کی حرارت سے خالی۔ الہیہ ٹیکنیکی خوبیاں آپ ان میں چاہے جتنی تلاش کر لیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ شیکسپیر کا ڈراما دیکھنے کے لیے بمشکل ایک سو آدمی آتے ہیں اور وہ بھی ڈرامے کے دوران میں جھانپاں لیتے رہتے ہیں مگر ڈرامے کے اختتام پر بڑے زور و شور سے اس کے فنی پہلوؤں پر بات چیت کرتے ہیں۔

ایک دانشور نے یہ سوال بر محل اٹھایا ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم انگریزی زبان کے گڑے نردوں کو اکھاڑ کر اپنے نونہالوں کے ذہنوں میں دفن کر دیں جب کہ اس سے انہیں حاصل کچھ نہ ہوگا۔ انگریزوں نے اپنے دور اقتدار میں اپنی ہر چیز کی طرح اپنے ادب کو بھی عالمگیر بنادیا تھا مگر آپ دیکھیں گے کہ دقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بیشتر مصنف اور تصنیفات محض لائبریریوں کی زینت بن کر رہ جائیں گی۔ زندگی بہت تیزی سے رواں دواں ہے۔ 1884ء کے چارلس ڈکنس سے آج کے پاکستانی بچے کو بھلا کیا واسطہ ہو سکتا ہے؟

Great Expectations تو شاید وہ

ہضم کر لے مگر پک دک بچہ ذرا اس کے حلق سے کیونکر اتریں گے مگر اصرار یہ ہے کہ یہ کلاسیک ادب ہے جو لوگ محض تفریح یا دل بستگی کے لیے پڑھتے ہیں ان کے نزدیک مذکورہ مصنف قصہ پارینہ بن چکے ہیں مگر ہمارے نصاب کی کتابوں میں آج بھی بچے ان کو پڑھنے پر مجبور ہیں مگر کیا یہ جائز ہے؟

☆.....☆

زمانہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ آج کے نوجوان کل کے جوان اور مجر بہ کار بوڑھے کہلاتے ہیں۔ آج بھی جب میں اخبارات میں بعض صحافیوں اور سیاستدانوں کے لیے بزرگ سیاستدان یا بزرگ صحافی کے خطابات پڑھتا ہوں تو ہنستا ہوں۔ ان لوگوں پر نہیں بلکہ زمانے کی نیرنگی پر یہ ہمارے معصر ہیں۔ ان میں سے کچھ ہمارے سینئر ہیں مگر جب ہم نے انہیں پہلے پہل دیکھا تو یہ نوجوان تھے۔ کامیابیوں کے دروازے کھٹکھٹا رہے تھے، ہر شعبے میں بے شمار نواآموز اور ناک تجربہ کار داخلے کی راہیں تلاش کر رہے تھے مگر دقت کے ساتھ ساتھ اب وہ ادھیڑ عمر یا بوڑھے ہو چکے ہیں۔ آج کی نسل کے لیے وہ بزرگ ہیں مگر اپنے ہمعصروں کے نزدیک ان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مثلاً جب میں اپنے صحافی اور اہل قلم دوستوں کو دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ بات بات پر ان کے ذہن داری کا مظاہرہ کرنے والا کبیرہ دانش

حاصل کر سکتی ہے؟ حالت یہ ہے کہ اسکول اور کالجوں میں شیکسپیر گھوٹ گھوٹ کر پلایا جاتا ہے اس کی تحریروں کے اعلیٰ نکات سمجھائے جاتے ہیں مگر ذرا ایمان سے سوچے کہ کتنے لوگ ہیں جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد وقت گزاری یا محض دلچسپی کے لیے بھی شیکسپیر کو پڑھتے ہیں؟ انگریزی کے سب سے بڑے مقبول مصنف ہیں جنہیں انگریزی داں دلچسپی سے پڑھتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان میں ردمانک راسٹر بھی ہیں اور جرائم کی کہانیاں لکھنے والے بھی لیکن جیمز ہیڈلے چیز کو جس بڑے پلانے پر اور جس قدر دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ کیا شیکسپیر کے بارے میں بھی یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ شیکسپیر کو زبردستی اعصاب اور دماغ پر نازل کیا جاتا ہے اور وقت گزرنے کے بعد یہ نقش بالکل معدوم ہو جاتا ہے۔

شیکسپیر کے بارے میں گزشتہ سالوں میں تحقیقات کے بعد بہت سے انکشافات بھی کیے گئے۔ اکثر دوسرے مصنفین کے ڈراموں سے اس کا موضوع ٹکراتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شیکسپیر نے اپنے تمام ڈراموں کے لیے خیالات دوسری جگہوں سے مستعار لیے تھے بلکہ ایک محقق نے تو یہ بھی ثابت کر دیا کہ شیکسپیر نامی کسی شخصیت کا وجود نہیں تھا۔ یہ محض ایک قلمی نام ہے اس کے باوجود انگریز نہ تو خود اپنے ذہنوں سے شیکسپیر کی عظمت کا خول اتارنا چاہتے ہیں اور نہ ہم ایشیائیوں کے ماہرین تعلیم شیکسپیر کا بچھا چھوڑنے کے لیے تیار ہیں۔

بعض رستار کہتے ہیں کہ شیکسپیر کے ڈرامے محض پڑھنے کے لیے تیار رکھتے ہیں جب کہ دوسرے کہتے ہیں کہ شیکسپیر کا ڈراما آج کے بحر طاری کر دیتا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ ہم نے خود لکھنا نہیں بھی شیکسپیر کے ڈرامے دیکھے ہیں۔ تماشائی منہ کھولے اور آئیں پھاڑے مرعوب بیٹھے دیکھتے رہے۔ قسم لے لو جو کسی نے نا انجی Injoy کیا ہو۔ ہمارے ملکوں میں بھی شیکسپیر کے ڈرامے دیکھنے والوں کی تعداد ملتی بھر ہے۔ ان میں سے بھی اکثریت خاموش رہتی جی دیکھتی رہتی ہے۔ ڈراما دیکھنے کا یہ انداز تو نہیں ہوگا لیکن وجہ یہ ہے کہ کیوں کہ بچپن ہی سے ہمیں شیکسپیر کی عظمت اور خوبیاں زبانی یاد کرا دی جاتی ہیں اس لیے کسی میں یہ اخلاقی جرأت نہیں کہ اظہار ناپسندیدگی کر سکے۔ ڈراما دراصل جیتے جاگتے کرداروں کا مظہر ہونا چاہیے۔ ناکہ ہزاروں سال پرانی تہذیب کا نوحد معلوم ہو۔ کردار بے جان، الفاظ زندگی





سابق صدر پرویز مشرف اور فضل محمود

کچھ کلنڈر انوجوان ایک دن پنجابی اور اردو شاعری کا بزرگ ستون بن جائے گا۔ میری مراد شیر نیاڑی سے ہے۔ ابھی نکل ہی کی بات ہے کہ شیر نیاڑی کبھی سعادت حسن منٹو، کبھی ابراہیم جلیس، کبھی شاد امرتسری اور نصیر انور کے ساتھ آفاق کے دفتر میں آکر گھنٹوں چائے پیتا اور لپٹے سناٹا تھا مگر اب وہ جہاں ویدہ اور قاضی احرام بزرگ شاعر ہے۔ انتظار حسین کو دیکھ لیجئے لڑکے سے لگتے تھے۔ آفاق میں میرے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ ان کی ادبی عظمت کو کبھی ان کے سامنے ہم نے تسلیم کر کے نہیں دیا۔ کبھی ان کے محاوروں کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ کبھی الزام ہے کہ انتظار صاحب تو نکالی زبان نہیں بلکہ پاپوڑا اور خولہ کی مقامی زبان لکھتے ہیں۔ جنہیں اہل پنجاب مرحوب ہو کر ”شستہ اردو“ سمجھ لیتے ہیں۔



مجید نظامی

انتظار حسین بڑے مرتجا مرچ نوجوان تھے۔ ہاں ادبی بحث شروع ہو جائے تو ان کے گلے میں نہ جانے کہاں سے لاڈل ڈاؤن میکر فٹ ہو جاتا ہے۔ ورنہ بہت دھیمی آواز میں بولنے والے نرم لب مسکرانے والے۔ اپنی زبان کی غلطیوں کی نشاندہی پر بھی مسکرا کر محض یہ کہہ کر رہ جاتے تم کیا جانو زبان کی موتی ہے؟ ”اب وہ ثقہ ادبی شخصیت ہیں، بزرگ ادیب۔“ صاحبوں میں بہت سے صحافی جو آج اخبارات کے صفحات پر دم مار رہے ہیں اس وقت مصافحت میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے۔ بہت سے صحافت کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں ہمارے ساتھ کام کرنے والے حبیب اللہ اوج، جمیل الزماں، عبدالسلام خورشید، ظہور عالم شہید، خالد لطیف، زاہد چودھری، سردار فضل، ہدایت اللہ آضر، بشیر احمد، ارشد ابو صالح، اصلاحی (مرحوم)، میاں محمد شفیع، ممتاز احمد خاں، امجد حسین، احمد بشیر، ظہیر باہر، خورشید الاسلام، حمید ہاشمی مرحوم، عبد اللہ ملک، افتخار احمد وغیرہ تھے۔ آج ان میں کتنے ہی فوت ہو گئے

ہیں۔ باقی ماندہ ”بزرگ صحافی“ بن گئے ہیں۔ آج کے ضیاء الاسلام انصاری، عبد القادر حسن وغیرہ ہمارے کچھ بعد وارد ہوئے اور ان کے بعد آنے والے تو اور بھی نوجوان ہیں۔ مجید نظامی نواسے وقت کے مدبر اور متین اینڈیٹر ہیں۔ میں نواسے وقت میں تھا تو مجید نظامی ابھی اخبار سے وابستہ بھی نہیں ہوئے تھے بعد میں ایک صحافی وفد سندھ ثنائی علاقوں کے دورے پر گیا تھا مجید نظامی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ آج کے زرعی کالم لکھنے والے سیالانی ان دنوں جونیئر انفارمیشن آفیسر تھے۔ مجید صاحب شروع سے ہی کم گو ہیں مگر اب تو غالباً ”سکٹرین گو“ ہو گئے ہیں مگر مجھے جب ان کا خیال آتا ہے وہی مسکراتی ہوئی تصویر نگاہوں میں ابھرتی ہے جو سات آٹھ دن کی مصروفی کے دوران میرے ذہن پر نقش ہو گئی۔ ذکی الدین ہال نواسے وقت میں رپورٹر تھے اور قانون کے طالب علم بھی، بہت درد مند اور ذمے دار نوجوان تھے۔ ایک بار رات کو ڈیوٹی سرانجام دیتے ہوئے میں نے ایک کامن پن نگل لی۔ یار لوگوں نے بہت التالٹکا کر دیا یا جھکے دیے مگر پن نہ نکلی۔ ایک کا تب نے بتایا کہ یہ تو خون کی رگ میں جا کر خون میں شامل ہو جائے گی اور کسی بھی جگہ انک کر مصیبت ڈال دے گی۔ یہ خبر سن کر میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھ سے زیادہ ہوش ظہور عالم شہید کے اڑسے جو نیوز اینڈیٹر انچارج تھے۔ فوراً تاکہ لایا گیا اور ذکی الدین ہال کی سرجری میں چند لوگ ہمیں بے ہوشی کے عالم میں لے کر میو اسپتال گئے۔ وہاں دور واز تک کیا ہوا یہ ایک الگ کہانی ہے مگر میں قلم کے بارے بار بار ہوش میں آتا اور بار بار بے ہوش ہوتا۔ جب ہوش میں آتا تو ذکی الدین ہال میرے پاس بیٹھے نظر آتے۔ ان دنوں ڈاکٹر عالم نے اسکریے لے لیا



اور کہا کہ پن جسم میں موجود نہیں ہے مگر میں اپنے گلے دل، جگر اور نہ جانے جسم کے کن کن حصوں میں سوئی کی خیالی چھین محسوس کرتا اور شور مچاتا کہ نہیں پن ابھی جسم میں موجود ہے۔ اسپتال سے واپس آنے کے دو دن بعد ایک روز کھانا کھا رہا تھا کہ نواسے میں کوئی چیز جھبی دیکھا تو ایک رنگ آلود پن تھی۔ یہ معنا آج تک حل نہیں ہوا کہ یہ پن وہی تھی جو میں نے نگلی تھی؟ اور اگر وہی تھی تو اتنے دن تک کہاں غائب رہی۔ بہر حال یہ واقعہ بعد میں لطیفہ بن گیا اور ضرب الشل کے طور پر نواسے وقت میں کام کرنے والے ہر نووارد سب ایڈیٹر کو سنایا جاتا رہا۔

ذکی الدین پال نے بعد میں زور شور سے وکالت کی اور اس کے بعد اس سے بھی زیادہ زور شور سے پنجاب ہائی کورٹ کے جج رہے اس عرصے میں ایک بار بھی میری ان سے ملاقات نہ ہوئی۔ ایک بار میں اپنی شادی کے بعد مری گیا تو ایک ہونٹ میں دور سے ذکی الدین پال صاحب نظر آئے۔ میں نے اپنی بیوی کو بتایا کہ جج صاحب ہمارے بے تکلف ساتھی تھے تو جج صاحب کی سنجیدگی اور متانت دیکھ کر اسے یقین نہ آیا۔ ذکی صاحب دور چند لوگوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ میں نے اس وقت ملاقات کو نامناسب سمجھا مگر آج تک کوئی موقع قیمت نہ ملا کہ ذکی صاحب سے ملاقات ہوتی۔

☆.....☆

فضل محمود کا ایک ریکارڈ عمران خان نے توڑ دیا تھا۔ آج کی نسلی کے لیے عمران خان ہی آئیڈل ہے اور سچ بھی یہ ہے کہ عمران خان نے پاکستان میں کرکٹ کو ایک رومانٹک ایجنڈے میں بہت مدد کی ہے۔ قیامت کے باؤلر اور آفٹ سے بھرے ہوئے بینسمین تھے مگر میرے دھیان کی گلیوں میں فضل محمود گھوم رہے ہیں۔ عمران تو اگلی نسل ہیں۔ نسل اسی وقت اچھی ہوتی ہے جب پچھلے اہل خاندان کا تجربہ اور کارنامے یاد ہوں۔ فضل محمود اور عتیق محمد کا عروج ہماری آنکھوں دیکھتے ہوا یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں مگر مگر کرکٹ کو پہچانے میں ان دونوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یوں تو کاردار بھی تھے امتیاز، وقار، نذر محمد، خان محمد، محمود حسین، صادق بھی تھے گویا ایک لمبی قطار ہے۔ جنہوں نے کرکٹ کو نام عروج تک پہنچانے کے لیے خدمات سرانجام دیں مگر مگر مگر اس کھیل کو مقبول کرنے کا سہرا فضل محمود اور حنیف محمد کے سر ہے۔ جسے دیکھیے فضل یا حنیف بننے کی کوشش کر رہا

ہے۔ ضرب الشل کے طور پر اب یہ فقرہ متروک ہو گیا تھا کہ ”تم کون سے بریل میں یا طر ہو۔“ اس کی جگہ عام ہو گیا تھا۔ ”کیا اپنے آپ کو حنیف اور فضل سمجھتے ہو؟“

حنیف پر فضل کو جو فوقیت حاصل تھی۔ وہ ان کی شخصیت تھی، ایسا بانٹا بھلا گورا، سرخ و سفید رنگت اور دلکش نقش کا مالک، نئی آنکھیں، شرعی بال، قد و قامت مثالی اس پر گفتار الکی نہیں تھی اور بے تکلف۔ اگر یہی شخص ”اوول“ کا ہیرو بھی ہو تو مجھے کہ قیامت آگئی۔ فلمی اداکاروں پر وہ انجم اور پروانہ وار پورش نہیں دیکھی جو فضل محمود کے مقدر میں تھی۔ ہندوستان کے دورے پر گئے تو کروڑوں دلوں کو دھڑکنا چھوڑ آئے۔ انگلستان گئے تو حسینان فرنگ کو لوٹ لیا۔ ”اوول“ کی فتح کے بعد جب ایک شام پاکستانی پولیس کی وردی میں ملیں ایک اسمارٹ اور خوش روٹو جوان لندن کے ایک سینما میں داخل ہوا تو چاروں طرف تہلکہ مچ گیا۔ ”فضل..... فضل“ انگریز قوم جو بہت منظم اور مہذب ہے (اور اس زمانے میں واقعی ہوا کرتی تھی) چوڑی بھول گئی۔ جسے دیکھیے فضل پر ٹوٹا ہوا ہے۔ بڑے سے بڑے چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے دل میں فضل سے ملنے کی خواہش تھی اور لڑکیاں تو شاید اس زمانے میں خواب میں اوول کے ہیرو کو دیکھا کرتی تھیں۔ ان میں ہر ملک کی لڑکیاں شامل کر لیجیے۔

فضل فلمی حلقوں میں بھی ہیروز سے زیادہ مقبول اور ہر دلچز پر تھے۔ ہیروئن آگے پیچھے بھر رہی ہیں۔ فلم ساز کام کرنے کی دعوت دے رہے ہیں مگر ایک بات میں فضل محمود کی تعریف میں ضرور کروں گا۔ خدا نے فضل محمود کو جو شخصیت جو شہرت اور عروج عنایت کیا تھا اس کا ایک چوتھائی بھی کسی اور کو ملتا تو واقعی تو ازان کھو بیشتا۔ مگر فضل ہمیشہ ایک متوازن اور نارمل انسان رہے۔ بعد میں یہی خوبی میں نے عمران خان میں پائی۔ یہ خدا کا بندہ بھی تعریف شہرت حسن و جمال کسی بات پر نازاں نہیں رہا۔ خدا خوش رکھے اور اسی طرح کامیاب و کامران رکھے۔ یہ لوگ جو کچھ پا چکے ہیں اس کے مستحق ہیں اور جو انہیں اب تک نہیں ملا وہ بھی ان کا حق ہے۔

ہاں تو بات فضل محمود کی ہو رہی تھی۔ ہونٹ کے سروں میں دوستوں کے دفتروں میں فضل محمود بے تکلفی سے آجاتے، نان کباب کھائے جارہے ہیں، گلیں ہو رہی ہیں مگر فضل کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی تعریف اور اپنے



”باغی گروپ“ کی خبریں اخبارات میں عام ہونے لگیں تو میں نے دیکھا کہ حامیوں اور مخالفین کے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ میاں واو کی حمایت میں تھا اور کہہ رہا تھا کہ ماجد، سرفراز ہیں کیا۔ ان کے بغیر پاکستان میں کرکٹ زیادہ کامیاب رہے گی۔ دوسری طرف ایک گروہ تھا جو کہہ رہا تھا کہ جاوید میاں داد کا کھیل اب بس ہو گیا۔ ایک نوجوان غیر ذمہ دار کھلاڑی کی خاطر اسے بہت سے اچھے کھلاڑیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ جاوید کو اب کرکٹ سے ریٹائر ہو جانا چاہیے۔ یہی رویہ سری لنکا کے ساتھ میچوں کے دوران دیکھنے میں آیا۔ بہت سے لوگ جاوید میاں واو کی حمایت میں نعرے لگا رہے ہیں۔ بہت سے قماشانی، ماجد، عمران، سرفراز اور ظہیر کی حمایت میں چلا رہے ہیں اور دوسرے گروہ کے لیے ”مردہ باد“ کے نعرے لگا رہے ہیں۔ انہیں تو آپ عوام، نوجوان اور جذباتی مداح کہہ کر شاید نظر انداز کر دیں مگر اخبارات کے مراسلات کے کالموں میں بھی یہی طرز گفتگو رہا اور تو اور صحافتی کالم نگاروں، اسپورٹس اور رپورٹروں نے بھی کسی ایک کی حمایت اور دوسرے کی مخالفت شروع کر دی تو تشویش پیدا ہونے لگی۔ کتنی بد نصیبی ہے ہماری کہ ہم جذبات میں بہہ جاتے ہیں اور خود اپنے ہی ایک عضو کی دوسرے عضو پر برتری یا کمتری ثابت کرنے لگ جاتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ خود اپنے جسم کے ایک حصے کو ناکارہ قرار دے کر اسے کاٹ کر پھینک دینے پر زور دیتے ہیں۔ یہ رویہ زندہ قوموں کی شان کے شایان نہیں ہے۔ دراصل ہم ابھی یہ شعور پیدا نہیں کر پاسے ہیں کہ اس ملک کی جو بھی چیز یا جو بھی شخصیت ہے وہ ہماری ہے جس طرح ایک خاندان کے فرد اور ان کی چاہ یا ہوتی ہے۔ معمولی سی بحث یا اختلاف پر کسی خاندان کے افراد میں کاٹ چھانٹ تو نہیں شروع ہو جاتی۔ سارے فنکار، سارے کھلاڑی، سارے شاعر اور ادیب ہمارے ہیں۔ ہمیں ان سب پر فخر ہونا چاہیے۔ ان کے باہمی جھگڑوں سے اپنے آپ کو بالاتر رکھنا چاہیے۔ جب عمران میدان میں وکٹ کی طرف دوڑتا تھا تو ہمارا دل ختم ہو جاتا تھا۔ سرفراز نواز، اقبال قاسم، مدثر نذر جو بھی وکٹ لیتا تھا ہمیں فخر کا احساس ہوتا ہے۔ جاوید میاں داد، ظہیر علی، ماجد، مدثر یہ سب ہماری آنکھوں کے تارے ہیں۔ پاکستان کو کٹ نیم کا ہر کھلاڑی ہمارے جگر کا ٹکڑا ہے۔ ہماری دعائیں اور تحنیں ان سب کے لیے ہیں اس لیے کہ یہ پاکستان کے ہیں۔

کارناموں کا زیادہ بیان نہیں کرتے تھے۔ البتہ لپٹنے کے طور پر کچھ واقعات ضرور سنایا کرتے تھے۔ مثلاً ایک بار جب وہ پولیس کی ڈیوٹی کے سلسلے میں ایک علاقے میں متعین تھے، دیکھا کہ ایک دیہاتی پٹا کٹنا چور مال غنیمت لے کر بھاگ رہا ہے۔ انہوں نے جیب میں پیچھا کرنا چاہا مگر راستہ دشوار گزار تھا۔ جھٹ جیب سے گود کر پیدل دوڑنے لگے۔ میل ہا میل تک دونوں آگے پیچھے دوڑتے گئے۔ وہ دیہات کا پکا ہوا چور بھاگنے میں طاق۔ یہ ادول کے ہیرا اور اسپورٹس میں دوڑنے میں کب ہار مان سکتے تھے۔ کئی میل کا سفر طے ہو گیا مگر نہ چور بھاگنے سے باز آیا نہ فضل محمود تعاقب کرنے سے، آخر ایک جگہ چور تھک کر رکھیت کی منڈ پر بیٹھ گیا اور ہانپنے لگا۔ فضل محمود بھی جا کر پاس ہی دراز ہو گئے اور سانس درست کرنے لگے۔ دونوں کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو چور نے بڑی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تمہیں ارجی میں نے تمہارے جیسا جوان پولیس میں نہیں دیکھا۔

فضل مسکرائے اور بولے مگر کرکٹ کے میدان میں تو دیکھا ہوگا۔ بعد میں انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ چور نے کرکٹ کبھی نہیں کھیلی تھی۔ نہ کبھی بیچ دیکھا تھا مگر فضل محمود کا نام جانتا تھا فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سلام کیا اور کہا۔ ”اجی پہلے بتا دیا ہوتا کہ تو فٹبال ہے۔“

فضل نے بہت فتوحات حاصل کیں مگر آخر ایک دن ریٹائر ہونا تھا۔ کچھ عرصے بعد صوفیت کی طرف مائل ہو گئے۔ داڑھی رکھ لی۔ پانچوں وقت کی نماز، روزے، وظائف اور اسلامی موضوعات پر تحریریں۔ یہ فضل محمود کا دوسرا روپ تھا۔ کئی سال وہ مذہب اور روحانیت کے سمندر میں غوطہ زن رہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان تمام ادوار میں وہ بطور پولیس افسر بھی اپنی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ پھر وہ ”بزرگ کھلاڑی“ بنے اور نوجوانوں کو مشورے دیتے رہے مگر میری نگاہوں میں ان کی وہی سبکی، خوب صورت، ہنس مکھ اور نوجوان شخصیت تصویر کا عکس بنی رہی۔ شاید میں بذات خود ذہنی طور پر اپنے آپ کو ”بزرگ“ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا؟

آج کے نوجوان کل کے بزرگ ہوں گے اور اس طرح یہ تجربے مشاہدے نسل در نسل منتقل ہوتے رہیں گے۔ آنے والی نسل گزری ہوئی نسل کے کارناموں میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے گی۔

ایک بار قصہ یہ ہوا کہ جب کرکٹ کنٹرول بورڈ اور



حاصل ہو بھی جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس دوران میں طرزِ ایک بھائی کا ماحول میں مصائب کی زندگی گزارتا ہے اور ہماری جیلوں کا ماحول ایسا ہے کہ کچھ عرصہ وہاں گزارنے کے بعد انسان یا تو تارک الدنیا ہو جاتا ہے یا عادی مجرم۔

پرو چانڈیو ہو یا کوئی دوسرا ڈاکو۔ ہر ایک کی زندگی کو ان ہی مرحلوں سے گزرتا پڑا ہے اور آج جو پرو چانڈیو سوسائٹی میں موجود ہیں انہیں بھی بعینہ وہی حالات درپیش ہیں۔ جو لوگ ڈاکو بن چکے، وہ تو اب واپسی کا سفر اختیار کرنے سے معذور ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ معاشرے میں مستقبل کے جو پرو چانڈیو جنم لے رہے ہیں یا جنم لینے والے ہیں ان کی روک تھام کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں؟ بھارت میں بھی ڈاکوؤں کی کوئی کمی نہیں ہے، نہ تھی۔ یہ اور بات ہے پرو چانڈیو

مادام نور جہاں کی جہاں کہیں عزت افزائی اور آؤ بھگت ہوتی تھی۔ ہم سمجھتے کہ یہ ہماری ذاتی عزت افزائی ہے۔ ہمارے ملک کی عزت افزائی ہے۔ فیض، جوش، احمد فراز، منیر شاہزی، جمیل الدین حالی۔ قشیش شٹائی۔ احمد نعیم قاسمی جہاں کہیں اپنی شاعرانہ عظمت کے جھنڈے گاڑتے ہیں ہم سمجھتے کہ وہ ہماری فتح ہے۔ جہاں ہماری خوشبو پھیل جاتی ہے۔ ان میں بڑے چھوٹے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ ہمارے دل ان سب کے لیے یکساں دھڑکتے ہیں۔ اب بھی میرا یہ خیال ہے کہ یہ سب ہمارے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔ جب تک یہ رویہ عام نہ ہوگا۔ ہم اپنے مایہ ناز فرزند کی دل شکنی کے مرتکب ہوتے رہیں گے۔ ان کی ناقدری کا جرم سرزد کرتے رہیں گے۔ دیکھیے ناں اگر آپ سرفراز یا ماجد کو پست کرتے ہیں اور جادید میانداد کو بلند پر لے جاتے ہیں تو نقصان تو ہمارے پاکستان کا ہے۔ وطن کی سرزمین کے یہ بیٹے اپنی ماں کی نظروں میں یکساں عزیز اور محبوب ہیں۔

سندھ کا مشہور و معروف ڈاکو پرو چانڈیو اپنی زندگی میں بھی خبروں کا موضوع بنا رہا، مرنے کے بعد بھی پرو چانڈیو کے تذکرے ختم نہیں ہوئے تھے۔ اخباری نامہ نگار اس بارے میں خصوصی جائزہ شائع کر رہے تھے اور اس کی زندگی پر ایک کتاب بھی شائع کی تھی جس میں اس کے بچپن سے لے کر جوانی اور پھر ہلاکت تک کے واقعات تفصیل سے درج تھے۔ پرو چانڈیو ڈاکو کیوں بنا؟ اس کے اسباب قریب قریب بتائی ہیں جو برصغیر میں پیدا ہونے والے تمام قاتل و ڈاکوؤں کا قاتل و ڈاکوؤں کے ہوتے ہیں یعنی سماجی انصاف سے محرومی، جاگیرداروں اور وڈیروں کا استحصال، پولیس کی بے اعتنائی، انصاف کا عدم حصول، معاشی لوٹ کھسوٹ، طبقہ وارانہ تشییب و فساد اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی بے حس۔ اس کے بعد نوبت آتی ہے عدالتی انصاف کی۔ عدالتیں انصاف کرنے کے لیے کوائف و شواہد کی محتاج ہوتی ہیں اور ابتدائی رپورٹوں اور دوسرے واقعات کی ترتیب دینے میں پولیس اور جھوٹی گواہیوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مرحلے پر بھی عدالت بے نوا اور بے زرا آدمی کو انصاف میسر نہیں آتا پھر ہمارے عدالتی طریقہء کار کی طوالت بھی ایک مرحلہ ہے۔ مقدمات اتنی طوالت اختیار کر لیتے ہیں کہ اگر بشرط حال کسی کو انصاف



کہ اگر ملک کی وسعت اور آبادی کے تناسب کو دیکھا جائے تو غالباً ہمارے ہاں ڈاکوؤں کی پرورش اور تعداد کہیں زیادہ ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد سماجی اور انتظامی نظام تو بھارت میں بھی زیادہ تبدیل نہیں ہوا۔ نہ ہی سماجی نا انصافیوں اور معاشی نا ہمواریوں کا ازالہ ہو سکا۔ طبقہ وارانہ منافرت بھی اس معاشرے میں ہم سے کہیں زیادہ ہے اس کے باوجود سماجی بنیادوں پر ڈاکوؤں کو اور راست پر لانے کے لیے وہاں کئی تحریکیں چلائی گئیں جنہیں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ ڈاکوؤں کی عام معافی کا اعلان کیا گیا۔ تائب ہونے کی صورت میں وعدہ کیا گیا کہ انہیں معمولی سزائوں کے بعد معاشرے میں نئے سرے سے باعزت شہریوں کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ اس طرح ایک محدود دہانے پر ہی کسی عمر بھارت میں ڈاکوؤں کو ختم کرنے کی ایک شعوری اور سماجی کوشش ضرور کی گئی جب کہ ہمارے ہاں درجنوں سماجی انجمنوں اور مثالی اسلامی معاشرے کے قیام کے باوجود ان کی طرف سے اس اہم مسئلے کو حل کرنے



کی کوئی تدبیر اور کوشش نہیں کی گئی۔

پرو چانڈیو کی زندگی کے حالات پر ایک نظر ڈالیں اور اس کے بعد آئے دن منظر عام پر نمودار ہونے والے ڈاکوؤں کے حالات زندگی پر جیسے (جو عموماً اخباری کالموں کی زینت بنتے رہتے ہیں) تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ بالا وجوہ آپ کو ہر ڈاکو کے معاملے میں کارفرما نظر آئیں گی۔ اسباب و علل قریب قریب وہی ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے (یا ان کو خراب تر کرنے) کے طریقے بھی وہی ہیں۔ چلیے ایک شہری جائز یا ناجائز شکایات کی بنا پر ڈاکو بن گیا یا پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ مرحلہ بھی اپنی جگہ انتہائی قابل غور اور تشویش ناک ہے۔ ڈاکوؤں سے لے کر عام بد معاشوں تک کے واقعات دیکھ لیجیے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ابتدائی جرائم میں یا تو وہ پکڑا ہی نہیں گیا یا بہ آسانی ضمانت پر رہا ہو گیا۔ اچھا یہ کہ ایک قابل بھی جیل جانے سے بچ گیا یا پھر مختصر سزا کاٹ کر دوبارہ سنگین جرائم کرنے کے لیے تازہ دم اور تربیت یافتہ ہو کر جیل سے باہر آ گیا۔ گویا سنگین جرائم میں ہلکی اور برائے نام سزائیں اور اکثر حالات میں سزاؤں سے محفوظ رہتا بھی اس رجحان کو بڑھانے میں نمایاں ہے۔ اگر کوئی شخص قابو میں آ ہی گیا تو اس نے دو راستے اختیار کیے۔ سپاہیوں یا جیل کے حکام سے مراعات حاصل کرنے کے بعد موقع پا کر ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل بھاگ گیا مردانہ اور جیل تو ذکر فرما رہا ہو گیا اور اس طرح پہلے سے بھی زیادہ خطرناک اور سنگین جرائم کا مرتکب ہوا۔ گویا ثابت یہ ہوا کہ جب تک قانون نافذ کرنے والے اداروں کو موثر نہ بنایا جائے اور قانون و انصاف کی فراہمی کی سہولتیں ہر خاص و عام کے لیے یکساں، آسان اور فراوان میسر نہ کی جائیں انتظامی طور پر اس مسئلے کا کوئی حل ممکن نہیں ہے اور یہ تو اس مسئلے کا سرے سے کوئی حل ہی نہیں بلکہ پہلے تو ڈاکو بنائے جائیں اور پھر پولیس مقابلے میں انہیں ہلاک کیا جائے اور اس سلسلے میں سینکڑوں پولیس والے بھی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

ایسی کہانیوں میں سو فیصد آپ کو ایسے شواہد ملیں گے کہ سماجی نا انصافی اور زبردست مظالم سے تنگ آ کر ایک شخص نے جب پولیس چوکی کے دروازے کھٹکھٹائے تو اسے تحفظ کی بجائے بے حسی اور سرد مہری ہی نصیب ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کے دل و دماغ میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ یہ معاشرہ جس کی لالچی اس کی بھینس کے فلسفے پر عامل ہے اور

جب تک وہ خود قانون کو ہاتھ میں نہیں لے گا اس کو انصاف نہیں مل سکے گا۔ ہر ڈاکو، بد معاش اور مجرم کے حالات زندگی میں یہ نکتہ آپ کو مشترک نظر آئے گا۔

دوسری حالات اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم کب تک اور کتنے ڈاکوؤں کو ماریں گے اور اس کا فائدہ کیا ہوگا جب کہ ان کی جگہ دوسرے اور اکثر حالات میں ان سے زیادہ تعداد میں ڈاکو پیدا ہو جائیں گے؟ دوسرے لفظوں میں جب تک ڈاکو ساز نرسریاں اور اسکول ختم نہ ہوں گے ڈاکوؤں کی پیدائش، نشوونما اور پرورش ختم نہ ہو سکے گی۔

وہ لوگ جو جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار کے لیے فلموں، خصوصاً پنجابی فلموں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں ان کے لیے بھی یہ ایک فحشہ فکر یہ ہے۔ پنجابی فلموں میں ظلم کے خلاف ہتھیار اٹھانے والے مظلوم کو ہیرو کا نام دیا جاتا ہے جو معمول کے مطابق انصاف حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ ان میں دوسرا موضوع باہمی دشمنیاں اور انتقام کی آگ کو بنایا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے معاشرے میں بدرجہ اتم موجود ہیں اور آئے دن اخبارات میں شائع ہونے والے روح فرما اور سنگین واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہماری پنجابی فلمیں کسی حد تک ہمارے دیہاتی معاشرے کی زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہیں جب کہ دوسری فلموں میں کل و بلبل کے رومانی قصوں اور جرم و سزا کے مغربی تصورات کے سوا دوسرے موضوعات کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں اور یہی پنجابی فلموں کے قبول عام ہونے کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ دیہاتی معاشرے میں عام کسان کی زندگی کے شب و روز جس نا انصافی کے ماحول میں بسر ہوتے ہیں اور حصول انصاف سے محروم رہنے کے باوجود اس کے دل میں جو جذبات اور آتش فشاں اگلے رہتے ہیں اس کے نتیجے میں یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص پرو چانڈیو بن جائے مگر جب کوئی پرو چانڈیو بن جاتا ہے تو اس کے کارناموں میں ہر شخص اپنی دلی ہوئی خواہشوں اور سسکتی ہوئی آرزوؤں کا نظارہ کر لیتا ہے اور اس طرح مجرموں کو ان کے نزدیک ہیرو کا درجہ مل جاتا ہے۔

ایک انتہائی خوفناک اور تشویش ناک صورت حال ہے۔ یوں سمجھیں کہ ہم ایک آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں جس کی حدت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے مگر ہم اس آگ کو بجھانے کی تدبیر تو کیا اس کے متعلق سنجیدگی



سے سوچتے اور غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ مغرب میں رائین ہڈ ایک ایسا ہی کردار تھا، یہ مغرب کے استحصائی معاشرے میں انصاف کا علمبردار اور غریبوں اور مظلوموں کا حمایتی تھا۔ رائین ہڈ امیروں کی دولت چھین کر غریبوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ غریبوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف سینہ سپر ہو کر امیروں کے سامنے اپنی چٹان بن کر کھڑا ہو جاتا تھا مگر آپ نے بھی غور کیا کہ آج کے مغربی معاشرے میں کوئی رائین ہڈ کیوں نہیں جنم لیتا۔ وہ مغربی بچے جو کسی زمانے میں رائین ہڈ کی کہانیوں کو حفظ جاس بنا کر رکھتے تھے۔ اب ان کے لیے رائین ہڈ ایک خیالی کردار بن کر رہ گیا ہے اور اس کردار میں بھی اب ان کے لیے کوئی خاص دلچسپی کا سامان موجود نہیں ہے۔ مغرب کا بچہ اب سائنس فکشن اور ایٹمی وژن میں سائنس لینے والے کرداروں کی خیالی کہانیوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ اب وہاں رائین ہڈ پیدا ہونا بند ہو گئے ہیں۔ مغربی معاشرے میں سائنٹیفک انداز میں۔ بینک لوٹے، فراڈ کرنے والے، لوٹ مار کرنے والے اور دوسرے جرائم کرنے والے لوگ تو موجود ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ معاشرہ اب رائین ہڈ سے محروم ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ سماجی ناہمواری، انصاف کا عدم حصول، قانونی عمل کی سست رفتاری اور مائنٹ از رائٹ کا اس معاشرے میں کوئی وجود باقی نہیں ہے مگر کیا ہمارے معاشرے میں بھی اس کا کوئی امکان ہے؟ خاص طور ایسی صورت میں جب کہ ہم ایک مثالی اسلامی معاشرے کے قیام کے دعویدار بھی ہیں؟

☆.....☆

آزادی کے پہلے کسی بھی جگہ کے سربراہ کو کسی بھی معاملے میں درخواست کرنے کے لیے کچھ اس قسم کی عبارت مخصوص تھی۔

بکثور فیض منجور صاحب۔ صاحب بہادر۔۔۔۔۔ جناب والا۔ گزارش کترین کی یہ ہے کہ۔۔۔۔۔ اس کے بعد کترین نہایت عاجزی سے اپنی گزارشات پیش کرنے کے بعد آخر میں صاحب بہادر کی شان میں کچھ اور تعید ہے اور اس اُمید پر دعائیں درج کرتا تھا کہ شاید اس کی درخواست کی پذیرائی ہو جائے۔ درخواست کا اختتام کچھ اس طرح کرتا تھا۔

آپ کا نیاز مند۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہوایہ کہ جب انگریز حاکم نے برصغیر سے اپنا بوریا بستر

مہلبانہ سرگزشت

گول کیا اور اس خطے کے عوام کو غلامی کے دور سے نجات حاصل ہو گئی اس کے بعد بھی ساہیا سال تک محکمانہ عرصوں کے لیے یہی طرز نگارش مخصوص رہی۔ یہی نہیں بلکہ ہر جگہ کے باہر جس بورڈ پر متعلقہ محکمہ کے افسر کا نام درج ہوا کرتا تھا اس کے ساتھ ہی بے شمار القاب بھی درج ہوا کرتے تھے۔ مثلاً صاحب بہادر و پنی ڈائریکٹر محکمہ فلاں۔ پھر اخبارات میں متعلقہ محکموں کی جانب سے جو ٹینڈرنس یا اشتہارات شائع ہوا کرتے تھے ان کے آخر میں بھی جناب صاحب بہادر کے تمام القاب درج کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا گویا سیاسی طور پر تو ہم لوگوں نے آزادی حاصل کر لی تھی لیکن جہاں تک دفتری آزادی کا تعلق ہے اس سے محروم تھے اور فریق صرف اتنا تھا کہ پہلے غلامی انگریز کے پیرو کریت کی تھی اور اب پاکستانی پیرو کریت کی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خود کسی جگہ کے سربراہ یا پیرو کریت اعظم کو بھی اس صورت حال کا احساس نہیں ہوا، وہ بدستور اپنی افسری کی شان میں گمن تھے اور عوام بدستور فدیہ کثرتی کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے کافی عرصے بعد کچھ اخبار نویسوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ یہ غیر ضروری القاب و آداب آزادی کے بعد بھی کیوں اور کس لیے استعمال کیے جاتے ہیں؟ بلکہ درحقیقت ان درخواستوں کا انداز تحریر اس قدر فدیہ دیا نہ ہوا کرتا تھا اور درخواست گزار اس میں اپنی کثرتی اور احقری کے اظہار میں اتنا فراغ دل ہوا کرتا تھا کہ ان درخواستوں پر ایک نظر ڈالنے سے ہی کراہیت آتی تھی۔ حیرت ہے کہ درخواستیں پڑھنے والوں کو کبھی یہ احساس تک نہ ہوا کہ وہ بنی نوع انسان کو کس قدر ذلیل کر رہے ہیں اور انسانی عظمت کی اہانت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

بہر حال، اخبارات میں شور و غل ہوا۔ کچھ حکومتیں ایسی آئیں جنہیں یہ احساس دلایا گیا کہ اب اس قسم کے القاب و آداب کو متروک کر دینا چاہیے اس لیے کہ آزاد ملکوں میں سرکاری افسر عوام کے حاکم نہیں بلکہ ملازم اور خدمت گار ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ درخواستوں کا لب و لہجہ بدلنے لگا مگر دفاتر کے باہر لکھے ہوئے آداب و القاب میں کوئی فرق نہ آیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اس مسئلے پر بھی توجہ دی گئی اور غالباً سرکاری افسروں نے بذات خود ہی احساس کمر

نہیں کیا کہ یہ مجبور ہو کر اپنے القاب کو مختصر کر دیا۔ اب جہاں تک دفاتر کا تعلق ہے یہ القاب دیکھنے میں نہیں آتے۔ نہ



ہی اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہارات کے آخر میں جناب صاحب بہادر قسم کے الفاظ دیکھنے میں آتے ہیں لیکن یہ انقلاب بابت تبدیلی محض تحریر کی حد تک ہوتی ہے۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے افسروں کا رویہ بدستور دیا ہی تنکمانہ ہے اور درخواست گزار کی لجا جت اور کسٹری میں عملی طور پر کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس موضوع پر اخبارات کے کالموں میں بہت کچھ لکھا گیا عالموں نے مقالات لکھے۔ فاضلوں نے تحقیق کا جال بچایا اور یہ دور کی کوڑی لائے کہ دراصل یہ ہمارے دور غلامی کی یادگار ہے۔ اس کے لیے دانشوروں نے ایک اصطلاح بھی واضح کر لی ہے جسے عرف عام میں ”غلامانہ ذہنیت“ کہا جاتا ہے۔

غلامانہ ذہنیت کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ کیوں کہ ہم نے ساہا سالانہ گریز کی غلامی کی ہے اس لیے ہم ذہنی طور پر اب تک غلامی کے ان اثرات سے نجات حاصل نہیں کر سکے جو ہمارے ذہنوں اور دماغوں میں سرایت کر چکے ہیں۔ غلامانہ ذہنیت ہی کا کرشمہ ہے کہ اس معاشرے میں جو بھی اور جہاں بھی قدرے صاحب اختیار ہے اس کا فرض ہے کہ دوسروں کو ڈرائے دھمکائے۔ اپنے سے کمتر جاننے والے سے بدسلوکی کرے۔ ان صاحب اختیار لوگوں میں اعلیٰ سرکاری حاکم سے لے کر محکمہ کا چپرا اسی تک سبھی شامل ہیں بلکہ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ ایسے مقامات پر بھی اس غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے جہاں عوام کو کسی ”صاحب اختیار“ کی نظر کرم کا امیدوار ہونا پڑتا ہے۔ وہاں ضروری ہے کہ عام التجا کریں اور جس سے ان کا واسطہ پڑا ہے یا جان کا حاجت روا ہے وہ ان کو گھر کیاں دے، جہز کے اور ضرورت پڑے تو انہیں برا بھلا کہے۔ کئی جگہ پر تو آپ نے عوام کو پولیس اور انتظامیہ کے دھمکے کھاتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ عوام یہ ڈنڈے نہایت مہربان سے کھاتے ہیں اور حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ نہ نفی و نہ ہارنے والوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو وہ دھمکے رسید کر رہے ہیں دراصل وہ آزاد ملک کے معزز شہری ہیں۔ ساری دنیا میں گاموں سے جو سلوک کیا جاتا ہے وہ سب معلوم ہے اور آزاد ملکوں کے معزز شہری جن مراعات اور جس عزت و احترام کے مستحق ہیں اس سے بھی اب سب واقف ہو چکے ہیں مگر ہماری غلامانہ ذہنیت نے ہماری فہم اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو سلب کر لیا ہے اس لیے ہم یہ نہیں غور کرتے کہ ہم کس اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی بلکہ قانونی

جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں جیسا کہ میں نے اوپر تحریر کیا ہے اس قسم کے مظاہروں کے لیے کسی سرکاری دفتر میں جانا ضروری نہیں ہے۔ ہر وہ شخص جو کسی بھی قسم کے اختیار کا مالک ہے اپنے سے نیچے لوگوں سے بدسلوکی کرتا ہے اور اپنے سے اونچے درجے کے افراد کے سامنے ٹھکھٹاتا ہے۔ ہاتھ باندھ کر اتنا کرتا ہے۔ آسان زبان میں یوں کہا جاتا ہے کہ شاید ہم لوگوں کو ”عزت نفس“ کا پاس نہیں ہے یا دوسرے الفاظ میں خود داری سے محروم ہیں۔ تم غریبی یہ ہے کہ اقبال کے کلام کو بھی ہم لہک لہک کر پڑھتے ہیں اور علامہ کے فلسفہ خودی کے حد درجے معترف ہیں۔ علامہ اقبال کا یہ شعر نصاب کی ہر کتاب میں شامل ہے اور ہر وہ شخص جو اردو پڑھتا ہے وہ یہ شعر بھی زبانی یاد رکھتا ہے خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بند سے ہے یہ پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟  
یعنی ایک طرف خودی کی بلندی کا یہ عالم ہے کہ اللہ میاں سے بھی طلب گار ہیں کہ ہماری عزت نفس کا خیال رکھا جائے اور دوسری طرف خودی کی پستی کا یہ عالم ہے کہ مجھے کے چہرے کے آگے بھی ہاتھ باندھے، سر جھکائے کھڑے ہیں۔ داناؤں نے بتایا ہے کہ یہ دراصل ہماری غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

ہم تو تقدیر کے اس فیصلے کو غلامانہ ذہنیت کا لازمی جز تسلیم کر کے راضی برضا تھے مگر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ پچھلے دنوں جب ہم امریکا گئے تو ہمیں ان سیاہ فام لوگوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا جو کچھ عرصے پہلے جج جج کے غلام تھے یعنی جن کے آباؤ اجداد کو خرید کر دور دراز علاقوں سے لایا گیا اور پھر انہیں امریکا کے سفید فام مالکوں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا جیسا کہ آپ نے امریکی تاریخ میں پڑھا ہوگا غلام کے جسم و جان کا مالک اس کا آقا ہوا کرتا تھا۔ امریکا میں بھی کالے غلاموں پر ان کے آقاؤں کو ہر طرح کا اختیار حاصل تھا۔ انہیں انسانی حقوق تو کیا انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کا بھی اختیار نہیں تھا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب کالوں کی ریزائش نسل بھی سویڈن کی طرح کی جاتی تھی۔ یعنی بدمذہب اور توانا مرد اور محنت کش خوش شکل اور مضبوط عورتوں کو جن نسل بڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور اس ضمن میں کتنی بھی نہیں رکھی جاتی تھی کہ ان کا آپس میں کوئی خون کا رشتہ تو نہیں ہے؟ گویا امریکا کے کالے جج معنوں میں غلام تھے۔ ہمیں انسانی حقوق سے محروم۔



جب دنیا بھر میں آزادی کا غلغلہ مچا ہوا اور خود امریکا آزادی کی تحریک کا چیمپین بن گیا تو وہاں بھی کالوں کے انسانی حقوق بحال کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ آج سے چند دہائی پہلے تک امریکا کے بہت سے شہروں اور علاقوں میں کالے لوگ سفید قوم لوگوں کے ساتھ بس میں نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ہوٹلوں میں نہیں داخل ہو سکتے تھے۔ گوروں کے اسکولوں میں کالوں کا داخلہ ممنوع تھا لیکن کالوں نے اپنے حقوق کے لیے قربانیاں دیں گوروں کی آبادی کے ایک معقول عنصر نے بھی ان کے مطالبات کی حمایت کی غرض یہ کہ سالہا سال کی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد کالوں نے گوروں کے مساوی حقوق حاصل کر لیے۔ اب عملی طور پر صورت حال یہ ہے کہ کالوں کو آبادی کے تناسب سے نوکریاں حاصل ہیں۔ واشنگٹن ڈی سی امریکا کا دارالحکومت ہے جہاں کالوں کی آبادی تقریباً 75 فیصد ہے۔ منتخب اداروں کے علاوہ سرکاری دفاتر میں بھی ہر جگہ آپ کو اسی تناسب سے کالے نظر آئیں گے گوروں کے افسر بھی کالے ہیں۔ واشنگٹن ڈی سی کا میئر کالا ہے۔ پولیس کمانڈر، ایئر فوری جرنل، چیف جج سب کالے ہیں اور سب نام کے افسر نہیں ہیں۔ انہیں مکمل اختیارات بھی حاصل ہیں لیکن قائل ذکر بات یہ ہے کہ ان کالوں میں غلامی کا احساس اب رائل ہو چکا ہے۔ وہ غلامانہ ذہنیت کے شکار نہیں ہیں۔ وہ بڑی بے تکلفی سے گوروں سے میل جول رکھتے ہیں۔ برابری کے تعلقات ہیں بلکہ ایک لحاظ سے وہ اپنے آپ کو گوروں سے برتر سمجھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کالوں نے گوروں کے فیشن اور ان کا فحش اختیار کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ امریکا میں کالوں کے فیشن مختلف ہیں۔ مازن سیاہ فام عورتیں بھی بالوں کے اسٹائل مختلف بناتی ہیں جو کالوں کے مخصوص انداز سے ملنا جلتا رکھتے ہیں۔ ان کے لباس گوری عورتوں سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ انہوں نے رہن بہن بھی گوروں سے الگ اختیار کیا ہے مگر جو بات سب سے زیادہ حیران کن ہے وہ یہ ہے کہ وہ بالکل برابری سے گوروں سے بات کرتے ہیں نہ ان کے ساتھ جھگڑاتے ہیں، نہ خوشامد کرتے ہیں، نہ کسی قسم کے احساس کتبی کا شکار ہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ کالے غلامانہ ذہنیت سے کیونکر محفوظ ہیں؟ بلکہ دیکھا جائے تو غریبی اور پسماندگی کے باوجود ان میں ایک احساس تقاضا اور رعب و اب کا عنصر موجود ہے۔ مثال کے طور پر گورا کچھ مانگے گا تو

اخلاقی اور لجاجت سے مگر کالا اپنا حق سمجھ کر۔ ایک دن فٹ پاتھ پر ایک بچے کئے کالے سے ملاقات ہوئی۔ وہ بے تکلفی سے میری طرف بڑھا اور نہایت دوستانہ لہجے میں بولا۔ ”آپ جو سگار پی رہے ہیں ایسا دوسرا سگار ہو تو مجھے دے دیں۔“

میں نے کہا۔ ”میرے پاس دوسرا سگار نہیں ہے۔“ کہنے لگے۔ ”تو پھر یہی دے دیں۔ یہ میرا پسندیدہ سگار ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ میرا بھی پسندیدہ سگار ہے اور صرف ایک ہے۔“ اس نے سر جھپایا اور بولا۔ ”ایک ڈالر ہو گا؟“ میں نے ایک ڈالر ان کے حوالے کیا۔ وہ ”ٹھیک یو“ کہہ کر اپنی راہ چل دیے۔ نہ سر کہہ کر مخاطب کیا نہ ملتجیانہ لہجہ اختیار کیا۔ حد تو یہ ہے کہ بھیک مانگتے وقت بھی میں نے کالوں کو فدویانہ انداز اختیار کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ایک دن ہم اپنے ایک پاکستانی دوست کے ریسٹورنٹ میں گئے۔ پتا چلا کہ وہاں کچھ امریکی ملازم ہیں۔ کچھ عرب ایک سیاہ فام لڑکی کیرن گرے اور ایک پاکستانی صاحب مسٹر شفیع۔ پاکستانی کی یہ شہرت تھی کہ وہ ریسٹورنٹ کے عرب اسٹنٹ مینیجر سے بھی سر کے بغیر بات نہیں کرتے تھے اور نہایت فدویانہ اور احقرانہ انداز اختیار کیے رکھتے تھے، کوئی مطالبہ کرتے تو ٹھکھکیا کر یہاں تک کہ چٹائی کی درخواست بھی کرتے تو پہلے اپنی کسی فرضی بیماری کا تذکرہ کرتے اور پھر ایک دن کی چٹائی طلب کرتے۔ جب کہ دوسرے لوگوں کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ ایک دن کیرن گرے نے مجھ سے پوچھا۔ ”مسٹر آفاق! یہ پاکستانی ہم سب سے مختلف ہے، یہ اتنی خوشامد کیوں کرتا ہے۔ میں نے دوسرے پاکستانی لوگوں کو بھی اسی طرح التجائیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔“

ہمیں کوئی جواب نہیں سوجھا مگر پھر فرار و دامغ نے کام کیا اور ہم نے کہا۔ ”کیرن! دراصل بات یہ ہے کہ ہم لوگ انگریزوں کے غلام رہے ہیں۔ ہماری ذہنیت ہی غلامانہ ہو گئی ہے۔ رفتہ رفتہ اس سے نجات ملے گی۔“ وہ کہنے لگی۔ ”آپ کو آزاد ہوئے تو 34 سال ہو گئے ہیں پھر بھی آپ لوگوں کی ذہنیت نہیں بدلی۔“ ہم لا جواب ہو کر کوئی عذر تلاش کر رہے تھے کہ اس نے کہا۔ ”میں نے ہندوستان کی تاریخ پڑھی ہے، مسلمانوں نے تقریباً نو سو سال ہندوستان پر حکومت کی ہے۔ غلامی کا آغاز 1057ء سے ہوا۔ 1947ء میں آپ لوگ آزاد ہو گئے میں حیران





راگ تان سین کی تخلیق ہیں۔ وہ شہنشاہ اکبر کے نورتنوں میں شمار ہوتے تھے۔ مشہور ہے کہ وہ دیپک راگ گا کر دیے جلاتے اور مہاراجا کرپال کے ذریعے انہیں بجھا دیا کرتے۔ اب بھی فن موسیقی کے طالب علم میاں تان سین کی قبر کے سربانے پیری کے درخت کا ایک پتہ کھا کر یہ سمجھتے ہیں کہ رانوں کا سمندر ان کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دے گا۔ اورنگزیب عالمگیر کے علاوہ دیگر مغل شہنشاہ موسیقاروں کی سرپرستی کیا کرتے۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد ہندو راجوں اور مسلمان قوادوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اسی اثنا میں موسیقی کے کئی گھرانے وجود میں آچکے تھے۔ جن میں زیادہ مشہور پٹیاں، شام چوراسی، کیرانہ، گوالیار، دہلی، آگرہ، یارگیلا، سبے پور، اترالی وغیرہ شامل ہیں۔ ان گھرانوں کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں، کوئی تان پر زیادہ دھیان دیتا ہے تو کوئی الفاظ کی اداکاری کا خاص اہتمام کرتا ہے۔ قوادوں اور مہاراجوں کے دور میں کئی عظیم مسلم موسیقاروں نے جنم لیا۔ ماضی قریب کے بہترین کاریگروں میں ایک نام استاد فیاض خان کا ہے جنہیں آفتاب موسیقی کہا جاتا ہے۔ ان کا تعلق آگرہ گھرانے سے تھا۔ خاندانی پس منظر بہترین موسیقاروں سے تھا اور بے پناہ ذہنی استعداد نے انہیں اپنے دور کا عظیم ترین موسیقار بنا دیا۔ ان کے نانا غلام عباس خان نے انہیں اپنے گھرانے کی کاریگری کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنے کے بعد دوسرے گھرانوں کے اساتذہ کے پاس بھیجا

ہوں کہ صرف 90 سال میں آپ کی زہنیت غلامانہ ہو گئی مگر نو سو سال کی حکمرانی کا اثر آپ میں کیوں باقی نہ رہا۔

کیرن گرے کے اس سوال کا جواب نہ ہمیں اس وقت سوچنا تھا نہ اب ہمارے پاس اس کا کوئی معقول جواب ہے۔ کسی صاحب کے پاس ہوتا تھا میں۔

☆.....☆

فن موسیقی میں مسلمانوں میں پہلا نام مشہور صوفی بزرگ حضرت امیر خسرو کا ہے جو حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید خاص تھے۔ آپ کو موسیقی کی تمام شاخوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے اس وقت کے سب سے بڑے ہندو موسیقار بانسنگ گوپال کو کاریگری کے مقابلے میں شکست دی۔ برصغیر کے فن موسیقی پر امیر خسرو کے بڑے احسانات ہیں۔ انہوں نے خیال کرنا، نقش اور کئی دوسری اصناف موسیقی ایجاد کیں۔

قرون وسطیٰ میں حضرت امیر خسرو کے بعد دوسرا بڑا نام جو مسلمان موسیقاروں میں آتا ہے وہ نعت خان صدرا رنگ المعروف میاں تان سین (1535ء سے 1592ء) کا ہے۔ میاں تان سین کو مشرقی کلاسیکل موسیقی کا عظیم ترین کاریگہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کئی راگ ایجاد کیے۔ میاں کی مہار میاں کی نوڈی اور دوسرے کئی



جس سے خان صاحب نے اکتساب فن کیا۔

24 سال کی عمر میں استاد فیاض خان کو ایک محفل میں گانے کا موقع ملا جس میں پٹیل گھرانے کا مشہور گائیک میاں جان خان بھی موجود تھے۔ میاں جان خان نے نوجوان گلوکار کی برقرار منس دیکھ کر کہا ”اصل استاد تو تم ہو“ اس دور کے بڑے گلوکار کردار کے اعتبار سے بھی عظیم تھے۔ فن موسیقی پر استاد فیاض خان کی گرفت کا اندازہ ایک واقعے سے لگایا جاسکتا ہے جو استاد امراؤ بندو خان نے بیان کیا۔ ایک محفل میں خان صاحب نے تان بھیری تو ایک پنڈت جو پاس بیٹھے تھے بولے ”استاد صاحب! آپ نے غلط سُر لگایا ہے۔“ فیاض خان نے مسکرا کر پوچھا ”کیسے؟“ پنڈت نے کہا کہ شاستر میں اس طرح لکھا ہے۔ استاد نے پاس دھری شاستر سے کان لگا دیے۔ تھوڑی دیر بعد کہا ”پنڈت صاحب! یہ تو کچھ نہیں بولتی۔ اس نے جواب دیا کہ یہ بولے گی۔ تھوڑی اسے کھول کر دیکھیے کہ اس میں لکھا کیا ہے؟ استاد فیاض نے کہا ”اس میں جس طریقے سے لکھا ہے آپ اس طریقے سے گا کر دکھا دیجئے۔“ یہ سن کر ہندو پنڈت حیران رہ گیا اور اس کی بولی بند ہو گئی۔ خان صاحب نے 1950ء میں وفات پائی۔

استاد بڑے غلام علی خان پٹیل گھرانے سے تعلق رکھنے والا بہت بڑا نام ہے۔ خان صاحب ہمیشہ شخص تھے، خوراک پہلو انوں کے برابر تھی۔ بڑی بڑی سوچیں چلنے کا شاہانہ انداز۔ نہایت متاثر کن شخصیت کے مالک شخص کو دیکھ کر یہ ماننا مشکل ہوتا تھا کہ اس آدمی کی آواز نہایت ہی مدھر اور نازک ہے۔ وہ فن موسیقی کے تحقق اساتذہ میں سے تھے جن کی ایک ایک پہلو پر گہری نظر تھی۔ استاد صاحب کی گائی ہوئی ضرریاں مثلاً یاد بیا کی آ کی کئے نہ برہا کی رات پریم کے پسندے میں آ کر تھی نظر بیا کے بین وغیرہ ابھی تک سننے والوں میں مقبول ہیں اور ان کے ریکارڈ ہاتھوں ہاتھ بک جاتے تھے۔ استاد بڑے غلام علی خان کے چھوٹے بھائی استاد برکت علی خان بھی عظیم گائیکوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جن کی آواز کی صداقت بھی کبھی تو بڑے غلام علی خان سے بھی بڑھ جایا کرتی۔ باغوں میں بڑے جھیلے، دونوں جہاں تیری محبت میں بار کے اک ستم اور لاکھ آوازیں دھنرہ ایسے آنکھوں میں جنہوں نے استاد برکت علی خان کے ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا۔

موسیقی کی دنیا میں ایک بہت بڑا نام استاد علاؤ الدین

خان کا ہے جنہیں ”بابا“ کہا جاتا ہے۔ بنگال کے ایک معزز گھرانے میں جنم لینے والے علاؤ الدین کو موسیقی سیکھنے کے شوق نے گھر سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے گائیکی کے علاوہ سازوں کی موسیقی میں بھی بہت مہارت حاصل کی۔ وائلن، پیانو، کلارینٹ، شہنائی کے علاوہ ایسے سازوں کی تعداد سو سے زائد ہے جنہیں بھانے میں بابا علاؤ الدین کو مہارت تھی۔ انہوں نے مسٹر رابرٹ لو بو سے مغربی کلاسیکی موسیقی بھی سیکھی۔ تان سین گھرانے کے استاد

مظہر امراؤ بندو خان



وزیر خان نے علاؤ الدین خان کو چالیس سال تک سرودا رباب، سرستھار کے علاوہ دوسرے ساز بجانے سکھائے اور دھریہ کے ساتھ ساتھ موسیقی کی دیگر اصناف کا بھی ماہر بنا دیا۔ بابا علاؤ الدین خان نے کئی راگ ایجاد کیے۔ ان میں وہ جملہ اوصاف موجود تھے جو تان سین گھرانے کا خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ دیسے انہوں نے مختلف گھرانوں کے پانچ سو سے زائد اساتذہ سے فن موسیقی پاریکیاں سیکھیں یوں انہیں اس پر عبور حاصل ہو گیا۔

کسی فرد کے گھرانے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے کس استاد سے سب سے طویل عرصے تک تعلیم حاصل کی اور وہ اس کے انداز میں موجود خوبیوں کو کتنے انداز میں ادا کر سکتا ہے۔ یہ فرق نہایت واضح تھے اور



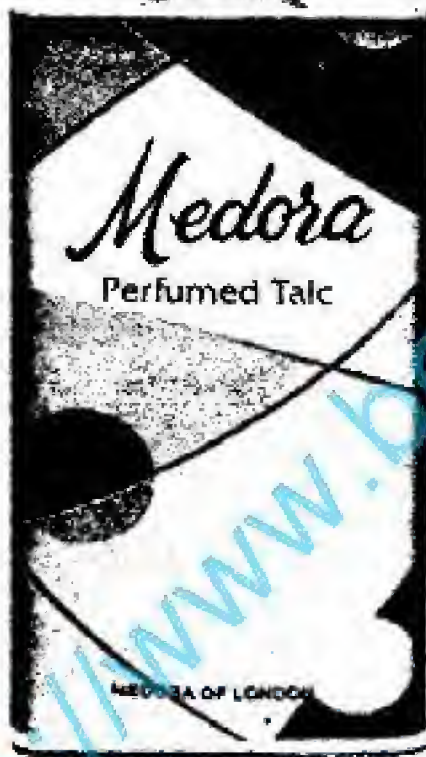
# Medora

Perfumed Talc

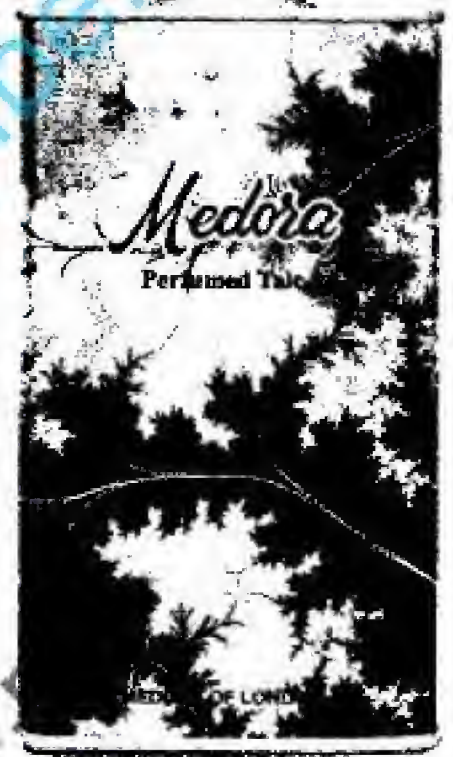
خوشبو جو دل کو بہائے  
تازگی جو ہر کوئی چاہے

Joy

Cherish



میں اور ہر فیوڈلک  
کی تازگی چاہتا  
خوشبو جو  
میں آپ کو ملے گا فریش  
احساس جو دھڑکتا ہے  
آپ کے ساتھ



8 مختلف وافریم خوشبوؤں میں دستیاب ہے

Pleasure, Cherish, Joy, Season, Passion

Salute اور Dignity, Greetings

MEDORA OF LONDON



کی بنا پر گھرانوں کی حد بندیاں کی گئیں لیکن قدیم اساتذہ میں ایک دوسرے کا احترام لازم سمجھا جاتا تھا۔ استاد اللہ دیا خان کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ جب ایک گائیک نے ان کے سامنے دوسرے کا مذاق اڑایا تو استاد صاحب نے اسے سختی سے ڈانٹا اور کہا "ایسی بات مت کرو اور کسی کو بھی احترام نہ دو۔ ہر کسی کے گانے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔"

استاد اور گھرانے کی گائیکی کئی امور میں نہایت فائدہ مند بھی ہے کہ اس سے گائیک میں چٹکی آتی ہے۔ یہ چٹری موسیقی کے جدید اسکولوں میں سیکھنے والوں کے لیے نہایت مشکل ہے۔ ایک مرتبہ مشہور مغنیہ سدھیش وری دیوی نے کہا تھا "کون سا اسکول استاد کا مقابل ہو سکتا ہے۔ میرے استاد نے مجھے ٹوڈی راگ کے 18 انداز سکھائے۔ کس اسکول میں فن اس گہرائی تک سکھایا جاتا ہے۔ یہ تو شوقیلیٹ حاصل کرنے کا دور ہے فن سیکھنے کا نہیں۔"

اساتذہ فن میں ایک بہت بڑا نام استاد امیر خان کا ہے جو جنوبی ہند سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی آواز میں جادو کا سا اثر تھا۔ ایک مصنف کے بقول خان صاحب کا گایا ہوا میٹھ اور لالیٹ راگ انسان کو گرد و پیش کی دنیا سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ امیر خان نے باقاعدہ طور پر کسی بھی گھرانے کی شاگردی اختیار نہیں کی تھی اس لیے ان کی گائیکی میں کئی گھرانوں کی خصوصیات کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ اپنے انداز گائیکی کو "اندور گھرانہ" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ فن موسیقی کی تمام تر اصناف میں مہارت کے باوجود وہ عوامی اجتماعات میں ٹھمری نہیں گایا کرتے تھے کیونکہ وہ استاد بڑے غلام علی خان کو ٹھمری کا اپنے سے بہتر گائیک مانتے تھے۔ مشہور ہندو گائیک پنڈت گوکلاتھ ساؤجی نے ہوہو استاد امیر خان کا انداز اپنایا۔ ایک مرتبہ بھارتی ریڈیو پر پنڈت جی نے استاد امیر خان کی گائی ہوئی غزل گائی۔ دونوں کی آواز میں اس حد تک مشابہت ہے کہ پاکستان سے بہت لوگوں نے بھارتی ریڈیو کو خط لکھے کہ استاد امیر خان مرحوم کی غزل کسی دوسرے کے نام سے چلا دی گئی۔ پنڈت امر ناتھ کے مطابق موجودہ موسیقاروں میں سے 60 فی صد استاد امیر خان کے انداز سے متاثر ہیں۔ ان کا انتقال 1974ء میں ایک ٹریفک حادثے میں ہوا۔

مسلمان گائیکوں میں ایک اور نام استاد ولایت خان کا ہے۔ ان کا شجرہ نسب میاں تان سین سے ملتا ہے۔ انہیں موجودہ عہد کے عظیم ترین گلوکاروں میں سے ایک کہا

جاسکتا ہے۔ انہوں نے میوزک فیئول بمبئی میں پہلی پبلک پرفارمنس دی تو بمبئی کے ایک تھیمز نے ان کا شور کھ دیا۔ تھیمز میں لوگ بھر جانے کے بعد لاڈلہ اسٹیکر لگائے گئے اور تھیمز کے باہر 10 ہزار لوگوں نے استاد ولایت خان کو گاتے ہوئے سنا۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ملکہ برطانیہ نے انہیں مجلس میں مدعو کر کے ان کی گائیکی سنی۔ اپنے فن سے خلوص کا یہ عالم تھا کہ بھارتی حکومت نے انہیں 1964ء میں پدماشری اور 1968ء میں پدم بھوشن ایوارڈ دینے کا اعلان کیا جو بھارت کے سب سے بڑے اعزاز ہیں تو انہوں نے یہ ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ بمبئی میں شامل افراد کی فنی اہلیت اتنی نہیں کہ وہ میرے فن کو پرکھ سکیں۔ استاد ولایت خان نے ستار نوازی کو ایک نیا انداز دیا اور ستار کے تار 7 سے کم کر کے 6 کر دیے اور اس پر بہترین پرفارمنس دی۔ 2004ء میں انہوں نے وفات پائی۔ فن گائیکی کے علاوہ مختلف سازوں کے بجانے میں بھی مسلمان فنکاروں نے اپنا آپ منوایا۔ استاد نسیم اللہ خان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے شہنائی کو کلاسیکی موسیقی کا حصہ بنادیا۔ وہ شہرت کو تاپسند کرتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ فنکار کو صرف سنا جانا چاہیے۔ وہ ایشیا اور یورپ کے کئی ممالک کا دورہ کر کے اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ موسیقی کے گھرانوں میں بعض بھائیوں کی جوڑیاں بہت مقبول ہوئیں جو مل کر گاتے اور شائقین سے اپنے فن کی داد وصول کرتے۔ استاد امانت علی خان اور فتح علی خان ایسی ہی ایک جوڑی تھی جن کا تعلق پٹنالا گھرانے سے تھا۔ سلاست علی خان اور نزاکت علی خان بھی بہت مقبول ہیں جو شام چوراسی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیگر برادران بھی مل کر اپنے فن کا جادو جگاتے ہیں۔ یہ استاد ظہیر الدین خان اور فیاض الدین خان ہیں۔

مسلمان خواتین گلوکاراؤں نے بھی موسیقی میں اپنا لو منوایا۔ ملکہ موسیقی روشن آراہیم کو زشتہ صدی کی سب سے بڑی گلوکارہ کہا جاسکتا ہے۔ وہ فن کی باریکیوں سے پورا طرح آگاہ اور آگرہ گھرانے کے انداز میں اعلیٰ ترین معیار کی گائیکی پیش کرنے پر قادر تھیں۔ پھر ملکہ بھارہ اختر کی بائی ایالے دانی، نیکم اختر خواتین کا وہ ٹیکا جو کلاسیکل موسیقی میں منفرد مقام رکھتی ہیں اور ان کے ذہن کے بغیر اس فن کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا۔



نئی دنیا کی تلاش میں سینکڑوں جہاں گرد اپنی جان گنوا بیٹھے۔ صرف چند ایک مہم جو کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ انہی خوش قسمت مہم جو میں ایک بڑا نام سیموئل ڈی چیملپ لین ہے۔ اس نے کس طرح کینیڈا کو دریافت کیا اسے جاننے کے لیے لکھا گیا ایک مختصر اہم مضمون۔

## نئی دنیا

طارق عزیز خاں



نئی سرزمین تلاش کرنے والے مہم جو کا تذکرہ

دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے۔ کینیڈا کا کل زمینی رقبہ 99 لاکھ 70 ہزار 6 سو 10 مربع کلومیٹر اور مسوچوہ (2011ء) آبادی 4 کروڑ کے قریب ہے۔ کینیڈا کے شمال میں بحیرہ منجمد شمالی پر مشتمل قطب شمالی کا علاقہ ہے جبکہ جنوب میں ریاست ہائے متحدہ امریکا، مشرق میں شمالی بحر اوقیانوس، شمال مشرق میں خلیج نیفن، مغرب میں شمالی بحر الکاہل اور شمال مغرب میں الاسکا واقع ہیں۔ کینیڈا کی سرزمین پر یورپین کے قدم سن 1000ء میں پہلے جب ماروے۔ سے تعلق رکھنے والے بحری قزاق لیف ایرکسن نے شمالی بحر اوقیانوس کو پار کر کے نیوفاؤنڈ لینڈ کے علاقے کو دریافت کیا اور پانچویں کے دور میں کینیڈا کی سرزمین تک رسائی کی پہلی بلحاظہ کوشش 1497ء میں ہوئی جب اطالوی نژاد برطانوی مہم جو جیمز کیبوت نے مشرقی کینیڈا سے

سرزمین کینیڈا کی دریافت کے حوالے سے فرانسیسی جغرافیہ دان اور مہم جو، سیموئل ڈی چیملپ لین (Samuel de Champlain) کی مہمات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے 1608ء میں کیوبک کے علاقے میں نئے فرانس (New France) کے نام سے پہلی فرینچ کولونی سلطنت کی بنیاد رکھی جو اگلے 150 سال تک قائم رہی۔ وہ 1612ء سے اپنی وفات (1635ء) تک نیو فرانس کا پہلا وائسرے رہا۔ چیملپ لین کے اقدامات کے نتیجے میں امریکا اور کینیڈا کی سرحد پر واقع عظیم جھیلوں (Great Lakes) کے علاقے کا سروے ممکن ہوا۔

بڑا عظیم شمالی امریکا کا سب سے بڑا ملک کینیڈا رقبے کے لحاظ سے ریشمن فیڈریشن (رقبہ 17,075,200) کے بعد

©2015ء

135

ماہنامہ سرگزشت



عمریوڈو پونٹ (Fancois Grave Du Pont) کی مہم سے وابستہ ہو کر بحراوقیانوس پار کرنے کا پہلا موقع ملا۔

فرینکوکس کے چار بحری جہازوں نے فروری 1603ء کی شروعات میں شمالی فرانس سے مہم کا آغاز کیا۔ انہوں نے اگلے پانچ ہفتوں کے دوران شمالی بحراوقیانوس کو پار کر کے مشرقی کینیڈا میں نیوفاؤنڈ لینڈ اور جزیرہ نما نووا سکوشیا (Nova Scotia) کے درمیان واقع خلیج سینٹ لارنس (Gulf of St Lawrence) میں رسائی حاصل کی۔ وہ خلیج کو پار کر کے اس کے مغربی حصے میں واقع دریائے سینٹ لارنس کے چوڑے دہانے کے اندر داخل ہوئے۔ فرانسیسی بیڑے نے 15 مارچ کے دن دریائے سینٹ لارنس اور دریائے سیکوئے (Saguenay) کے سنگم پر واقع ٹھیک اس جگہ ٹکر کر کے جہاں آج ٹاڈو ساک (Tadoussac) کی چھوٹی سی بندرگاہ واقع ہے۔

فنگی پر قدم رکھتے ہی مقامیوں کی ایک بھیڑ نے یورپین کو گھیر لیا۔ ان کے قدم لیے، رنگ سرخی مائل سفید اور جسم مضبوط تھے۔ انہوں نے سر پر ہندمی پٹی سے پرندوں کے پر اڑتے ہوئے تھے اور جانوروں کی کھالوں سے اپنے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ مشرقی کینیڈا میں آباد مونٹیک نیس (Montagnais) قبائلی تھے۔ ان کے سردار بیگو رات (Begourat) نے فرانسیسیوں کو اپنی سرزمین پر خوش آمدید کہا اور ان سے سمور (Fur) کی تجارت پر آمدگی ظاہر کی۔

جیمپ لین نے فرینکوکس کو مقامی شکاریوں کے ساتھ لین دین میں مصروف دیکھ کر چھوٹی کشتیوں کے سہارے دریائے سینٹ لارنس کی سیاحت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے دریا کے شفاف اور ٹھہرے ہوئے پانی میں جنوب کی طرف مہم کا آغاز کیا۔ دو خط استواء سے 46 ڈگری شمال کے خط پر دریائے سینٹ لارنس سے آکر ٹپنے والے ایک دریا کے دہانے پر پہنچا۔ جیمپ لین اسے ری چیلی (Rechellieu) کا نام دیا۔ اس نے سفر جاری رکھا، یہاں تک کہ وہ خط استواء سے 45.35 ڈگری شمال کے خط پر دریائے سینٹ لارنس اور دریائے اوٹاوا (Ottawa) کے سنگم پر واقع مونتریاں کے موجودہ جزیرے تک پہنچا۔ یاد رہے کہ مونتریاں کے جزیرے کو جیکوٹس کارنیر نے اکتوبر 1535ء کے دن دریافت کیا تھا۔ جہاں اس زمانہ میں شکاریوں کی ایک ہستی آباد تھی۔ کارنیر نے جزیرے کو ری چیلی (Mont-Royal) نام دیا۔

تصل نووا سکوشیا اور نیوفاؤنڈ لینڈ کو دریافت کیا۔ 16 ویں صدی کی دوسری دہائی میں فرانس بھی دریافتوں کی دوڑ میں شامل ہو گیا۔ 1524ء میں فرانسیسی حکومت نے اطالوی نژاد مہم جو، گیووانی ڈاؤریاز کو شمال مغرب کی طرف سے چین تک رسائی کی مہم پر روانہ کیا۔ اس مہم کے نتیجے میں ورازانو نے امریکا کی مشرقی ساحلی پٹی کو دریافت کیا، تاہم وہ مزید شمال میں جانے کی بجائے یورپ واپس چلا آیا۔ 1534-36ء کے دوران فرانسیسی مہم جو، جیکوٹس کارنیر (Jacques Cartier) نے شمالی بحراوقیانوس کو پار کر کے کینیڈا کی مرکزی سرزمین کو دریافت کیا اور اسے اس کا موجودہ نام دیا۔ کارنیر کی مہمات کے نتیجے میں فرانس کے بادشاہ فرانس اول (1494-1547) نے کینیڈا کی ملکیت کا دعویٰ کیا۔ فرانسیسی حکومت نے کینیڈا میں پہلی فرنگ کالونی کی بنیاد رکھنے کی منصوبہ بندی کی۔ تاہم اگلے کئی عشروں تک یہ منصوبہ بار آور نہ ہو سکا۔ 17 ویں صدی کے آغاز پر فرانسیسی مہم جو، سیموئل چیمپ لین نے کارنیر کے قدموں کے نشان پر سفر کرتے ہوئے کینیڈا میں قدم رکھا۔ اس نے مشرقی کینیڈا کے علاقوں میں فرنگ خاندانوں کو آباد کرنے کے ایک جامع پروگرام کو شروع کیا جس کے نتیجے میں شمالی امریکا کی سرزمین پر ”نیو فرانس“ کے نام سے ایک نئے نوآبادیاتی دور کا آغاز ہوا۔

سیموئل ڈی چیمپ لین 1567ء میں مغربی فرانس میں خلیج بسکے کے کنارے واقع قصبے برواج (Brouage) میں پیدا ہوا۔ اس کے اباؤ اجداد پیشہ ور طاح تھے۔ اس کا بچپن اپنے باپ اور چچا کے ساتھ خلیج بسکے کی بندرگاہوں کے تجارتی سفر کرتے ہوئے گزرا۔ اس نے لڑکپن میں ہی بحری جہاز رانی کے آلات کے استعمال میں مہارت حاصل کی۔ 1597ء میں جیمپ لین ایک تجارتی بحری جہاز کا کپتان مقرر ہوا۔ اس نے 1598ء میں اپنے چچا کے بحری جہاز سینٹ جولین (Saint Julien) میں جنوبی افریقہ کی بندرگاہوں کا تجارتی سفر کیا۔ وہ 1601ء میں دارالحکومت پیرس چلا آیا اور بادشاہ ہنری چہارم (1553-1610) کے دربار سے بطور جغرافیہ دان وابستہ ہو گیا۔ پیرس میں قیام کے دوران جیمپ لین کی فرانسیسی مہم جو، جیکوٹس کارنیر کی مہمات کے تحریری ریکارڈ تک رسائی ممکن ہوئی۔ اس نے ان مہمات سے متعلق مواد کا باریکہ بنی بنی مطالعہ کیا اور فرانس کی حکومت کے لیے شمالی امریکا کے نقشے تیار کیے۔ اس دوران جیمپ لین کو فرانسیسی بحری، فرینکوکس



(Spednik) سے لکھا ہے۔ یہ خلیج فنڈ سے میں سمائے جانے سے پہلے کینیڈا کے صوبے نیو برنس وک اور امریکی ریاست مینی کی سرحد کا کام دیتا ہے۔ دریا کا بیسن بیٹھے پانی کی چھوٹی بڑی جھیلوں سے انا ایک سرسبز علاقہ ہے۔ فرانسیسی ہم جوڈس کی آمد کے وقت یہاں ایل گون کوئن (Algonquian) زبان بولنے والے شکاری قبائل آباد تھے۔

جیمپ لین اور اس کے ساتھیوں نے موسم گرما کے دوران قرب و جوار کے علاقے کی سیاحت کی اور وہاں بس رہے مقامیوں سے جانوروں کی کھالوں کا لین دین کیا۔ انہوں نے سر دیاں گزارنے کے لیے دریا کے کنارے لکڑی کے تین سیمن تیار کیے۔ موسم سرما کے عروج پر پورا علاقہ شدید دھند اور برقی طوفانوں کی زد میں رہا۔ دریائے کروکس اور خلیج کا بیشتر حصہ ٹھنڈ ہو گیا اور قرب و جوار کی سر زمین کئی کئی فٹ برف کی تہ کے نیچے دب گئی۔ جان لیوا ٹھنڈ اور خوراک کی کمی کی وجہ سے فرانسیسیوں کے 79 میں سے 44 لوگ ہلاک ہو گئے۔ 1605ء کے موسم گرما کے دوران جیمپ لین نے خلیج مینی کے مغرب میں واقع نیو برنس ویک سمیت امریکی ریاست مینی، نیو ہیم شائر اور میساچوسٹس میں کیپ گڈ (Cape God) تک کے ساحلی علاقے کا نقشہ تیار کیا۔ اس نے نئے علاقے کو "آکیڈیا" (Acadia) کا نیا نام دیا اور اس کی تحریک پر تین درجن فرانسیسیوں نے ڈوگا ڈی مونٹس کو آکیڈیا کا پہلا گورنر منتخب کر لیا۔ انہوں نے اگلے دو سال خلیج مینی کے ساحلوں پر گزارے اور 1607ء کی گرمیوں کے دوران فرانس واپس پہنچ گئے۔ فرانسیسی بادشاہ ہنری چارم نے جیمپ لین کی ہم کو سراہا۔ اس نے مشرقی کینیڈا اور شمال مشرقی امریکا پر مستقل آکیڈیاک کی ملکیت کا دعویٰ اور وہاں پہلی فریج کالونی کی بنیاد رکھنے کے اقدامات شروع کر دیے۔

1608ء کے موسم بہار میں سیوکل جیمپ لین نے فرانسیسی حکومت کی سرپرستی اور ڈوگا ڈی مونٹس کے مالی تعاون سے کینیڈا تک رسائی کی تیسری ہم کا آغاز کیا۔ فرانسیسی بیرونیک شپ Don-de-Dieu (خدا کا تحفہ) اور Levier (شکاری کتا) نام کے دو بڑے بحری جہازوں پر مشتمل تھا۔ چنانچہ 150 سے زیادہ افراد میں آباد کاری کے لیے چھ فرانسیسی خاندان بھی شامل تھے۔

دونوں بحری جہازوں نے بحر اوقیانوس پار کیا اور اپریل کے آخر میں خلیج سینٹ لارنس سے ہوتے ہوئے

نام دیا جو آگے چل کر مونٹریال سے تبدیل ہو گیا۔ جیمپ لین، مونٹریال کے جزیرے پر آباد مقامی انڈینز سے کھل مل گیا۔ اس نے مقامیوں کی بات چیت سے اعزازہ لگایا کہ دریائے سینٹ لارنس وہاں سے 250 کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع بیٹھے پانی کی ایک بڑی جھیل سے نکلتا ہے۔ مقامیوں نے انکشاف کیا کہ اس جھیل کے مغرب میں عظیم جھیلوں کا ایک سلسلہ واقع تھا۔ جیمپ لین نے خیال کیا کہ یہ جھیلیں اس براعظم کے مغرب میں واقع سمندر تک رسائی کا ذریعہ ہو سکتی تھیں۔ جیمپ لین نے مونٹریال سمیت قرب و جوار کے علاقے کا نقشہ تیار کیا۔ وہ عظیم جھیلوں کے علاقے تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا، ہم اس کے ساتھیوں نے واپسی کا مطالبہ کیا۔ جیمپ لین نے فرینکونس کی قیادت میں یورپ واپسی کا سفر شروع کیا اور ان کے بحری جہاز 20 ستمبر 1603ء کو شمالی فرانس کے ساحلوں پر پہنچ گئے۔

سیوکل جیمپ لین نے پیرس میں بادشاہ ہنری چارم سے ملاقات کے دوران اپنے سفر کی روداد پر روشنی ڈالی۔ اس نے بادشاہ کی تحریک پر اپنی ہم سے متعلق سفر نامہ تحریر کیا۔ جس میں شمالی بحر اوقیانوس میں کینیڈا تک رسائی کے آسان بحری راستے کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس نے وسائل سے بھرپور کینیڈا کی سر زمین خاص کر دریائے سینٹ لارنس کے درخیز کناروں کو فرانسیسی آبادکاروں کے لیے ایک مثالی مقام قرار دیا۔ جیمپ لین کے ترغیب دلانے پر فرانسیسی مہم تاروں نے بحر اوقیانوس کو پار کرنے کی مہمات ترتیب دیں۔

سیوکل جیمپ لین نے مارچ 1604ء میں فرانسیسی پیر جیرے ڈوگا ڈی مونٹس (Pierre Dugua de Monts) کی قیادت میں دوسری بار کینیڈا کا سفر اختیار کیا۔ ان کے دو بحری جہاز مینی کے آغاز میں مشرقی کینیڈا سے متصل جزیرہ نیا نووا سکوشیا کے قریب پہنچے۔ انہوں نے کینیڈا کی مرکزی سر زمین تک رسائی کے لیے جزیرہ نیا کے شمال میں واقع خلیج سینٹ لارنس کی بجائے جنوب میں واقع خلیج مینی (Gulf of Maine) کا انتخاب کیا۔ جیمپ لین کی راہنمائی میں دونوں بحری جہازوں نے خلیج مینی اور خلیج فنڈ (Gulf of Fundy) کے سنگم پر خط استواء سے 45 ڈگری شمال پر 367 ڈگری مغرب کے خط پر واقع دریائے سینٹ کروکس (St Croix River) کے دہانے کے قریب ٹکرا گئے۔ لگ بھگ 200 کلومیٹر لمبا دریائے سینٹ کروکس، امریکا اور نیڈا کی سرحد پر واقع جھیل پیڈ تک (Lake



دریائے سینٹ لارنس میں داخل ہوئے۔ جیمپ لین نے 3 جولائی 1608ء کے دن خط استواء سے 47.50 ڈگری شمال اور 71.13 ڈگری مغرب کے خط پر دریائے سینٹ لارنس کے کنارے کیوبک (Quebec) شہر کی بنیاد رکھی جسے موجودہ کینیڈا کی حدود میں قائم ہونے والی پہلی یورپین کالونی کا اعزاز حاصل ہے۔ جیمپ لین نے کینیڈا کے علاقوں کو "نیو فرانس" کا نیا نام دیا۔

مئی 1610ء میں ہنری چہارم کے قتل کے بعد جیمپ لین کو فرانس واپس آنا پڑا۔ اس نے نو سالہ بادشاہ Louis XIII کی سرپرست ملکہ میری ڈی میڈیسی (Marie de Medici) سے ملاقات کی۔ اس نے ملکہ کو نیو فرانس میں فرانسیسیوں کی آبادکاری سے متعلق اعتماد میں لیا۔ میڈیسی نے جیمپ لین کو نیو فرانس کا پہلا وائسرائے مقرر کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کینیڈا تک رسائی کے لیے مزید مہمات روانہ کرنے کا اعلان کیا۔

جیمپ لین نے 27 دسمبر 1610ء کو پیرس میں ایک دولت مند خاتون سے شادی کی۔ وہ اپریل 1611ء میں نئے وسائل کے ساتھ واپس کینیڈا پہنچا۔ اس نے 1612ء میں باقاعدہ طور پر نیو فرانس کے پہلے وائسرائے کا حلف اٹھایا۔ جیمپ لین کی زندگی کے اگلے 23 سال مشرقی کینیڈا پر فرانس کے قبضے کو مستحکم بنانے کے لیے ایک طویل جدوجہد سے عبارت ہیں۔ اس نے اس قلیل عرصے میں وسائل جمع کرنے لیے فرانس اور کینیڈا کے درمیان ایک درجن سے زیادہ بار بحران قیام کئے۔ اس نے دریائے سینٹ لارنس کے کنارے فوجی قلعے تعمیر کروائے اور نیو فاؤنڈ لینڈ، نیو برنس ویک اور کیوبک کے علاقوں میں آباد مقامی انڈینز قبائل کو فرانسیسی بادشاہ کے تابع کرنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا۔ جیمپ لین نے مقامی انڈینز کو فرانسیسی فوج میں بھرتی کرنے کا پروگرام شروع کیا اور ان میں بدین طرز معاشرت اپنانے کے آداب سکھائے۔ اس کیوبک اور اونٹاریو کی حدود میں عیسائی مشنریوں کے وفد روانہ کیے۔ اس کیوبک پر عظیم جمیلوں کے علاقے میں متحدہ دوریا نشیں ممکن ہوئیں۔ جن میں جمیل ہورن (Lake Huron)، جمیل اوٹاوا (Lake Ontario)، جمیل سپیریئر (Lake Superior)، جمیل مشی مکن (Lake Michigan)، جمیل ایری (Lake Erie) اور جمیل جیمپ لین نمایاں ہیں۔

جیمپ لین 1633ء میں فرانس کے آخری دور سے

کے بعد کینیڈا واپس پہنچا۔ وہ 1634ء میں کیوبک شہر میں تھا اور نیو فرانس کے نام سے لگائے اپنے پودے کو پھلتا پھول دیکھ رہا تھا۔ اس نے 1635ء کے موسم بہار میں عیسائی مشنریوں کے ایک وفد کو دریائے سینٹ لارنس میں مونٹریال کے جزیرے پر روانہ کیا۔ وہ جزیرے پر نیا شہر بسانے آرژوند مند تھا، تاہم جیمپ لین کی یہ خواہش اس کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی اور 25 دسمبر 1635ء کو اس کا کیوبک میں انتقال ہو گیا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے بتاتے چلیں کہ جیمپ لین کی وفات کے بعد 1640ء میں چالیس فرانسیسی آبادکاروں نے مونٹریال کے جزیرے پر پہلی فرنج کالونی کی بنیاد رکھی اور مقامی لوگوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی۔ یہ جیمپ لین کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج 45 لاکھ کی آبادی مشتمل مونٹریال، کینیڈا کا سب سے بڑا اور پیرس کے بعد فرنج زبان بولنے والا دنیا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔

ایک اندازے کے مطابق سیمول جیمپ لین نے 1603ء سے 1612ء کے دوران فرانس سے کینیڈا تک رسائی کی تحن نمایاں مہمات کے دوران مجموعی طور پر 50 ہزار کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ اس نے مشرقی کینیڈا اور شمال مشرقی امریکا کے لگ بھگ 15 لاکھ مربع کلومیٹر علاقے کو دریافت کیا۔ جیمپ لین نے 1608ء میں نیو فرانس کی نوآبادی سلطنت قائم کی جو 1763ء تک قائم رہی۔ 1750ء کی دہائی میں اپنے دور عروج پر یہ سلطنت کینیڈا اور امریکا کے 60 لاکھ مربع کلومیٹر کے قریب رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں عظیم جمیلوں سمیت دریائے سینٹ لارنس اور دریائے سینی کے تین کا پورا علاقہ نیو فرانس کی سلطنت کا حصہ تھا۔ 18 ویں صدی کے آخر میں برطانیہ نے کینیڈا کو فتح کر کے لیے مہمات ترتیب دیں۔ ان مہمات کے نتیجے میں فرانس کی عملداری کیوبک تک محدود ہو گئی جبکہ کینیڈا کے 90 فی صد کے قریب علاقے پر برطانیہ کا کنٹرول قائم ہو گیا۔ 4 جولائی 1776ء کو ریاست ہائے متحدہ امریکا کے اعلان آزادی کے بعد کینیڈا کے عوام نے بھی غیر ملکی قبضے کے خلاف آزادی شروع کر دی۔ کینیڈا کی آزادی کا یہ سفر اگلے سو تک جاری رہا، یہاں تک کہ یکم جولائی 1867ء کو کینیڈا برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ جس کے بعد انچوائے میں فرانس بھی کینیڈا کی آزادی حثیت کو تسلیم کرتے ہوئے کیوبک اور متحدہ علاقوں کی ملکیت سے دستبردار ہو گیا۔

# الوداع

حبیب رزاقی

اپنی قومی ایئر لائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایئر لائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب و روز کی لفظی تصویر کہ رہے ہیں طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

بازوق قارئین کے لیے توصیہ خاص



ہے۔ "انکار کی گنجائش نہ تھی نوکری خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ میں ان کے ساتھ اپنے دفتر لوٹ آیا۔ ابتدائی کام شروع کرنا چاہا لیکن ممکن نہ ہوا۔ اس لیے کہ جہاز خریدنے کے لیے جو بنیادی معلومات تھیں وہ تک ان کے پاس نہیں تھیں۔ طے پایا کہ جیسے ہی مجھے کچھ فرصت ملے گی میں شام جا کر ان کے ساتھ یہ کام مکمل کروں گا۔ اس دوران میں وہ ان تمام معلومات کو اکٹھا کریں گے جن کی مجھے ضرورت ہے۔ یہ میرا یکن کا پہلا اور آخری سفر تھا۔

معمولی نوعیت کا شاید ایک ہی شہر ہے۔ جہاں ہر چیز مختصر پیمانے پر ملتی تھی سوائے نئی پارلیمنٹ بلڈنگ کے۔ لوگ چھوٹے، دوکانیں چھوٹی، مکان چھوٹے مگر بلند۔ مکان یہاں چھوٹے سے پلاٹ پر بنائے گئے تھے۔ زیادہ تر میں ایک منزل پر ایک ہی کمرہ بخش میں دو۔ ہر عمارت

سنا ہے ایک زمانے میں نجران کا علاقہ جو اب سعودی عرب میں ہے، یمن کا حصہ ہوتا تھا۔ یمن سعودی عرب کا ایک طرح سے کنٹرول تھا۔

یمن ایئر لائنز کے B-737 جہاز بھی سعودی عرب نے ہی دلوائے تھے اور اب انجن کے اس کنٹریکٹ کی باری تھی۔ میں نے کنٹریکٹ کا تجزیہ کر کے رپورٹ چمٹی تھی پہلے عدنان کو بھجوا دی۔ آج کا قصہ میری حد تک ختم ہو چکا تھا۔ JT8D انجن کی سرمایہ بینک کے بعد میں مانٹریال سے واپس آ چکا تھا کوئی تین ہفتہ قبل۔

عدنان کے دفتر سے بلاوا آیا۔ وہاں پہنچا تو ایک صاحب سے تعارف ہوا۔ "یہ یہیہ کے ٹیکنیکل کے سربراہ ہیں۔ یہیہ کو ایک A300 جہاز خریدتا ہے۔ ان صاحب کے ساتھ اس کے سوا صفات پر تم کو کام کرنا

ماہنامہ معرکہ گزشت

© 2015

[139]



یہ مرحلہ بھی خیریت سے گزر گیا۔ اب میں آزاد تھا۔  
میں کی چیزیں باؤں میں نہ تھیں۔

RB-211 انجن کا کنٹریکٹ BA کے ساتھ ختم

ہو چکا تھا۔ نیا کنٹریکٹ Qantas کے ساتھ طے پایا۔  
اس وقت سعودیہ کے پاس سو سے زیادہ RB-211 انجن  
تھے۔ دس انجن کا کنٹریکٹ بھی ایک بڑا کنٹریکٹ ہوتا ہے۔  
RB-211 انجن کا کنٹریکٹ بہت ہی بڑا کنٹریکٹ تھا۔  
Qantas نے اپنے پاور پلانٹ کے نیچر مسٹروس بار کا کو  
مستقل طور پر جدہ میں ٹھیکات کر دیا تھا تاکہ Qantas  
بہترین طور پر اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکے۔ Qantas  
کے لیے سب سے بڑا مفتی مسٹر سڈنی اور جدہ کے درمیان کا  
فاصلہ تھا۔ روس کو ٹھیکنی بنانا تھا کہ اس مسئلے کے باوجود سعودیہ  
کو بروقت انجن یا اس کے پرزہ جات لانے لے جانے میں  
کوئی کوتاہی نہ ہو ورنہ یہ گاڑی زیادہ دور نہ چل سکتی تھی۔  
روس ایک قاضی انجینئر اور مینیجر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک  
اچھے انسان بھی تھے۔ شریف النفس، دھیمی طبیعت، ہونٹوں  
پر ہر وقت مسکراہٹ۔

سڈنی کی پہلی کارکردگی کی سہ ماہی مینٹگ میں کرٹ  
نے شرکت کی تھی۔ دوسری مینٹگ میں مجھے جانا تھا۔ میں  
سڈنی پہلی دفعہ چار ہاتھ۔ میں نے مینٹگ سے متصل ہفتہ وار  
چھٹی کے ساتھ تین دن مزید چھٹی لے لی۔ تاکہ راستے میں  
دو دن تھائی لینڈ بھی رک سکوں۔ میرے ساتھ انجن شاپ  
کے زین الدین کو بھی جانا تھا مگر ان کی فلائٹ الگ دن تھی۔  
ہم دونوں کو مقررہ دن سڈنی میں ہونک میں ملنا تھا۔ بینکا کے  
میں میرا قیام نہ تھا۔ مجھے پھوکیٹ جانا تھا پھر وہاں سے جیمز  
بونڈ آئی لینڈ۔ وقت کم تھا۔

بالی کے بعد پھوکیٹ میرا پسندیدہ جزیرہ تھا جہاں میں  
چھٹیاں گزارنے جاتا تھا۔ بے حد خوب صورت جگہ لوگ  
بہت منسار۔

پھوکیٹ پہنچا تو سفر کی ٹکان تھی۔ کھانا کھا کر سو  
باہر جانے کا موقع نہ ملا۔ دوسرے دن صبح جیمز بونڈ آ  
لینڈ جانا تھا۔

راستے کا پانی بہت اٹھلا تھا۔ بعض جگہ تو پانی کی  
کی تھی کہ کشتی کو چوبلی بجائے بانس سے کھینچنا پڑتا تھا۔  
کار منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

اس جزیرے کا نام پہلے کچھ اور ہوتا تھا مگر یہاں  
میں ایک فلم کی شوٹنگ ہوئی تھی جس کے بعد سے

تین چار یا پانچ منزل۔ ایک منزل پر ملاقات کا کمراد دوسری پر  
کھانے پکانے اور کھانے کا اہتمام اس کے اوپر خواب گاہ  
وغیرہ وغیرہ۔

زیادہ تر عمارتیں پتھر کی بنی ہوئی تھیں۔ یہ پتھر مقامی طور  
پر دستیاب تھے۔ اور کئی رنگوں میں تھے جو قدرتی تھے ان پر رنگ  
دروغن کی ضرورت نہ تھی۔ ان پتھروں کا رنگ ان دھاتوں کا  
مرہون منت ہوتا ہے جو اس میں شامل ہوتی ہیں۔ یمن کا پتھر  
خانہ کعب میں بھی بہت استعمال ہوا ہے۔

کام دو تین دن میں ختم ہو چکا تھا مکنہ مواصفات تیار ہو  
چکے تھے۔ میرا کام مکمل ہو چکا تھا۔ یمنیہ نے مجھے تازہ گھمانے  
کی پیشکش کی جو مجھے منظور تھی۔ میں اور میرے ساتھی یمنیہ کے  
دو افسروں اور ڈرائیور کے ساتھ تازہ کے لیے روانہ ہو گئے۔  
تازہ پہاڑی علاقہ ہے۔ بہت پر فضا۔ سعودی عرب کے  
علاقے بحر ان سے متصل۔

راستے میں ڈرائیور نے کہا۔ "اگر آپ لوگ اجازت  
لیں تو ہم کات کے بازار سے ہوتے ہوئے چھٹیں بارہ بجتے  
والے ہیں۔ ایک دو گھنٹے بعد یہ بازار بند ہو جائے گا۔ معلوم  
کرنے پر پتا چلا کہ کات ایک شہر کا پتہ ہوتا ہے جس میں خوار یا  
ہلکا نشہ ہوتا ہے۔ یہ یمن کی تہذیب کا جز لازم ہے۔ خاص  
خاص جگہوں پر اس کے باقاعدہ بازار لگتے ہیں جہاں کات کی  
کاشت کرنے والے اس کو لانا کر بیچتے ہیں۔ یہ بازار دس بجے  
صبح سے لے کر تقریباً دو بجے تک چلتے ہیں۔"

بازار میں پہنچ کر دیکھا تو کات کے پتے کچھ نیم کے  
چوں کی طرح دکھائی دیے۔ جب لوگ اپنی ضرورت کے  
مطابق کات خرید لیتے ہیں تو پھر کات کی محفل جمتی ہے۔ جس  
میں کات کی کوئل چوں کو منہ میں جمع کر کے اس کا رس حلق  
سے اتارتے ہیں جس سے ان کو سرور ملتا ہے۔

☆.....☆

ہم ہوٹل پہنچے تھے۔ ڈرائیور نے کات کا گھٹھا اٹھایا۔  
دونوں افسروں نے ہم سے دو گھنٹے بعد ملنے کا وعدہ کیا اور کات  
کی محفل جمانے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

مجھے یمنیہ کے کنٹریکٹ مینیجر کو کنٹریکٹ کے اسرار و رموز  
سے شناسائی کروانی تھی۔ مجھے شرعی کے دفتر کا پس بارہ سال  
پہلے کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب L-1011 کے کنٹریکٹ کی میری  
رپورٹ دیکھ کر شرعی کا نظام صوتی کلام کا محفل نہ رہا تھا۔  
انہوں نے ہاتھ کے اشاروں سے مجھے اپنے دفتر سے دُور ہو  
جانے کا عندیہ مرحمت فرمایا تھا۔

ماہنامہ سرگزشت



کا نام جیمز بوٹل آئی لینڈ پڑ گیا۔ آئی لینڈ ٹھیک ٹھاک تھا۔ اتنا خاص نہ تھا جتنا اس کا شہرہ تھا۔ دوپہر کو واپسی تھی۔ کھانا نور میں شامل تھا۔ کھانے کے لیے راستے میں ایک جگہ رکنا تھا۔ یہ جگہ پہاڑی کے دامن پر بنائی ہوئی ایک چھیروں کی بستی تھی۔ اونچے اونچے بانسوں پر لکڑی کے بڑے بڑے تختے بچھا کر یہ بستی بنائی گئی تھی۔ تمام گھر لکڑی کے بنے ہوئے تھے سوائے ایک عمارت کے۔ یہ عمارت ایک مسجد تھی۔ بستی کے رہنے والے مسلمان تھے اور اسی مسجد میں عبادت کیا کرتے تھے۔ میں نے اپنے گائیڈ سے آدھا گھنٹا مسجد میں گزارنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے کہا جلدی آ جانا کھانا کسی کا انتظار نہیں کرے گا۔ تم کو ایسا سی فوڈ پورے تھائی لینڈ میں نہیں ملے گا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا اور مسجد کی طرف چل پڑا۔

مسجد کے مؤذن صاحب مل کر بہت خوش ہوئے۔ ان کو پاکستان کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہ تھیں بس یہ معلوم تھا کہ یہ ایک بڑا اسلامی ملک ہے۔ انہوں نے اپنی بیوی اور بیٹی سے بھی ملوایا۔ زیادہ وقت نہ تھا میں کھانے کی جگہ واپس آ گیا۔ کھانا ایک لمبے اور پتلے کمرے میں لمبی لمبی تین میزوں پر سجا ہوا تھا۔ ان میزوں پر جس جس قسم کا سی فوڈ آپ کے ذہن میں آ سکتا تھا موجود تھا۔ پھلی، جھینگے، اسکوئڈ، کیکنڈے، گھونگے، سپایاں اور بہت کچھ۔ گائیڈ کا کہنا صحیح تھا کہ اتنی انواع میں اور اس وافر تعداد میں سی فوڈ پورے تھائی لینڈ میں ملنا مشکل تھا حالانکہ بینکاک میں بھی بہت اعلیٰ سی فوڈ ریسٹورنٹ ہیں۔

کھانا کھا کر واپس پھوکیٹ۔ شام کی فلائٹ سے بینکاک۔ پھر سڈنی۔ سڈنی میں میسٹنگ کے دو دن پہلے پہنچا تھا تا کہ میں سڈنی شہر اور اس کے ارد گردی کے علاقوں میں گھوم سکوں لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ہوٹل پہنچا تو مجھے بخار ہو چکا تھا۔ اگلے دن دوپہر کو طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔ میرے ساتھی زین ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ مجھے فون کیا۔ ”سڈنی میں کیا کیا دیکھ لیا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ابھی تو صرف ہوٹل کا کمرہ اور ہاتھ روم دیکھا ہے۔ جب سے آیا ہوں بخار نے جکڑ رکھا ہے۔“

”اگر اب بہتر ہو تو بوٹل آئی لینڈ چلتے ہیں۔“ بوٹل آئی لینڈ کا مشہور بیچ ہے۔

”ابھی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”دو مہینے بعد۔“

چ پر تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد میں اور زین شہر گھومنے نکل گئے۔ سڈنی میں مجھے محسوس ہوا کہ یہاں پر انگریزوں کی تہذیب کا کافی حد تک اثر موجود ہے۔ گوکہ آسٹریلیا، برطانیہ کی کالونی تھا لیکن پہلا یورپ کا باشندہ جس نے آسٹریلیا میں قدم رکھا اس کا نام ولیم جاسزون تھا جس کا تعلق نیدر لینڈ سے تھا۔ یہ 1606ء میں آسٹریلیا گئے تھے۔ برطانیہ کے جیمز کک بہت بعد میں 1770ء میں بوٹلی بے پر اترے۔ بوٹلی بے آج کے سڈنی کا پرانا نام ہے۔ 1788ء میں انگلستان نے بوٹلی بے کو باقاعدہ اپنی کالونی بنا لیا۔ یہاں پر انگلستان کے معزول مجرموں کو سزا کے طور پر رکھا جاتا تھا۔ آج کے اکثر گورے آسٹریلین انہی مجرموں کی اولادیں ہیں۔ بعد میں بہت سے لوگ آسٹریلیا آ کر آباد ہو گئے۔ یہاں تقریباً دنیا کے دو سو ملکوں سے آ کر لوگ آباد ہوئے ہیں۔ آسٹریلیا کی آبادی تقریباً کراچی کی آبادی کے برابر ہے۔ آسٹریلیا جڑیہ ہے۔ زیادہ تر آبادی جڑیہ کے چاروں طرف ساحلوں پر ہے۔ جڑیہ کے اندرونی حصہ بہت کم آباد ہے جہاں زیادہ تر ایپو رینجیسی لوگ رہتے ہیں جو پہلے نیم وحشیوں کی طرح رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ پچاس ساٹھ ہزار سال پہلے انڈونیشیا سے آ کر بوٹلی بے وغیرہ کے علاقوں میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کا رنگ بہت کالا اور ٹانگ بے تحاشا پھیل ہوئی ہوتی ہے۔

۶۶.....۶۷

Qantas کے ساتھ میسٹنگ شروع ہو چکی تھی۔

جن لوگوں نے اس تحریر کو یہاں تک پڑھنے کی ہمت کی ہے ان کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میسٹنگ کا اہم ترین جز چائے کا دور ہوتا ہے۔ جب یہ کام سرانجام پا چکا تو انہیں کام کا مزہ پڑ بھٹ آیا۔ اس کی تفصیل نیند کی گولیوں کا کام دے گی۔ اس سے اجتناب سب کے حق میں بہتر ہو گا۔ میسٹنگ کے دوران کام کا اہم جز تو چائے ہے مگر میسٹنگ کے بعد اہم ترین موضوع رات کے کھانے کا ہوتا ہے۔ فرانس میں کسی کسی دن ہم لوگوں کو چائے اور کھانے کے درمیان کام کا بھی مزہ مل جاتا تھا لیکن سڈنی تو لوہوں کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ سڈنی میں کام زیادہ اور پیٹ پوچا کم۔

رات کا کھانا سڈنی بار بر میں ایک کشتی میں تھا۔ مقررہ وقت پر لوگ اس کشتی پر سوار ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ کشتی ساحل کی طرف جاتی اور اگلے تین گھنٹے سڈنی بار کے گرد چکر لگاتی۔ اس کشتی میں کھانے کے کمرے اس



نگاہ سے خطرناک ہو سکتی تھی خاص طور سے پرانے جہازوں کے لیے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے یونٹنگ نے ایک مرمت (موڈی فیکیشن) تیار کیا جو سیکشن 41 موڈی فیکیشن کہلایا۔ یہ بڑا کام تھا کئی ہزار ٹھکنے کا۔ سعودیہ کو بھی اپنے پہلی کھپ کے B-747 پر یہ کام کروانا تھا۔ اس کے کرنے کے لیے خاص مہارت کی ضرورت تھی۔ جس کمپنی سے یہ کروایا جائے اس کی استعداد، قابلیت، مہارت اور تجربہ کا جانچنا ضروری تھا۔ سعودیہ کی ٹیم جو ان کمپنیوں کا جائزہ لینے اور معائنہ کرنے گئی اس کی سربراہی میرے ذمے تھی۔

آسٹریلیا میں ایک کمپنی Asta کے نام سے تھی ان کا ہیڈکوارٹر بھی دیکھنا تھا۔ یہ کمپنی پہلے آسٹریلیوی حکومت کے پاس تھی پھر اس کی بیج کاری کے بعد اب یہ Asta کے نام سے کام کر رہی تھی بعد میں اس کو روکول نے خرید لیا۔ اب یہ یونٹنگ کی ملکیت ہے۔ Asta کا دفتر اور ہیڈکوارٹر ملبورن میں تھے۔ ہم ملبورن، بینیکاک سے گئے تھے۔ راتین راتوں کے علاوہ تھائی لینڈ جن چیزوں کے لیے مشہور ہے ان میں مگر بچھ اور سانپ کی کھال سے بنی ہوئی چیزیں، تھائی سلک اور جواہرات خاص طور سے شامل ہیں۔

میں نے مگر بچھ کو تو کبھی تکلیف نہیں دی لیکن ایک دفعہ سانپ کی کھال کا بنا ہوا جوتوں کا جوڑا ضرور خریدا تھا۔ ان جوتوں کے علاوہ میں تھائی سلک بھی خرید چکا تھا مگر اس دفعہ ماں کی فرمائش پر مجھے تھائی سلک ایک بار اور خریدا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ایک کم قیمت انگوٹھی بھی۔ تھائی سلک لینے میں تھامسن سلک کی دکان پہنچ گیا۔ یہ دکان جم تھامسن کی یادگار ہے۔ تھائی سلک کا ذکر جم تھامسن کے ذکر کے بغیر ادھر ہے۔ جم تھامسن کی کہانی غیر معمولی اور دلچسپ ہے۔ ان ایک طرح سے تھائی سلک کی صنعت کا بانی اور محافظ کہا جاسکتا ہے۔ جم امریکی باشندے تھے ابتدائی طور پر انہوں نے بحیثیت آرکیٹیکٹ کام کیا پھر دوسری جنگ عظیم کے دوران OSS میں شامل ہو گئے۔ OSS کو بعد میں تو ڈاکٹر IA کو تشکیل کیا گیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جم تھائی لینڈ آئے جہاں انہوں نے OSS کا آفس قائم کیا۔ 1946ء میں تھائی لینڈ جم نے آرمی کو خیر یاد کیا اور 1946ء میں تھائی لینڈ انگوٹھا پتھر سلک کی کالج انڈسٹری کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے اپنا سارا وقت اور محنت وقف کر دیا۔ تھائی سلک کمپنی

طرح بنائے گئے تھے کہ ہر طرف شیشے لگے ہوئے تھے۔ لوگ کھانا بھی کھاتے جاتے اور ہاریر کے منظر سے بھی لطف اندوز ہوتے۔ سڈنی کا مشہور و معروف آپرہاؤس بھی سڈنی ہاریر پر ہے۔ اس کا کشتی کے بادبانوں جیسا ڈیزائن اپنی نظیر آپ ہے۔ بلاشبہ بے نظیر۔ اس کا ڈیزائن ڈنمارک کے آرکیٹیکٹ یورن اتران کا بنایا ہوا ہے۔ یہ ایک انعام یافتہ ڈیزائن تھا جو یورن نے سخت بین الاقوامی مقابلے کے بعد 1957ء میں جیتا تھا۔ رات کے وقت سڈنی آپرہاؤس کا دید ہوتا ہے۔ سڈنی ہاریر میں دوسری قابل دید چیز یہاں کا پل ہے جو سڈنی ہاریر برج کہلاتا ہے۔ یہ ایک محراب کی شکل کا اسٹیل کا بنا ہوا پل ہے۔ اس پر سے ٹرین، گاڑیاں، سائیکلیں اور پیدل چلنے والے سب گزرتے ہیں۔ یہ پل سڈنی کے کاروباری مرکز کو شمالی سڈنی سے ملاتا ہے۔ یہ دنیا کا دوسرا سب سے چوڑا پل ہے جو اتنا لمبا ہے۔ دنیا کا سب سے چوڑا لمبا پل کینیڈا کے شہر وینکوور کے پاس ہے جس کا نام پورٹ لین برج ہے۔

اس مجمع میں Qantas کے تمام انصران اعلیٰ مع اپنی بیگمات کے موجود تھے۔ روس ہارکھا بھی جدہ سے ہمارے ساتھ آئے تھے ان کی بیگم بھی ساتھ تھیں۔ بعض جوڑے ایسے ہوتے ہیں جن میں میاں بیوی دونوں متاثر کن اور دل آویز شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ روس اور ان کی بیگم کا شمار بھی ان جوڑوں میں ہوتا ہے۔ وقت بہت اچھا گزرا۔ کھانے سے زیادہ ماحول اچھا تھا۔ کل میٹنگ کا دوسرا اور آخری دن تھا۔

یہ میرا آسٹریلیا کا پہلا چکر تھا لیکن آخری نہ تھا۔ چونکہ میری دلچسپی کی بھٹی بخار منانے میں نکل گئی تھی۔ روس (Ross) نے وعدہ کیا کہ وہ اس زیادتی کا مداوا کریں گے۔ میری اگلی سیڑھی مجھے آسٹریلیا آنا ہوگا۔ ٹکٹ کی ذمہ داری Qantas کی تھی۔ اس ٹکٹ کا فائدہ نہ اٹھانا بھی زیادتی ہوتی۔ میری اگلی سیڑھی سڈنی میں گزری۔ یہ بھی آسٹریلیا کا آخری چکر ثابت ہوا۔ چند ماہ بعد میں پھر آسٹریلیا میں تھا مگر اس بار سڈنی نہیں بلکہ ملبورن۔

B-747 کی فیوز لاج (جہاز کا دھڑ) سیکشن میں بنا ہوا ہے۔ کاک پٹ جس سیکشن میں ہے وہ سیکشن 41 کہلاتا ہے۔ پچھلے چند سال کے دوران مختلف انٹر لائنوں کے جہاز 41 کے معائنے کے دوران اس میں کڑیک اور دوسرے نقص پائے گئے تھے۔ یہ صورت حال جہاز کی سیفٹی کے نکتہ



چوبیس تھا۔ دہلی تھی۔ لہذا وہ محل اوسط مگر مسکراہٹ دل میں اتر جانے والی۔ ”میں آنکھ بجے آپ کو اسی جگہ ملوں گی۔“ ماریانہ نے کہا۔

”میں اس کو کھولیوں۔“  
”کیوں نہیں۔ یہ کھولنے کے ہی لیے پیک کیا گیا ہے۔“

قلم پا کر ماریانہ کی آنکھوں میں بچوں جیسی خوشی کی چمک تھی۔ کھانا آچکا تھا۔ اس میں کئی طرح کے گوشت کے پتلے پتلے کئے ہوئے پارچے تھے۔ کچھ سبزیاں، چاول۔ کل صبح Qantas کی پرواز سے ملبورن جانا تھا۔ انگلی میری جیب میں تھی۔ اس کو ہونٹ میں چھوڑنا مناسب نہ تھا۔

ملبورن انٹرپورٹ پر فلائٹ رات میں پہنچی۔ Asia نے ہونٹ کا ہندو بست کر دیا تھا۔ ہم سیدھے ہونٹ چلے گئے۔ نو دس گھنٹے کی پرواز کے بعد صرف ایک چیز سوچتی ہے بستر، رات سونے لینا تو صبح کی خبر لی۔

صبح نو بجے کے قریب Asta کے ڈائریکٹر مارکینگ مسٹر والٹر ہونٹ کی لابی میں موجود تھے مع اپنی گاڑی کے۔ ان کی گاڑی میں سوار ہو کر ہم Asta کے لیے روانہ ہو گئے۔ Asta کا دفتر ملبورن سے کچھ قاصدے پر تھا۔ راستے میں ہم لوگ ایک اونٹنی پر سے گزرے۔ نیچے عقیق کھاکی تھی۔

سیکشن 41 سوڈی فیکشن کی Asta کی تیاری قابل ستائش تھی۔ ساری دنیا میں B-747 کے جتنے بھی جہاز متاثر تھے ان سب کا نقصانی ریکارڈ کمپیوٹر میں محفوظ تھے۔ سعودیہ کے جہازوں سمیت Asta کے لیے ضروری تھا کہ اگر وہ اپنی خدمات دنیا میں پہنچنا چاہتے تھے تو ان کی خدمات دوسروں سے بہتر ہوں اس لیے کہ آسٹریلیا بہت سے ملکوں سے بہت دور پڑتا ہے اور جو ممالک آسٹریلیا کے قریب ہیں یعنی آنکھ کھٹنے کی پرواز کے اندر۔ ان سب کے پاس خود اپنی صلاحیتیں موجود ہیں جیسے Haeco سنگاپور انٹر لائن، جاپانی انٹر لائن وغیرہ۔

Asta کا بیسکر بھی منفرد تھا۔ اس کی شکل گنبد نما تھی۔ اتنا بڑا گنبد نما بیسکر بنانا آسان کام نہیں۔ میننگ کا رآمد اور کامیاب رہی۔ وقت ہمارے پاس کم تھا۔ دو ہفتے سے بھی کم وقت میں دنیا کے کئی کئی کمرچہ و محروں کا معائنہ اور ابتدائی بات چیت کرنی تھی۔ ہم یورپ، امریکا اور آسٹریلیا

برائیز کی مشہور زمانہ فلم دی سنگ اینڈ آئی میں استعمال ہوئے۔ اس کے بعد سے تھامسن کی کمپنی ترقی پر ترقی کرتی گئی۔ جم کو غریب تھائی خواتین کا بہت خیال رہتا تھا۔ انہوں نے بے شمار کام کرنے والوں کو غربت کی دلدل سے نکالا۔ چند سال بعد وہ بے پناہ ہو گئے ہر طرح کی کوشش کے باوجود ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔

تھائی سلک میں خرید چکا تھا۔ اب مجھے مسٹر بھونگ کی دکان پر جا کر ایک انگلی خریدنا تھا۔ مسٹر بھونگ تقریباً میرے دوست بن چکے تھے۔ پچھلے چند برسوں میں، میں اپنے ایک سعودی ساتھی کے ہمراہ ان کی دکان پر تین چار مرتبہ جا چکا تھا۔ میرے یہ سعودی ساتھی بھونگ کے مستقل خریدار تھے وہ اکثر بھونگ کی دکان سے جیولری خرید کر لے جاتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تھائی لینڈ میں جواہرات کی خریداری میں دھوکے کا بہت امکان رہتا ہے۔ یہاں زیادہ تر سیاح زرنگی میں صرف ایک باری آتے ہیں۔ ان سیاحوں کو اگر ناقص یا جھوٹا مال بیچ بھی دیا جائے تو وہ اس کو واپس کرنے دوبارہ تھائی لینڈ نہیں آئیں گے۔ بھونگ نہ صرف ایماندار تھے بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی قیمتیں بھی مناسب ہوا کرتی تھیں۔ انگلی میں نے پسند کی اور خرید لی لیکن شاید بھونگ مجھے اپنا مستقل گاہک بنا کر میری وفاداریوں کو یقینی بنانا چاہتے تھے گوکہ اس دن کے بعد میں ان کی دکان پر دوبارہ پھر بھی نہیں گیا۔ انہوں نے اصرار کیا۔ ”آج رات کے کھانے پر تم میرے مہمان ہو۔ میں تم کو کوریا کا کھانا کھلاؤں گا۔“ میں نے کوریا کا کھانا پہلے بھی نہیں کھایا تھا گو کہ بعد میں مجھے یہ شرف اس وقت حاصل ہوا جب میں چند سال بعد کوریا کے شہر سیول گیا۔

”کپڑے اچھے پہن کر آنا۔“ بھونگ نے وارننگ دی۔

کپڑوں سے کھانے کا کیا تعلق۔ کیا تو کھانا کھانا کپڑے دیکھ کر دیا جاتا ہے۔ مجھے زیادہ دماغ نہ لڑا گیا۔ اچھے کپڑوں کی وجہ بھونگ کے برابر آکر کھڑی ہو چکی تھی۔ ”کھانے پر تم کو ماریانہ لے جائے گی۔ ماریانہ کورین ہے۔“

بتانے کی ضرورت نہ تھی۔ ماریانہ کو دیکھنے سے ہی ہر چل جاتا تھا کہ وہ کورین ہے۔ تھائی لوگوں کے مقابلے میں کورین لوگوں کے رنگ گورے ہوتے ہیں۔ ناک تقریباً ستواں اور چہرے کے نقش مختلف۔ ماریانہ کا پورا نام ماریانہ



دھار دکھائی دے رہی ہے۔“

ہوائی جہاز میں ہر طرح کے وزن احتیاط کے ساتھ مقرر کیے جاتے ہیں۔ بلند ہونے اور لینڈ کرنے کے وزن کی حدیں مقرر ہوتی ہیں۔ لینڈ کرتے وقت اگر جہاز کا وزن اس حد سے تجاوز کر جائے تو اس کے لینڈنگ میسر پر اثر پڑ سکتا ہے۔ لینڈنگ میسر نوٹ بھی سکتا ہے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے زائد ایندھن کو گرا دیا جاتا ہے تاکہ وزن کی حد مقررہ پر جہاز کو اتارا جاسکے۔ ہمارے جہاز نے جیسے ہی اڑان پکڑی اس کے ایک انجن میں خرابی پیدا ہو چکی تھی۔ جہاز کو واپس جدہ ائر پورٹ پر اتارنا لازمی ہو گیا تھا۔ بغیر ایندھن سمندر میں پھینکے جہاز اتر نہیں سکتا تھا۔

تیسرا جہاز جب مسافروں کو لے کر کراچی ائر پورٹ پر اترتا تو راست کے تین بج رہے تھے۔ شادی کی تقریب ختم ہو چکی تھی۔ دولہا دلہن تھکے میں تھے۔

کراچی میں جمعہ اور ہفتے کی درمیانی شب کو پہنچا تھا۔ اتوار کو مجھے زیورخ جانا تھا جہاں سوئس ائر اور پریٹ اینڈ ویٹی کے ساتھ A-300 کے انجن کے سمن میں میٹنگ میں شرکت کرنا تھا۔ میری پرواز اتر فرانس سے تھی۔ پہلے کراچی سے جیڑس پھر جیڑس سے زیورخ۔

اتر فرانس کی یہ پرواز بینکاک سے کراچی آتی تھی۔ میں اس پرواز سے دو تین دفعہ کراچی آچکا تھا۔ کراچی سے مسافروں کو لے کر یہ پرواز جیڑس کے لیے روانہ ہوتی تھی۔ کراچی سے بہت کم مسافر سوار ہوتے تھے۔

ائر پورٹ پہنچا تو وہاں ہر ایک صاحب اور ایک لڑکی کو اتر فرانس کے کاؤنٹر کے پاس کھڑا پایا۔ وہ صاحب آگے بڑھے اور کہنے لگے۔ ”یہ میری بیٹی ہے۔ چند دن پہلے اس کی شادی ہوئی ہے اسے شوہر کے پاس امریکا جا رہی ہے۔ آپ اس کا خیال رکھیے گا۔“ میں نے جواب دیا کہ ”مگر صرف جیڑس تک جا رہا ہوں۔“

”جہاں تک آپ جا رہے ہیں خیال رکھیے گا۔ میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“

لڑکی ویسی ہی دہلی پتلی سی تھی جیسی انہیں بائیس سا کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ہاتھوں کی مہندی چمکی پڑ چکی تھی۔ ابھی مٹی نہ تھی۔ کچھ کھوئی کھوئی سی کچھ کچھ اداس۔ کچھ باؤ کے آنکھن کی پیاس۔ کچھ ساجن سے ملنے کی آس۔ شاید اسی انہیں متضاد جذباتوں کا اثر تھا۔ ایک طرف بائیں۔ آنکھن سے پھرنے کا غم دوسری طرف جیون ساٹھی سے۔

آچکے تھے۔ اگلا اسٹاپ ہانگ کا ہنگ پھر واپس جدہ۔ یہ میرا دنیا کے گرد تیسرا چکر تھا۔ شاید ایک چکر اور لگانا پڑے۔ وقت بتائے گا۔

☆.....☆

کراچی میں شادی کی تقریب ختم تھی مجھے اس میں شرکت کرنا تھا۔ اس زمانے میں جدہ سے کراچی کے لیے کسی روز دو کسی روز تین پروازیں ہوتی تھیں۔ میں نے صبح دس بجے چلنے والی پرواز کا انتخاب کیا۔ وقت مقررہ پر مسافروں کو جہاز پر سوار کروایا گیا۔ پرواز کی اڑان کا وقت ہو چکا تھا مگر اڑنے کی تیاری کے کوئی آثار نہ تھے۔ جہاز کے دروازے ابھی تک کھلے ہوئے تھے۔ پھر وقت سے پندرہ منٹ اوپر ہو گئے۔ کپتان نے اعلان کیا کہ فنی خرابی کے باعث تاخیر ہو رہی ہے۔ پندرہ تیس منٹ اور لگیں گے۔ مزید آدھا گھنٹا گزر گیا۔ اعلان ہوا کہ فنی خرابی دور کرنے میں وقت لگے گا ہم آپ کو واپس لاؤنج لیے چلتے ہیں۔ لاؤنج میں دو گھنٹے انتظار کے بعد اعلان ہوا کہ یہ جہاز نہیں جاسکتا۔ دوسرا کوئی جہاز اس وقت موجود نہیں ہے۔ تین گھنٹے بعد دوسرا جہاز مسافروں کو لے کر کراچی جائے گا۔ جہاز میں خرابی کے ایسے واقعات کوئی غیر معمولی بات نہیں ہیں۔ ہوتے رہتے ہیں۔ تین گھنٹے بعد مسافر دوسرے جہاز میں بیٹھ گئے۔ جہاز فضا میں بلند ہو گیا۔

ہر ائر پورٹ پر جہازوں کے آنے اور جانے کے راستے متعین ہیں۔ آنے والے راستے Star اور جانے والے راستے Sids کہلاتے ہیں۔ جدہ سے کراچی پرواز کے لیے جہاز کو ایک خاص زاویہ سے جانا ہوتا ہے۔ ٹھوڑا سا سمت کی طرف جا کر پھر مشرق کی طرف جہاز مڑتا ہے۔ ہمارا جہاز مشرق کی طرف مڑنے کی بجائے سمندر کے رخ چلا گیا۔ میں منہ کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا میرے برابر میرے عزیز دوست ڈاکٹر یوسف کمال بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ ”اب ہم واپس جدہ ائر پورٹ جا رہے گے۔“ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ ”کیسے معلوم۔“ ان کا سوال غیر متوقع نہ تھا۔ ”جہاز سمندر میں فیول ڈسپ کر رہا ہے۔“ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ ”میں نے جواب دیا۔“

”آپ کو کیسے معلوم؟“

”میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا ہے۔“ ایندھن جھینکنے کی نالی باہر نکلی ہوئی ہے۔ ایندھن گرنے کی

کی گھن۔ کسی بھی لڑکی کے لیے یہ بڑی آزمائش کا مقام ہوتا ہے۔

یہ لڑکی شاید زندگی میں پہلی دفعہ از پورٹ آئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کو کسی چیز کی کوئی معلومات نہ تھیں۔ یہ اکیلی امریکا کیسے جائے گی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ بقول امام نذیر میرا جذبہ شفقت پدرانہ یکا یک دیو بن کر میرے سامنے کھڑا تھا۔ ”یہ لڑکی تمہاری ذمہ داری ہے۔ اس کو خیریت سے پہنچانا تمہارا کام ہے۔“ میرا بس چلتا تو میں امریکا جا کر اس کے سامن کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا کر لوٹا لیکن شاید سعودیہ کو یہ بات پسند نہ آتی کہ میں زیورخ کی میٹنگ چھوڑ کر امریکا بھاگ نکلوں۔

پیرس پہنچ کر میں نے اس سے کہا۔ ”آپ ٹرانزٹ لاؤنچ چلی جائیں۔“ جواب ملا۔ ”وہ کیا ہوتا ہے۔“ مزید تفصیل میں جانا غیر ضروری تھا۔

میری اپنی فلائٹ میں تقریباً ایک گھنٹہ پہلے تھا مگر اس لڑکی کو اس کے جہاز تک پہنچانا ضروری تھا۔ اگر میری فلائٹ چھوٹ بھی گئی تو میں دوسری فلائٹ سے یا ٹرین سے زیورخ جاسکتا تھا۔ اس لڑکی کو بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

میں جب اس کا پورڈنگ کارڈ لے کر اس کو اس کے ڈیپارچر گیٹ پر چھوڑ کر اپنی فلائٹ کی طرف آیا تو میری فلائٹ روانہ ہونے والی تھی۔ زیورخ پانچ منٹ کی دیر میرے لیے پریشانی کا باعث ہوتی مگر میرے جذبہ شفقت پدرانہ کو ایک گونہ سکون مل چکا تھا۔

ایسے موقعوں پر مجھے ہمیشہ مارٹینا یاد آ جاتی ہے۔ اس کا الہزپن، معصومیت اور ہچکنا نہ بے نیازی۔

سعودیہ کے 1011- لائسنس یافتہ جہاز میں فرسٹ کلاس اور اکانومی کلاس کے درمیان ایک کیمین ہوتا تھا جس میں سینوں کی ٹین یا چار قطاریں ہوا کرتی تھیں جو کبھی کبھار کا عملہ اور ملازمین بڑی تعداد میں سعودیہ کا کاروباری اور ذاتی سفر کیا کرتے تھے۔ اس کیمین میں زیادہ تر سعودیہ کے ملازمین کوئی بیٹیس دی جاتی تھیں تاکہ دوسرے مسافروں کو ان کی وجہ سے کسی قسم کی دشواری یا تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ آج مجھے بھی اس کیمین میں سیٹ ملی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ چکا تھا۔ میں سعودیہ کا دفتری کام ختم کرنے کے بعد لندن سے جدہ واپس جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد ایک نوخیز فوجی کیمین میں داخل ہو میں۔ پورڈنگ کارڈ پر اپنا

سیٹ نمبر دیکھ کر میرے برابر آ کر کھڑی ہو گئیں۔ ان کے ہندو قبا کا ذکر لازمی ہے کہ یہ سارا کھیل ان کی اسی ہندو قبا کا ہے۔

شہر میں ان کے رنگ حنا کی ہندو قبا کی بات چلی انہوں نے بغیر آستین کی بہت زیادہ نیچے گلے والی بنیان نما چیز پہن رکھی تھی۔ اس ڈھیلی ڈھالی بنیان کے اوپر سرخی مائل نارنجی رنگ کی بلاؤز زیب تن کر رکھی تھی جس کی آستینوں نے کانٹھوں سے کہنی تک دونوں ہاتھوں کو ڈھانک رکھا تھا۔ سامنے سے بلاؤز پوری طرح سے کھلا ہوا تھا۔ کمر سے کچھ نیچے بلاؤز میں ایک ڈھیلی سی گرو ہندھی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے انتہائی کسی ہوئی جینز جو پنڈلیوں تک جا کر اختتام پذیر ہوئی تھی۔ ماتھے سے اوپر بالوں پر کالی ٹیک۔ منہ میں چوبیس گم ہاتھ میں دو بیگ۔

بڑے بیگ کو اوپر بٹے ہوئے سامان کے خانے میں رکھنے کے بعد انہوں نے میرے برابر والی سیٹ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ سیٹ ان کی ہے۔ میں کھڑے ہو کر ایک طرف ہو گیا کہ وہ اپنی سیٹ تک رسائی حاصل کر سکیں۔ سیٹ پر بیٹھ کر انہوں نے دوسرا بیگ اٹھایا اور جھٹک کر اس بیگ کو اپنے سامنے والی سیٹ کے نیچے سامان کے لیے بنی ہوئی جگہ پر رکھ دیا۔

بیگ کو ٹھکانے لگانے کے کارخیز کے بعد جب وہ ایک جھٹکے سے اپنی سیٹ پر سیدھی ہونے لگیں تو اس جھٹکے کی تاب نہ لاتے ہوئے ان کی بنیان نما جامہ علم بغاوت بلند کر دیا۔

محترمہ نے بنیان کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر کھینچا اور اس کو ٹھیک کرنے کے بعد میری طرف مسکرا کر یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں ”آپس کی بات ہے۔“ مجھے جہاز نکسنوی کی نظم ”نورا“ کے اختتامی شعر اس صورت حال کی عکاسی کرتے دکھائی دیے۔

ادھر میرے دل میں تو محشر بپا تھا مگر اس طرف حال ہی دوسرا تھا ہنسی اور ہنسی اس طرح کھٹکھٹا کر شمع حیا رہ گئی جھملا کر نہ سہی مسکراہٹ رہی سہی محشر میری طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بھی اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ ابھی مصافحہ ختم ہی ہوا تھا کہ وہ خواتین کے مقبول ترین مشغلے میں مشغول ہو گئیں۔ باتیں بغیر رکے لاقندی باتیں۔



خود ہی سوال کرتیں اور خود ہی جواب دیتیں۔ مجھے سچ سچ میں ہوں ہاں کرنے اور سر ہلانے کی اجازت تھی۔ اپنی طرف سے بغیر کوئی سوال پوچھے ہوئے ہی۔ میرے پاس ان کی فائل مع تمام اہم کوائف کے تیار ہو چکی تھی۔

مارٹینا کا تعلق ڈنمارک سے تھا۔ عمر انیس سال چار مہینے اور ساڑھے دس دن۔ آدھے دن کا حساب یوں تھا کہ وہ رات دس بجے کی مبارک ساعت پر اس دنیا میں وارد ہوئی تھیں۔ ابھی لندن میں صبح کے صرف نو بجے تھے جو ڈنمارک میں صبح کے دس کا ٹل تھا۔ ابھی ان کی پیدائش کے مہینے میں گیارہواں دن مکمل ہونے میں پورے بارہ گھنٹے باقی تھے۔ لہذا ابھی عمر عزیز کے بیسویں سال کے پانچویں مہینے کے صرف ساڑھے دس دن پورے ہوئے تھے۔ گیارہ نہیں۔ بات معقول نکلی۔

مارٹینا کا ایمان تھا کہ ہائی اسکول کے آگے پڑھائی جاری رکھنے سے ذہن پر مضرت اثرات مرتب ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ وہ یہ خطرہ مول لینے کے حق میں نہیں تھیں۔ باتوں کی شوقین اس لیے تھیں کہ زیادہ باتیں کرنے سے ذہن کو جلا ملتی ہے۔ باتوں کے علاوہ وہ گھومنے کی شوقین تھیں۔

اپنے اس گھومنے کے شوق کو پورا کرنے کی خاطر وہ پچھلے ایک سال سے SAS انٹر لائن میں بطور ایئر ہوسٹس کام کر رہی تھیں۔ اسی دوران ان کے کسی دوست نے ان کی توجہ سعودی انٹر لائن کے اشتہار کی طرف دلائی کہ سعودی انٹر لائن کو تجربہ کار ایئر ہوسٹس کی ضرورت تھی۔ مارٹینا نے درخواست دی، انٹرویو ہوا۔ منتخب ہو گئیں۔ آج کی پرواز سے وہ اپنی نوکری کا آغاز کرنے کی غرض سے عازم جدہ تھیں۔ یہ ان کا جدہ جانے کا پہلا اتفاق تھا۔

اب تکتن میں صرف سنتا رہا تھا لیکن اب میرے بولنے کا موقع آ گیا تھا۔ مارٹینا کو سعودی عرب کے رسم و رواج سے متعلق معلومات پہنچانا ضروری تھا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی سادگی کی وجہ سے کسی ایسی دیکھی مشکل میں پڑ جائے۔ میرا خیال تھا کہ یہ کام بہت آسان ہے۔ اس میں کسی قسم کی دشواری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ میں غلط تھا۔

جب میں نے مارٹینا کو سعودی عرب میں عورتوں کے لباس کے متعلق بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہاں پر زیادہ تر خواتین اپنے لباس کے اوپر عجیب بھی پہنتی ہیں تو اس کو یقین نہیں آیا۔ وہ مجھے آزادی نسواں پر کچھ دینے کو تیار ہو گئی۔ میرے لیے

یہ صبر آزمائیت تھا۔ وہ مجھ سے اس بات پر بحث کر رہی تھی کہ جس پر نہ تو میرا ہی کوئی اختیار تھا اور نہ ہی اس کا۔ صبر کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

جب اس کا جوش ذرا خفنا پڑا تو میں نے اس کو سہولت کے ساتھ سمجھایا کہ یہ اس ملک کا دستور اور قانون ہے۔ یہاں اس کو آزادی نسواں کا کوئی حامی نہیں ملے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ میرے مشورے پر عمل کرے۔ اگر وہ سعودی عرب میں رہنا چاہتی ہے تو درنہ خفندے خفندے اپنے دیس اپنے ماحول میں واپس چلی جائے۔

بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر نیند نے اسے آ دیو چا۔ سوتے میں وہ انتہائی معصوم دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی معصومیت دیکھ کر مجھے فیض صاحب کا شعر یاد آ گیا۔

ادلے حسن کی معصومیت کو کم کر دے  
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے  
میں نے اس کے شانوں پر کبل ڈال دیا۔ مارٹینا سوئی رہی۔ میں اس کے متعلق سوچتا رہا۔

مارٹینا کا تعلق ایک ایسے ملک سے تھا کہ جہاں پورے خاندان کا بغیر کپڑوں کے ساحل سمندر پر دھوپ سینکنا۔ دوڑ بھاگ کرنا۔ روزمرہ کی عام بات تھی۔ اس ماحول میں پٹنے بڑھنے والی کسی لڑکی کے لیے مختصر کپڑے پہننا یا ستر کا ٹکڑا جانا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ان لوگوں کے معاشرے میں ستر کا وہ تصور نہیں ہے جو اسلام میں ہے۔ اس ماحول میں پٹی ہوئی مارٹینا مجھے ایک سیدھی سادی، البڑ اور بے ساختہ لڑکی لگی جو کم عمری میں دنیا گھومنے کا شوق پورا کر رہی تھی۔ بغیر کسی خدشے کے کہ وہ کسی خطرناک حادثے سے بھی دوچار ہو سکتی تھی۔

اس واقعے کو دہراتے ہوئے مجھے مستنصر حسین تارڑ صاحب کی لال ٹھری یاد آ گئی۔ لیکن یہ تقابل مناسب نہیں۔ لال ٹھری کی زندگی تو ایک جی کا شکار ہو گئی تھی کہ سالگرہ کے چٹھے میں ملی ہوئی اسپورٹس کار چلاتے ہوئے ایک چاؤٹے کا شکار ہو گئی اور اپنی ٹانگ ٹنوا بیٹھی۔ مگر مارٹینا تو لالہ تھی کہ جس نے صرف بہار دیکھی تھی۔ خزاں کا تصور شاید اس کے خواب میں بھی نہیں آیا تھا۔

خزاں کے جو دستم کو نہ جس نے دیکھا  
پہاں نے جسے خون جگر سے پالا



جدہ آچکا تھا۔ میں نے اور مارٹینا نے اپنی اپنی راہ چکری۔

اس دن کے بعد سے میری مارٹینا سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی مذہبیٹر حالانکہ ہم دونوں ہی سعودی ائر لائن کی سہیا کی ہوئی رہائش گاہ سعودیہ سٹی میں رہتے تھے۔ اس کے باوجود جب بھی مجھے مارٹینا کا خیال آتا تو اس کا الہڑ پن اور اس کی بے ساختگی اور معصومیت یاد آ جاتی اور اس کے لیے میرے دل میں ایک ہی تمنا ابھرتی۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو

☆.....☆

زیورخ کی مینٹنگ کا تذکرہ غیر ضروری ہے کہ وہ روز مرہ کی عادی مینٹنگ تھی۔ کوئی غیر معمولی بات یا واقعہ نہ ہوا۔ البتہ مینٹنگ کے بعد کی مشغولیت کا ذکر ضروری ہے۔ یہ مشغولیت زیورخ کے ایک بڑے ہوٹل میں وقوع پذیر ہوئی۔

کھانے کی لمبی سی میز پر سترہ انھارہ لوگ موجود تھے۔ میز بانی سوئس انز کی تھی۔ لطیفوں کا دور چل پڑا۔ سعودی عرب میں سو سے اوپر شہریت کے لوگ کام کرتے ہیں۔ ہر شہریت والے نے دوسرے کے متعلق لطیفے بتا رکھے ہیں۔ دو تین افراد کی باری آئی اس کے بعد اور ہال شاپ کے سعودی سو پروائیز نے ایک لطیفہ سنایا۔

ایک کشتی میں چار لوگ سفر کر رہے تھے۔ ایک آئرش، ایک کیوبین، ایک سعودی اور ایک پاکستانی۔ بیچ سمندر میں پہنچے تو آئرش نے داسکی سے بھرا ہوا بکس پانی میں پھینک دیا۔ سب نے شور مچایا اتنی جیتی داسکی تم نے سمندر میں بہا دی۔ اس نے شان آستھٹی سے دیکھا اور کہا۔ ”کوئی بات نہیں آئر لینڈ میں داسکی کی کوئی کمی نہیں۔ ہمارے یہاں بہت داسکی ہوتی ہے۔“

اور تھوڑی دور گئے تو کیوبین نے ہوانا سگار کا بھرت بڑا ڈبہ سمندر میں بہا دیا۔ اس کا جواب بھی وہی تھا جو آئرش کا تھا۔ ”کیوبا میں لاتعداد سگار ہوتے ہیں ہم کو ان کی کوئی پروا نہیں۔“

”جب سعودی کی باری آئی تو اس نے پاکستانی کو اٹھا کر پانی میں پھینک دیا کہ سعودی عرب میں پاکستانیوں کی کوئی کمی نہیں۔“ پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ میری غیرت کو لکرا کر کیا۔

امریکا میں پولینڈ کے باشندوں کی دانش مندی کے

استے ہی چہ چہ ہیں جتنے سکھوں کی دانش مندی کے چہ چہ پاک و ہند میں ہیں۔ پولش لوگوں کا امریکا میں اسی طرح ذکر خیر ہوتا ہے جیسا ہمارے یہاں سکھوں کا۔

پریٹ اینڈ وٹنی نے جو اپنا مقامی انجینئر جدہ میں تعینات کیا تھا وہ بھی پولش تھا۔ اس کا نام اسٹاسکی تھا۔ وہ کھانے کی میز پر ہمارے ساتھ تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ”سعودی میرے بھائی ہیں میں ان کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ پولش لوگوں کے بارے میں کہہ سکتا ہوں اس لیے کہ میں آپ کو پولش لوگوں کے بہت قریب محسوس کرتا ہوں اگر آپ میرے نام میں صرف اس اضافہ کریں تو میں پولش بن جاؤں گا میرا نام رزا اسکی ہو جائے گا اور میں اسٹاسکی کا سگا نہیں تو کم از کم سوچتا بھائی ضرور لگوں گا۔“ اس کے بعد میں نے ایک سنا سنا یا قصہ سنا دیا۔ وہ قصہ یہ تھا۔ ایک دفعہ ایک امریکی ایک ڈاکٹر کے پاس گیا اور کہا۔ ”مجھے پولش بننا ہے۔“ ڈاکٹر کا منہ حیرت سے کھل گیا کہنے لگا۔ ”دنیا کا کوئی صحیح الدماغ آدمی پولش نہیں بننا چاہتا۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”کچھ بھی ہو مجھے پولش بنا دو یہ میری بچپن کی خواہش ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”اس کے لیے تمہارا آدھا دماغ نکالنا پڑے گا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”منظور۔“

آپریشن ہو گیا جب مریض ہوش میں آیا تو اس نے پوچھا کہ سب کام ٹھیک ٹھاک ہو گیا تو ڈاکٹر نے کہا۔ ”ایک تھوڑی سی غلطی ہوئی ماتحت ڈاکٹر نے آدھے کی بجائے پورا دماغ نکال دیا۔“

مریض نے کہا۔ ”مالش“ اور اٹھ کر چلا گیا۔

ہال ایک دفعہ پھر گونج اٹھا۔

یہ مالش چھٹی سیل والا مالش نہیں تھا۔ مالش عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کوئی بات نہیں۔ امریکی پورا دماغ نکلنے کے بعد پولش نہیں بلکہ سعودی بن چکا تھا۔

میرے سعودی دوستوں کو یہ بات زیادہ نہ بھائی مگر اس کے بعد سے کسی سعودی نے مجھے پاکستانیوں کے خلاف کوئی لطیفہ نہیں سنایا۔

اگلے روز جدہ واپسی تھی۔

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا

بس یہی بات ہے اچھی مرے ہر جانی کی

کیونکہ ہر جانی کا دل جدہ سے بھرتے لگا تھا۔

☆.....☆

سعودیہ کے پاس اس وقت پانچ 100-747 B

ماہ 2015ء



جہاز تھے اور ایک B747-SP ریاض اور جدہ سے نیویارک کی پرواز پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کا دھڑ چھوٹا ہوتا ہے۔ پیٹرول اتنا ہی ہوتا ہے جتنا B747-100 میں ہوتا ہے۔ پیٹرول اتنا ہی اور وزن کم۔ اس طرح یہ جہاز بغیر جدہ سے نیویارک جاسکتا تھا۔ اس میں یہ احتیاط ضرور رکھی جاتی تھی کہ آئرلینڈ کے شہرین میں اس کوری ڈیج کیا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسافروں اور سامان کے وزن کو اور ہوا کے رخ وغیرہ کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جاتا تھا کہ جہاز میں ایندھن بچا ہے وہ نیویارک جانے کے لیے کافی ہے یا نہیں اگر ایندھن کافی نہیں ہوا تو جہاز کو شہرین میں اتار کر اس میں مزید ایندھن بھرا جاتا تھا۔ ایندھن لینے کے لیے جب جہاز اترتا ہے تو اس کو ٹیکنیکل لینڈنگ کہا جاتا ہے اگر جہاز ٹیکنیکل لینڈنگ کرے تو اس کو وہاں سے مزید مسافر اٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔

ٹیکنیکل لینڈنگ کے امکانات کو کم سے کم کرنے کے لیے سعودیہ کی خواہش تھی کہ روس رائس اپنے RB-211 انجن کی کارکردگی کو بہتر بنانے پر غور کرے۔ B-747 کی اگلی کھپ میں اس پر کافی زور تھا۔

یہ اگلی کھپ چار جہازوں کی تھی تین B747-100 اور ایک B747-SP۔

اب مواصفات میری ذمہ داری نہ تھی۔ فلائیڈ اس کے ذمہ دار تھے مگر جہاز کے مواصفات سے اتنی آسانی سے رشید توڑنا مشکل تھا فلائیڈ بھی میرے سابقہ تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس لیے مجھے مواصفات کی میننگ میں بھی شرکت کرنی پڑی کہ اب میری ذمہ داری صرف جہاز کی خریداری کے سپر بیٹ تک محدود تھی۔

چونکہ B-747 کی پہلی کھپ میں تمام اہم معاملات طے پا چکے تھے ان چار جہازوں کی خریداری میں کوئی خاص مسئلہ نہ ہوا۔ مواصفات میں صرف چند تبدیلیاں کی گئیں جن کا محرک سعودیہ کا ان جہازوں کے اڑنے کے طور و سرعت کا تجربہ تھا۔ B-747 کی دوسری کھپ کی خریداری کے کنٹریکٹ پر دستخط ہونے کے بعد موقع تھا کہ میں بھی مشاغل لے سکوں۔ میں نے تین بیٹے کی چھٹی کی درخواست دی۔

☆.....☆

کالج کے زمانے میں ایک انگریزی فلم دیکھی تھی جس

میں جیک لیس، بٹلی ووڈ اور ٹونی کرٹس نے کام کیا تھا۔ فلم کا نام تھا "دنیا کے گرد اسی دن میں" وہ لوگ اسی (80) دن میں دنیا کے گرد گھومے تھے۔ میں بیس دن میں دنیا کے گرد گھوموں گا۔ یہ تھامیری چھٹی کا مقصد۔

پچھلے چند سال میں، میں آسٹریلیا کے علاوہ باقی چار براعظموں میں کافی گھوم چکا تھا گوکہ چند سال بعد میرا کئی دفعہ آسٹریلیا جانے کا اتفاق ہوا جس کا ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے۔ اب کی میں چند ایسی جگہوں پر بھی جانا چاہتا تھا جہاں پہلے کبھی نہیں گیا تھا مگر آسٹریلیا اس دور سے میں شامل نہ تھا۔ کینیڈا میں بھی چند دن گزارنے تھے میں کافی عرصے سے کینیڈا نہیں گیا تھا۔ ابتداء یورپ سے کرتا تھا۔ پہلا اسٹاپ میڈرڈ۔

میڈرڈ میں پہلے جا چکا تھا۔ اس زمانے میں جب میں برطانیہ میں پڑھائی کر رہا تھا۔ میڈرڈ کے علاوہ قرطبہ اور سیول بھی دیکھ چکا تھا۔ ٹولیڈو اور قرطبہ میڈرڈ سے سیول جاتے ہوئے راستے میں پڑتے ہیں۔ سیول میڈرڈ کے جنوب میں تقریباً ساڑھے پانچ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس دفعہ میں بارسلونا جانا چاہتا تھا جو میڈرڈ سے مشرق اور تھوڑا شمال میں سواچھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ میڈرڈ سے بارسلونا کا سفر بذریعہ ٹرین تھا۔

میڈرڈ سے بارسلونا کے لیے رات میں کوستا براوا ٹرین چلتی ہے جو نو یا دس گھنٹے کے سفر کے بعد صبح بارسلونا پہنچا دیتی ہے۔ اوپر نیچے دونوں برتھ پر رات کو سونے کا بندوبست ہوتا ہے۔ دو طرف ٹرین کی دیوار اور دو طرف ٹارپوٹین کے پردے۔ بیڈ روم جیسا آرام برتھ نہایت آرام دہ۔

مجھے میڈرڈ میں ہوٹل میں نہ ٹھہرنا تھا۔ چند گھنٹے رکنا تھا۔ وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہاں پر ایک صاحب مل گئے ان کا نام تھا آرتورو۔ یہ انگریزوں کے آرتھر کا ہم معنی ہے۔ آرتورو بارسلونا میں رہتے تھے۔ میڈرڈ کام سے آئے تھے اب گھر واپس جا رہے تھے۔

"بارسلونا میں کہاں ٹھہرو گے۔" آرتورو نے پوچھا۔ "معلوم نہیں، کوئی ہوٹل ڈھونڈوں گا۔ دو دن رکنا ہے۔"

"اگر تم میرا مشورہ مانو۔" آرتورو نے مشورہ دینا چاہا۔ "تو تم ہوٹل کی بجائے ہسپتال میں ٹھہرو وہاں تم کو گھر کا محسوس ہوگا۔" ہوٹل والے لوتے ہیں اور ٹھیک سے خیال

بھی نہیں رکھتے۔“

شہر گھومنے کے لیے بھی آرتورو کے مشورے قابل قدر تھے۔ ”سگراڈا فیملیا چرچ ضرور دیکھنا۔ ساری دنیا میں اس کی ٹکر کا کوئی چرچ نہیں۔ ساحل سمندر جانا وہاں پر پھیلی اچھی ملتی ہے اور جیسے جیسے بارسلونا میں ملتے ہیں اور کہیں نہیں مل سکتے ہم ان کو کامیاب کہتے ہیں۔ سمندری نمک کے ساتھ بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان نعمتوں سے محروم رہتے ہیں وہ سی فوڈ نہیں کھاتے۔ تم سی فوڈ کھاتے ہو؟“

”جی میں سی فوڈ کھاتا ہوں۔“ میں نے اقرار کیا۔

ٹرین آہنگی مٹی میں اور آرتورو اپنے اپنے ذہنوں کی طرف جارہے تھے کہ آرتورو کو کچھ یاد آگیا۔ اچانک مڑے اور کہا۔ ”ہاں مجھے ہوئے آکٹوپس کھانا مت بھولنا، باقی باقی۔“

اس نے تفصیلی مشورے شاید کوئی ٹریول ایجنٹ بھی مجھے نہ دیتا۔ میں نے آرتورو کا شکریہ ادا کیا اور اپنے ڈسبے کی طرف بڑھ گیا۔

پنسیون دراصل انگریزی زبان کا پشن ہے۔ یہ ذاتی کھروں کے وہ ایک دو کمرے ہوتے ہیں جو وہ مقامی لوگ جو ریٹائرڈ ہو چکے ہوتے ہیں کرائے پر اٹھا کر اپنی آمدنی بڑھانے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ میں ایک پنسیون چنچ گیا۔ بڑے میاں اور بڑی بی دونوں بہت محبت سے ملے۔ انگریزی سے زیادہ آشنا نہ تھے۔ دو دن واقعی اپنائیت کا پرسکون ماحول ملا۔ ناشتا بھی ملا۔

سب سے پہلے سگراڈا فیملیا دیکھنا تھا۔ یہ واقعی قابل دید عمارت تھی جس کا ڈیزائن کیتھڈرل کے آرکیٹیکٹ انٹونی گاؤڈی نے بنایا تھا۔ اس کے آٹھ اونچے اونچے مینار ہیں جن میں سے کم سے کم اونچے مینار کی اونچائی سو میٹر سے زیادہ ہے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر سگراڈا فیملیا کی نیابت کا صحیح لطف اٹھانا ہے تو اس کے مینار پر چڑھ کر اس کا نظارہ کرو۔ تین سو فٹ میڑھیاں چڑھنے کی ہمت نہ جب میں نے اب ہے۔

دوپہر کا وقت ہو چلا تھا۔ بھوک لگ رہی تھی آرتورو نے کہا تھا کہ ساحل سمندر پر پھیلی نہایت لذیذ ملتی ہے۔ بیچ کا رخ کیا۔ لوگ حسب معمول دھوپ سینٹے اور سمندر میں نہانے کے مڑے لوٹ رہے تھے مگر آگے جانے سے پہلے مجھے پیٹ پوجا کرنا تھا۔

عارضی قسم کے ہوٹل بنے ہوئے تھے۔ ان کے باہر میزیں لگی تھیں۔ میں کرسی کھینچ کر ایک میز کے پاس بیٹھ گیا۔ آواز آئی۔ ”کیا کھا میں گے۔“ یہ جملہ اردو میں کہا گیا تھا۔ میں نے تعجب سے پلٹ کر دیکھا تو ایک پاکستانی لڑکا کھڑا تھا۔ ”حیران نہ ہوں سر، میں بھی پاکستانی ہوں۔ انگلستان جاتا تھا۔ ایجنٹ نے یہاں تک لا کر چھوڑ دیا۔ پیٹ تو بھرنا ہے۔ میں نے یہاں پیرے کی نوکری کر لی۔ یہاں پھیلی مزیدار ہوتی ہے۔ لے آؤں۔“

”ہاں لے آؤ۔“ میں نے جواب دیا۔ خدا معلوم ایسے کتنے ہی پاکستانی دنیا بھر میں ایجنٹوں کے ہاتھوں رسوا اور پریشان ہو رہے تھے اور اب بھی ہو رہے ہیں۔

کھانا کھا کر میں ساحل کی طرف نکل گیا۔ پنسیون پہنچا تو بڑی بی اسی طرح پریشان تھیں جس طرح گھر والے دیر سے آنے پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ ”سینور (مسٹر) آپ کہاں چلے گئے تھے، دوپہر کھانے پر بھی نہیں آئے؟“ میں نے بتایا کہ میں سگراڈا فیملیا دیکھنے اور بیچ گھومنے چلا گیا تھا۔ بڑی بی نے فوراً اپنے سینے پر کراس کا نشان بتایا۔ میں کمرے میں آرام کرنے چلا گیا اتھین آکر مل فائٹ اور فلمینکو ڈانس نہ دیکھنا اسپینر ڈکی غیرت کو لٹکانے کے برابر ہے۔ رات کو فلمینکو ڈانس دیکھنا تھا۔

اگلے دن آرکیٹیکٹ انٹونی گاؤڈی کی بنائی ہوئی ایک اور عمارت کا زامیلا دیکھنا تھا جو لاپیڈیرا بھی کہلاتی ہے۔ لاپیڈیرا کے معنی صید یا شکار کے ہیں۔ یہ نام شاید اس لیے پڑ گیا ہو کہ یہ عمارت ایک جوڑے روزریسکمون اور پیرے میلانے بنوائی تھی۔ روزبر ایک امیر بیوہ تھی۔ میلانے اس سے شادی کر لی تھی اور اس کے پیسے سے عیش کی زندگی گزارتا تھا۔ لوگ اس کے پیچھے پڑے تھے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ یہ عمارت بھی اپنے ڈیزائن میں منفرد ہے تین چار منزلہ ہر منزل پر کئی اپارٹمنٹ انٹالڈ میں اس کا احاطہ کرنا صرف مستنصر حسین تارڑ کو آتا ہوگا۔ میں نہیں کر سکتا۔ اس عمارت کی کہانی صرف اس کی تصویر کی زبانی ہی سنی جاسکتی ہے۔

پھلی میں کل کھا چکا تھا۔ کامیاب کھانا باقی تھا۔ میں نے ساحل کا رخ کیا۔ ساحل سے باہر سڑک پر کئی ہوٹل موجود تھے جہاں کامیاب کھانے جاسکتے تھے۔ یہاں کامیاب ثابت مل جاتے ہیں۔ سمندری نمک کے ساتھ پلیٹ میں دیے جاتے ہیں۔ کامیاب کے سر اور دم کو خود الگ



کرنا ہوتا ہے۔ لوگ گامباس کے سروں کو پھینکنے سے پہلے ان کو چوس رہے تھے۔ میں نے بھی ڈرتے ڈرتے کراہیت کے ساتھ ایک سر کو چوسا۔ خلاف توقع مزے کا لگا۔ اتنے بڑے جھینگے میں نے پہلے بھی نہ دیکھے تھے نہ کھائے تھے مگر اس کے بعد بینکاک میں کھانے کا اتفاق ہوا۔ تھائی لینڈ میں بھی گامباس اسی طرح بتاتے ہیں مگر وہ لوگ سمندری نمک کی بجائے اس کو تلے ہوئے لہسن کے ساتھ بتاتے ہیں۔

آرتور ورنے جو کھانے کی چیزیں بتاتی تھیں اس میں صرف بھنے ہوئے آکٹوپس کھانا باقی تھا۔ پیسین والی بڑی بی سے پوچھا تو انہوں نے ایک جگہ کا نام بتایا جو قریب ہی ویسے تو آکٹوپس ہر جگہ مل جاتے تھے۔ میں شام میں وہاں چلا گیا۔ یہ کئی کئی فٹ لمبے آٹھ دس پیروں والے آکٹوپس نہ تھے بلکہ ننھے ننھے آکٹوپس کے بچے تھے جن کو یہ لوگ حل کر اس طرح کھاتے تھے جیسے ہم چنے وغیرہ کھاتے ہیں۔

بارسلونا میں دیکھ چکا تھا۔ اب مجھے براستہ نہیں، کانز جانا تھا جہاں سالانہ بین الاقوامی فلمی میلہ لگتا تھا۔ میں تو لوں سے تقریباً ساڑھے پانچ سو کلومیٹر مشرق کی طرف بحر میڈیٹیرینین کے کنارے ہے۔ کانز وہاں سے نہیں پہنچ سکتا میرٹر پر واضح ہے۔ میں پہلے چاچکا تھا کانز بھی نہیں کی طرح نکلا کوئی قابل ذکر بات نہ تھی کانز میں جان ای وقت پڑتی ہے جب یہاں سالانہ بین الاقوامی فلمی میلہ منعقد ہوتا ہے۔ میں سے جس پھر نورٹو۔

کراچی کے بعد مجھے جس شہر سے لگاؤ ہے وہ نورٹو ہے مگر میں یہاں تین چار دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اپنے رشتے داروں اور پرانے دوستوں سے ملنے اس کے بعد ہی لاس انجلس سے ہوتا ہوا غیلا بھینچ گیا۔ یہ سب جگہیں میں پہلے بھی ایک سے زیادہ دفعہ دیکھ چکا تھا۔ اس دفعہ شہری میری تہ جانا چاہتا تھا جو چند چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل تھا اور اس پر امریکا کی عملداری تھی۔ دیکھ جانے کے لیے مجھے پہلے گوام جانا تھا۔

میں جزیرہ سیپ جانا چاہتا تھا مگر وہاں کی پرواز میں دو دن جگہ نہ تھی میرے پاس وقت نہ تھا میں نے جزیرہ رونا کا ٹکٹ خریدا اور جہاز میں بیٹھ گیا۔ رونا وہ جگہ تھی جہاں وہ شہر جاتا ہے کرنے کے لیے کچھ نہیں صرف ساحلوں پر کھو میں اور آرام کریں۔ یہ جزیرہ جاپان کے لوگوں کی پسندیدہ جگہ ہے۔ یہاں پر جاپانوں نے ایک بڑا ہوٹل تیار کر رکھا ہے جس میں جاپان کے لوگ چھٹیاں گزارنے آتے

ہیں۔ اس وقت میرے علاوہ اس ہوٹل کا ہر سہان جاپانی تھا یا تھی۔ جزیرہ مھوم کر کھانا کھانے آیا تو اسٹیک مل سکتا تھا یا جاپانی کھانا۔ میں نے جاپانی کھانا کھایا۔ کیا کھایا یہ صرف باورچی کو معلوم تھا کہ جاپانی تو ہر چیز کھا جاتے ہیں۔

شام کمرے میں لیٹا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازے پر ایک جاپانی صاحب کھڑے تھے۔ دروازہ کھلا تو وہ جاپانی طریقے سے دد فدر کوغ میں گئے۔ مجھے بھی جانا پڑا۔ ”آج شام ہم ایک جاپانی فیسیول منار ہے ہیں آپ شریک ہوں گے تو ہماری عزت افزائی ہوگی۔ کھانے پر آپ ہمارے سہان ہوں گے۔“ دیا ر غیر میں وقت گزارنے کا بندوبست ہو گیا تھا۔ ”ضرور۔“ پھر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

وقت مقررہ پر تقریب کی جگہ پہنچا تو میرے میزبان مسٹر آ کی ہیکو دوڑے ہوئے آئے اور آتے ہی رکوع میں چلے گئے۔ مجھے بھی رکوع میں جانا پڑا۔ ہم دونوں باری باری کئی دفعہ رکوع میں گئے۔ ہر رکوع کے بعد جھکاؤ میں نیٹا کی آتی جا رہی تھی۔ آخر کار ہم سیدھے کھڑے ہو گئے پھر ہاتھ ملایا۔ فیسیول میں کچھ مذہبی رنگ تھا بہت سی لائیں اور پٹائے۔ پھر جاپانی دھن میں گانے۔ ہیکو صاحب نے مجھے اور لوگوں سے ملایا اور پوچھا۔ ”آپ سا کی ٹھنڈی پیس کے ٹکٹنی یا گرم۔“ سا کی ایک قسم کی جاپانی شراب ہے جو چاول سے بنتی ہے اور موسم اور پینے والے کے ذوق کے مطابق ٹھنڈی ٹکٹنی یا گرم کر کے پی جاتی ہے۔ میں نے کوکا کولا پر اکتفا کیا۔ اب یہی میرا پسندیدہ مشروب بن چکا تھا۔

جاپانی موسیقی ختم ہوئی تو تیز مغربی دھنیں بجنے لگیں تو جوان جوڑے رقص کرنے میں مشغول ہو گئے۔ فیسیول ختم ہوا تو آدمی رات گزر چکی تھی۔ میں نے مسٹر ہیکو اور ان کی بیگم کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے کا رخ کیا۔

اب میں براستہ فیلا بینکاک پہنچ چکا تھا۔ تھائی لینڈ میرا پسندیدہ ملک ہے لیکن پسندیدہ شہر بینکاک نہیں۔ بینکاک کا ذکر میں متعدد بار کر چکا ہوں لیکن اس دفعہ بینکاک کا ذکر صرف ایک واقعے کے ضمن میں ہے۔

میں شیرن ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا جو سری وونگ روڈ پر واقع ہے۔ اس کے نزدیک ہی پیٹ پونگ روڈ ہے جو اپنی شہینہ زندگی کے لیے بدنام اور مشہور ہے۔ رات کے وقت یہ



سڑک ٹریفک کے لیے بند کر دی جاتی تھی اور یہاں پر رات کا بازار لگتا تھا جہاں پر لوگ ٹیلیوں پر اپنا مال سجا کر بیچتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف بارگھس جہاں شراب اور رقص کا دور چلتا تھا۔ اندھیرا ہو چلا تھا میں پیٹ پوٹنگ مارکیٹ سے بینسٹن خریدتا چاہتا تھا۔ بینسٹن یہاں اچھی اور بہت کم داموں مل جاتی تھیں۔ میں نے دو بینسٹن خریدیں ان کو فریم سے نکلوا کر رول کروالیا کیوں کہ جہاز میں فریم لے جانا مشکل تھا۔ یہ کام ختم کر کے میں ایک بار میں چلا گیا۔ پاس لگ رہی تھی میں کوک پوتا چاہتا تھا ایک لڑکی کوک لے آئی۔ کوک دینے کے بعد اس نے فرمائش کی کہ مجھے ایک ڈرنک خرید دو۔ میں نے خرید دیا۔

وہ ڈرنک لے کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی پھر فرمائش کی۔ ”میں بہت تھک گئی ہوں۔ کام نہیں کرنا چاہتی۔ تم ”ماما سین“ کو دو سو بھات دے دو وہ مجھے چمچنی دے دے گی۔ ”ماما سین بہت اچھی ہے۔“ اس کے بعد کی تفصیل۔ ”پھر تم مجھے اپنے ساتھ ہوٹل لے چلو۔ صبح پانچ سو بھات دے دینا۔“

میں نے انکار کر دیا وہ پیچھے پڑ گئی۔ آخر کار میں نے کہا ٹھیک ہے چلو یہ دو سو بھات ”ماما سین“ کو دے دو۔ باہر آ کر میں نے اس کو پانچ سو بھات دیے۔ ”یہ لو اپنے پانچ سو بھات میں تم کو ہوٹل نہیں لے جاؤں گا۔“

”تم خفا ہو گئے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو معافی مانگتی ہوں۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”واپس جاؤں گی تو ”ماما سین“ ناراض ہوگی۔ میں اس کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تم مجھے ہوٹل لے چلو۔“

میں نے بیچھا چھڑانے کے لیے کہہ دیا میں ہوٹل نہیں جا رہا ہوں۔ مجھے رانسن اسٹور جانے کی خریدنی ہیں۔“

”میں بھی رانسن چلوں گی۔“ وہ کسی طرح بیچھا چھوڑنے کو تیار نہ ہوئی۔

”اچھا چلو۔“ میں نے تھک آ کر کہا لیکن ابھی نہ میری آزمائش ختم ہوئی تھی نہ اس کی فرمائشیں میں کپڑے بدل کر چلوں گی۔ میرا کمر ہوٹل کے پیچھے ہے زیادہ دور نہیں تم میرے ساتھ چلو گے؟ اب میں وہی کچھ کروں گا جو یہ کہے گی۔ ”ضرور چلوں گا۔“

ہم چلتے چلتے ٹیرن کے پھوڑے آ گئے۔ اس شاعر ہوٹل کے پیچھے جو گندگی، غربت اور افلاس تھا بیان سے باہر ہے۔ ایک دروازے کے سامنے اس نے چابی نکالی

اس کو دروازے میں گھما کر دروازہ کھولا۔ چھوٹا سا کمر۔ صرف ضرورت کی چند چیزیں ساتھ میں غسل خانہ۔ وہ دروازے کی اوٹ میں کپڑے بدلنے چلی گئی۔ میں سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ دروازے کے پیچھے جانے سے پہلے اس نے کیسٹ پلیئر چلا دیا تھا۔ کیسٹ سے تھائی گاٹوں کی بھائے ہندی گاتوں کی آواز آرہی تھی۔

”تم ہندی گانے سنتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔ جواب ملا۔ ”یہ میرے بابا کے گانے ہیں وہ سنتا تھا۔“ اب وہ کپڑے بدل کر آ چکی تھی۔ ”میرا بابا ہندوستان سے آیا تھا۔ وہ میری ماں سے ملا۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ میری ماں نے گھر والوں سے چھپ کر میرے باپ سے شادی کر لی۔ گھر والوں نے اس کے بعد میری ماں کی شکل نہیں دیکھی۔ سب نے اس کو چھوڑ دیا۔ مگر وہ میرے باپ کی اتنی دیوانی تھی کہ اسے اور کچھ نہ چاہیے تھا۔ پھر میں پیدا ہو گئی۔ میرا باپ بہن کا ہو رہا۔ اچھی ہندوستان والہیں نہ گیا۔ میری ماں ہی اس کی سب کچھ تھی۔“ وہ سانس درست کرنے کو رہی۔ میرا تجسس بڑھ رہا تھا۔ ”پھر کیا ہوا۔“

”پھر۔“ اس نے کہا۔ ”میرا باپ اچانک مر گیا۔ میری ماں یہ مدد برداشت نہ کر سکی دو مہینے بعد وہ بھی مر گئی۔ میں اکیلی رہ گئی۔“ میرا اشتیاق بڑھ رہا تھا۔ وہ رک گئی۔ ”تم چائے پیو گے۔“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم ”ماما سین“ کے پاس کیسے پہنچ سکتی۔“

”ماما سین بہت اچھی ہے۔“ اس نے عقیدت سے کہا۔ میں نے ”ماما سین“ کو بار میں دیکھا تھا وہ خود میں سالی سے کم عمر کی رہی ہوگی۔ اس لڑکی نے بات چاری رکھی۔ ”میرے کسی رشتے دار نے مجھے سہارا نہیں دیا۔ مالک مکان نے گھر سے نکال دیا۔ میں دو دن سے بھوکی تھی۔ سڑک پر غنڈے مجھے پکڑ کر لے جانا چاہتے تھے۔ ”ماما سین“ اور اس کے دو ساتھی وہاں سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بچا یا۔ پھر ”ماما سین“ مجھے اپنے ساتھ لے آئی۔ اس نے مجھے دو مہینے اپنے پاس رکھا۔ میں اپنا جسم نہیں چھپنا چاہتی تھی ”ماما سین“ کے پاس کب تک اس طرح رہتی۔ ”ماما سین بہت اچھی ہے۔“ اس نے کبھی میرے ساتھ نہ ہی کوئی زیادتی کی اور نہ ہی اپنا جسم بیچنے پر مجبور کیا لیکن میں ہمیشہ کے لیے ”ماما سین“ پر بھروسہ نہیں بن سکتی تھی۔ اپنی ذمہ داری



مجھے خود اٹھانی تھی۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”آج میں بہت تھک گئی تھی۔ ورنہ میں ماما سین کا نقصان نہ کرتی۔ ماما سین فرشتہ ہے۔“

اس کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ میرے ذہن میں طوائف کا جو پلید اور غلاقت بھرا تصور تھا دھل چکا تھا۔

میں نے اس کے ہاتھ پر پانچ سو بھات رکھے اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

یہ لڑکی ایک ہندوستانی مرد اور ایک تھائی عورت کی لازوال محبت کا شرمیلی جو بیچاک کے بازاروں میں بیک رہی تھی۔

ہوٹل جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اصل بدکار کون تھا ماما سین جو اس لڑکی سے پیشہ کروائی تھی یا وہ معاشرہ جس نے ایک کم عمر اور بے سہارا لڑکی کو تحفظ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کیا ماما سین واقعی فرشتہ تھی۔

طبیعت کدھر ہو چکی تھی۔ ماں باو آ رہی تھی۔ میں نے پھوکیٹ کا پروگرام کنسل کیا اور اگلے روز کراچی پہنچ گیا۔ ماں کی ماما میری منتظر تھی۔

باقی چھٹیاں کراچی میں گزار کر میں جدہ پہنچ چکا تھا۔

میرا دنیا کے گرد کا سفر پورا ہو چکا تھا لیکن میں نہیں، بائیس دن میں۔ میرے سعودیہ میں شامل ہونے کے بعد

سے اب تک سعودیہ تین مزید 1011-1011-747 B اور گیارہ A-300 جہاز خرید چکی تھی۔ اب اس کو

B-707 طیاروں کی ضرورت نہ رہی تھی۔ ویسے بھی یہ

جہاز کافی پرانے ہو چکے تھے۔ پرانے جہازوں کی مرمت

اور دیکھ بھال کا خرچہ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ یہ جہاز

فالتو تھے بیچے جاسکتے تھے۔ گاہک کی تلاش تھی۔ اسی

دوران سعودی حکومت نے طے کیا کہ ایک B-707

سوڈان کے صدر نمیری Numairy کو تحفہ پیش کیا

جائے۔ اس تحفے سے متعلق تمام تکنیکی امور کی ذمہ داری

میرے سر تھی۔

جب بھی کوئی جہاز خریدایا یا بیچا جاتا ہے یا کسی اور

طریقے سے اس کی منتقلی ایک فریق سے دوسرے فریق کو

ہو تو یہ دستور ہے کہ اس کا C چیک کیا جاتا ہے۔ ساتھ

ہی ساتھ جہاز کو مرمت اور دیکھ بھال کا پچھلے کئی سال کا

ریکارڈ بھی منتقل کیا جاتا ہے۔ انجن کے ریکارڈ کی بہت

زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ پچھلے چند سال سے

بہت سے بوئنگ پرزے مارکیٹ میں آ گئے تھے اور کئی

ماہنامہ سرگزشت

حادثوں کا باعث بنے تھے۔ اس لیے اب انجن کی منتقلی سے پہلے اس کے پیدائش سے آج تک کا تمام ریکارڈ ہونا لازمی قرار پایا۔

جہاز کے انجن بنیادی طور پر تیس ٹربائن ہوتے ہیں ان کو صنعت میں بھی استعمال کیا جاتا ہے مگر ان کے مواعفات سے اتنے سخت نہیں ہوتے جتنے جہاز کے استعمال کے لیے ضروری ہیں۔

ان کے پرزے جہاز میں استعمال کیے جانے والے پرزوں کی نسبت کمزور ہوتے ہیں۔ کم قیمت ہوتے ہیں۔ یہ جہاز کے انجن میں قانونی طور پر استعمال نہیں کیے جاسکتے ہیں لیکن چند انسان اداروں نے ان پرزوں کو ناجائز طور پر

جہاز کے انجنوں میں لگانا شروع کر دیا تھا جس کے خطرناک نتائج سامنے آچکے تھے۔ جس کی بنا پر انجن کے پرزوں کے

ریکارڈ کی فراہمی لازمی قرار دے دی گئی تھی۔ اس کے بغیر

انجن نہیں بیچے جاسکتے تھے۔

جہاز کا چیک مکمل ہو چکا تھا۔ کل صبح یہ سوڈان جائے

کا۔

جہاز کو سعودیہ کے رائل ٹرمینل کے سامنے پارک کر دیا

گیا ہے۔ میرے پاس رات میں ڈکرن کا فون آیا۔

”ریڈیو لائسنس اور جہاز کا رجسٹریشن کس کے پاس

ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ ڈکرن نے جواب دیا۔ ”اتارے

مجھے تھے یا نہیں۔“ پھر وہی جواب ملا۔ ”معلوم نہیں۔“ میں

فوراً ایئرپورٹ بھاگا یہ دونوں دستاویزات سول ایوی ایشن

میں جمع کروانی تھیں۔ جہاز کا سوڈانی رجسٹریشن ہو چکا

تھا۔

میں نے جہاز پر سیر می گوائی اور دونوں دستاویزات

گھر لے آیا۔

صبح دفتر پہنچا تو کرٹ کے پاس پیشی ہوگی۔ تم

رات میں سوڈان والے جہاز پر گئے تھے۔“

”ہاں ریڈیو لائسنس اور رجسٹریشن اتارنے۔“ میں

نے جواب دیا۔ کرٹ نے مجھے بتایا کہ میرا تعلق دنیا کے کس

جانور سے ہے۔

”تم سے بڑا گدھا کوئی نہیں ہوگا۔“ اس اعزاز کی

وجہ کا بھی پتا چل گیا۔

”تم آخری آدمی تھے جو جہاز پر گئے تھے۔ تم کیسورٹی

رسک بن چکے ہو۔ اس فلائٹ پر سوڈان کی بہت اہم

مختصین پرواز کریں گی اگر خدا نخواستہ کوئی حادثہ ہوا تو تم جیل جانے والے پہلے آدمی ہو گے۔“

کرسٹ کی بات سو فیصد سچ تھی میں نے کام کی دھن میں اس بات پر غور ہی نہ کیا تھا کہ مجھے یہ کام سرکاری طور پر کروانا چاہیے تھا۔ جب تک جہاز خرطوم کے ائر پورٹ پر اتر نہ گیا میں تمام مسافروں کی درازی عمر کی دعائیں مانگتا رہا۔

ایک B-707 جا چکا تھا مگر ابھی پانچ کا مسئلہ باقی تھا۔ پھر اچانک بوئنگ کے مقامی منیجر نے جوحدہ میں سعودیہ کے دفاتر میں بیٹھا تھا رابطہ کیا کہ بوئنگ کمپنی ان جہازوں کو خریدنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ وہ ان کو فیکٹر میں تبدیل کریں گے۔ ظاہر ہے فیکٹر لڑاکا جہازوں کو فضا میں ابھرنے کے لیے استعمال ہوتے۔ بوئنگ خود تو ان کو استعمال نہیں کرے گی کوئی اور ان کے ذریعے ان جہازوں کو خریدے گا۔ سعودیہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ طیارے بطور فیکٹر کسی ایسے ملک کو پہنچ جائیں جن سے سعودی عرب کو کسی قسم کا خطرہ ہو۔ یہ چیز بوئنگ پر واضح کر دی گئی مذاکرات لندن میں ہوں گے سلمان کوٹھی اور میں مذاکرات میں شامل ہوں گے۔

عدنان ترقی ہو کر EVP آپریشنز کی خدمت پر مقرر ہو چکے تھے۔ ان کی جگہ سلمان کوٹھی VP انجینئرنگ بنا دیے گئے تھے۔ لندن کی بہت مشہور لافرم کا ورڈ چانس کے نام سے تھی جو لندن میں سعودیہ کے تمام قانونی معاملات سنبھالتی تھی۔ بیل میٹنگ ان کے ساتھ تھی۔

میٹنگ سعودیہ کے لندن ٹاؤن آفس میں ہونی تھی۔ مقررہ وقت پر ایک ٹی ٹی ٹاؤن آفس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ دہلی، چلی، کینیڈا، آنکھوں پر عینک گردن پر مظہر، دکام زدہ سڑسڑ کرتی ہوئی ”میراث نام این ہے۔“ اس نے اپنا تعارف کروایا۔ ”میں کلورڈ چانس میں وکیل ہوں۔ ایوی ایشن میرا فیلڈ ہے۔“ میں نے اور سلمان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی نگاہوں میں مایوسی تھی مگر میٹنگ تو بہر حال کر لی تھی۔ ہم نے این کو اپنے نکات بتائے۔ این نے ان کو نوٹ کیا۔ پھر سوالات پوچھنے شروع کیے وضاحت طلب کی۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے ہم کو اندازہ ہوتا گیا کہ ہمارا پہلا تاثر کس قدر غلط تھا این بہت ذہین تھی۔ اگلے دن جب وہ کنٹریکٹ بنا کر لائی تو وہ سو فیصد ہماری ضروریات اور

خواہشات کے مطابق تھا۔

کئی سال بعد میں اور سلمان ایک دفعہ پھر لندن میں کا ورڈ چانس کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ اس دفعہ B-747 کے مال بردار جہاز کی خریداری کا مسئلہ تھا۔ سلمان نے خاص طور سے این کے متعلق پوچھا اور اس کی ذہانت اور کام کی تعریف کی۔ این کسی اور پروجیکٹ پر کام کر رہی تھی۔ مصروفیت کی بنا پر ہم سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مگر اس کا کام ہمارے ذہن پر اپنے نقش چھوڑ چکا تھا۔

ہمارا قیام لندن کے ہیتھرو ائر پورٹ پر تھا۔ ہیتھرو پر دو شیرٹن ہوٹل ہیں۔ ایک شیرٹن ہیتھرو کہلاتا ہے۔ دوسرا اسکائی لائن شیرٹن۔ ہم اسکائی لائن شیرٹن میں ٹھہرے تھے۔ سعودیہ کا آپریشنز آفس بھی اسی ہوٹل میں تھا۔ اس سے پہلے یہ آفس ہیتھرو ہوٹل میں ہوا کرتا تھا اس وقت سعودیہ کے زیادہ تر لوگ بھی ہیتھرو ہوٹل میں ہی ٹھہرا کرتے تھے۔ یہ ہوٹل بہت پرانا تھا اور دنیا کی تقریباً ہر ائر لائن کے لوگ یہاں ٹھہرا کرتے تھے خاص طور سے پائلٹ وغیرہ۔ ہیتھرو ہوٹل کی بار میں ساری دنیا کے پائلٹ ایک دوسرے سے اپنے اپنے تجربات بیان کرتے تھے۔ بعد میں اس کا نام بدل کر چینیٹا ہوٹل رکھ دیا گیا آج کل یہ کسی اور نام سے چلتا ہے۔

اسکاٹی لائن چاہا ہوٹل تھا۔ اس کی خاص بات اس کا بار تھا۔ بار کے سامنے بڑا ساحوس بنا ہوا تھا۔ بار میڈ اس میں تیر کر آتی تھیں اور مہمانوں کو ان کی طلب کردہ مشروبات پہنچاتی تھیں۔

میٹنگ سے واپس آکر میں اور سلمان تازہ دم ہونے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ گھنٹے بھر بعد بار کے سامنے ملنے کا پروگرام تھا۔ ایک گھنٹا بعد ہم لوگ پول کے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ لڑکی حیرتی ہوئی آئی اور ہماری مشروبات ہم کو تھما دیں۔ میں اپنا ٹریڈ مارک کوک پی رہا تھا۔ سلمان اپنی پسندیدہ مشروب۔ سلمان بغیر رکے۔ بلا ٹیکان اور بلا ٹکلف گھنٹوں بول سکتے ہیں۔ ان کا افتتاحی جملہ ہوتا تھا۔ ”میں بولتا بہت ہوں۔“ اس کے بعد وہ دودھین تین چھپنے مسلسل بول کر اپنے افتتاحی جملے کو سچ ثابت کرتے تھے۔ اب بھی یہی ہوا۔

دوسرے دن بوئنگ سے میٹنگ تھی۔ جو دو دن جاری رہی۔ سارے معاملات طے ہوئے۔ کنٹریکٹ کو حتمی شکل دے دی گئی۔ تین دن بعد میں اور سلمان جدہ واپس آ چکے



جب کوئی بات طے ہو جائے تو پھر وہ ہر طرح سے اور پوری ایمانداری سے اس پر کار بند رہتی ہیں۔ چاہے ان کا نفع ہو یا نقصان، زبان۔ زبان ہے۔

ڈکرن نے محنت اور جانفشانی سے اپنے کام کو احسن طور پر انجام دیتے ہوئے وقت سے پہلے ہی B-707 کے چیک۔C عمل کر لیے تھے۔ یہ جہاز یونٹک کو بروقت ڈیلیور کر دیے گئے۔ اب سعودیہ کے بیڑے میں کوئی B-707 باقی نہ بچا تھا۔

Opec کے وجود میں آنے کے بعد ترکی دہائی میں تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے باعث مغربی ملکوں کو جو معاشی جھٹکا لگا تھا اس کے نتیجے میں ان ملکوں نے بعض اہم قدم اٹھائے تھے جس کے نتیجے میں اسی (80) کی دہائی کے شروعات سے ہی تیل کی قیمتیں گرنے لگی تھیں۔ Opec کے ملکوں کو شدید معاشی بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ تیل کی قیمتیں 36 ڈالر فی بیرل سے گر کر 9 ڈالر فی بیرل تک پہنچ چکی تھیں۔ ان حالات میں سعودیہ کو مزید اس B-747 جہاز خریدنے تھے۔ اس زمانے میں B-747 کا نیا ماڈل آچکا تھا یہ ماڈل B-747-300 کہلایا۔ اس سے پہلے سعودیہ نے آٹھ B-747-100 اور دو B-747-SP خرید رکھے تھے۔

B-747-300 کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی اوپری منزل کو پیچھے کی طرف کافی بڑھا دیا گیا تھا۔ اب یہاں پر سٹیش نصب کی جاسکتی تھیں جن پر مسافروں کو بٹھایا جاسکتا تھا۔ اس سے پہلے والے جہازوں پر اوپری منزل چھوٹی ہی ہوتی تھی۔ اس میں مسافروں کے لیے صوف نما سٹیش تھیں جو فروخت نہیں کی جاسکتی تھیں اس لیے کہ ان میں وہ مضبوطی نہیں ہوتی تھی جو مسافروں کی سیٹ کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ ٹیک آف اور لینڈنگ کے وقت ان سیٹوں کو خالی رکھنا لازمی تھا۔ ان صوف نما سیٹوں پر ٹیک آف اور لینڈنگ کے وقت کوئی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

B-747 کی عرفیت SUD پڑ گئی۔ اوپری منزل کی لمبائی کی وجہ سے SUD اسٹریچڈ اپر ڈیک (Stretched upper deck) کا مخفف تھا۔

اگلے روز یونٹک کی مواصفات کی ٹیم کے ساتھ میٹنگ ہوئی۔ ٹیم کے اہم ترین جز یعنی چاسے کے لوازمات

تھے۔ جہازوں کا چیک C شروع کروا دیا گیا۔ اس پروجیکٹ کا انچارج ڈکرن چودھان تھا۔ قومیت لینائی۔

B-707 کے ایک اور واقعے کا ذکر کردوں جو دو سال قبل پیش آیا تھا۔ ایک دن انسپکشن کے دوران معلوم ہوا کہ جہاز چارلی چارلی (CC) میں بہت بڑا کریم ہے۔ جہاز فوراً گراؤنڈ کر دیا گیا۔ اس حالت میں اس کے اڑنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کریم اتنا بڑا اور گہرا تھا کہ مریض طریقوں سے اس کی مرمت ناممکن تھی یا تو یونٹک کوئی نیا طریقہ مرمت بتائے یا پھر یونٹک بدلا جائے۔ یونٹک کی ٹیکنیکل ٹیم کریم کا جائزہ لینے کے لیے جدہ آئی۔ وہاں جا کر تجزیہ کر کے یونٹک نے بتایا کہ مرمت ہو جائے گی مگر کام بہت بڑا ہے۔ یونٹک کے اپنے آدمی کام کریں گے۔ صحیح طور پر ٹیکس کہا جاسکتا کہ کتنا وقت اور کتنے آدمی لگیں گے۔ اس لیے کہ ایسا کام پہلے B-707 پر نہیں ہوا تھا۔ خرچا سات لاکھ ڈالر کے قریب اگر منظور ہو تو سعودیہ بتا دے۔

سعودیہ کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ کام ہو گیا۔ پیسے دے دیے گئے۔ چند مہینے بعد یونٹک کے پاس سے پیغام آیا کام اندازہ سے زیادہ آسان نکلا۔ خرچہ صرف پانچ لاکھ ڈالر کا ہوا ہے۔ یونٹک کے پاس سعودیہ کے دو لاکھ ڈالر جمع ہیں۔

اسی طرح کا ایک واقعہ اور ہوا۔ سعودیہ نے جو آخری تین L-1011 جہاز خریدے تھے۔ اس میں ایک رعایت یہ تھی کہ لاکھ بیڑ سعودیہ کو چند لاکھ ڈالر کے پرزہ جات مفت فراہم کرے گا۔ ایک بیڑ کینی شہری ہوا بازی سے نکل کر اب صرف ملٹری جہازوں پر توجہ دینا چاہتی تھی۔ L-1011 کے سارے معاملات بند کر دیے گئے۔

یہ تین جہاز خریدے ہوئے تھے حال گزر چکے تھے۔ ایک دن لاکھ بیڑ کا خط آیا کہ ان چند لاکھ ڈالر کی رعایت سعودیہ نے استعمال میں کی ہے۔ وہ پیسے دے کر پرزہ جات خریدتے رہے ہیں۔ یہ ڈالر سعودیہ کی طرح لینا پسند کرے گی۔

ان واقعات کا ذکر صرف اس وجہ سے کیا گیا کہ جب جہاز ساز کمپنیاں مذاکرات کرتی ہیں تو ہاتھوں پہنے جیواوتی ہیں۔ خاص طور سے جہاں ذمہ داریوں کا ذکر ہو تو وہ اپنے کنٹرکٹ کے متن سے ایک لفظ ادھر سے ادھر نہیں ہوتیں مگر



نکمل تھے۔ دودھ کے ساتھ ساتھ لیموں اور پودینے کا بھی بندوبست تھا۔ اس دور سے گزرنے کے بعد مواصلات پر توجہ دی جانی تھی۔ اب تک سعودیہ دو کھپوں میں دس جہاز خرید چکی تھی۔ مواصلات کا مرحلہ دودھ لے کر کیا جا چکا تھا مگر اس دفعہ چند ایک نئی چیزیں تھیں۔

سعودیہ کی سب سے لمبی پرواز ریاض اور نیویارک کے درمیان ہو سکتی تھی جس کا دورانیہ نیویارک جاتے ہوئے پندرہ سولہ گھنٹے اور واپسی پر گیارہ بارہ گھنٹے ہو سکتا تھا۔ جانے اور آنے میں وقت کی کمی یا زیادتی ہوا کے رخ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ کرۂ عرض پر ہوا میں مغرب سے مشرق کے رخ چلتی ہیں۔ جاتے وقت یہ باد مخالف ہوتی ہے۔ ہیڈ ونڈ کہلاتی ہے۔ جہاز کو ہوا کے خلاف اڑنا پڑتا ہے۔ واپسی میں ہوا ایک طرح سے جہاز کو دھکا دیتی ہے جہاز کی پرواز کا وقت گھٹ جاتا ہے۔ یہ ٹیل ونڈ کہلاتی ہے۔

کسی پائلٹ کو اتنے لمبے دورانیے کے لیے جہاز اڑانے کی اجازت نہیں ہوتی اس لیے لمبی پرواز کے لیے ڈبل عملہ ساتھ چلتا ہے۔ ایک جتھا جہاز اڑاتا ہے۔ دوسرا آرام کرتا ہے۔ جب پہلے عملے کا وقت پورا ہو جاتا ہے تو وہ آرام کرتا ہے۔ جہاز کی کمان دوسرے عملے کو سونپ دی جاتی ہے۔

B-747-SP میں جگہ کی کمی کی وجہ سے دوسرے عملے کے لیے مسافروں کی سیٹوں کو استعمال کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے ان سیٹوں کا کرایہ ضائع ہو جاتا تھا۔ B-747-300 میں جگہ بہت بڑھ گئی تھی اب جو ائر لائن چاہیں ایسے جہازوں میں عملے کے آرام کرنے کے لیے کیریوریٹ بنک لگا سکتی تھی اس کی قیمت تھی۔

دوسری اہم چیز ایندھن کی کمی تھی۔ جہاز میں اتنا ایندھن ڈالنے کا بندوبست ہو کہ بلا کسی پریشانی کے جہاز ریاض سے نیویارک پہنچ جائے۔ اس کا بندوبست جہاز کے کارگو کمپارٹمنٹ میں فالٹو ٹینک لگا کر کیا گیا تھا۔ جہاز میں قیمت ادا کر کے لگوائے جاسکتے تھے۔

زائد ایندھن کے وزن کے توڑ کے لیے ایسے انجن کی ضرورت تھی جس کی کارکردگی بہتر ہو تاکہ وہ کم سے کم ایندھن استعمال کر کے منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ یہ تمام چیزیں خالص مینیکل تھیں لیکن ایک اور اہم تبدیلی تھی جو سعودیہ کی انا کا مسئلہ تھا۔ سعودیہ کے جہازوں اور دوسری ہوا باز کمپنیوں کے جہازوں میں ایک خاص امتیاز یہ تھا کہ اپنے

مسافروں کے طور طریقوں کو مد نظر رکھتے ہوئے سعودیہ کے جہازوں میں فرسٹ کلاس کی سیٹیں بہت زیادہ تعداد میں ہوتی تھیں۔ سعودیہ کی خواہش تھی کہ سعودیہ کے B-747-300 کا فرسٹ کلاس کا سیکشن ایسا ہو کہ دنیا کی کسی ائر لائن کا نہ ہو۔ سب سے بڑا سب سے اچھا سب سے بہتر وغیرہ کی ذہنیت کا فرمان تھی۔ دنیا کی سب سے بڑی سائیکل جو سو فٹ سے بھی لمبی تھی۔ جدہ کی ایک چورنگی پر نصب تھی۔

بونک کی ٹیم کو سیائل (Seattle) واپس جا کر ان سب امور پر کام کرنا تھا۔ اس کے بعد دوسری میننگ سیائل میں ہوگی۔ اس میننگ میں کافی وقت باقی تھا مگر مجھے اس سے پہلے ایک ضروری ذاتی کام کرنا تھا۔

میں آج تک براعظم جنوبی امریکا کے کسی ملک نہ گیا تھا۔ ریو ڈی جینیرو کا بہت شہرہ تھا۔ مگر مشکل یہی تھی لمبی چٹیاں نہیں مل سکتی تھیں۔ صرف چار پانچ دن۔ وہی حیدرآباد دکن کی مثل نہیں ماموں سے ملنے ماموں بہتر۔ جانا تو تھا۔

مراکش کا نام بھی بہت سن رکھا تھا لیکن کبھی جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ مراکش کی ائر لائن سعودیہ کے ملازمین کو 90 فیصد رعایتی ٹکٹ بھی دیتی تھی۔ رائل ائرموراک کی پرواز مراکش کے شہر کا سالانہ سہ ہر اسٹڈ ڈکار ریو جاتی تھی۔ ایک پختہ دو کالج مراکش اور ریو دونوں جگہ جایا جاسکتا مگر بہت کم عرصے کے لیے۔ سعودیہ کی فلائٹ سے میں کا سالانہ پہنچ گیا۔ کا سالانہ دو دن ٹھہر کر یہاں سے ریو براستہ ڈکار ائرموراک سے جانے کا پروگرام تھا۔

ساتویں صدی عیسوی میں کا سالانہ کار پر بربر لوگوں کی بادشاہت تھی۔ پھر کا سالانہ عربوں کے ہاتھ آیا پھر آخر میں پرتگالیوں اور ہسپانیہ کے ہاتھ۔ پرتگالیوں نے اس کا نام کا سالانہ رکھا جس کے معنی سفید گھر کے ہیں۔ جب ہسپانیہ نے اس پر قبضہ کیا تو کا سالانہ کو اس کے ہم معنی ہسپانوی زبان کے نام کا سالانہ سے تبدیل کر دیا۔ عرب کا سالانہ کو مدار البیض کہتے اس کے معنی بھی سفید گھر کے ہیں۔

کا سالانہ مراکش کا سب سے بڑا شہر ہے جس کی آج کی آبادی تقریباً تیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ یہاں شمالی افریقہ کا سب سے بڑا بندرگاہ بھی ہے لیکن مجھے کا سالانہ سے بڑھ کر فیض جانے کا شوق تھا۔ میں کا سالانہ کے بازار سے بڑھ کر مجھے مقامی سامان آرائش







ہوئی سیٹیں استعمال کی گئیں جن کا نام فارس سیٹ رکھا گیا یہ اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ آرام دہ سیٹیں تھیں۔ قالین دو لگایا گیا جس میں پاؤں دھنس جائیں۔ سامان رکھنے والے خانوں کی بنائیاں سونے کے پانی پھیرے ہوئے دھات کی بنائی گئی تھیں۔ سگریٹ کے راکھ دان بھی سونے پھرے دھات کے بنائے گئے تھے۔ ہر جہاز پر تقریباً چھ لاکھ ڈالر کا خرچہ کیا تھا مگر دنیا نے اس سے پہلے اتنا آرام دہ فرسٹ کلاس سیکشن نہ دیکھا تھا۔ وقت مقررہ پر یہ جہاز جدہ پہنچ گئے اور استعمال میں آ گئے۔

جب قاہرہ جانے والی پہلی پرواز جدہ واپس آئی تو سونے کے پانی پھرے ہوئی دھات کی الیش ٹرے غائب تھیں۔ قاہرہ کے ملینکس کو بتا چل گیا تھا کہ ان پر سونا پھرا ہوا ہے۔

قاہرہ اسٹیشن پر چوری معمول کی بات تھی۔ سعودیہ کے جہاز جب قاہرہ سے واپس آتے تھے تو چندہ میں ایمر جنسی کٹ سیٹوں کے پیچھے سے غائب ہوتی تھیں۔ مسافر ان کو بطور سوغات لے جاتے تھے اور سمندر میں تیرنے کے لیے استعمال کرتے۔ یہ ان کا حق تھا۔ آخر کو انہوں نے ٹکٹ خرید ا ہوا ہوتا تھا۔

قاہرہ کے حوالے سے ایک لطیفہ سعودیہ میں مشہور تھا کہ ایک دفعہ ایک مصری بدو جہاز میں داخل ہوا اس کو جو پہلی سیٹ ملی اس پر بیٹھ گیا۔ یہ فرسٹ کلاس کی سیٹ تھی۔ ملے کے ہر شخص نے اس کو اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر میں ایک مصری اسٹیورڈ آیا اس نے بدو کے کان میں کچھ کہا جس پر بدو نے اپنا پوٹا سنبھالا اور پیچھے اکانوی کلاس میں چلا گیا۔ اسٹیورڈ نے اس بدو سے کان میں صرف یہ کہا تھا۔ ”یہ سیٹ قاہرہ نہیں جائے گی۔ قاہرہ جانے والی سیٹ پیچھے ہے۔“

ضروری نوٹ: اس کتاب کے تمام لیٹرس بنائے ہیں۔ ان میں میرا ہذا و ماغ استعمال نہیں ہوا ہے۔ قاہرہ کی پرواز چند راکھ دانوں کی چوری کے کارکن معطل نہ کی جاسکتی تھیں لیکن یہ راکھ دان عام دھات کے بنائے جاسکتے تھے۔ یہی اس مسئلے کا حل نکالا گیا۔ قاہرہ کے ملینکس کی مایوسی کا کسی کو خیال نہ آیا۔ اب سعودیہ کے بیڑے میں میں B-747 شامل تھے مگر ایک آخری B-747 اور خریدا جائے گا۔ یہ مال بردار B-747 ہوگا۔ سعودیہ کے B-747 کی پہلی کھیپ کی وصولی

شروع ہو چکی تھی۔ شاید تیسرا یا چوتھا جہاز تھا۔ سعودیہ کے پائلٹ اس جہاز کو وصول کرنے سائل ائر پورٹ پر اترے۔ کو پائلٹ اور فلائٹ انجینئر تو امیگریشن سے آسانی سے فارغ ہو گئے مگر کپتان کو روک لیا گیا۔ جب کپتان آگیا تو اس نے امیگریشن والوں سے کہا کہ میں واپس جا رہا ہوں مگر نقصان تمہارا ہو گا اڑتا لیس ملین ڈالر کا۔ امیگریشن آفیسر جو سگے۔ ”نقصان کیسے ہوگا۔“

”میں یہاں سعودیہ کے لیے جہاز وصول کرنے آیا ہوں۔ میں واپس چلا جاؤں گا اڑتا لیس ملین ڈالر بھی میرے ساتھ واپس چلے جائیں گے۔“

اڑتا لیس ملین ڈالر میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ ”یس سر۔“ کپتان کے پاسپورٹ پر ٹھہلا گ گیا۔

سعودیہ کو ایک مال بردار B-747 خریدا تھا لیکن جیل کی قیمتیں جو آسمان سے باتیں کرتی تھیں اب زمین پر اتر آئی تھیں۔ اڑتا لیس ملین ڈالر نقد کا رعب ختم ہو چکا تھا۔ مال بردار جہاز حاصل کرنے کی دو صورتیں تھیں یا تو کسی ایک مسافر بردار طیارے کو مال بردار میں تبدیل کروا لیا جائے جس میں خرچہ چاکم تھا۔ یا نیا جہاز خریدا جائے۔

کارگو، انجینئرنگ اور کنسٹرکٹ کی ٹیم تشکیل دی گئی جس نے آدھی دنیا چھان کر مشورہ دیا کہ نیا جہاز خریدنا بہتر ہے۔ نئے جہاز کے کنسٹرکٹ پر دستخط ہو گئے۔ ایڈوانس پیسے بھی دے دیے گئے۔ اب جہاز تیار تھا باقی چیزوں کا بندوبست کرنا تھا جس کا دور سعودیہ نے پہلی دفعہ محسوس کیا۔ بینک سے قرض لیا جائے۔ یہ آسان کام نہ تھا۔ سعودیہ نے پہلے بھی قرض پر جہاز نہ خریدا تھا ہمیشہ نقد کا سودا کیا تھا۔ اس کے علاوہ اور پیچیدگیاں بھی تھیں۔

عام طور سے جہاز کے انجن جہاز ساز کمپنی مہیا کرتی ہے۔ لیکن چونکہ سعودیہ نے B-747-300 کے ساتھ بیس فالٹو انجن خرید رکھے تھے۔ جن میں سے زیادہ تر استعمال نہیں ہوئے تھے۔ ضرورت سے بہت زیادہ تھے۔ مال بردار جہاز کے انجن ان ہی فالٹو انجنوں میں سے مہیا کیے گئے تھے۔ اس کی وجہ سے انشورنس کی پیچیدگیاں پیدا ہوئی تھیں۔ ان انجنوں کی وارنٹی بھی ختم ہو چکی تھی۔

اس تمام پیچیدگیوں کو حل کرنے کے لیے فائننس، انشورنس، لیگس، کنسٹرکٹ کی ٹیم لندن پہنچ گئی۔ دو ہفتے کی مسلسل کوششوں کے بعد یہ معاملات حل ہو چکے تھے۔ جہاز کی وصولی کے لیے کپتان اب دوسرا عمل سائل روانہ ہو چکا



تھا۔

سعود یہ کی پوری ٹیم کے لیے یہ نیا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے بیسوں کو ہم میں سے کسی نے اتنا اہم نہ سمجھا تھا۔

سعود یہ کے ڈائریکٹر جنرل کمپنیشن ملٹر نے سعود یہ کی ٹیم کے تمام شرکا کو تعریفی خطوط جاری کیے جن میں ٹیم کے شرکا کی کوششوں کو سراہا گیا تھا۔

اب جب بھی قرضہ لے کر جہاز خریدنا پڑا۔ ہماری ٹیم خدمت کے لیے تیار ملے گی۔

☆.....☆

سعود یہ کے ساتھ یہ میرا آخری پروجیکٹ تھا۔ مزید چھ B-747 جہاز خریدنے تھے۔

اس سے پہلے تین کھپ میں سعود یہ میں B-747-F مالی پرواز جہاز خرید چکی تھی۔ جیسے بھی مواضعاتی، قانونی، معاشی نکات ہو سکتے تھے ان پر کئی کئی دفعہ مذاکرات ہو چکے تھے یہ کنٹریکٹ بالکل سیدھا سادا تھا۔ اس کے دستخط ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے سوچا۔ ہمیشہ کی طرح میں اس دفعہ بھی غلط تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

دوسری طرف سلمان کوٹھی تھے۔ وائس پریزیڈنٹ مینیجنگل۔ ”میرے کمرے میں آ جاؤ۔ نئے جہازوں کا کنٹریکٹ لیتے آنا۔“

”یا اللہ خیر۔“ میں نے سوچا۔

سلمان کے کمرے میں پہنچا تو ارشاد ہوا۔ ”اس کنٹریکٹ میں تبدیلیاں لا کر اس کو سعود یہ کے حق میں بہتر بنانا ہے۔“

بارہ سال پہلے کا منظر میری آنکھوں میں گھوم گیا۔ میں شرمعی کے دفتر میں کھڑا تھا۔ شرمعی نے مجھے L-1011 کا کنٹریکٹ دکھایا۔ یہ بات کہی تھی جو آج سلمان مجھ سے کہہ رہے تھے۔ اس کنٹریکٹ کو سعود یہ کے حق میں بہتر بنانا ہے۔ پھر میں نے L-1011 کے کنٹریکٹ کو بہتر بنانے کے لیے جو شاندار کارنامہ انجام دیا تھا اس کے نتیجے میں شرمعی بولتا بھول چکے تھے صرف ہاتھ کے اشاروں سے مجھے اپنے دفتر سے دفع کیا تھا۔

لیکن پچھلے بارہ سال میں مجھے کنٹریکٹ کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔

”اس میں ہر چیز ملے ہے۔ تم کس قسم کی تبدیلی

چاہتے ہو۔“ میں نے سلمان سے تفصیل جاننی چاہئیں۔ سلمان چاہتے تھے کہ چند دوسری چیزوں کے علاوہ بونگ کی ذمہ داریوں میں بھی تبدیلی لائی جائے۔ میں نے سلمان سے کہا ”باقی چیزیں تو شاید بونگ کو قائل بنول ہوں مگر ذمہ داریوں میں وہ کس سے کس نہیں ہوں گے۔ ذمہ داری کی شقیں کنٹریکٹ میں ایسے لکھی جاتی ہیں جیسے جوہری انگوٹھی میں حکینے جوڑنا ہے ایک ایک لفظ سوچا سمجھا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں تبدیلی ناممکن ہے۔“ سلمان خود کنٹریکٹ کے پیچھے ہوئے کھڑی تھے۔ ان کو بھی معلوم تھا لیکن بولے۔ ”تم بونگ کو لکھو۔ دیکھا جائے گا۔“ میں نے بونگ کو لکھ دیا۔ جواب دی آیا جس کی توقع تھی۔

”یہ ایسے نہیں مانیں گے۔“ سلمان نے کہا۔ ”ان کے مقابلے پر دوسری کمپنی کو کھڑا کرنا پڑے گا۔ تم ڈھکس کو لکھو کہ ہم کو چھ MD-11 جہاز خریدنے ہیں۔“ سعود یہ کا دور دور بھی MD-11 خریدنے کا خیال نہ تھا یہ کھیل صرف سلمان اور میں کھیل رہے تھے۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ڈھکس کا نہ صرف جواب آیا بلکہ ان کی مارکیٹنگ ٹیم اگلے ہفتے جدہ میں موجود تھی۔ جواب میں سعود یہ کی ٹیم بھی ڈھکس اور G.E کی فیکٹریوں کے دورے پر گئی۔

سب کچھ ہو گیا مگر ذمہ داریوں کے ضمن میں ڈھکس کا موقف بالکل وہی تھا جو بونگ کا تھا۔ سلمان کو اور مجھے پہلے ہی اس کا اندازہ تھا مگر سلمان ایک دفعہ کوشش کر دیکھنا چاہتے تھے۔ سعود یہ کا MD11 خریدنے کا مطلق ارادہ نہ تھا۔

میں سعود یہ کو خیر باد کہہ کر ٹورنٹو آ چکا تھا۔

چند ہفتے بعد معلوم ہوا کہ وہ آرڈر جو چھ B-747 سے شروع ہوا تھا بڑھ چڑھ کر ساٹھ جہازوں سے بھی اوپر پہنچ چکا تھا۔ سعود یہ نے نہ صرف MD-11 بلکہ ان کے ساتھ ہی ساتھ ڈھکس کے چھوٹے جہاز MD-90 اور G.E کے انجن خریدنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میرے عزیز دوست اور G.E کے سعودی خواہ امریکی ڈائریکٹر مارکیٹنگ محمد لدانی کو ان کے دیرینہ سوال کا جواب مل چکا تھا۔

”یا شیخ رزاقی تم میرے انجن کب خریدو گے۔“

سعود یہ۔ الوداع۔

## خزانہ

منظر امم



مدفون خزانے کی تلاش صدیوں سے انسان کو صحرائوں، پہاڑوں، جنگلوں میں بھٹکاتی رہی ہے۔ کچھ لوگ کامیاب بھی ہوئے ہیں مگر زیادہ تر ناکامیابی کا زخم کھا کر جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے آج بھی ایسے بے شمار سر پہرے موجود ہیں جو اپنی جان ہتھیلی پر لیے کر سمندر کی گہرائی میں غلٹ بوس برفیلی چوٹیوں پر اور جنگل بیابانوں میں مدفون خزانے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی ایسے بہت سے مدفون خزانے ہیں جن کی تلاش میں سر پہرے پاگلوں کی طرح بھٹکتے رہیں۔

انسان بہت سے خوابوں کے درمیان رہتا ہے۔ وہ نئے نئے خواب دیکھتا کرتا ہے۔ پر یوں کے خواب، شہزادوں کے خواب، انکی طاقتوں کے خواب جو اس کے کنٹرول میں آکر اس کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔

ایسا ہی ایک خواب خفیہ خزانوں کا ہے۔ ہزاروں کہانیاں اس قسم کے خفیہ خزانوں پر لکھی جاتی ہیں۔ رائیڈر ہیکر ڈکے، سلیمان سے لے کر زیر ولینڈ تک کا سفر، کبھی پتا چلتا ہے کہ فلاں سمندر میں برسوں پہلے جو



## ملتان کا خزانہ

ملتان کے محلہ باغ واڑہ دہلی گیٹ کے ایک مکان میں ہونے والا واقعہ بہت الم ناک اور سبق آموز ہے۔ یہ واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہم ابھی تک کن پتھروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ جعلی عامل اور بابا ختم کے لوگ کس طرح ہماری سادہ لوحی اور راتوں رات دولت مند بن جانے کے خوابوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ڈیٹان عالم قریشی نام تھا اس شخص کا جس کو ایک بابا نے بتایا کہ تمہارے مکان میں ایک خزانہ دفن ہے۔ عالم قریشی کی عمر 68 برس تھی۔ بے چارہ غریب انسان، جس نے بھی اچھے دن نہیں دیکھے تھے جسے معلوم ہی نہیں تھا کہ دولت کیا ہوتی ہے اور مل جائے تو زندگی کتنی خوش گوار ہو جاتی ہے۔

عالم قریشی جس مکان میں رہتا تھا وہ کسی زمانے میں ایک سکھ خاندان کی ملکیت تھا۔ وہ سکھ خاندان 1947ء میں پاکستان سے ہندوستان چلا گیا تھا۔

بابا نے بتایا کہ وہ سکھ خاندان اس مکان میں بہت سی دولت دفن کر کے گیا ہے۔ کیوں کہ وہ اتنی دولت اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا۔

عالم قریشی نے دریافت کیا۔ ”بابا اب وہ خزانہ میرے ہاتھ کیسے آسکتا ہے؟“

”بہت آسان ہے۔ خزانہ تیرے گھر میں دفن ہے۔ گھر تیرے قبضے میں ہے۔ بس کھدائی شرع کر دے۔“

اور اس بد نصیب نے کھدائی شروع کر دی۔ محلے والوں کے بیان کے مطابق عالم قریشی کے مکان سے کئی مہینوں سے کدال اور بھانڈے چلنے کی آوازیں آتی رہی ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ ٹڑھے کی مٹی کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ اس کے لیے عالم قریشی نے یہ کیا کہ آنگن میں مٹی جمع کرنا چلا گیا۔

بالآخر 13 اپریل 2014ء کو خزانے کی تلاش رنگ لائی کہ وہ سرنگ ہی بیٹھ گئی جس میں عالم قریشی کھدائی کر رہا تھا۔ اس جنونی نے پچاس فٹ گہری سرنگ بنائی تھی۔ پچاس فٹ گہری بغیر کسی سہارے کی سرنگ کا یہی انجام ہونا تھا۔ وہ اچانک بیٹھ گئی اور عالم قریشی منوں منی تلے دفن ہو گیا۔

سنابے کہ پولیس نے اس بابا کو گرفتار بھی کر لیا تھا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کچھ دنوں بعد وہ باہر باہو کر بھر کی اور کوئلے کا فٹ بنارہا ہوگا۔



ڈیٹان قریشی کے گھر میں امدادی کارکن سرنگ معائنہ کرتے ہوئے

جہاز ڈوبا تھا اس کا خزانہ آج تک محفوظ ہے اور ہم جو حضرات ان خزانوں کی تلاش میں غوطہ خوری کرنے نکلے ہیں۔

بھی پتا چلتا ہے کہ فلاں گم شدہ تہذیب کا خزانہ فلاں جنگل میں محفوظ ہے اور لوگ اس کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر خفیہ خزانے کا ایک عدد نقشہ بھی ہوتا ہے جس کی مدد سے یہ بے چارے خواب دیکھنے والے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

اس موضوع پر لا جواب فلمیں بھی بن چکی ہیں جیسے رابینڈراف آف دی لوموسٹ آرک۔ ایسے خزانے اہرام مصر کی داستانوں سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ ہزاروں سال پہلے کے ان خزانوں کو تلاش بھی کیا جاتا رہا ہے اور تھوڑی بہت کامیابی بھی ہوئی ہے۔

خفیہ خزانے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو روایتی یا افسانوی ہوتے ہیں یعنی ان کی حقیقت کہانوں کی ہوتی ہے۔ جو صدیوں سے سنی جاتی رہی ہیں اور دوسری قسم کے خزانے وہ ہوتے ہیں جو تصدیق شدہ ہوتے ہیں۔ جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ ان خزانوں کا واقعی کوئی وجود تھا اور اب وہ غائب ہو چکے ہیں۔

اس قسم کے حقیقی اور غیر حقیقی خزانے پوری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک پاکستان میں بھی ہیں اور ہمارے یہاں ان کو تلاش کرنے کے لیے جعلی باباؤں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ ہمارے نام نہاد عملیات کے ذریعے بتا دیتا ہے کہ جاؤ فلاں مقام پر کرڈروں کا خزانہ ہے، کھود کر حاصل کر لو۔

پچھلے دنوں ملتان میں ایسے خزانے کی تلاش کے دوران میں جو الم ناک واقعہ پیش آیا اس سے تو ہر ملک واقف ہے۔ آپ نے بھی اخبارات میں پڑھا اور ٹی وی چینلز پر دیکھا ہوگا۔ یہاں ہم آپ کو تھوڑی سی تحقیق دے کر دنیا کے دیگر ایسے علاقوں کی طرف لیے چلتے ہیں جہاں افسانوی اور حقیقی دونوں طرح کے خزانے موجود ہیں۔

بہر حال یہ تو تھا ملتان کا واقعہ۔ اب ہم دنیا کے دوسرے علاقوں کی طرف چل کر دیکھتے ہیں کہ کہاں کہاں واقعی خزانے ہیں یا صرف روایات ہیں۔

## کوسوناگی کا خزانہ

یہ ایک روایتی خزانہ ہے۔ اس کا تعلق جاپان کی ایک قدیم کہانی سے ہے۔

کوسوناگی ایک روایتی تلووار کا نام ہے۔ جس کا مطلب ہوتا ہے وہ تلووار جو بادلوں کو بھی کاٹ کر رکھ دے۔ ممکن ہے کہ کسی اور کے لیے اس نام اور اس تلووار کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو لیکن جاپانیوں کے لیے یہ بہت مقدس ہے اس لیے اس کی قیمت کروڑوں میں ہے۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ قدیم زمانے میں ایک بلا تھی جس کے آٹھ سراور آٹھ ہی دم تھیں۔ اتفاق سے اس بلا نے ایک غریب خاندان کو دکھ لیا۔ جس کی آٹھ بیٹیاں تھیں۔ اب وہ بلا ہر صبح آتی اور اس غریب کسان کی ایک بیٹی کو اپنے ساتھ لے جاتی۔ اس طرح وہ اس کی سات بیٹیوں کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ جب وہ آٹھویں اور آخری بیٹی کو اپنے آنے والی تھی۔ اس وقت دیوتا سکھ سانو کو اس بلا کے بارے میں بتایا گیا۔ اس نے اس کسان کو بچانے کا



فیصلہ کر لیا۔ اس نے معلوم کیا کہ اس بلا کو کھانے میں کیا پسند ہے۔ اس نے وہی چیز آٹھ مختلف مقامات پر زہر ملا کر رکھ دی۔ وہ بلا اپنے وقت پر آئی۔ اس نے اپنی من پسند چیز دیکھی اور ایک منہ سے کھا لیا۔ زہر کھانے کی وجہ سے بلا کچھ کمزور ہو گئی۔ وہ آگے بڑھی تو اس نے دوسری جگہ بھی وہی چیز دیکھی۔ خود کو روک نہ سکی اور اس نے وہ بھی کھا لیا۔ اس طرح اس نے سات مقامات سے وہ من پسند چیز کھائی لیکن آٹھویں مقام کی چیز نہیں کھائی۔ پھر دیوتا سانو باہر نکلا اور اس نے بلا کو مارنا شروع کر دیا وہ اپنی تلووار سے اس کے سروں کو کاٹنا چلا گیا۔ جب تک بلا زہر کھا کر کمزور ہو چکی تھی۔ سات دم بھی کٹ گئیں۔ لیکن آٹھویں دم نہیں کٹ پائی۔ دیوتا سانو بہت حیران اور مایوس ہو رہا تھا کہ یہ دم کیوں نہیں کٹ رہی۔ پھر اس کی نگاہ بلا کے پیٹ میں رہی ہوئی تلووار پر پڑی۔ اس نے وہ تلووار اٹھائی اور اس تلووار سے وہ دم کٹ گئی۔ یہ وہی تلووار ہے جس کو کوسوناگی کا نام دیا گیا ہے۔ یہ تلووار جاپان کے شاہی خزانے میں موجود تھی۔ 1185ء میں یہ کہیں غائب ہو گئی۔ اب یہ جاپان کا بہت قیمتی گم شدہ خزانہ ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ صرف ایک کہانی ہو لیکن جاپانیوں کے مطابق یہ صرف کہانی نہیں ہے بلکہ اس کی بہت اہمیت ہے۔

## لانوچ کا خزانہ

یہ خزانہ روایتی بھی ہے اور حقیقی بھی۔ کیوں کہ اس کے کردار اور واقعات حقیقی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا خزانہ موجود ہو۔



لانوچ کے خزانے کی منتظر



سونا ہے۔

وہ سونا ایسی قوم کا ہو سکتا تھا جو سونا ذخیرہ کرنے کی شوقین ہو۔

فارمیٹ 1960ء میں پائلٹ بن گیا۔ پائلٹ بن جانے کے بعد اس نے اپنا ایک چھوٹا جہاز خرید لیا۔ وہ ان پہاڑیوں کے ارد گرد پروازیں کرتا رہتا جہاں اس نے پہلی بار سونے کا تیر دیکھا تھا۔ اس نے بیس سال اس جدوجہد میں لگا دیے۔ بالآخر 1980ء میں اس نے اعلان کیا کہ اس نے بہت کچھ پایا ہے لیکن وہ اپنی اس دریافت سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ کیوں کہ اسے کینسر ہو چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے اپنا خزانہ ان پہاڑوں کے دامن میں نہیں چھپا دیا ہے۔ اس نے ٹھیک مقام کی نشاندہی نہیں کی۔ اس کے بیان کے مطابق اس نے جتنا خزانہ حاصل کیا اس کی

تاریخ بتاتی ہے کہ میکسیکو پر ازبیک حکمران تھے۔ یہ بہت تہذیب یافتہ اور دولت مند قوم تھی۔ اس کے آثار میکسیکو میں جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ ازبیک کے آخری حکمران کا نام میک فی لڑتا تھا۔ اس شخص کو سونا جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے پاس سونے کے زیورات تھے، برتن تھے، سونے کا ایک تخت تھا اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

اسپین نے ازبیک سلطنت پر حملہ کر دیا۔ بہت زبردست جنگ ہوئی تھی اور ازبیک سلطنت کمزور پڑنے لگی۔ زوما کو یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ اس جنگ میں شکست کھا جائے گا۔ اس نے اپنے سونے کے ذخائر میکسیکو کے ساحل پر نہیں چھپا دیے۔ وہ خزانہ آج تک معما بنا ہوا ہے کہ واقعی تھا بھی یا نہیں اور اگر تھا تو پھر کہاں ہے۔ اس کی تلاش بھی ناکام ہو چکی ہے۔

فین کے بتائے گئے مقام کی تصویر



### فارمیٹ فین

یہ ایک شخص کا نام ہے جس نے خزانہ دریافت کر لیا تھا۔ یہ ایک حقیقی خزانہ ہے۔ یعنی لہجہ کا وجود ہے۔ اب صدائے عام ہے یارانِ نکتہ والے کے لیے لکھی جو چاہے تلاش کر لے۔

فارمیٹ فینکس میں رہتا تھا۔ جب وہ صرف بچوں کا تھا تو اس نے اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک پہاڑی کے دامن میں ایک تیر پڑا ہوا پایا۔ وہ تیر خالص سونے کا تھا۔ اس کے بعد سے اس پر خزانہ حاصل کرنے کی دھن سوار ہو گئی۔ سونے کے اس تیر کا مطلب یہ تھا کہ اس پاس اور بھی

مالیت اس زمانے میں 3 مین ڈالر تھی۔ اس حساب سے آج کی مالیت لگالیں۔ فارمیٹ خزانے کو چھپا کر مر گیا اور لوگ ابھی بھی اس خزانے کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔

### کیٹن گرانٹ کا خزانہ

یہ خزانہ بھی حقیقی ہے۔ یعنی اس خزانے کا وجود ہے۔ یہ اٹھارہویں صدی کی بات ہے جب لوگوں پر سونے کی تلاش کا جنون سوار تھا۔ ساحل کی ریت چھانی جاتی، دریاؤں میں ڈھونڈا جاتا، پہاڑوں میں تلاش کیا جاتا۔ یعنی جہاں جہاں سونا ملنے کے امکانات پائے جاتے لوگ وہاں بوریابسوں کی طرح نکلتے۔

عام ہوتے ہی ہم جو حضرات نے اس ڈوبی ہوئی لالچ کی تلاش شروع کر دی۔ بے شمار بارشیاں مختلف اوقات میں ان سوتیوں کی تلاش میں جاتی رہیں لیکن کسی کو کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر 1870ء میں لاس انجلس اسٹار نام کے ایک اخبار میں ایک شخص جاری نے یہ دعویٰ کیا کہ اس نے وہ خزانہ تلاش کر لیا ہے۔ ثبوت کے طور پر اس نے کچھ سوتی بھی دکھائے جو ویسے عیا تھے جیسے اس تم شدہ لالچ پر تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ لالچ سمندر کے اندر ایک بڑی پہاڑی کے درمیان پھنس ہوئی ہے اور وہ اس مقام سے واقف ہے۔ وہ عقرب ایک ٹیم لے کر جانے والا ہے۔ کیوں کہ اس خزانے کو نکالنا ایک اسکیل شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے کچھ لوگ بھی چاہئیں۔ لوگ



سوتیوں کی تلاش جاری ہے

بھی آگئے، تیاریاں بھی شروع ہو گئیں لیکن اس دوران میں اس شخص کا انتقال ہو گیا اور وہ خزانہ آج تک دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔

## اوک آئی لینڈ کی دولت



ویسے تو یہ بھی ایک حوالہ دہی دولت ہے۔ ان کے

2015ء



کیپٹن گرانٹ مارشل ایک لالچ کا مالک تھا۔ وہ بھی اپنی لالچ لیے سونے کی تلاش میں بھٹکتا رہتا۔ کچھ لوگوں نے سونٹا میں سونا تلاش بھی کر لیا تھا۔ سونے کے اس ذخیرے کے لیے جارج اے کسٹر اپنے فوجیوں کو لے کر پہنچ گیا اور اس نے بے شمار سونے کی سلاخیں مقامی لوگوں سے جنگ کرنے کے بعد حاصل کر لیں لیکن اس جنگ کے دوران میں اس کے بہت سے فوجی زخمی ہو گئے تھے۔ اسے یہ خبر ملی کہ کیپٹن گرانٹ کی لالچ آس پاس ہی موجود ہے تو اس نے پیغام بھیجا کہ وہ زخمی فوجیوں اور سونے کی سلاخوں کو اپنی لالچ میں بھر کر لے جائے اور حکومت کے حوالے کر دے۔ کیپٹن گرانٹ کی لالچ میں فوجی اور سلاخیں بھردی گئیں لیکن کچھ اسکے سمندر میں زیادہ بوجھ ہونے کی وجہ سے لالچ ڈوب گئی۔

کہا جاتا ہے کہ اس زمانے کے لحاظ سے یہ لالچ پونے چار لاکھ ڈالر کا سونا موجود تھا جس کا آج تک سراں میں رکھا ہے۔ اس کی تلاش میں بہت سے غوطہ خور نہیں روکے گئے۔ جا چکی ہیں اور خدا ہی جانے کہ وہ خزانہ کس کو ملتا ہے۔

## موتی ہی موتی

یہ بھی ایک قیمتی خزانہ ہے۔ یعنی اس کا وجود ہے کبلی فورڈیا کولارا ڈور یا میں ایک لالچ ڈوب گئی تھی۔ وہ لالچ اٹلین کی بھی اور اس میں بے شمار موتی بھرے ہوئے تھے۔ یہ خالص سوتی تھے۔ جن کی مالیت کروڑوں کی ہو سکتی تھی۔ اس خبر کے

عابد احمد سرگودشت





بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ 1795ء میں گم ہو گیا تھا۔ اس خزانے کی گمشدگی کا مقام کینیڈا کا ساحل نور اسکوشیا بتایا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق یہ خزانہ لاکھوں ملین ڈالر کا ہے۔ یہ ملا تو نہیں ہے اس کے باوجود اس کو تلاش کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں لیکن آج تک کامیابی نہیں ملی۔

### پولینڈ کا شاہی خزانہ

ایک صدقہ خزانہ ہے۔ اس کی باقاعدہ ایک تاریخ ہے۔ یہ خزانہ بھی 1795ء میں گم ہو گیا ہے اور آج تک سراغ نہیں مل سکا۔

یہ پولینڈ کا شاہی خزانہ تھا۔ اس میں سونے اور جواہرات کے کئی تاج، تلواریں اور زیورات وغیرہ تھے۔ جرمنی کے فریڈرک ولیم (سوم) کے حکم پر لوٹا گیا تھا لیکن اس کے بعد ہی غائب ہو گیا اور آج تک غائب ہے۔ خزانے کی تلاش کرنے والوں کے لیے یہ ایک چیلنج بن چکا ہے۔

### لیما کا خزانہ

یہ بھی ایک صدقہ خزانہ ہے۔ یہ خزانہ 1820ء میں



لیما کے خزانے

چرا کر کوئلہ کا کے کوز جزیرے میں کہیں دفن کر دیا گیا تھا۔ مقام کی نشاندہی ہونے کے باوجود اس خزانے کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔ اس کی مالیت 160 ملین کے قریب ہے۔

### بے خانہ کا خزانہ

یہ اگرچہ ایک روایتی خزانہ ہے لیکن بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ موجود تھا۔ اس خزانے کی مالیت کا بھی تخمینہ لگایا گیا ہے۔ تقریباً 300 ملین ڈالر کا۔ یہ خزانہ حکومت کی ملکیت تھا۔ کہیں منتقل کیا جا رہا تھا کہ راستے میں ہلاکوں نے لوٹ کر موجودہ بلجیئم کے آس پاس کہیں دفن کر دیا تھا۔ اس خزانے کے گم ہونے کی تاریخ 1821ء ہے۔ اس کو اب بھی تک تلاش کیا جا رہا ہے۔

### Confidaratata gold

یہ بھی ایک صدقہ خزانہ ہے۔ 1865ء میں گم ہوا۔ یہ سونے کی وزنی سلاخیں تھیں جو امریکا کی خانہ جنگی کے دوران میں غائب ہو گئیں اور آج تک مل نہ سکیں۔

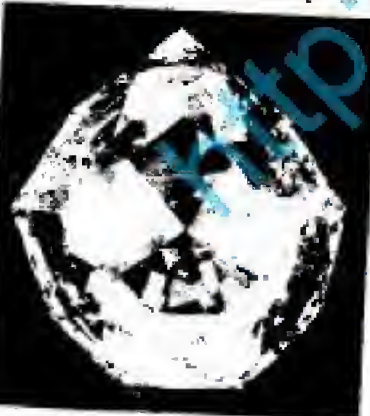
### آئر لینڈ کے شاہی زیورات

یہ بہت قیمتی زیورات تھے جو 1907ء میں ڈبلن کے قلعے سے چوری ہو گئے اور کوئی نہیں جانتا کہ کون لے گئے اور کہاں لے گئے۔ اس زمانے اور اس کے بعد کئی حکومتوں نے اس کی تلاش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن وہ خزانہ آج تک نہیں مل سکا ہے۔

### فلورینٹائن

#### کا ہیرا

ہیرے، جواہرات اور سونا ازل سے انسان کی کمزوری چلے آرہے ہیں۔ حالانکہ یہ انسان



مئی 2015ء

اس کھوپڑی میں منجمد ہو کر رہ گئے تھے لیکن پھر 1941ء میں وہ کھوپڑی کم ہو گئی۔ اسے ایک لالچ میں کہیں پہنچایا جا رہا تھا کہ بدقسمتی سے وہ لالچ ڈوب گئی اور اس کے ساتھ وہ کھوپڑی بھی دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور آج تک اوجھل ہے اگر آپ میں ہمت ہے تو سمندر میں جا کر اسے تلاش کر سکتے ہیں۔

### امبر اوم

بادشاہوں اور ملکاؤں کے بھی کیا شوق ہوتے ہیں۔



ملکہ کتھیرین نے اپنی شب خوابی کے لیے یہ کراہوا تھا۔ آپ اس کی تصویر

دیکھیں تو آپ کے ہوش اڑ جائیں۔ کمرے کی دیواریں خالص سونے کی اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ جن میں جگہ جگہ ہیرے لگے ہوئے تھے۔ چھت پر سونے کی زر دوزی کا کام تھا۔ کمز کیوں کے فریم اور چوکھٹ سونے کے تھے۔ فرش کی ٹائیلز میں جگہ جگہ ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس کمرے کی مالیت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکا ہے۔ اس کمرے کو جرمنوں نے دوسری جنگ عظیم میں جرمن بھجوا دیا تھا۔ وہاں یہ پورا کمرہ ہی غائب ہو گیا اور آج تک غائب ہے۔

### یاما شینا کا خزانہ

یہ خزانہ بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے بے مثال اور اپنی مالیت کے لحاظ سے بے اندازہ تھا۔

1945ء میں جاپان کے جنرل تو مویوکی نے لونا اور جاپانوں کی شکست کے آثار دیکھ کر فلپائن کی ایک پہاڑی کے مختلف غاروں میں چھپا ہوا تمام خزانے کے بعد بھی اس خزانے کا آج تک پتہ نہیں چل سکا ہے۔



کے کسی جسمانی کام میں نہیں آتے۔ اس کے باوجود ان کی اہمیت اور قیمت کسی زمانے میں کم نہیں ہوئی۔

دنیا میں ایک سے ایک خوب صورت ہیرے ہیں جن کی مالیت کروڑوں تک ہے۔ ان ہیروں کی پوری ایک تاریخ ہے لیکن اس وقت ذکر ہے فلورینائن کے ہیرے کا۔ یہ مکمل زر درگاہ کا اپنی مثال آپ تھا۔ ایسا زر درگاہ کا ہیرا دنیا بھر میں کہیں نہیں دیکھا گیا۔ یہ ہیرا 1914ء میں چوری کر لیا گیا تھا اور آج تک اس کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔ اس قسم کی نایاب چیزوں کے ساتھ ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ آسانی سے فروخت نہیں ہوتی۔ کیوں کہ یہ مشہور ہوتی ہیں اور کوئی بھی اپنے پاس رکھنا پسند نہیں کرتا۔ پھر چرانے والے نے اس سے کیا فائدہ اٹھایا ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا۔

### Peking Man یہ کنگ کا آدمی

جی ہاں یہ بہت بڑا خزانہ ہے اور وہ چھپ بات یہ



ہے کہ یہ نہ تو کوئی ہیرا ہے اور نہ ہی سونے سے بنی ہوئی کوئی چیز۔ یعنی اگر یہ آپ کے ہاتھ لگے تو کسے سے فوراً پھینک دیں لیکن اس کی اہمیت اتنی ہے کہ آج تک کوئی اندازہ نہیں کر پایا ہے اور اس کی قیمت کروڑوں کی ہے۔ یہ ایک کھوپڑی ہے۔ جی ہاں انسانی کھوپڑی ہے۔ چارہ جب زندہ ہوگا تب ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی حاکم ہو۔ پتھروں کے غار میں رہتا ہو۔ اگلے سیدھے شکار کر کے اپنا پیٹ بھرتا ہو لیکن اپنی موت کے باوجود لاکھ سال بعد اس کی کھوپڑی کی قیمت کروڑوں میں جا پہنچی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ انسانی نسل کے پہلے انسان کی کھوپڑی ہے اس لیے ماہرین کے نزدیک اس کی قیمت اتنی زیادہ ہے۔ وہ اس پر ریسرچ کرتے رہے ہیں۔ انسان کی ارتقاء کے مختلف ادوار





## آوامارو کا خزانہ

آوامارو ایک جاپانی بحری جہاز کا نام تھا۔ اس پر 5



سے بڑی چوری تھی۔ اس قسم کے چور بھی کمال کے ہوتے ہیں جن کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہوگا کہ یہ آنکھوں سے کاجل تک چرا لیتے ہیں۔ اسی طرح برسلز میں بھی ایک طیارے سے 50 ملین کے جواہرات چوری ہو چکے ہیں۔

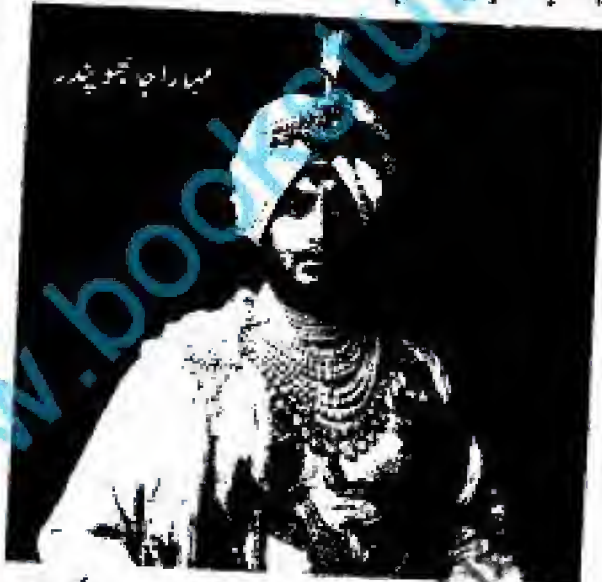
یہ تو چند واقعات ہیں، چند خزانے ہیں، ان کے علاوہ اور نہ جانے کتنے ایسے خزانے ہوں گے جن کی حضرت انسان نے اپنی جانوں سے بڑھ کر حفاظت کی ہوگی لیکن آج وہ غائب ہو چکے ہیں یا کم از کم ان کے استعمال میں تو نہیں آ رہے جنہوں نے یہ خزانے جمع کیے تھے۔

انسان سب جانتا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز اس کے کام میں نہیں آنے والی۔ اس کے باوجود وہ دولت کے انبار لگائے چلا جاتا ہے۔

بلین کے قریب سو نا، بلا ٹینم اور جواہرات وغیرہ تھے۔ آوامارو ڈوب گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خزانہ بھی ڈوب گیا اور ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔

## پٹیاہ کا نیکلس

وہ بہت ہی قیمتی نیکلس ہندوستان میں پٹیاہ کے مہاراجا بھوپندر کے پاس تھا۔ اس نیکلس میں 2930



مہاراجا بھوپندر

## ٹاپ لیز جھیل کا خزانہ

بے انتہاء دولت تھی۔ مرنے کی سلاٹیں، زیورات، جواہرات اور نہ جانے کیا کیا۔ دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ سب سے بڑا مسئلہ اس خزانے کو دشمنوں کی نگاہوں سے محفوظ رکھنے کا تھا۔ اس کے لیے طریقہ یہ سوچا گیا کہ لوہے کے صندوقوں میں بھر کر جھیل میں ڈال دیا جائے اور جنگ کے خاتمے کے بعد ان صندوقوں کو نکال لیا جائے۔

جنگ ختم بھی ہو گئی اس کے بعد جب اس خزانے کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ یا تو وہ صندوق چرا لیے گئے جو کہ بہت مشکل تھا یا پھر جھیل میں ہونے والی کسی تبدیلی کی وجہ سے غائب ہو گئے۔

## انکا تھیب کا خزانہ

انکا تھیب جنوبی امریکا کی بہت ترنی یافتہ تہذیب تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انکا قوم تعمیرات، نجوم، طب وغیرہ جیسے علوم میں مہارت رکھتی تھی۔ (پچھلے دنوں انکا تھیب کے کینڈرکا بہت چرچا رہا ہے)۔

اس ترنی یافتہ تہذیب کے آثار آج تک جنوبی امریکا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس قوم کے پاس بے انداز

بہرے لگے تھے۔ اس میں دنیا کا ساتواں بڑا ہیرا بھی تھا جس کا وزن 428 گرام تھا۔

1948ء میں یہ نیکلس غائب ہو گیا۔ کہاں غائب ہوا یہ کسی کو نہیں معلوم۔ آج تک اس کا پتا نہیں چل سکا ہے۔

## لفٹ ہنسا کا خزانہ

لفٹ ہنسا جرمنی کی ایک فضائی کمپنی کا نام ہے۔ 1978ء میں اس کمپنی کے ایک طیارے میں ایک صندوق رکھا گیا۔ اس صندوق میں 5 ملین ڈالر تھے اور امریکا کے جان الیف کینیڈی ایئر پورٹ پر وہ صندوق غائب ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک وہ چوری امریکا میں نقد رقم کی سب

دولت تھی۔ ان کا ایک شہر

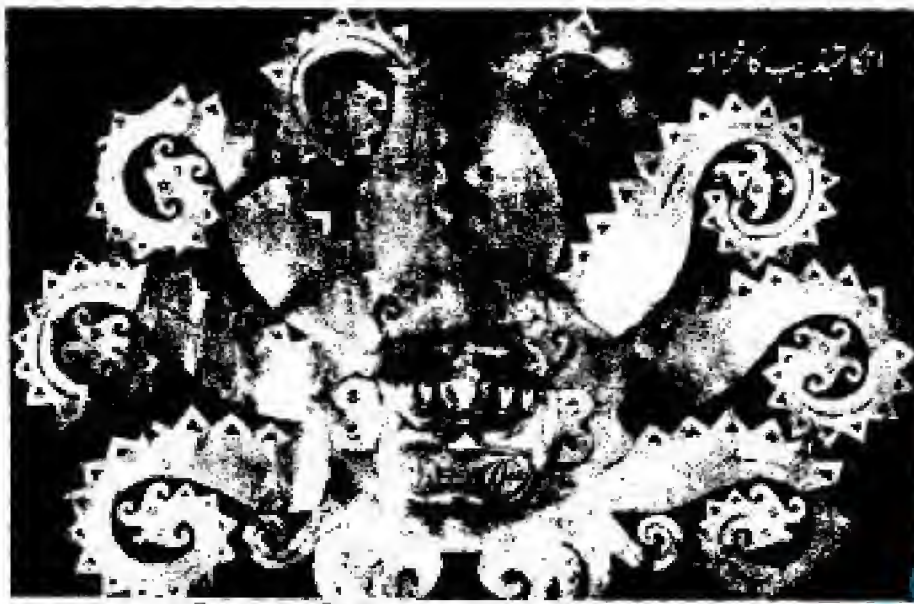
تھا۔ Paititi۔ جب یہ  
تہذیب فنا ہونے لگی تو ان  
کا یہ خزانہ اس شہر کے آس  
پاس تھا لیکن برسوں گزر  
جانے کے بعد بھی اس  
خزانے کا پتا نہیں چل سکا  
ہے۔

**کن شی ہینگ**

**کا خزانہ**

یہ شخص چین کا بادشاہ تھا۔ اس کو سونے سے بہت دل  
چسپی تھی۔ برتن سونے کے، زیورات سونے کے، کتوار  
سونے کی۔ انتہا یہ ہے کہ اس نے اپنی خواب گاہ کی دیواریں

**کن شی ہینگ کا خزانہ**



بیک سونے کی بنوا رکھی تھیں۔ اس قیمتی خواب گاہ کے  
تذکرے چینی تاریخ میں ہوتے چلے آئے ہیں۔

پھر وہ پورا کراہی غائب ہو گیا۔ 1974ء میں اس  
کی خواب گاہ کا صرف ایک حصہ دریافت ہوا لیکن بقیہ کرا  
کہاں ہے اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ اس  
کمرے کی گمشدگی بھی دنیا کے پراسرار واقعات میں سے  
ایک واقعہ ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں بھی اس قسم کے خزانے  
دفن ہوں جیسے ہمارے یہاں مختلف تہذیبیں گزری ہیں۔  
موہن جو دڑو، ہڑپہ، نیکسلا اور گندھارا وغیرہ۔

کھدائی کے دوران میں چھوٹی موٹی چیزیں تو ملتی  
رہی ہیں لیکن کوئی بڑا خزانہ ہاتھ نہیں لگا ہے۔

اس قسم کے خزانے کی تلاش کرنے والے دو کیمپری  
کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو ریسرچ اور علم حاصل  
کرنے کے لیے ان خزانوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے  
ہیں اور دوسری کیمپری وہ ہے جو دولت کے لالچ میں ایسے  
خزانے تلاش کرتے ہیں۔

اتفاق سے دوسری قسم کے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ  
ہے اور ہمارے یہاں کے جالی عامل قسم کے لوگ اس  
کیمپری سے فائدہ اٹھا کر اٹنے سیدھے طریقے بتاتے  
رہتے ہیں۔

پوری دنیا میں حقیقی خزانے تو شاید کم ہی ہوں لیکن  
روایتی اور افسانوی خزانے بہت زیادہ ہیں۔ ہماری کلاسیکی  
کہانیاں ایسے خزانوں کے ذکر سے بھری ہوئی ہیں۔





## سراب

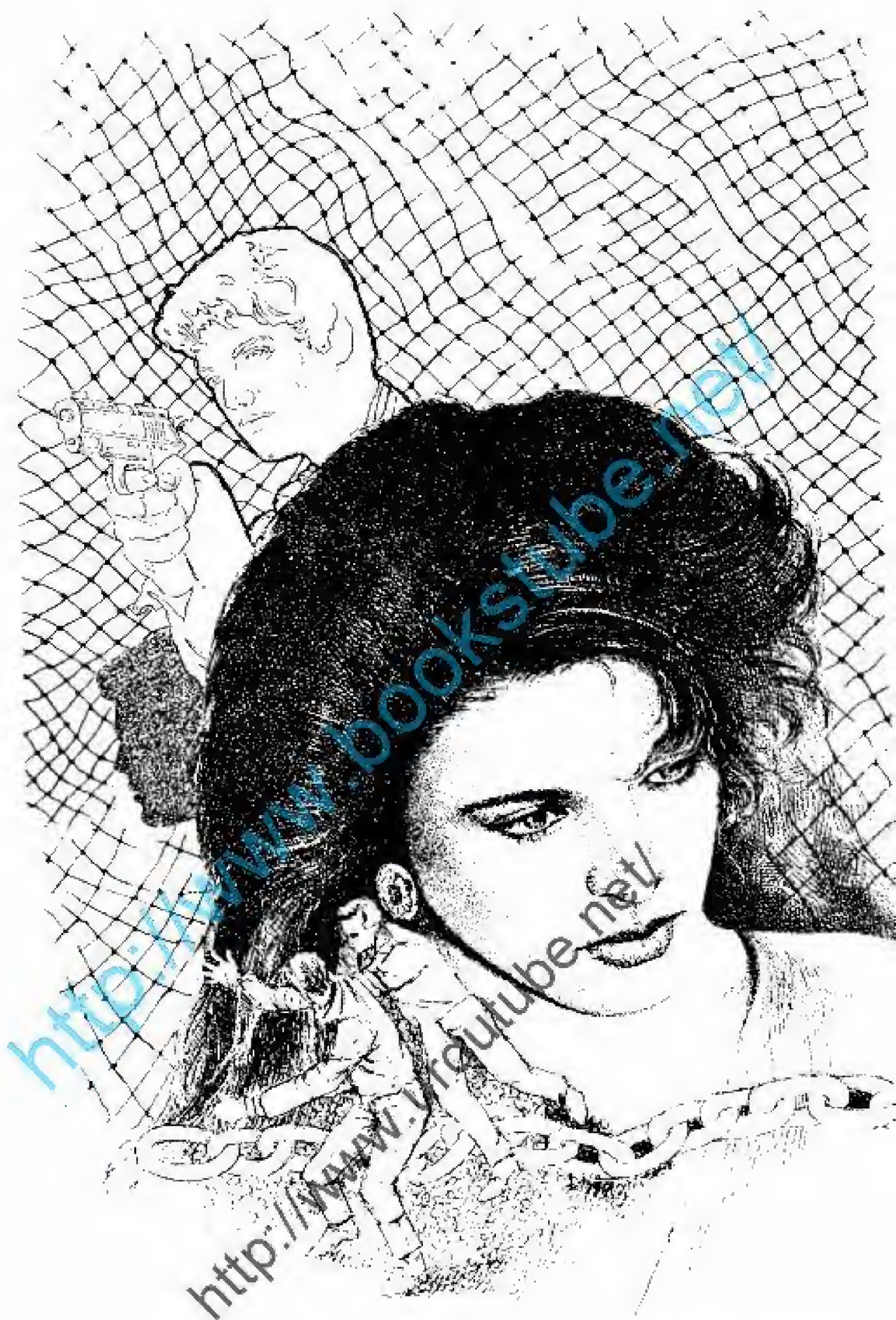
راوی : شہباز ملک

تحریر : کاشف زبیر

قسط نمبر: 95

وہ بیدار بنی تھا جو تھا بلند و بالا پہاڑ، سنگلاخ جناس۔ برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدود کے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک لٹکارسہ ہوا کی محسوس ہوئی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسخ ہو کر اپنا آپ بنا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا جھوٹا سراب۔ ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بہتکاتا ہے۔ جدیدوں کو مقہور دینا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لینا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سراپوں کے ایسے دالروں میں گزرتی اور گزرتی رہتی۔ وقت کے گرداب میں گھومے ہوئے نوجوان کی سستی خبر اور ولولہ انگیز داستان حیات

بندہ جو مصلوں اور بے مثال ونالوں سے گندھی ایک تپتہ فیر کہاں





میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر ریتاوی مٹی تھیں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادری سے ٹکراؤ ہوا اور یہ ٹکراؤ ذاتی  
ان میں بدل گیا۔ ایک طرف سرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہی جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر  
ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ مجھے ڈیوڈ شاہی کے پیروں  
تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس، بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا  
خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زرونگی کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر بیٹھ کر دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر  
آئی۔ سرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم ہانسمو پہنچے۔ وہاں دسم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست  
کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہر تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرونگی  
بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو  
بھاگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرونگی ملے۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک  
مٹرے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ ہسپتال کے زور پر وہ مجھے اس مٹرے تک لے گیا مگر میں نے جب مٹرے میں  
ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اسے میں میری امداد کو اٹھائی جس کے والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان  
کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ سفیر کو دعائی بھیجتا تھا اسے  
اگر پورے سے سی آف کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی متاثر حسن نامی سیاست دان کی بیٹی شبنم کی تھی  
زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج  
کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔  
بہالت مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاک کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے  
چست مٹی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں اڑ گیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں  
بٹھا کر لے چلے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ ٹائیک اور راسن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پالیا پھر راج کنور پر قابو پالیا لیکن  
جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کھڑا تھا۔ "شہباز تھیں پھر تک کر باہر آ جاؤ۔" میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر مارا ہسپتال نکل  
کر دور جا کر پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیاہ کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ راج کنور کو لے کر سرحد  
پار کر گیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اسے واپس اڑایا لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے  
بیلی کا پٹر لانے کو کہا۔ شملہ پتھہ پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی ناک بندی کرنے چاہیے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو  
راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی جیتے سڑک پر تو کیلی کیلیں بچھا دی گئیں۔ گاڑی  
زودیک پہنچے ہی دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو بیڑے کے شانے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کر دیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر  
وہاں سعدیہ کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے کہ ایک بیلی کا پٹر اترا رہا تھا۔ اس سے سعدیہ اتری اور اندر چلی گئی۔ میں بیڑے کو لے کر  
ڈاکٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن سیتا کے کمرے بھیج دیا۔ سیتا کا شوہر اردن اسے حراساں کر رہا تھا  
اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دور طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شاہی کے  
اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ اس کے ساتھ ڈیوڈ شاہی کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد  
دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کون سا مکان سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے  
پوجان نامی نوکرالی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ گھر سے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی "شاجی، شہباز ملک کسی  
عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شاہی کا منہ سن نہیں پایا کیونکہ بوجھانے مانگ بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور  
لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر ہسپتال پر باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کر دیا اور محل میں پہنچا دیا۔  
مجھے پتا تھا ہر جگہ دیکھا فون لگا ہوا ہے۔ بھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے جیج کر کہا "کنور ہوشیار" سادی کو لے کر چھپرے۔ "مگر حملہ  
اوجھڑا رہ گیا اور سادی کی جیج سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں  
اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانہ بن لیا۔ بھی راج کنور آ گیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیڑے کی گردن میں  
لگی۔ میں نے غصے میں پورا ہسپتال راج کنور پر خالی کر دیا بیڑے مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک بیلی کا پٹر کے ذریعہ  
سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آئی۔ اس نے تصدیق کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم جگے میں



بیٹھے بائیں کر رہے تھے کہ کبھی بھینک کر ہمیں بے ہوش کر دیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شاکی قید میں شانے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہتا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی ذہرا جیکٹ کر دیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہو گیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہتا یا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سیناٹائڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیب کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شانے میرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے چڑچڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گر پڑا تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کر کے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہو گیا مگر آگے جا کر میں نے فتح خان کو کوئی ماردی اور وہاں وہاں آیا جہاں گاڑی کر کے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے نکل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں وہاں ہو گیا کہ راستے میں ایک عورت اور دونو جوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے دار ہوا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

### (اب آگے پڑھیں)

سے کہا۔ ”ہاں یہ غلطی کی مگر بہر حال تم قابو میں آ ہی گئے۔ اب اپنے ہاتھ پیچھے کرو۔“

میں نے ہاتھ پیچھے کیے تو اس نے پلاسٹک تار کی کس جانے والی پھنڑی سے میرے دونوں ہاتھ باندھ دیئے۔ شیر خان لکھ سے نہ تو قبائلی لگ رہا تھا اور نہ ہی اس طرف کارہنے والا۔ البتہ اس نے علیہ ضرور ایسا بنایا ہوا تھا۔ اس نے ڈھیلی شلوار قمیص اور اوپر پگڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے باقی دوساتھیوں کا علیہ بھی تقریباً ایسا ہی تھا۔ مجھے بے بس کرنے کے بعد ان میں سے ایک کہیں گیا اور چند منٹ بعد ایک نیچے وجیب کے ساتھ نمودار ہوا۔ مجھے بازو سے پکڑ کر نیچے لایا گیا اور وجیب کے پچھلے حصے میں بٹھا دیا گیا۔ دو میرے دائیں بائیں آگئے۔ شیر خان نے فرنٹ سیٹ سنبھالی اور ڈرائیونگ زینے کے حصے میں آئی جو بدستور اسی علیہ میں تھی۔ یہ لوگ مادر پدر آزاد لگ رہے تھے۔ البتہ سردی سے بچنے کے لیے اس نے ایک شال لے لی تھی۔ میرا اسلحہ اور دوسرا سامان انہوں نے میری ٹاکارہ ہو جانے والی جیب میں ڈال دیا تھا۔ میں اپنے ہاتھوں کی بندش کی مضبوطی کا اندازہ کر رہا تھا اور جلد میں نے محسوس کر لیا کہ اسے کھولنا ممکن نہیں تھا زور لگانے سے یہ میری کلائیوں میں گڑ رہی تھی۔ اس کی بندش ویسے ہی بہت سخت تھی اور ذرا سی دیر میں خون رکنے لگا تھا۔

”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

ان کا رخ مجھ کی طرف تھا یعنی وہ میدانِ علاقے کی طرف جا رہے تھے۔ کھلا کہا جاسکتا تھا۔ اس دشوار گزار علاقے میں بعض اوقات جان کی طرف جانے کے لیے کئی

ابھی شیر خان کی رائفل سر پر موجود تھی کہ سامنے سے ہارچ کی روشنی مجھ پر پڑی تھی۔ پھر دوسری ہارچ آن ہوئی۔ میں ہر طرف سے گھبرا گیا تھا۔ زینے مجھ سے ڈرا دور سرک کر کھڑی ہوئی تو روشنی میں اس کی سنڈول لمبی ٹانگیں نمایاں ہوئیں اور میں اس حالت میں بھی لاجول پڑا۔ میرے نہیں رہ سکا تھا۔ شیر خان نے حکم دیا۔ ”تھپتھپا آرام سے آگے ڈال دو جلد بازی مت کرنا۔“

”اگر میں جلد بازی کروں اور تم مجھے شوٹ کر دو تو ان لوگوں کو کیا جواب دو گے جنہوں نے مجھے زندہ سلامت لانے کو کہا ہے؟“

”انہوں نے ہم سے اپنی جان کی قیمت پر زندہ لانے کو نہیں کہا ہے۔ اگر ہمیں خطرہ ہو تو ہم گولی چلانے میں دیر نہیں کریں گے۔“ شیر خان بولا۔ ”تھپتھپا دو۔“ اس بار میں نے رائفل پھینک دی۔ ”مزید کوئی حکم؟“

”تمہارے پاس پستول بھی ہے۔“

”وہ جیکٹ میں ہے خود نکال لو۔“

شیر خان نے مجھے ٹٹولا اور جیکٹ سے پستول نکال لیا۔ اس نے میری مزید شکاشی لی اور باقی سب چیزیں بھی نکال لیں۔ زخمی ہونے کے باوجود اس کا دم خرم قابلِ تعریف تھا۔ شاید گولی اس کے بازو کو چھوئی گزر گئی تھی۔ ورنہ وہ اتنے سکون میں نہ ہوتا۔ میں نے کہا۔ ”بہ قول اس خاتون کے تمہارے ساتھ اور افراد بھی ہیں تو تم نے مجھے اسے کھٹیا انداز میں گرفتار کرنے کی کوشش کیوں کی؟“

”ہم بس چار ہی لوگ ہیں۔“ شیر خان نے آہستہ



بار جنوب کا رخ بھی کرنا پڑتا تھا کیونکہ سڑکیں اور راستے نایاب تھے۔ کتنی کی چند سڑکیں ہیں جو اس پورے علاقے کو آپس میں ملاتی ہیں۔ ہم الائی سے کچھ ہی دور تھے۔ یہاں سے جیپ مغرب کی طرف مڑ گئی۔ یہ سڑک بینکورہ کی طرف بھی جاتی تھی اور اگر اس بردا میں طرف مڑ جاتے تو جزالہ کی طرف بھی جاسکتے تھے۔ صبح قریب تھی۔ میں ایک بجے سویا تھا اور ساڑھے تین بجے اٹھ گیا تھا۔ اس کے بعد یہ چکر شروع ہوا اور اسے بھی اب ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ مشرقی افق پر سفیدی نمودار ہو رہی تھی۔ میرے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اب ان لوگوں کا رویہ بہت پروفیشنل لگ رہا تھا۔ ذرا دیر میں روشنی ہونے لگی۔

میں سیٹ سے سر نکالے بظاہر آرام کر رہا تھا مگر نیم وا آنکھوں سے اس پاس کے مناظر دیکھ رہا تھا تا کہ مجھے معلوم رہے کہ یہ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ چھ بجے ہم اس سڑک پر آ گئے جس کے ایک طرف بینکورہ تھا اور دوسری طرف جزالہ کو راستہ جاتا تھا۔ جیپ دوسری سمت مڑ گئی۔ گویا یہ مزید شمال کی طرف جا رہے تھے۔ میں کسی قدر مشکل میں تھا کہ ہاتھ پیچھے بندھے ہونے کی وجہ سے میں پوری پشت نہیں لگا سکتا تھا اور نہ ہی آرام وہ طریقے سے بیٹھ سکتا تھا۔ دو گھنٹے کے سفر میں میرے بازو اکڑ گئے تھے۔ ان لوگوں سے پوچھنا بیکار تھا وہ اپنی منزل پر پہنچ کر ہی رکستے۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ مرشد یا کوئی اور دشمن نہیں ہو سکتا تھا جو مجھے یوں اٹھواتا۔ پھر اس طرف جانے کا کیا جواز تھا۔ یہ کوئی اور ہی چکر تھا۔ مجھے کرنل عبدالرحمن کا خیال آیا۔ کیونکہ وہ ایک بار اسی علاقے میں مجھے بلوا کر بھارتیوں کے حوالے کر چکا تھا۔ مگر اس سے میرا اب کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ آخری بار اس نے میری مدد بھی کی تھی۔ پھر یہ کون ہو سکتے تھے؟

بھارتیوں سے حال آیا کہ کہیں ان لوگوں کو بھارتیوں نے ہار تو نہیں لیا تھا۔ بڑوسی ملک میں ہمارے اس ازلی دشمن نے اپنے لیے ہمارے لیے تھے اور اب انہیں مضبوط کر رہا تھا۔ جگہ جگہ اس کے کوسٹ گارڈ تھے جو اصل میں را کے اڈے تھے۔ بھارتی سرگرم تھے اور میں ان کو مطلوب تھا۔ یہ سوچ کر میرے جسم میں پھر بری سی آگ لگی۔ میں اس قوم اور اس کی تاریخ سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ بھڑکی کھال میں بھیڑیا اور چرخ صفت قوم ہے۔ جب آپ کی زد پر آتی ہے تو قدموں میں لوٹ پوٹ ہو جاتی ہے اور جب آپ کو اپنی زد میں لے لے تو رحم و مروت کرنا گناہ

ماہنامہ سرگزشت

عظیم سمجھتی ہے۔ صرف نصف صدی کے عرصے میں اس نے پے در پے ہمیں نقصانات اور صدمات سے دوچار کیا اور اس کے باوجود ہم اتنے سادہ ہیں کہ اب بھی اسے دوست بنانے کی سعی کر رہے ہیں۔ جب کہ وہ ہمیں برباد کرنے اور پاکستان کا نام دنیا کے نقشے سے مٹانے کے لیے ذرا بھی کوتاہی سے کام نہیں لے رہا۔ پتا نہیں کب ہمیں یہ بات سمجھ آئے گی۔ خوف اس کا ہے کہیں بہت دیر نہ ہو جائے۔

اچانک جیپ دھچکے سے رکی تو میں چونک کر خیالوں سے نکل آیا۔ جیپ سڑک کے ساتھ ایک چھوٹے سے بنگلے کے سامنے رکی تھی اور شیر خان نے اتر کر لوہے کا گیٹ کھولا۔ زینی جیپ اندر لے آئی اور شیر خان نے عقب میں گیٹ بند کر دیا۔ میرے دائیں طرف موجود حصے اتر اور اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے بھی نیچے اتارا۔ دوسرا اپنی طرف سے اتر آیا۔ زینی اب اندر جا رہی تھی۔ میں نے استہزاء سے انداز میں کہا۔ ”تم بٹے کٹے مرو پورے لباس میں ہو اس بے چاری نے کیا تصور کیا ہے؟“

”کیپ کو امیٹ۔“ ہم سے ساتھ موجود نو جوان نے کہا۔ میرا ہاتھ کا کیونکہ وہ پہلی بار بولا تھا اب تک شیر خان یازینی ہی بولتے آئے تھے۔ نو جوان کا لہجہ شہری اور تعلیم یافتہ تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہ نہیں تھے جو خود کو ظاہر کر رہے تھے۔ بلکہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے اوپری حصے میں شاید ایک ہی کمر تھا کیونکہ اس کی چھتیں ترجیحی اور لکڑی کی بنی ہوئی تھیں البتہ نیچے کی مکانیت زیادہ لگ رہی تھی۔ زینی نے لاک کھولا اور اندر چلی گئی۔ میں ان تینوں کے ساتھ اندر آیا۔ وہ میرے ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود میری طرف سے پوری طرح چوکنا تھے۔ شیر خان نے چاقو سے میری بندشیں کاٹیں اور انہوں نے مجھے ایک کمرے میں دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ کمرہ چھوٹا تھا اور اس میں ایک سنگھل بیڈ اور ایک طرف دیوار گیر الماری تھی۔ فرش پر قالین اور ایک کھڑکی پر اس کے ہم رنگ پردے لٹک رہے تھے، میں نے پردہ ہٹا کر کھڑکی کا معائنہ کیا تو اسے مضبوط کرل سے کور پایا۔

ظاہر ہے وہ ایسی حماقت نہیں کر سکتے تھے کہ مجھے فرار کا راستہ عنایت کرتے۔ میں بازوؤں کو حرکت دیتا ہوا بیڈ پر بیٹھ گیا۔ حالات بتا رہے تھے کہ یہاں میرا قیام مختصر تھا اور جلد یا تو میرے خریدار مجھے لینے آجائے یا پھر یہ مجھے آگے بھجایا جاتا۔ انہوں نے جس طرح مجھے اپنا ٹھکانہ دیکھنے کا موقع دیا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ یا تو یہ ان کا عارضی ٹھکانہ



تھا۔ اس خوب صورت پہاڑی علاقے میں بے شمار ایسے جنگلے اور کوٹھیاں ہیں۔ جو شہروں اور میدانوں میں رہنے والے صاحب ثروت لوگوں نے بنوا رکھی ہیں اور وہ سال میں چند مہینے یا چند ہفتے یہاں گزارتے ہیں باقی سارے سال یہ کوٹھیاں اور جنگلے خالی پڑے رہتے ہیں۔ چونکہ یہاں یہ کوٹھیاں اور جنگلے خالی پڑے رہتے ہیں۔ چونکہ یہاں یہ کوٹھیاں اور جنگلے خالی پڑے رہتے ہیں۔ چونکہ یہاں یہ کوٹھیاں اور جنگلے خالی پڑے رہتے ہیں۔

دوسرا مکان یہ تھا کہ میری والدہ جی نہ ہوتی اور ان سے کوئی حساب نہیں لیتا اس لیے انہوں نے مطمئن ہو کر مجھے یہ ٹھکانہ دیکھنے کا موقع دیا تھا۔ ذرا آرام کے بعد میں نے اٹھ کر ہلکی پھلکی ایکسر سائیکل شروع کی تاکہ میرا جسم چاق و چوبند رہے۔ رات آرام کی کمی سے جو سہل مندی تھی وہ دور ہو جائے۔ دس چندرہ منٹ کی ایکسر سائیکل کے بعد میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔ کمزری مشرق کی طرف تھی اس لیے دھوپ اندر آئی اور کمر روشن ہو گیا۔ میں نے الماری کھولنے کی کوشش کی تو وہ لاکڈنگلی میں نے بلا تکلف اس کا ہینڈل پکڑ کر جھٹکا دیا اور کھٹ کی آواز کے ساتھ لاک ٹوٹ گیا۔ اگر آواز باہر تک گئی تھی تب بھی مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ مگر الماری سے کوئی ایسی چیز ملنے کی خواہش خرابی ہی رہ گئی جس سے میں آزادی حاصل کر سکتا۔ نہ کوئی ہتھیار تھا اور نہ ہی ایسی کوئی چیز۔ اندر صرف مردانہ اور زنانہ کپڑے تھے۔ نچلے حصے میں جوتے رکھے تھے۔ ایک دروازہ میں رومال، بنیان اور مردانہ اندر بدیر تھے۔ دوسری دروازہ کھولی تو اس میں سے زنانہ اشیاء نکل آئیں۔ میں نے اسے بند کر کے مردانہ حصے کا جائزہ لیا۔

مردانہ کپڑے زیادہ تر مقامی ساخت تھے اور زنانہ ملبوسات بھی شریفانہ تھے۔ یعنی فیشن سے میل نہیں کھتے۔ شاید میرا پہلا خیال درست تھا کہ یہ جگہ ان لوگوں کی نہیں تھی۔ یہ باقاعدگی سے زندگی گزارنے والے لوگ نہیں لگ رہے تھے۔ میرا نہیں خیال کہ زنی جیسی عورت اس حصے کے لباس استعمال کرتی ہوگی۔ درازیں اور الماری کے پتے جھٹکے میں واپس بیٹھ پر آ بیٹھا۔ انہوں نے میری کمزری بھی دیکھی تھی۔ راستے میں مجھے جیب کے وٹیش بورڈ پر لگی کمزری سے وقت کا پتا چلا رہا تھا۔ ہم تقریباً سات بجے یہاں پہنچے تھے اور مجھے بند ہوئے ایک گھنٹا مزید گزر گیا تھا۔ آٹھ بج چکے تھے۔ اگرچہ مجھے نہ تو بھوک پیاس لگ رہی تھی اور نہ ہی کوئی دوسرا مسئلہ تھا مگر میں نے دروازہ بجانے میں حرج نہیں سمجھا۔ دوسری بار بجانے پر زنی کی آواز آئی۔ ”کیا مسئلہ

ہے؟“ ”مسئلہ فطرت کا ہے کس زنی۔“ میں نے ذرا فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”تم جانتی ہوتا جب فطرت آدمی کو آواز دیتی ہے تو اسے کہاں جانا ہوتا ہے۔“ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ ”دس منٹ رکو ہم ذرا مصروف ہیں۔“ ”او کے دس منٹ۔“

جب میرے خیال میں دس منٹ پورے ہو گئے تو میں نے پھر دروازہ بجانا شروع کر دیا اور اس وقت تک بجاتا رہا تھا جب تک وہ کھل نہیں گیا۔ سامنے ایک کلین شیڈ خوبرو نوجوان تھا جو مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا اس نے فرما کر کہا۔ ”تمہیں مسئلہ ہے؟“ ”بالکل بھی نہیں کیونکہ میں اس صاف ستھرے کمرے کو ہاتھ روم کی جگہ استعمال کرنا نہیں چاہ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے تمہاری جون ہی بدل گئی ہے۔ داڑھی موچھیں ہٹا کر بہت چمکنے لگے ہو۔“

ایک لمحے کو اس کی آنکھیں سرخ ہوئی تھیں مگر اس نے سر دلچہ میں صرف اتنا کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“ نوجوان نے جیپز اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ باقی پارٹی ڈرائنگ روم میں تھی اور کھانے پینے سے قفل کر رہی تھی ان کا علیہ بھی بدل گیا تھا۔ دائرہ میوچس غائب نہیں اور وہ پینٹ شرٹ میں تھے۔ زنی نے بہت کئی ہوئی جیپز کے ساتھ نہایت ڈھیلی موٹے نیٹ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا گلا ایک شانے سے ڈھلک کر بازو تک آ گیا تھا۔ میز پر کھانے پینے کی تیار چیزیں تھیں۔ ان کے ساتھ بیئر کی بوتلیں اور گولڈ ڈرنک کے ٹن تھے۔ نوجوان مجھے ساتھ والے کمرے کے دامن روم تک لایا اور اس نے کہا۔ ”جلدی کرو جو کرنا ہے۔“

”ذرا دیر لگے گی۔“ میں نے کہا اور اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ مگر جب میں نے دامن روم کا جائزہ لیا تو وہاں سے بھی نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ ایک نہایت چھوٹا سا روشن دان تھا اور اس پر بھی شیشہ ٹکس تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر سرد پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور ضروریات سے فارغ ہوا۔ پھر باہر آیا تو نوجوان وہیں موجود تھا۔ ”مجھے لے کر واپس آیا تو زنی نے آواز دی۔“ ”ایک منٹ اسے بھی کھانے کو دے دو، آگے طویل سفر ہے۔“

مجھے ایک ٹھنڈا چھوٹا بڑا اور چند نان خطائیوں کے



مست کرو۔ میں جان مگنی ہوں تم عورت سے متاثر ہونے والے آدمی نہیں ہو۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔“ میں نے کہا اور باہر آیا تو ایک بار پھر میرے دونوں ہاتھ پشت پر پلاٹنگ ڈور سے باندھے گئے۔ اس کی گرفت اور سختی اذیت ناک ہوتی ہے جو دوران خون روک دیتی ہے اور کھلنے کے بعد بھی خاصی ہاتھ کسی قابل نہیں رہتے ہیں۔ وہ باہر آئے اور مجھے جیب میں بٹھایا۔ کل رات کی طرح ڈرائیونگ زینی نے سنبھالی تھی۔ اس وقت اس نے اپنی سنسنی خیز شرٹ پر ایک ہلکی جیکٹ پہن لی تھی۔ شیر خان اس کے برابر میں تھا اور اس کے دونوں سامی میرے دائیں بائیں تھے۔ وہ سب ہی نو جوان اور خاصے خوب صورت تھے۔ عمریں تیس کے اندر تھیں۔ میں نے شیر خان سے کہا۔ ”کیا میرے کچھ اور سوالوں کے جوابات مل سکتے ہیں؟“

”کیسے سوالات؟“

”تم لوگوں کے بارے میں۔“

”یو چھو اگر دے سکا تو دوں گا۔“

”تمہارا تعلق پاکستان سے ہے؟“

”میرا ہے۔“ شیر خان بولا۔ ”یہ تینوں باہر سے ہیں۔“

”لیکن تم چاروں ایک ٹیم ہو؟“

”ہاں ہم چاروں ایک ٹیم ہیں۔“ اس نے تسلیم کیا۔

”اسی قسم کے کام کرتے ہو؟“

”ظاہر ہے۔“ شیر خان نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کافی سوالات ہو گئے ہیں۔“

”مہربانی تمہاری کہ تم نے جواب کی زحمت کی۔“

”میں تمہارے بارے میں جانتا ہوں اس لیے ذرا فکر مند بھی تھا کہ تم شاید اتنی آسانی سے ہاتھ نہ آؤ جتنی آسانی سے آ گئے۔“

”میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”تمہارا مکمل بیک گراؤنڈ۔“ شیر خان بولا۔ ”بچی بات ہے میں تم سے متاثر بھی ہوا تھا۔“

”مگویا اب نہیں ہو؟“

”نہیں اب بھی ہوں۔“ وہ یوں بولا جیسے کہتا چاہ رہا ہو کہ انسان کو اپنا خیال اتنی جلدی نہیں بدلتا جیسے ورنہ وہ اب تک بدل چکا ہوتا۔

”گلتا ہے تمہیں میرے بارے میں کچھ غلط معلومات کی ہیں میں ایک عام آدمی ہوں بس ذرا مختلف طرز زندگی

ساتھ کو لڈ ڈرنک کا ایک ٹن عینایت کچ گیا اور واپس بند کر دیا گیا۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا تھا کہ یہاں قیام عارضی تھا۔ انہیں آگے جانا تھا مگر کہاں جانا تھا میں اس سے بے خبر تھا۔ اس خبر نے میرے خدشات بڑھا دیے تھے کہ کہیں مجھے پھر تو بھارتیوں کے حوالے کرنے کا کوئی پلان تو رو بہ عمل نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی بھارتی دو بار مجھے لے جانے کی کوشش کر چکے تھے اور انہیں دونوں کوششیں خاصی مہنگی پڑی تھیں جب انہیں اپنے پہلی کاپڑ اور کمانڈرز سے ہاتھ دھو کر بڑے تھے۔ یہاں سے اگرچہ افغانستان کی سرحد زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر خط مستقیم میں سفر کیا جائے تو فاصلہ ساٹھ کلومیٹر بھی نہیں بنتا تھا لیکن دشوار اور پہاڑی راستوں کے کھمبہ پھراؤ کی وجہ سے یہ تین گنا بھی ہو سکتا تھا۔ شاید اسی لیے زینی نے کہا تھا کہ دور جانا ہے۔ کھانے کے دوران میں نے سوچا کہ کہیں میں کچھ زیادہ تو نہیں سوچ رہا ہوں لیکن ہے یہ مجھے یہاں سے کسی میدانی علاقے کی طرف لے جائیں۔ آدھے گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور شیر خان کے ساتھ زینی اور وہی خوبرو نو جوان موجود تھے۔ وہ سچ اور چوکنا تھے۔ شیر خان نے کہا۔

”باہر آؤ کوئی غلط حرکت مت کرنا۔“

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر پوچھا۔ ”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو اور کن کے حوالے کرو گے؟“

”سوال مت کرو۔“ خوبرو نو جوان غرایب۔ ”شرافت سے باہر آ جاؤ۔“

”اگر میں نہ آؤں تو تم کیا کرو گے؟ مجھے گولی مار دو گے؟“ میں نے ٹیم سنجیدہ لہجے میں دریافت کیا۔

”ہاں تمہارے گھٹنے پر گولی ماریں گے اور پھر تمہیں سمجھ کر کھینچ جائیں گے۔ زندہ لانے کو کہا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ سلامت بھی ہو۔“ شیر خان نے اپنی رائفل کا رخ میرے بچہ کی طرف کر دیا۔ ”میرے تین بیک گھٹنے سے پہلے فیصلہ کر لو کہ کس طرح آؤ گے؟“

”اؤکے۔“ میں نے اس کے تین کہنے سے پہلے ہاتھ اٹھا دیا۔ ”میں آ رہا ہوں لیکن مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے کن لوگوں نے اٹھوایا ہے۔“

”جلد تمہارے سامنے آ جائے گا مسٹر ٹھیکانہ۔“ زینی بولی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ لباس بھی تم پر ہی ہے۔“

”لیکن رات تو تم قیامت لگ رہے تھیں۔“

”شٹ اپ۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”جمہونی تعریف



گزارنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں۔“

شیر خان چپ رہا۔ جب کارخ میری توقع کے مطابق شمال کی طرف تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”شیر خان اور زنی کیا یہ اصل نام ہیں؟“

”میرا نام اصل ہے۔“ زنی بولی۔ ”لیکن یہ یک نام ہے۔“

”وہ تو ظاہر ہے، اس کا مطلب ہے شیر خان نام نہیں ہے؟“

”ہاں میرا نام کچھ اور ہے مگر تم چاہو تو مجھے شیر خان ہی کہہ سکتے ہو۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہارے بازو کا زخم کیا ہے؟“

”ٹھیک ہے کوئی چھوٹی ہوئی کز رنگی تھی۔“

وہ چاروں یقیناً کل شام سے اس مشن پر تھے انہیں اس جگہ پہنچنے اور مجھے تلاش کرنے میں کچھ وقت لگا ہوگا۔ پھر وہ مجھے یہاں لائے اور اس کے بعد بھی آرام نہیں کیا۔ اپنا گیٹ اپ تبدیل کیا اور کھاتے پیتے رہے۔ اس کے باوجود وہ چاروں تازہ دم لگ رہے تھے۔ شاید انہوں نے کوئی دوا استعمال کی تھی۔ آج کل ایسی دوائیں عام ہو گئی ہیں جو انسان کو بہت بری حالت میں بھی یوں چاق و چوبند کر دیتی ہیں جیسے وہ پھر پورا آرام کر کے اٹھا ہو۔ اگرچہ ان دواؤں کے سائیڈ ایفیکٹس بھی ہوتے ہیں مگر وقفے سے استعمال کرنے سے خاص اثر نہیں پڑتا ہے۔ دیم نے مجھے ان دواؤں کے بارے میں بتایا تھا جو وہ طویل مشن کے دوران استعمال کرتے تھے۔ یہ ممکن اور اس کے اثرات غائب کر کے انہیں چاق و چوبند کر دیتی تھیں۔ اس میدان میں جدید ایجادات کا فائدہ شیر خان جیسے لوگ زیادہ اٹھا رہے ہیں کیونکہ وہ اس سے اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ اب وہشت گرد ایسی ادویات کا فائدہ اٹھاتے ہیں جو ان کے مشن میں کارآمد ہوں جیسے بہتے خون کو روکنے والی دوا، زیند اڑانے اور جھکن بھگانے والی دوائیں، ایسٹرائیزر اور کچھ دیر کے لیے انسان کو سپر مین بنادیتے ہیں۔ اب سنا ہے خواہ اس سے کرنے والی دوائیں بھی میدان میں آگئی ہیں۔ ممکن ہے کچھ عرصے بعد ہم انسان اور مشین کا ملاپ یعنی سائی بورگ بھی اپنی زندگی میں دیکھ سکیں۔

جب اسی سڑک پر تیزی سے آگے جا رہی تھی۔ اگرچہ راستہ بہت اچھا نہیں تھا مگر جب کا طاقتور انجن اور بہترین ریڈیل ٹائرز کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم کسی اچھی کوالٹی کی ہائی وے پر سفر کر رہے ہوں۔ زنی اچھی ڈرائیور

تھی۔ اسپیدومیٹر کی سوئی مستقل چالیس کے پاس تھی مگر اس نے ایک بار بھی گاڑی کو قابو سے باہر ہونے نہیں دیا تھا۔ ورنہ یہاں بہت تنگ اور پوٹرن ٹائپ موڑ تھے۔ ایک جگہ سڑک کا تقریباً ایک کلومیٹر کا ٹکڑا بارش کی وجہ سے شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا صرف اسی جگہ میں رفتار زوراً کم ہوئی تھی اور اس کے بعد جب پھر اپنی رفتار سے دوڑنے لگی۔ یہاں بلندی بھی کم زیادہ ہو رہی تھی۔ ایک مقام پر ہم نو ہزار فٹ کی بلندی سے بھی گزرے اور اکثر مقامات جہ سے سات ہزار فٹ بلند تھے۔ بلندی پر سردی بڑھ جاتی تھی اور نیچے آتے تو موسم معتدل ہو جاتا۔

راجا عمر دراز سے ملاقات کا فیصلہ مجھے مسلسل مہنگا پڑ رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک مصیبت میں گرفتار ہوتا رہا اور اللہ کے فضل سے اس مصیبت سے نکلتا رہا۔ مگر اس آخری مصیبت سے چھٹکارے کی فی الحال کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ جب کے ٹائر برسٹ ہو جانے کے بعد اگر میں بجس میں پڑنے کی بجائے فرار کو ترجیح دیتا تو شاید اس مصیبت میں نہ پڑتا۔ بہر حال یہ مقدر میں بھی تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم کھوسے اور مغرب کی طرف جانے لگے مزید آدھے گھنٹے بعد ہمارا رخ جنوب مغرب کی طرف ہو گیا یعنی اب ہم الٹی سمت میں جا رہے تھے۔ سڑک ٹارک اور پتلی ہوئی جا رہی تھی مگر اس پر بھی ٹریفک تھا۔ بڑے ٹرکوں سے لے کر مسافر بردار کوچز، دین اور چھوٹی بڑی ہر طرح کی گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ سیزن کی وجہ سے سیاح بھی محو سفر تھے اور در سے کل جانے کی وجہ سے آنے والے سراما کے لیے ابھی سے سامان زندگی جمع کیا جا رہا تھا۔ سارے سال باہر رہ کر کھانے والے گرمیوں میں اپنے علاقے میں آتے جاتے تھے۔

جھنگر ال کے پاس رک کر جب کا انجن ٹھنڈا کیا گیا اور ان لوگوں نے بھی ہاتھ پاؤں کھولے مگر مجھے نیچے اترنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ نیچے اترنے پر بھی ان میں سے ایک میرے پاس ہی رہتا تھا۔ جب شیر خان کی باری آئی تو میں نے اس سے کپ شپ شروع کر دی۔ ”تم تعلیم یافتہ لگتے ہو؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”ماس کیونٹیکشن میں ماسٹر کیا ہے۔“

”لیکن یہ بعد از یادہ نفع بخش لگا ہوگا؟“

”درست کہا۔“

ماری۔ اتنی تھوڑی بھی نہیں تھی کہ اپنا ہی گزارہ کر سکا۔ اس لیے

175

www.pdfbooksfree.pk



یہ لائن پکڑ لی۔“

”تم تربیت یافتہ لگ رہے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے ایک سال کی ٹریننگ حاصل کی ہے۔“

”کہاں سے؟“

”یہیں سے، باہر کے لوگ آئے تھے انہوں نے بے شمار لوگ ہار کیے، ہمیں تربیت دی، کچھ کام لیے اور پھر واپس چلے۔ اب میں اور مجھ جیسے دوسرے بے شمار لوگ آزاد ہیں۔“

”نہیں وہ اب بھی غلام ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ اس ملک کو انتشار اور فساد کی نظر کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ انہوں نے بے شمار افراد کو مسلح تربیت دے کر آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اب ان کا رویہ کارکن سے وابستہ ہے۔ جیسے کہ تمہارا ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”فرق تو پڑتا ہے پہلے جرائم کم ہوتے تھے مگر اب جرائم زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس سے معاشرے کا ایک مجموعی تاثر کیا جاتا ہے؟ ملک کا کوئی گوشہ خرابی کا رویہ سے خالی نہیں ہے۔ جن لوگوں نے تمہیں تربیت دی انہوں نے ساتھ ہی یہاں اسلحہ کی بھرمار بھی کی ہے۔“

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تم کیسی باتیں کر رہے ہو کیا تم گمن استعمال نہیں کرتے۔“ اس نے اپنا پی بندھا بازو آگے کیا۔ ”یہ کس نے کیا ہے؟“

”یہ میں نے اپنے دفاع میں کیا ہے۔ میں نے آج تک گمن سے کوئی نفع یا مفاد نہیں کیا یا۔ صرف اپنا اور اپنے ساتھیوں کا دفاع کیا ہے۔ اگر میں تمہیں بتا دوں کہ میں نے چند دن پہلے کیا چھوڑا ہے تو تم یقیناً مجھے پاگل سمجھو گے۔“

”میں بھی اچھا دفاع کر رہا ہوں بھوک اور افلاس کے خلاف۔“ اس نے سر دھچک کر کہا۔

”غلط، جب تم جاب کر رہے تھے تو بے شک تم کو کم تنخواہ مل رہی تھی مگر یہ تنخواہ ہمیشہ ان کی رہتی۔ ایک دقت آتا جب تمہیں تمہارے تجربے اور قابلیت کے مطابق تنخواہ ملتی۔ یہاں نہ ملتی تو تم پیر دنیا ملک جا سکتے تھے مگر تم نے آسان راستہ اختیار کیا۔“

”یہ آسان راستہ ہے؟“ اس نے ایک بار پھر اسے بازو کی طرف اشارہ کیا وہ براہِ فروختہ نظر آیا تھا۔

میں نے سر ہلایا۔ ”ہاں دوسری دنیا کی طرف آسان

راستہ۔ آدمی جلدی اور بہت تیزی سے گزر جاتا ہے۔“

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو آواز دی اور ان سے چلنے کو کہا۔ اس بار ڈرائیونگ میرے ساتھ بیٹھے خوبہ نو جوان نے سنبھال لی اور زبانی اس کی جگہ آگئی۔ وہ جان بوجھ کر مجھ سے ڈرائنگ کر بیٹھی تھی۔ عورت ہونے سے قطع نظر وہ ان تینوں کے لیے صرف ایک ساتھی تھی اس لیے کسی کو نہ تو اس کے عریاں ہونے پر اعتراض ہوا تھا اور نہ ہی میرے ساتھ لگ کر بیٹھنے پر۔ میں گھسایا اور اسے زری سے پیچھے دھکیلا تو وہ مسکراتے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھوں میں چلچل تھا کہ ایک عورت سے ڈرتے ہو اور میں نے آنکھوں میں اعتراف کیا کہ عورت سے ہی ڈرتا ہوں کیونکہ وہ کبھی شکست تسلیم نہیں کرتی ہے اور بالآخر مرد کی عقل کو گھاس چرنے بھیجتی دیتی ہے۔ انسان کو موت سے اتنا نہیں ڈرنا چاہیے جتنا کہ بے باکی پر آمادہ عورت سے ڈرنا چاہیے۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے شیر خان سے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہم دیر کی طرف جا رہے ہیں۔“

”ہماری منزل اس سے آگے ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

وہ سے آگے چترال کی طرف جاتے ہوئے بہت وقت لگتا لیکن اگر ان لوگوں کی منزل افغانستان تھا تو ہم شام سے پہلے سرحد پار کر سکتے تھے۔ آج سے چند سال پہلے یہ سارا علاقہ دونوں طرف فوجوں کے اجتماع کی وجہ سے متحرک سرحد بن چکا تھا۔ آئے دن سرحد پار سے حملے اور جانی نقصان معمول کی بات تھی۔ جو پاکستان کو اتحادی کا درجہ دیتے ہیں وہ اس کی فوجی چوکیوں پر فضا کی حملے کرنے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔ کسی زمانے میں یہاں صرف نام کی سرحد ہوتی تھی اور دونوں طرف بسنے والے لوگ یوں سرحد پار آتے جاتے تھے جیسے ہم پنڈی سے اسلام آباد آتے جاتے ہیں۔ کاروبار سے لے کر رشتے واریاں تک سب چلتی تھیں۔ مگر فی الحال یہ سب بند تھا۔ پھر ایک بار خدشہ میرے ذہن میں سرسرائے لگا کہ مجھے بھارتیوں کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔

دوبارہ روانہ ہونے کے بعد سب میں لچ تقسیم ہوا۔ خشک ہو جانے والے مٹیے روٹنی نان اور کولڈ ڈرنکس پر مشتمل تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان لوگوں کو چائے کافی کا شوق نہیں تھا۔ کیونکہ بچلے میں بھی ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی جب کہ وہاں چائے کافی کا سامان ہو سکتا تھا۔ انہوں نے

بدن کے نرم و نازک حصے مجھ سے پیوست کر دیتی تھی۔ چند بار ایسا ہی ہوا تو میں نے تکلف بالائے طاق رکھ کر دونوں پاؤں اوپر کیے اور سیٹوں کی پشت پر جما دیے اور یوں میں ایک جگہ پوز ہو گیا۔ اگرچہ یہ بھی مشکل تھا کیونکہ پیچھے بندھے بازوؤں پر زور آ رہا تھا۔ بعض مقامات پر یہ پوز بھی لڑھکنے سے نہیں بچتا تھا۔ اونچے نیچے راستوں پر جیب کا ڈھانچا بول رہا تھا اور اس کی آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ جیب کو کتنے مشکل مراحل سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ ایک بار خود کو روکنے کے باوجود زین پر گرا تو اس نے مجھے داہیں دھکیلتے ہوئے کہا۔

”تم بیکار کی کوشش کر رہے ہو۔“  
”ٹھیک ہے کوشش نہیں کرتا۔“ میں نے کہا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس بار جھٹکا آیا تو میں پورے وزن سمیت اس پر گیا اور اس کی پیچ نکل گئی تھی۔ اس نے مجھے برہمی سے دھکیلا۔

”یہ کیا ہے؟“  
”بیکار کی کوشش نہ کرنے کا انجام۔“ میں نے جواب دیا۔ شکر ہے اسی وقت دشوار راستہ گزر گیا۔ سڑک ابھی بھی مٹی ہی تھی مگر ہموار ہو گئی تھی اور اب جیب بڑا آواز کے چل رہی تھی۔ ”ہم کس طرف جا رہے ہیں؟“  
میرے سوال پر شیر خان نے جیب کا کپاس دیکھا اور بولا۔ ”ٹھیک مغرب کی طرف۔“  
”یعنی افغانستان کی طرف، کیا میرے غلبہ گار وہاں بیٹھے ہیں۔“

”پتا نہیں کیونکہ تمہاری ڈیلیوری نہیں ہوگی۔“  
”باپ رہے۔“  
”ڈر دست۔“ زینبی فسی۔ ”یہ دوسری ڈیلیوری کی بات کر رہا ہے۔“  
”تم سخت واہیات عورت ہو۔“ میں نے جڑبڑ ہوتے ہوئے کہا۔

”شکر ہے تم نے عورت تسلیم کیا۔ ورنہ میں سمجھی کہ تم مجھ کو سمجھ رہے ہو۔“ اس نے طنز پر لہجہ میں کہا۔  
جب جس راستے پر چل رہی تھی اس کی ساخت سے لگ رہا تھا کہ اس پر انسانوں اور گاڑیوں کی آمد و رفت باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ راستے میں ایک جگہ نشیب میں آبادی بھی دکھائی دی تھی مگر جیب اس کے اوپر سے گزر گئی۔ اب تک کسی انسان کی صورت نظر نہیں آئی۔ ایک بڑا جنگل آیا اور اس سے گزر رہے کے بعد جیب ایک وسیع چراگاہ

راستے کے لیے آسان خوراک رکھی تھی جو سادہ بھی تھی اور توانائی بخش بھی۔ ان کے پاس پانی بھی تھا مگر کولڈ ڈرنک کی بہتات تھی ایک پورا ایک کولڈ ڈرنک ٹنوں سے بھرا ہوا تھا۔ دوسرے بیک میں بیڑ کی بوتلیں تھیں مگر ان سے صرف وہی شغل کر رہے تھے جنہوں نے ڈرائیو نہیں کرنی تھی۔ یعنی شیر خان اور میرے برابر میں بیٹھا ہوا دوسرا آدمی۔ میں نے بندھے ہاتھوں سے یوں لٹچ کیا کہ زینبی مجھے کھلاتی اور پلاتی رہی۔ انہوں نے میرے ہاتھ نہیں کھولے تھے۔ تین بجے تک ہم دیر اور چترال جانے والی سڑک پر آ گئے تھے۔ دیر کا علاقہ شروع ہو گیا تھا مگر چترال یہاں سے خاصا آگے تھا۔

سڑک زیادہ خراب ہو رہی تھی اور اب جیسکے لگنے لگے تھے۔ کہیں کہیں یہ اتنی تنگ ہو جاتی تھی کہ اس پر سے ایک وقت میں ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ مگر ایسے کلوڑے زیادہ طویل نہیں تھے۔ عام طور سے سڑک ایسی ڈھلان پر تنگ ہوتی تھی جو بہت ترچھی ہو اور اس پر پھوڑی سڑک بنانا ممکن نہ ہو۔ یہاں بہت گھنے اور آسان سے باتیں کرتے درختوں پر مشتمل جنگلات تھے اور جنگل سے بہت اونچی جگہ اٹھ رہی تھی۔ اب یہاں کثرت سے چشمے نظر آنے لگے تھے اور بیشتر سڑک سے گزر رہے تھے۔ بعض مقامات اسے حسین اور نظر نواز تھے کہ دل چاہتا آدمی وہیں رک جائے۔ مگر وہ رک نہیں سکتے تھے اور میں ان کا قیدی تھا۔ میں کئی بار اس سڑک پر سفر کر چکا تھا۔ دیر سے اوپر ایک راستہ افغانستان کی طرف جاتا تھا۔ اس سڑک سے یہاں بڑے پیمانے پر تجارت ہوتی تھی اور اسمگلنگ کی جاتی تھی۔ مگر جنگ کے بعد صورت حال بدل گئی تھی۔ اب اس راستے کی بجائے خفیہ راستے استعمال ہوتے ہیں۔ مگر اسمگلنگ پہلے جیسی کھلی نہیں رہی ہے۔ البتہ مقامی ضرورت کے تحت کی جاتی ہے اور سرحدی حکام اس سے چشم پوشی بھی کرتے ہیں۔ ایسا کرنے کی مجبوری ہے۔

اب یہ سڑک زیادہ تر فوجی نقل و حرکت کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس لیے جب یہ سڑک گزرنی ہو تو سمجھا کہ یہ آگے چترال کی طرف ہی جا رہے ہیں مگر آدھے گھنٹے بعد جیب ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی جھکوں کا آغاز ہوا۔ جھکے بھی ایسے تھے کہ کبھی ہم بائیں طرف گرتے تھے اور کبھی دائیں طرف۔ آگے جانے سے روکنے کے لیے مجھے پاؤں استعمال کرنے پڑتے تھے۔ میں دوہری مصیبت میں تھا کیونکہ ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور ہر جھکے پر یا تو میں زینبی پر گرتا تھا یا وہ مجھ پر آتی تھی اور مجھے خامے امتحان سے گزرنا پڑتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر اپنے



سست میں اونچا ہوتا پہاڑ تھا جس کی چوٹی پر برف نظر آرہی تھی اور کئی مقامات پر آبشاریں گر رہی تھیں۔ دامن میں گھٹا جنگل تھا۔ جیب درختوں کے درمیان روک کر انہوں نے اسے جھاڑیوں اور شاخوں سے ڈھک دیا۔ وہ کیمو فلاج کر رہے تھے۔ یہ علاقہ غیر تھا اور وہ یہاں بغیر اجازت کے آئے تھے اس لیے احتیاط لازمی تھی۔

ہم جس طرح سفر کرتے رہے تھے میرا اندازہ تھا کہ ہم افغانستان کی سرحد کے پاس کہیں تھے۔ شاید اس وجہ سے بھی یہ لوگ احتیاط کر رہے تھے۔ انہوں نے جیب کے عقبی حصے سے سلپنگ بیگز نکالے۔ اترنے کے بعد انہوں نے میرے ہاتھ گھول دیئے تھے۔ مگر اب وہ پوری طرح ہوشیار تھے۔ کھانے میں وہی تھپی روغنی روٹیاں اور کولڈ ڈرنک تھی۔ میں نے چائے کافی کا پوچھا تو جواب ملا کہ ایسی عیاشی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کھانے کے فوراً بعد مجھے سلپنگ بیگ میں جانے کا حکم ملا۔ خود میرا جھکن اور بازوؤں میں دھن سے حال اچھا نہیں تھا۔ میرا بایاں ہاتھ جو حکیم قادی کے علاج سے بچ گیا تھا اور تقریباً ٹھیک ہو گیا تھا اس وقت سن ہو رہا تھا۔ بہت دیر تک یہ حرکت کے قابل نہیں رہا تھا میں مسلسل اس کی مالش کرتا رہا تب کہیں جا کر یہ ٹھیک ہوا تھا۔

حکم ملنے پر میں سلپنگ بیگ میں داخل گیا۔ یہ ہلکا گرم تھا اور اصل میں کھردری زمین اور کٹڑے مکوڑوں سے بچاؤ کے لیے تھا۔ اس کا نصف اوپری حصہ نیٹ پر مشتمل تھا۔ نیچے دیڑھ تہ کی وجہ سے جسم کو آرام ملا تھا۔ سارے سلپنگ بیگز پاس پاس اور درختوں کے نیچے تھے۔ لگ رہا تھا کہ وہ اپنا قیام خفیہ رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جگہ بھی ایسی منتخب کی تھی جہاں سے کسی کا گزر نہ ہو۔ کچھ دیر بعد ان میں سے دو سلپنگ بیگز میں لیٹ گئے تھے اور باقی دو پہرے پر تھے۔ وہ مجھ پر اور آس پاس نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں لیٹا اور چند منٹ بعد سو گیا۔ پھر رات کسی پہر مٹانے پر دوبارہ آیا تو میں جاگ گیا۔ میں نے زپ نیچے کی تو نزدیک موجود زنی چوکی اور اس نے رات گلی کا رخ میری طرف کر دیا۔ ”کیا ہے؟“

”پھر سے..... فطرت کی پکار۔“

”جے ہڈی۔“ اس نے اسرکن اسٹائل میں اپنے

ساتھی کو آواز دی۔ ”اسے نیچر کال کر رہی ہے۔“

ہڈی وہی خوب روٹو جوان تھا۔ وہ مخالف سست سے آیا اور اس نے زنی سے کہا۔ ”آواز کم رکھو۔“

میں داخل ہوئی جو دو پہاڑوں کے درمیان تقریباً ایک کلومیٹر چوڑی پٹی میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میدان سے بے شمار ندیاں گزر رہی تھیں اور دبیز و اونچی گھاس میں لاتعداد بھیڑیں، بکریاں اور دوسرے پالتو جانور چر رہے تھے۔ انسان یہاں بھی چند ایک ہی تھے اور انہوں نے سرسری سی نظروں سے ہمیں دیکھا تھا۔ جیب چراگاہ سے بھی گزر کر ایک دریا کے کنارے چلنے لگی۔ موسم کی مناسبت سے دریا میں زیادہ پانی نہیں تھا۔ کچھ دیر دریا کے ساتھ چلتے رہے۔ یہ افغانستان اور پاکستان میں پہنچنے والا دریا کنہار تھا۔ جو کبھی سرحد کے اس طرف ہوتا ہے اور کبھی دوسری طرف چلا جاتا ہے اور بالآخر بعد میں اس کا پانی پاکستانی دریائی سسٹم میں شامل ہو جاتا ہے۔

سفر جس طرح جاری تھا صاف لگ رہا تھا کہ ان کو اپنی منزل اور وقت کا علم تھا۔ وہ کسی مرحلے میں نہ تو رکے تھے اور نہ ہی انہوں نے کسی سے رابطہ یا آپس میں کوئی مشورہ کیا تھا۔ سب پہلے سے طے شدہ تھا۔ جیب ایک خستہ حال پل کی طرف مڑی اور بہت احتیاط سے اسے گراس کر لیا۔ پل رسوں اور لکڑی کے سونے لختوں کا بنا ہوا تھا اور اس سے ایک وقت میں ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ جب تک جیب پل سے گزرتی رہی سب دم سادھے بیٹھے رہے اور پل کے بعد سانس میں سانس آئی تھی۔ پل گراس کرنے کے بعد ہم ایک لکڑی جنگل سے گزرنے لگے۔ اس کے چاروں طرف بلندی تھی اس لیے بارش کا پانی اس جگہ جمع ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ یہاں سبزے اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ اونچے درخت بھی تھے مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ آبادی سے فاصلے پر پہنچنے کی وجہ سے یہاں پرندوں کی بہتات تھی۔ خاص طور پر چکور اور غیر دکھائی دیئے تھے۔ پاس آبادی ہوئی تو شکاری انھیں جہاں بھی پھنستے۔

جنگل کے بعد ایک ندی آئی اور سفر جاری رہا۔ اب سورج مغرب کی طرف چمک گیا تھا اور کچھ دیر میں رات ہو جاتی۔ یہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور ان پر بے شمار ندیاں بہہ کر اوپر سے نیچے دریا کی طرف جاری تھیں مگر کوئی ندی اتنی بڑی نہیں تھی کہ رکاوٹ بنتی۔ ان کو گولہ نے راستے میں جیب میں پیٹرول بھروا لیا تھا اور پیچھے دروازے کے ساتھ تین عدد بڑے جہری کین بندھے ہوئے تھے۔ ان کینوں سے ہر ایک میں دس لیٹرن پیٹرول تھا۔ اس لیے وہ آرام سے سفر کر رہے تھے۔ سورج ڈوبنے تک سفر جاری رہا اور پھر انہوں نے ایک ندی گراس کی اور رک گئے۔ مغرب



میں سلپنگ بیک سے نکل آیا۔ نو جوان مجھے ایک طرف لے آیا اور دو درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”جو کرنا ہے یہیں کرو اور صرف دو منٹ میں۔“

ہم داہیں آئے تو میں سلپنگ بیک میں جانے کی بجائے اس پر بیٹھ گیا۔ زینہ نے کہا۔

”اندر جاؤ۔“

”میرا دم گھٹ رہا ہے یہاں رات میں بھی ہوا نہیں چل رہی۔“

”ہوا پہاڑ کے دوسری طرف لے گی۔“ اس نے کہا۔

”تم نہیں سوئیں؟“

”میں سو کر اٹھ گئی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ابھی صبح کے چار بج رہے ہیں۔“

”یعنی کچھ دیر میں صبح ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”میرا اندازہ ہے ام سرحد کے پاس ہیں۔“

”صرف ایک کلومیٹر دور ہیں۔“

”آگے تم لوگ جاؤ گے یا وہ آئیں گے؟“

”صبح چ پلے گا۔ حالات دیکھ کر فیصلہ ہوگا۔“ اس نے بہم انداز میں کہا جیسے واضح جواب دینے سے گریز کر رہی ہو۔

”تم جا رہیں ہو اتنی دور کہاں سے آئیں؟“ میں نے موضوع بدل دیا۔

”میں آئی نہیں لائی گئی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”جب یہاں امریکی آئے تو دوسری گنڈ گیوں کے ساتھ یہاں جسم فروشی کا کاروبار بھی چمک اٹھا۔ ڈالرز کے لیے عورتیں خود بھی آئیں اور زبردستی لائی بھی گئیں۔“

”تم زبردستی لائی گئیں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”اس وقت میں صرف چودہ سال کی تھی۔ میرا کزن ہی مجھے بہکا کر لے گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ان لوگوں کا ایجنٹ تھا۔ مجھے ایک افغان وار لارڈ کو فروخت کیا گیا۔ میرے ساتھ بارہ لڑکیاں اور تین جن میں سے مجھ سمیت تین اس وار لارڈ کے حصے میں آئیں۔“

”اس کے چنگل سے کیسے نکلیں؟“

”میں تین سال اس کے پاس رہی اور یہ پیری زندگی کے بہت مشکل تین سال تھے۔ پھر میں نے پہلا ٹل اسی وار لارڈ کا کیا۔ اس کے ساتھ اس کے چھ اہم ترین ساتھی بھی مارے گئے۔ میں نے ان میں سے کسی کی کلاشکوف کا پورا میگزین ان پر خالی کر دیا اور فرار ہو گئی۔ کچھ عرصے چھپتی رہی پھر یہاں آ گئی۔ مجھے شیر خان مل گیا اس نے اپنے ساتھ

سونے (Gold) کے معیار کے پیمانے کو کیرٹ (Carat) کہا جاتا ہے۔

24 کیرٹ اصلی اور خالص

22 کیرٹ 91.67 فی صد خالص

18 کیرٹ 75 فی صد خالص

14 کیرٹ 58.3 فی صد خالص

پاکستان اور بھارت میں روایتی طور پر 22 کیرٹ کے سونے سے زیورات تیار کیے جاتے ہیں جبکہ یورپی ممالک میں عمومی طور پر 14 سے 18 کیرٹ کا سونا استعمال کیا جاتا ہے لیکن امریکا میں 10 سے 14 کیرٹ کا سونا استعمال ہوتا ہے۔

سونا اعصابی بیماریوں کے علاج میں معاون ہے۔ اگر سونے کی ”ڈلی“ کورات کے وقت بھرے گلاس میں رکھ دیا جائے اور صبح یہ پانی پیا جائے تو اعصابی تناؤ میں کمی واقع ہوتی ہے۔ یہ پانی انسانی چہرے کو خوبصورت اور پرکشش بھی بناتا ہے۔

حقیقی: سرور منیر راول

مرسلہ: عبدالغفور چغتائی آنک

شامل کر لیا۔

”اب تم مطمئن ہو؟“

”انسان کسی حال میں مطمئن نہیں ہوتا ہے۔“ اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”صرف مطمئن ہونے کا دھوکا دیتا ہے۔“

”تو تم دھوکا دے رہی ہو؟“

”سب ویسے ہیں۔“ اس کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔ ”صرف میں ہی نہیں ہوں۔“

اس وقت مجھے لگا کہ اس کے ظاہری روپ سے قطع نظر اس کے اندر بہت کچھ بھری ہوئی تھی۔ شاید اس نے استحصال کا جو وقت دیکھا تھا یہ اس کا فطری رد عمل تھا۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے بھی شاک

ہو۔ عورت کتنی ہی آزاد خیال کیوں نہ ہو وہ استعمال ہونا پسند نہیں کرتی ہے۔ یہ لوگ اسے استعمال کر رہے تھے جس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”تم اپنے ساتھیوں سے خوش نہیں ہو؟“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“



”یہ تمہیں استعمال کر رہے ہیں جیسے مجھے ٹریپ کرنے کے لیے کیا۔“

”مگر تم ہوئے نہیں۔“

”میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ دوسرے میں جن حالات سے گزر رہا ہوں اپنے سائے پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ورنہ تم میں اور تمہاری کوشش میں کوئی کمی نہیں تھی۔“

وہ مسکرائی۔ ”تم نے مجھے مشتعل کر دیا تھا۔ اگر اس وقت میرے پاس گن ہوتی تو تم ابھی زندہ نہ ہوتے۔“

”جب مجھے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تمہارے پاس گن نہیں تھی۔“

باتوں کے دوران میں صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ زینی اور اس کا ساگھی رات دو بجے اٹھ گئے تھے۔ وہ اس سے پہلے چھ گھنٹے تک سوتے رہے تھے اور اب ان لوگوں کی باری تھی۔ روشنی ہوئی تو زینی نے نوجوان کو بلایا اور میرے سر پر چھوڑ کر خود جیب کی طرف گئی۔ وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا برنز اور دھات کی کیتلی تھی۔ اس نے پانی بھر کر کیتلی برنز پر رکھی اور جب پانی کھولنے لگا تو اس میں چائے کی جتی ڈال دی۔ چند لمحے بعد قضا میں چائے کی خوشبو تیرنے لگی۔ جب زینی نے کانڈ کے ٹک میں مجھے بھی چائے دی تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا جو اپنے بندے کی فضول عادات بھی یوں پوری کر رہا تھا۔ چائے بہت اچھی بنی تھی اگرچہ دودھ اور چینی کے بغیر تھی۔ میں چینی لیتا ہوں مگر اس وقت اس چائے نے بھی بہت مزہ دیا۔ سات بجے شیر خان اور اس کا دوسرا ساتھی اٹھ گئے تھے۔ انہوں نے سلسٹنک بیک واپس جیب میں رکھے۔ سب نے باری باری ندی پر جا کر منہ ہاتھ دھوئے۔ میں شیر خان کے ساتھ گیا۔ اگلے روٹنی ٹان سے ناشتا کیا گیا اور پھر انہوں نے سفر کی تیاری شروع کی مگر یہ سفر پیدل تھا۔ انہوں نے اپنا اسلحہ لے لیا اور مجھے اپنے ہاتھ بھر پست پر باندھ دیئے۔ پھر وہ اس طرح آگے بڑھے کہ سب سے آگے شیر خان تھا اور پیچھے زینی۔ اس کے پیچھے میں تھا اور میرے پیچھے باقی دو تھے۔ میں ایک بار پھر مضطرب ہونے لگا تھا۔ انہوں نے اب تک مجھے کوئی موقع نہیں دیا تھا کہ میں نے سوچ لیا کہ اگر معاملہ بھارتیوں کا ہوا تو میں اپنی جان پر کھیل کر بھی فرار کی کوشش کروں گا چاہے آگے نتیجہ جو بھی نکلے۔ بھارتیوں کے ہاتھ آتا مجھے کسی صورت گوارہ نہیں تھا۔ پہاڑی ڈھلان کے کھٹے جنگل کے ساتھ ساتھ چلتے

ہوئے ہم ایک کھلی مگر چھوٹی وادی میں نکلے۔ شیر خان نے ہمیں روک دیا۔ اس نے کہا۔ ”ہمیں یہیں روک جاؤ۔ ہمیں یہیں روک کر انتظار کرنا ہے۔“

میں نے شیر خان سے کہا۔ ”تم نے جو کام کیا ہے کیا اس کا معاوضہ لے لیا ہے؟“

”تمہیں اس سے کیا؟“ وہ کمر درے لہجے میں بولا۔

”کیونکہ سودا میرا ہورہا ہے۔ لیکن میرا پوچھنے کا مقصد کچھ اور ہے۔ تم جس طرح مجھے زیادہ نہیں جانتے اسی طرح میرے دشمنوں سے بھی واقف نہیں ہو گے وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو کسی قسم کا معاوضہ دینے کی بجائے چند گولیاں خرچ کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ اس لیے اگر تمہیں معاوضہ نہیں ملا ہے تو ہوشیار رہو کہ ادائیگی کا طریقہ کار تمہاری توقع کے خلاف نہ ہو۔“

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا لیکن پھر اس نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ درختوں میں غائب ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد زینی بولی۔ ”تم کس کی باتوں میں آرہے ہو؟“

”احتیاط کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“ شیر خان نے دانش مندی کی بات کی۔

زینی نے اختلاف جاری رکھا۔ ”یہ ہمارا قیدی ہے ہمیں کبھی ٹھیک مشورہ نہیں دے گا۔“

”تم میرے برابر راست دشمن نہیں ہو صرف پیسوں کے لیے کام کر رہے ہو۔“

زینی مجھے گھورتی رہی تھی۔ حالانکہ صبح اس نے مجھ سے بہت کھل کر گفتگو کی تھی۔ مگر اس وقت اس نے میری مخالفت کی تھی۔ نونج رہے تھے۔ شیر خان کی گھڑی پر میری نظر تھی۔ سورج بلند ہوتے ہی جنگلی تیزی سے غائب ہو رہی تھی اور گرمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ شاید یہ جگہ سطح سمندر سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ اچانک شیر خان کے پاس سے ہلکی سی ٹون کی آواز آئی اور اس نے اپنی جیکٹ سے ایک چھوٹا واکی ٹاکی برآمد کر کے اس کا ہٹن دیا۔ ”ہم پہنچ گئے ہیں۔“

اس نے صرف ایک لمبی جملہ کہہ کر واکی ٹاکی واپس رکھ لیا۔ پھر اس نے ہاتھ سے کوئی اشارہ کیا۔ یہ اشارہ یقیناً اپنے چھپے ساتھیوں کے لیے تھا۔ میں نے دیکھا کہ زینی بھی اچھے ہٹی اور ایک طرف درختوں میں چلی گئی۔ اب وہاں میں اور شیر خان تھے۔ ہم جس جگہ تھے اس کے تین طرف پہاڑ کی ڈھلان اور جنگل تھا صرف جنوبی سمت خالی تھی۔ چند منٹ بعد اسی سمت سے چار افراد نمودار ہوئے۔ میں چونکا کیونکہ



خان بولا۔ ”آدی لو اور معاوضہ دو۔“

اچانک ہی میرے اندر سے چھٹی حس نے اشارہ کیا اور میرا جسم سنسنا اٹھا تھا۔ یہاں کچھ ہونے والا تھا۔ میری نظر ان چاروں پر تھی لیکن انہوں نے کچھ نہیں کیا تھا اس کی بجائے اچانک جنگل کی طرف سے تڑخا ہٹ کی آواز آئی اور ایک مردانہ چیخ گونجی جس میں موت کا کرب رہا ہوا تھا۔ فوراً ہی کسی دوسری رائفل نے موت کا نوحہ گایا۔ شیر خان چونکا تھا کہ باس نے اس کے پیروں پر برسٹ مارا۔ وہ شاید اسے مارنا نہیں چاہتا تھا ورنہ اوپر فائر کرتا۔ شیر خان دھاڑ کے ساتھ نیچے گرا اور باس نے آگے بڑھ کر اس کی رائفل لاسٹ بارکروں پھینک دی پھر جبکہ اس کی بیلٹ سے بندھا ہوا پستول نکال لیا۔ اس کے باقی تین ساتھی تیزی سے جنگل کی طرف بڑھے تھے جہاں اب دورا نکل رہا تھا کہ کمرنگ رہی تھیں۔ میری چھٹی حس نے درست خبردار کیا تھا۔ وہاں زندگی و موت کا کھیل چاری تھی اور لگ رہا تھا کہ اس کھیل میں شیر خان اینڈ کمپنی کو موت نصیب ہوگی۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی جنگل کی طرف سے دوسری چیخ سنائی دی اور یہ بھی مردانہ تھی جس میں موت کا کرب رہا ہوا تھا۔ اب صرف زینبی باقی رہ گئی تھی۔ مگر دوسری چیخ کے بعد فائرنگ رک گئی تھی۔

شیر خان کی دونوں ہاتھیں چھٹی ہو گئی تھیں۔ خاص طور سے گھٹنے چکنا چور ہو گئے تھے اور وہ شدید اذیت میں تھا۔ اگر اسے فوری طور پر کسی بہت اچھے آرٹھوپیدک سرجن کی خدمات حاصل ہو جاتیں تب بھی اس کا امکان بہت کم تھا کہ وہ دوبارہ پہلے کی طرح اپنے پیروں پر چل سکے۔ مگر فی الحال تو اس کی زندگی کا امکان بھی کم ہی نظر آ رہا تھا۔ باس اس کی اور میری طرف سے پوری طرح چو کنا تھا۔ شیر خان جوش میں تھا اور کرا رہا تھا میں نے ذرا جبکہ کراسوس سے کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا تا تم نے آسان راستہ اختیار کیا ہے انجام کی طرف۔“

جواب میں اس کے منہ سے جو نکلا وہ سب ناگفتنی تھی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا کہ دم توڑتے آدی کو کیا کہتا۔ ایک منٹ بعد درختوں کی طرف سے زینبی نمودار ہوئی اور آنے والے تینوں افراد اس کے پیچھے تھے۔ ایک لمبے کولنگا مرد کو ہینڈز اپ کر کے لایا جا رہا ہے۔ مگر پھر میری نظر اس کے ہاتھوں میں موجود رائفل پر گئی اور وہ شکست خوردہ نہیں بلکہ فاتحانہ تھا۔ اچانک آ رہی تھی۔ میں نے شیر خان سے کہا۔ ”تمہاری ایک اور شکست..... ذرا دیکھنا زینبی کیسے

انہوں نے چٹلون شرٹ پر بلٹ پروف۔ لیکن رکھی تھیں اور وہ پوری طرح مسلح نظر آ رہے تھے۔ دور سے ان کی چال ڈھال بتا رہی تھی کہ وہ تربیت یافتہ تھے۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ گورے تھے۔ مگر نزدیک آنے پر پتا چلا کہ وہ مقامی تھے۔ شاید افغانی تھے۔ مگر بہت گورے چٹے تھے اس لیے دور سے سفید فام لگ رہے تھے۔ چاروں کے سر پر جھوٹے بال تھے جیسے کہ فوجیوں کے ہوتے ہیں۔ نزدیک آنے پر ان میں سے ایک آگے آیا اور اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”شیر خان، اسے ہمارے حوالے کرو۔“

مجھے شبہ ہوا کہ وہ پاکستانی تھا کیونکہ اس نے یہ جملہ بہت اچھی اردو میں کہا تھا۔ شیر خان نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”تمہارا آدی یہ رہا لیکن پہلے مجھے معاوضہ دیا جائے۔“

”معاوضہ مل جائے گا لیکن پہلے میں تصدیق کروں گا۔“ اس نے کہا اور آگے آیا۔ وہ شاید ان کا باس تھا۔ اس نے ایک چھوٹا سا آلہ نکالا جو سائز میں موبائل فون جتنا تھا مگر اس سے مختلف تھا اس کے اوپر جسے میں ایک چھوٹا سائینس لگا ہوا تھا۔ اس نے لیس میری دائیں آنکھ کے سامنے کیا اور بولا۔ ”اس میں دیکھو۔“

میں نے آنکھ بند کر لی اور پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”فکر مت کرو یہ تمہاری پٹلی کی تصدیق کرے گا۔“ اس نے کہا۔ ”اپنی آنکھ کھولو۔“

میں نے آنکھ کھولی اور لیس میں دیکھا۔ چند لمحوں بعد اس کے پیچھے موجود سبز لائٹ آن ہو گئی اور اس نے آلہ بند کر کے واپس رکھ لیا۔ اس کے تاثرات سپاٹ تھے اور پتا نہیں چل رہا تھا کہ تصدیق ہوئی ہے یا نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ میری آنکھ کی پٹلی کا نقش کس کے پاس ہوگا۔ یہ کسی آدی کی تصدیق کرنے کا سب سے آسان طریقہ ہے۔ جس طرح ہر آدی کے فنگر پرنٹ جدا ہوتے ہیں اسی طرح ہر آدی کی پٹلی کے اندر بنا ہوا ڈیزائن بھی مختلف ہوتا ہے۔ آج کل اس سے بھی آدی کی تصدیق کی جاتی ہے۔ آنکھ کی پٹلی بھی انسان کے بائیومیٹرکس میں شامل ہے۔ مگر ہم ان سے ہاں تو فنگر پرنٹ نیٹے اور رکھنے کا نظام بھی ڈھنگ کا نہیں ہے۔ آنکھ کی پٹلی سے تصدیق ابھی دور کی بات ہے۔ باس کے تین ساتھی ذرا فاصلے پر اور بہت چو کنا موجود تھے۔ اگرچہ ان کی رائفلوں کا رخ نیچے کی طرف تھا مگر ان کی اٹھیاں ٹریگز سے زیادہ دور نہیں تھیں۔ باس نے شیر خان سے پوچھا۔ ”تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟“

”تمہیں ان سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔“ شیر



آ رہی ہے۔“

شیر خان نے سر جھما کر زینی کو دیکھا اور اس کی ناگفتی کارخ اس کی طرف مڑ گیا۔ زینی نے اس کا جواب یوں دیا کہ آتے ہی اس کے ماتھے پر گولی ماری اور شیر خان نوراً مر گیا۔ مجھے اس کی جھان مرگی کا کوئی افسوس نہیں ہوا۔ ایسے لوگ اسی طرح دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ میں زینی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”تم نے ٹھیک کہا تھا کوئی آج کل مطمئن نہیں ہوتا صرف دھوکا دیتا ہے۔ جیسا کہ تم نے دیا۔“

”اے لے چلو۔“ زینی نے سر دلچے میں کہا تو ان چاروں نے مجھے گھیر لیا اور ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ زینی ایک طرف ہو کر الگ چل رہی تھی۔ اس کا تھکانہ رویہ اور ان چاروں کی نیاز مندی بتا رہی تھی کہ اب وہ باس تھی۔ سفر طویل نہیں تھا اور ہم آدھے گھنٹے بعد پہاڑ کی ڈھلان کے اوپری حصے میں پہنچ گئے تھے یہاں ایک باقاعدہ راستہ تھا جو صدیوں سے اس راہ پر چلنے والوں نے بنایا تھا۔ دور مجھے پاکستان کا پرچم لہراتا دکھائی دے رہا تھا اور اس سے ذرا فاصلے پر افغانستان کا پرچم تھا۔ گویا یہ سرحد تھی مگر ہم اس سے فاصلے پر تھے۔ ہم ڈھلان سے اترنے لگے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ ہم پاکستان کی حد میں تھے یا افغانستان کی حد میں داخل ہو چکے تھے۔ اوپر چڑھتا میرے لیے زیادہ دشوار نہیں تھا مگر نیچے اترتے ہوئے مجھے مشکل پیش آنے لگی۔ بندھے ہاتھوں سے توازن بگڑ رہا تھا۔ بعض جگہ قدم لڑکھڑاتے تو خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ میں نے زینی سے کہا۔

”میرے ہاتھ کھلو اور نہ نیچے گراؤ شاید ہڈیوں اور گوشت کا ڈھیر ملے تم کو لے جانے کے لیے۔“ وہ رکی اور پھر اپنی جیکٹ سے خنجر نکال کر میری طرف آئی اور ہاتھوں کی سرخیوں کاٹ دیں۔ ”تھینک یو۔“ میں نے ہاتھ مل کر کہا۔

ہم ڈھلان سے نیچے اترنے لگے۔ زینی نے اب سر پر بڑی سی اونٹنی ٹوپی پہنائی تھی جس سے اس کے سنہری بالوں کی پوتی نیل چھپ گئی تھی۔ غالباً وہ اپنی ہوائی شناخت چھپاتا چاہتی تھی۔ حالانکہ اس کی چمکتی چال بھی چاروں کی اس کا تعلق کس صنف سے ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ اپنی چال بدل لیتی مگر شاید وہ ایسا کرنے پر قادر نہیں تھی۔ آنے والے چاروں افراد پوری طرح مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی زینی کی طرف متوجہ ہونے یا اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی ایسا لگ رہا تھا۔ وہ اس سے مرعوب لگ رہے تھے اور اس کے تہہ بھی کچھ ایسے ہو گئے

تھے جیسے وہ اس کے بہت اونٹنی درجے کے خادم ہوں۔ ڈھلان سے اترتے ہی ایک مختصر لیکن بہت ترچھی چڑھائی آئی اور اس پر چڑھتے ہوئے صحیح معنوں میں کوہ پیائی کرنا پڑی تھی۔ اکثر مقامات پر چاروں ہاتھوں پیروں سے اور پتھروں یا درختوں کا سہارا لے کر چڑھنا پڑ رہا تھا۔

جب اوپر پہنچے تو سامنے پہاڑ نما وادی نظر آئی جو آخری حصے میں جا کر دو پہاڑوں کے بیچ آگئی تھی۔ ہم نیچے اترنے لگے اس طرف ڈھلان شریقتہ تھی اور ہم آرام سے اتر گئے اور دس منٹ بعد وادی سے نکل رہے تھے۔ وادی پھر چوڑی ہونے لگی اور اس کے دونوں طرف بلند پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے لگا کہ ہم سیدھے جانے کی بجائے بہت گھوم پھر کر جا رہے تھے اور غالباً ایسا اس لیے کیا جا رہا تھا کہ کسی سرحدی چوکی سے نہ بھیڑ نہ ہو۔ مگر وادی کے آخری حصے میں جو پہاڑ نظر آ رہا تھا وہ خاصا بلند تھا اور اس کے سب سے اوپر والے حصے میں برف کی سفیدی دکھائی دے رہی تھی یعنی یہ پہاڑ کم سے کم چندہ ہزار فٹ بلند تھا بھی اس پر گرمیوں میں بھی برف تھی۔ ہم نے چڑھنا شروع کیا۔ اس سفر نے سب کو تھکا دیا تھا اس لیے جب خطرناک والی چڑھائی شروع ہوئی تو زینی نے آدھے گھنٹے کے لیے رکنے کا اعلان کیا۔

میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہاں سائے میں کھلی تھی جب کہ دھوپ میں ذرا گرمی محسوس ہوتی تھی۔ شاید ابھی ہم سات یا آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ سب کے پاس پانی کی ڈھائی لیٹر والی بوتلیں تھیں۔ اس لیے پانی کی کمی نہیں تھی۔ میں نے راستے میں آنے والی تمام ندیوں سے دل کھول کر پانی پیا تھا اس لیے پیاس نہیں تھی مگر جیسے جیسے بلندی پر جاتے پیاس لگتی۔ سب مختلف جگہوں پر اس طرح بیٹھے تھے کہ میں ان کے درمیان میں تھا یعنی مجھے گھیرا ہوا تھا۔ زینی ایک کسی قدر بلند چٹان سے کھڑی تھی اس نے بیٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سورج سر پر آگیا تھا۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی پھر اس نے آدھا گھنٹا پورا ہوتے ہی کہا۔ ”ایس سووناؤ۔“

اس بار مجھے اس کے لہجے نے چونکا دیا کیونکہ اس نے بہت صاف اور شیطانی انگریزی لہجے میں یہ بات کہی تھی۔ مشرقی یورپ کے رہنے والے لی کوئی بولتے ہیں جب کہ اس نے لی ہی کہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ جیسے اس کی شخصیت، جذبات، لہجہ، نگاہیں، اس کی جارحانہ ہونے والی بات بھی غلط تھی؟ ہم نے اوپر چڑھنا شروع کیا اور اس بار



چڑھائی خاصی مشکل ثابت ہوئی کیونکہ یہ ایک مسلسل چڑھائی تھی اور اس میں راستے بھی نایاب تھے۔ ہمارے قدم ان راستوں پر پڑھ رہے تھے جن پر شاید پہلے بھی کوئی انسان نہیں گزرا تھا۔ جیسے جیسے ہم اوپر کی طرف جا رہے تھے سردی بڑھ رہی تھی اور سائے میں سے گزرتے ہوئے باقاعدہ سردی لگتی تھی۔ خدا خدا کر کے ہم اس پہاڑ کی اوپری حصے میں پہنچے یہاں سے ایک راستہ نشیب کی طرف جا رہا تھا اور دوسرا پہاڑ کی چوٹی تک تھا۔ ظاہر ہے ہمیں نیچے کا رخ کرنا تھا۔

اب سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی اور جب سانس کھینچتے تو ہوا جیسے خالی محسوس ہوتی تھی۔ یوں لگتا جیسے سینے میں کم ہوا لگی ہو۔ میرا تجربہ بتا رہا تھا کہ ہم دس ہزار فٹ کے آس پاس نہیں تھے۔ مگر اب نیچے اترنا نہ اور ہماری منزل دور تک نشیب میں پہلے تجربہ درتہ پہاڑوں میں کہیں تھی۔ ذرا نیچے آئے تو ایک جگہ ڈھلوان مل گئی جو انسانی قدموں سے آشنا تھی۔ اس لیے اس پر سفر آسان ثابت ہوا۔ ہم ایک اوپر چوٹی کے نیچے سے گزرے جس پر برف جمی تھی اور اس کی خلی یہاں تک آ رہی تھی۔ اس شفاف برف سے بہہ کر آنے والا پانی برف سے زیادہ سرد تھا مگر اسے پی کر میں تروتازہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہم ایک ایسے راستے پر چلنے لگے جو پہلے صراط سے مشابہ تھا اور اس کے دونوں طرف تا حد نگاہ ڈھلان تھی مگر یہ سیدھی ڈھلان نہیں تھی بلکہ گرنے کی صورت میں بہت سا حصہ آوی کوہوا میں طے کرنا پڑتا۔ جس کا لازمی نتیجہ فوجی کی صورت میں نکلا۔ اس لیے سب بہت محتاط ہو کر ایک قطار میں اس ڈھلان سے گزر رہے تھے۔

پہلے کو عبور کر کے ہم نے ایک اور ڈھلان پر قدم رکھا جس پر ایک بار پھر اونچے درجے کی نظر آنے لگے تھے اور اس سے ہوتے ہوئے بالآخر ایک چوڑی ٹیلا دی میں داخل ہوئے۔ یہ وادی اصل میں دریا کا پاٹ تھا مگر ٹیلا دی بانی اس کے وسط میں کسی ندی کی طرح بہہ رہا تھا۔ ممکن ہے سب کا برا حال تھا اس لیے ایک اسٹاپ آدھے گھنٹے کا اور روک لیا اور اس دوران میں ہم نے گڑے خشک چٹانوں سے پیٹ لیا۔ یہ توانائی بخش کھانا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد پھر سے روانہ ہوئے۔ دریائی وادی کے ساتھ چلتے ہوئے۔ ہم شام پانچ بجے کے قریب ایک جنگی مرکز تک پہنچے جہاں ایک بڑی آری جیب ہماری منتظر تھی۔ یہ اس قسم کی جیب تھی جیسی امریکی فوج استعمال کرتی ہے مگر اس پر نشانہات نہیں تھے اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سویٹین افغانی بیٹھا ہوا تھا۔

اب میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ چاروں بھی افغانی تھے۔ یہاں آتے ہی انہوں نے اپنی ہلٹ پر دفعتاً جیکبسن اتار دی اور روشن خیال افغانیوں والے طیلے میں آگئے۔ وہ سب کلین شیڈ تھے اور سروں پر چھوٹے بال تھے اس لیے انہیں سروں پر اڑتے ڈرون طیاروں سے خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر دوسرے خطرات تو تھے۔ پورے افغانستان میں جا بجا جہاز اترتی گروہیں ہیں۔ وار لارڈز اور ڈرگ لارڈز ہیں۔ ان کے علاوہ جرائم پیشہ گروہوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہر فرد مسلح ہوتا ہے اور سامنا ہونے پر کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا سانس بند دق بدست شخص جو چلا آ رہا ہے وہ کوئی ڈاکو ہے یا پھر شریف آدمی۔ چل چل کر سب کا برا حال ہو گیا تھا اس لیے گاڑی دیکھ کر مجھے سمیت سب نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ہم اس کے عقبی وسیع کینن میں آگئے جس میں آنے سانسے نشیں لگی تھیں۔ زینتی ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر آگئی۔ جیب آگے بڑھی اور کچھ راستے پر اس کی رفتار سست مگر ایک گھنٹے بعد ایک کسی قدر بڑھتے سڑک آگئی اور اس کی رفتار بڑھ گئی تھی میں نے زینتی سے کہا۔ ”ہم یقیناً افغانستان میں ہیں؟“

”ہاں تم اس وقت افغانستان میں ہو۔“

”رات میں بھی سفر جاری رہے گا؟“

”نہیں آج رات ہم ایک جگہ رکیں گے۔“ زینتی نے کہا۔ ”یہاں رات کے وقت سفر کرنا مناسب نہیں ہوتا ہے۔“

جیب سورج غروب ہونے کے بعد بھی چلتی رہی تھی۔ یہ علاقائی سڑک تھی مگر اس کا معیار بہت اچھا تھا۔ امریکیوں نے آنے کے بعد سب سے پہلے ذرائع مواصلات پر توجہ دی تھی اور یہاں بننے والی سڑکیں عالمی معیار کی تھیں۔ تاریکی چھانے کے کوئی ایک گھنٹے بعد جیب ایک چھوٹے سے قصبے میں داخل ہوئی۔ یہاں اس وقت بجلی نہیں تھی مگر جزیئر چل رہے تھے اور روشنی کے لیے دوسرے ذرائع سے بھی کام لیا جا رہا تھا۔ یہاں خاصی چھل چھل تھی اور بازار کھلا ہوا تھا۔ جیب ایک چھوٹے دو منزلہ ہوٹل کے سامنے رکی اور ہم اتر کر اندر آئے۔ انہوں نے تین کمرے لیے۔ ایک زینتی کے لیے تھا اور باقی دو ہمارے لیے تھے۔ کھانا اور پی پی طلب کیا تھا۔ جب اس نے رقم دی تو مجھے پتا چلا کہ اصل میزگانی تو یہاں تھی۔ تین کمروں اور رات کے کھانے کے چار کمرے کی ڈائریز چارج کیے گئے تھے یعنی چالیس ہزار پاکستانی روپیہ، اتنے میں تو پاکستان میں ہم



فانیو اشار نہ صحیح فور اشار ہوئیں میں قیام کر سکتے تھے۔ امریکیوں کے بارے میں بالکل درست کہا ہے کہ یہ جہاں جاتے ہیں چیزوں کے دام بڑھ جاتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

کھانے میں دسبے کا بھنا گوشت اور خاص طریقے سے پکی ہوئی روٹی تھی۔ کھانا بے شک مزہ تھا مگر اتنا ہی لذیذ بھی تھا۔ اس کے بعد قبوہ آیا۔ میرے لیے ایک ٹبل آیا تھا کیونکہ قبوہ ختم کرتے ہی میرے ذہن پر نیند نے یلغار کی تھی اور جب تک میں سوچتا کہ کیا ہوا ہے میں سوچتا تھا۔ ظاہر ہے یہ انتظام مجھے سکون سے سنانے کے لیے تھا تاکہ وہ بھی آرام سے سوئیں یا آرام ہی کر لیں کیونکہ اس سفر نے سب کے انجمن بھر ڈھیلے کر دیے تھے۔ میں بے ہوشی جیسی نیند میں تھا مگر فائرنگ کی آواز نے میرے شعور کو بھنجوڑا اور میں نے محسوس کیا کہ آس پاس شور ہو رہا تھا۔ بے مشکل میں نے آنکھ کھولی اور جھومتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ میرا ذہن بالکل خالی ہو رہا تھا۔ کمرابھی خالی تھا اور ہوٹل کے آس پاس سے رو رہ کر فائرنگ کا شور بلند ہو رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر تاریکی تھی یعنی ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ کمرے میں ایک چھوٹا انرجی سیور روشن تھا اور دیوار گیر گھڑی صبح کے چار بج رہی تھی۔ جاگنے کے باوجود میرے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت فی الحال خوابیدہ تھی۔ مگر میرا شعور اشارہ کر رہا تھا کہ آس پاس گڑبڑ ہے اور دراصل اسی نے مجھے بیدار کیا تھا ورنہ میری بیدار ہونے والی حالت نہیں تھی۔ اچانک دروازہ کھلا اور زینتی اندر آئی۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

”چلو یہاں گڑبڑ ہے؟“

”کیسی گڑبڑ؟“ میں نے خواب کی سی کیفیت میں کہا۔

”پتا نہیں کچھ لوگ آگئے ہیں میرے آدمی مقابلہ کر رہے ہیں مگر ہمیں یہاں سے ہٹانا ہوگا۔“

عجیب بات تھی میرا زونٹل تھیں ہوتا چاہیے تھا کہ میں سب سے پہلے اسے ہی دشمن سمجھتا اور اسے مارنے کی کوشش کرتا۔ یا پھر فرار کی راہ تلاش کرتا مگر اس کی بجائے میں اس کے ساتھ بھینچا چلا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم آپس میں دوست اور ساتھی ہیں۔ باہر آتے ہی اس نے ہوٹل کے اوپری حصے کا رخ کیا اور لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر ہم چھت پر آئے۔ آس پاس گولیوں کے شعلے چمک رہے تھے اور حملہ آور نے دو طرف سے ہوٹل کو گھیرا ہوا تھا۔ زینتی کے آدمیوں کی طرف سے جوابی کارروائی جاری تھی۔ مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ

ماہنامہ سرگزشت

دیڑھ حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ہتھیاروں سے لگ رہا تھا حملہ آوروں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ شاید اسی لیے زینتی مجھے یہاں سے نکال لے جانا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”ہم کس طرف جائیں یہاں تو دشمن ہیں۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“ وہ بولی اور برابر والے مکان کی طرف بڑھی۔ یہ بھی دو منزلہ تھا مگر ہوٹل سے ذرا نیچا تھا۔ زینتی نے مجھ سے کہا۔ ”نیچے اتر جاؤ اور پھر سہارا دے کر مجھے اتارو۔“

میں دیوار سے لٹک کر آرام سے چھت پر اتر گیا اور پھر میں نے ہاتھ اوپر کیا تو زینتی میرے بازوؤں میں آگئی۔ میں نے اسے نیچے کیا تو اس نے پھر میرا بازو پکڑا اور زینوں کا رخ کیا۔ اس بار بھی میں نے بلاچوں جی اس کا ساتھ دیا مگر میرے اترنے سے نیچے موجود افراد کو پتا چل گیا تھا کہ کوئی چھت پر آیا ہے۔ زینوں پر ایک نوجوان آدمی نمودار ہوا اور زینتی کی رائفل کا رخ اپنی طرف دیکھ کر ساکت ہو گیا۔ زینتی نے آہستہ سے کہا۔ ”شور مت کرنا ہم صرف یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں پیچھے ہمارے دشمن آ رہے ہیں۔ وہ آگئے تو تم بھی مارے جاؤ گے۔“

نوجوان نے سر ہلایا اور بولا۔ ”تم دونوں چلے جاؤ۔“ ہم نیچے آئے تو ایک کمرے میں بستر پر ایک لڑکی چادر میں دھکی ہوئی تھی ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف آیا اور اس نے چادر مزید مضبوطی سے خود پر لپیٹ لی۔ شاید وہ اس نوجوان کی بیوی تھی۔ اس فلور پر بس دو کمرے تھے اور ان میں یہی دو افراد تھے۔ معمولی سا فرنیچر اور ساز و سامان تھا۔ ہم اسے دیکھ کر کچلے والے فلور پر آگئے۔ یہ حصہ بند تھا صرف سیڑھیوں اور باہر جانے والا حصہ کھلا ہوا تھا۔ یہاں کوئی اور رہتا تھا۔ مشکل سے ستر اتنی گزرتے پر بنا ہوا کمر تھا۔ جس میں آنے جانے کا راستہ مشترک تھا۔ زینتی نے نوجوان سے کہا۔ ”اب تم جاؤ اور اپنے فلور پر رہو وہاں سے باہر مت آنا۔“

نوجوان سر ہلاتا ہوا اوپر چلا گیا۔ زینتی نے باہر جھانکا تو سامنے ہی دو مسخ افراد ایک ٹنکر بیٹ کی دیوار کی آڑ سے ہوٹل کی طرف فائرنگ کر رہے تھے۔ میں ان کو دیکھ رہا تھا کہ کب زینتی نے پستول پر سائیکسنگ لگا دیا اور پھر اس نے ہاتھ آگے کر کے ایک فائر کیا اور دیوار کے پیچھے موجود افراد میں سے ایک غائب ہو گیا۔ دوسرا اسے دیکھنے کے لیے جھکا اور پھر اس نے اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر جوش میں ہوٹل کی طرف پورا پورا سہارا دیا اور اس کے خاستے پر خود بھی مارا گیا۔



زینی نے اس کے سر میں گولی ماری تھی اور اس کا نشانہ بہترین تھا گولی میں گز کے فاصلے سے اس نے دونوں افراد کو ایک ایک گولی سے نشانہ بنایا تھا۔ پھر اس نے جھانک کر باہر دیکھا اور بولی۔ ”آؤ راستہ صاف ہے۔“

ہم باہر نکلے اور ہوٹل سے مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔ ہم جھگے ہوئے تھے اور رفتار تیز تھی۔ ایک گلی تک پہنچے تھے کہ عقب سے فائر ہوا اور ہم تیزی سے گلی میں گھس گئے۔ ہم بال بال پہنچے تھے کیونکہ چلائی جانے والی گولیاں ہمارے پاس سے گزری تھیں۔ عقب میں ہونے والی فائرنگ کے شور میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ گلی مڑتے ہی زینی نے دوڑنا شروع کر دیا اور میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اب تک میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ میری دشمن ہے مجھے قیدی بنا کر لائی ہے اور اب میرے پاس موقع ہے کہ میں آزادی حاصل کر سکوں مگر میں بنا سوچے سمجھے اس کا ساتھ دے رہا تھا جیسے وہ کہہ رہی تھی ویسا ہی کر رہا تھا۔ میں نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ مجھے فرار ہو جانا چاہیے یا اسے قابو کر لیتا چاہیے۔ میں یوں اس کے ساتھ لگا ہوا تھا جیسے ہم ایک ہی ہوں اور دشمن وہ ہے جو ہمارے پیچھے آیا ہے۔ گلی چوڑی تھی مگر آگے زینی جس گلی میں مڑی وہ تنگ تھی۔ ہم قصبہ کی اندرونی آبادی میں گھس گئے تھے۔

یہاں دشمن نہیں تھے مگر وہ پیچھے ضرور آتے۔ اس لیے زینی تیز رفتار سے گھیاں کر اس کر رہی تھی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس آبادی سے واقف تھی۔ یہ جھوٹا سا قصبہ پہاڑوں کے درمیان میں دریا کے کنارے تھا۔ کچھ دیر بعد ہم ایسی جگہوں سے گزرنے لگے جہاں مکانات فاصلے پر تھے اور درمیان میں باغات اور خالی جگہیں تھیں۔ فائرنگ کی آواز اب پیچھے رہ گئی تھی مگر وہ دیر آ رہی تھی۔ بھاگ دوڑ سے میری فتوہی غائب ہو گئی تھی۔ دشمن کو من کرنے والی کیفیت برقرار تھی۔ اب بھی میں کچھ سوچنے سے قاصر تھا۔ ہم جس سڑک سے آئے تھے وہ دریا کے دوسری طرف تھی اور قصبہ دریا کے اس طرف تھا اس لیے ہمیں ہائی وے تک جانے کے لیے دریا کر اس کرنا پڑتا۔ درختوں اور کھیتوں کا ایک مختصر حصہ آیا اور اس کے بعد قصبے کا دوسرا حصہ سامنے آیا جو اصل میں دریا کے بالکل ساتھ تھا اور اس سے ایک سڑک نکل کر مخالف سمت میں جا رہی تھی جہاں دریا پر پل تھا اور وہاں سے اسے کراس کیا جاسکتا تھا۔ زینی نے صبح کی نمودار ہوئی روشنی میں پل کی طرف اشارہ کیا۔

”ہمیں وہاں جانا ہے۔“

”وہ دور ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہمیں گاڑی کی ضرورت ہوگی۔“

”یہاں گاڑی نہیں ہے ہمیں پیدل جانا ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”چلو میرے ساتھ۔“

ہم درختوں اور مکانوں کی آڑ میں اس طرف روانہ ہوئے۔ فاصلہ ایک گلو میٹر سے کچھ کم تھا۔ اب فائرنگ کی آوازیں ختم ہو گئی تھیں اور اگر دشمن ہمارے پیچھے آیا تھا تو وہ ہمارا نشانہ کھو چکا تھا۔ جب ہم پل کے پاس پہنچے تو روشنی اتنی ہو گئی تھی کہ پل پر موجود ایک گاڑی اور اس کے آس پاس موجود سب افراد دکھائی دے رہے تھے۔ وہ جو کتنا تھے جیسے کسی کے منتظر ہوں۔ زینی نے تشویش سے کہا۔ ”یہ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔“

”ان کو کیسے بتا کہ ہم یہاں آئے ہیں؟“

”اب تک ہمارے فرار کا پتا چل گیا ہوگا اس لیے ان لوگوں کو اطلاع مل گئی ہوگی۔ یہ ہمیں دریا کر اس کرنے سے روکنا چاہتے ہیں۔“

”تب ہم پار کیسے جائیں گے؟“

”تیر کر۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میں نے اس بار بھی کوئی اعتراض نہیں کیا کہ دریا کا پانی بے پناہ سرد ہوگا اور ہماری قلبی جم سکتی تھی۔ درحقیقت میں اعتراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس وقت زینی مجھ سے کہتی کہ میں آگ کے دریا میں کود جاؤں تو میں سوچے سمجھے بغیر اس کی بات پر عمل کرتا۔ زینی ذرا پیچھے آئی اور اس نے اپنے جوتے اتار کر گھر سے باندھ لیے۔ میں نے جوتے نہیں اتارے۔ اس نے اسلحہ اپنی پشت پر بندھے بیک میں ڈال لیا تھا اور پھر ایک چھوٹی سی رسی نکال کر اسے اپنی اور میری چٹون کی بیلٹ سے باندھ لیا تاکہ ہم دریا میں الگ نہ ہو جائیں۔ پانی میں اترنے سے پہلے اس نے پوچھا۔ ”تم تیرنا جانتے ہو؟“

”بہت اچھی طرح۔“ میں نے کہا۔ مگر جب ہم دریا میں آئے اور ٹھنڈے پانی نے استقبال کیا تو اندازہ ہوا کہ میدانِ دریاؤں اور پہاڑی دریاؤں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ میں پانی نے ہمارے جسموں کی حرارت چوڑا شروع کر دی اور جب ہم دریا کے وسط تک پہنچے تو ٹھنڈے ٹھنڈے ٹھنڈے تھے۔ غصہ طاقت جیسے سلب ہو گئی تھی اور ہمارے ہاتھ اب سلوموشن میں چل رہے تھے اور آگے جانے کی بجائے ہم دھارے کے ساتھ بہ رہے تھے۔ زینی کی حالت بھی بری ہو رہی تھی۔ اس سے یوں بھی مشکل سے حیرا جابا تھا کہ اس



کے پشت پر دس بارہ کلو گرام وزن بیٹھا۔ کچھ دیر بعد اس نے غوطے کھانا شروع کر دیے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے اپنی تیراکی کی صلاحیت کا درست اندازہ نہیں تھا۔ خاص طور سے جب واسطہ ایسے شوریدہ سرد دریا سے ہو تو۔ ایک بار وہ پانی کے اندر گئی تو مجھے اس کو کھینچنا پڑا تھا اور اس کے بعد میں ہی اسے سنبھالنے لگا۔ مگر ہم تیرنے کی بجائے خود کو سطح پر برقرار رکھ رہے تھے۔ اس لیے کنارے کی طرف جانے کی بجائے دھارے کے ساتھ بہنے لگے اور اب ہلی کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے زینی سے کہا۔

”ہل نزدیک آرہا ہے۔“

”وہ..... دیکھ لیں..... مے۔“ زینی نے اکھڑی سانسوں کے درمیان کہا۔ ”ان کی نظروں سے بچنا۔“ نیچے دریا میں ابھی نیم تاریکی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ زینی نے کسی قدر شوخ اور بے رنگ کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ یہ پانی میں نمایاں ہو رہی تھی۔ میں نے اسے گھما کر اپنی آڑ میں کر لیا۔ میں آگے تھا اور وہ میرے پیچھے تھی۔ میری جیکٹ نیا لے رنگ کی تھی اور دریا کے پانی سے ہم رنگ ہو رہی تھی۔ اس کی جیکٹ مزید چھپانے کے لیے میں نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔ یوں وہ پانی میں زیادہ اندر چلی گئی تھی اور اس کی جیکٹ چھپ گئی تھی۔ اس نے خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ یہ عجیب جھوٹن تھی کہ ذہنی لحاظ سے میں اس کے بس میں تھا مگر جسمانی طور پر اس نے خود کو مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ ہم ہلی کے نزدیک آئے تو میں نے دیکھا ایک آدمی کنارے پر کھڑا ہوا تھا مگر وہ نیچے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر قصبے کی طرف تھی۔ پانی ہلی سے کوئی تیس بیس فٹ نیچے تھا۔ میں اس وقت جب ہم ہلی کے نیچے آرہے تھے اس آدمی نے نیچے دیکھا تو اس نے ہمیں دیکھ لیا۔ فوراً ہی اس کے چلانے کی آواز آئی۔

”وہ دریا میں ہیں۔“

”گھرے سانس لو اور سانس روک لو۔“ میں نے زینی سے کہا اور خود بھی گھرے سانس لیے لگا اور پھر پیمپروں میں ممکنہ حد تک ہوا بھر کر میں نے زینی سمیت پانی میں غوطہ لگایا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم ہلی کے دوسری طرف نکلے تو پانی کے اندر تھے۔ مگر فوراً ہی ہمارے آس پاس گولیاں برسے گی تھیں۔ فائرنگ کی آواز تو نہیں آرہی تھی مگر جب گولی پانی میں اترتی تو مرغوعے دار لکیری منج جاتی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ مزید نیچے جاؤں۔ زینی تنزی سے سانس خارج کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے مسلسل کبلے نکل رہے تھے۔ جب

کہ میں نے اپنی سانس اب تک روکے رکھی تھی۔ ہمیں پانی میں آئے ہوئے دو منٹ ہو گئے تھے اور زینی نے اپنی سانس مکمل خارج کر دی تھی اب وہ سطح پر جانے اور سانس لینے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی مگر گولیاں ہمارے آس پاس گر رہی تھیں یعنی ہم فائرنگ کی زد میں تھے۔ اس لیے میں زینی کو اوپر جانے سے روک رہا تھا۔ ایک خطرہ یہ تھا کہ وہ پانی ہلی لے گی اس لیے میں نے اس کے منہ پر ہاتھ جما لیا۔ وہ سانس کے لیے پھلنے لگی۔ مگر میں اس کا منہ نہیں چھوڑ سکتا تھا ورنہ پانی اس کے پیمپروں میں چلا جاتا اور اس کا بچنا مشکل ہو جاتا۔ کچھ دیر بعد اس کی مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ تیسرے منٹ تک ہم ہلی سے اتنا دور نکل گئے تھے کہ اب گولیاں ہم تک نہیں آرہی تھیں۔ اس لیے میں نے اوپر آنا مناسب سمجھا۔ زینی نے پھلنا بند کر دیا تھا اور اب ڈھیلے انداز میں تیر رہی تھی۔ باہر نکلتے ہی میں نے دیوانہ وار سانس لیے اور پھر زینی کو بلا لیا۔ مگر اس کا سانس رکا ہوا تھا۔

”اے سانس لو۔“ میں نے اسے جھنجھوڑا۔ مگر وہ ساکت رہی۔ مجبوراً میں نے اسے گھما کر سامنے کیا اور پہلے اس کے منہ سے منہ ملا کر اس کے پیمپروں میں ہوا بھری اور پھر اس کے سینے پر کئے مارے۔ نسوانی جسم کے نازک حصے پر یہ ضرب خاصی سخت تھی مگر مجبوری تھی۔ ایک بار کئے مارنے پر وہ بے حس رہی۔ مگر دوسری بار یہ عمل کرنے پر اس نے گھٹائیں کر سانس لی اور پھر گھرے گھرے سانس لینے لگی۔ میں نے بھی سکون کا سانس لیا اور اس کا سر پانی سے باہر رکھا کیونکہ وہ اس قابل نہیں تھی کہ از خود تیر سکتی۔ اس دوران میں ہم دریا میں بہتے جا رہے تھے اور مجھے ارد گرد کی خبر نہیں تھی۔ زینی کے سانس لینے کے بعد میں نے آس پاس دیکھا تو ہلی پیچھے رہ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد زینی نے آنکھیں کھول دیں اور آس پاس دیکھا۔

”ہم کہاں ہیں؟“

میں نے اسے آگاہ کیا ”ہلی سے آگے نکل آئے ہیں دھارے کے ساتھ جا رہے ہیں۔“

”ہم دوبارہ قصبے کی طرف جا رہے ہیں۔“ وہ مضطرب ہو گئی۔ ”ہمیں کنارے پر جانا ہے۔“

وہ رہ رہ کر کھائیں رہی تھی اور میرے کموں سے یقیناً سے تکلیف پہنچی تھی۔ قصبے کے پاس دریا کا پاٹ چوڑا اور دھار سست ہو گیا تھا۔ میں نے کنارے کی طرف دیکھا تو دور ایک کانپہاں ہائی وے پر نظر آئی مجھے شبہ ہوا کہ یہ وہی گاڑی تھی جو میں نے ہلی پر دیکھی تھی۔ پھر ہائی وے دریا



سے دور ہونے لگی اور گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ زینتی نے کہا۔ ”چلو ہمیں اس کنارے چلنا ہے۔“

”اس طرف دشمن ہے۔“

”اسی لیے تو اس طرف جانا چاہیے وہ سمجھے گا کہ ہم قصبے کی طرف جا رہے ہیں۔“

اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں صرف منطقی اعتراض کر سکتا تھا اگر زینتی کوئی بات کہہ دیتی تو اسے لازمی تسلیم کرنا چاہیے وہ عقل و منطق کے بالکل ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ میں نے اس کے ساتھ مخالف کنارے کی طرف حیرنا شروع کر دیا۔ دریا کا پاٹ چوڑا ہوا تھا مگر اس کی تندی ختم ہو گئی تھی اور اب ہم آرام سے تیر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم کنارے پہنچے۔ میں اوپر چڑھا اور پھر زینتی کو بھی کھینچا۔ میں بھی ہانپ رہا تھا مگر اس کی حالت بری تھی۔ وہ دیوانہ وار سانس لے رہی تھی اور بالکل ڈھیر ہو گئی تھی۔ میں نے آس پاس دیکھا اور پھر اس سے کہا۔ ”ان جھاڑیوں تک چلو یہاں دیکھ لیے جانے کا خطرہ ہے۔“

”میں نہیں جا سکتی۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم مجھے لے چلو۔“

میں اٹھا اور اسے سہارا دے کر ان جھاڑیوں تک لے آیا۔ اس نے اپنا بیک اتارا اور اس کی زپ کھولی تو اندر سب خشک تھا گویا یہ دائرہ پروف بیک تھا۔ اس نے اندر سے ایک میڈیکل پیک نکالا اور اس میں موجود چھوٹا سا انجکشن نکال کر اپنے دائیں بازو میں انجکشن کر دیا۔ اس کی رنگت نیلی ہو رہی تھی اور وہ کھانسنے لگی تھی۔ میں نے اس کی رنگت دیکھ کر انجکشن لگنے کے ایک منٹ بعد اس کی رنگت بحال ہونے لگی اور اس کی سانس بھی ہموار ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میڈیکل پیک میں اور بھی کئی انجکشن اور دو دوائیاں تھیں۔ مگر اس نے صرف وہی انجکشن لے کر پیک بند کیا اور اسے واپس بیک میں رکھ لیا۔ حالت ٹھیک ہوتے ہی اس نے اٹھ کر اپنی جیکٹ اتاری۔ پھر شرٹ کے بٹن کھولنے لگی تو اس نے منہ پھیر لیا۔ وہ رکی اور اس نے تحسنا نہ انداز میں کہا۔ ”میری طرف دیکھو۔“

میں نے نہ جانتے ہوئے بھی اس کی طرف دیکھا تو وہ دوبارہ بٹن کھولنے لگی تھی۔ اس نے شرٹ اتار دی۔ اس کے نیچے زیر جامہ تھا۔ پھر اس نے اپنی بھاری... اور کسی ہوئی چٹون کی قدر دقت سے اتاری۔ بھیک کر وہ اور چمٹ رہی تھی۔ نیچے بھی زیر جامہ تھا اور اب وہ نہ ہونے کے برابر لباس میں تھی۔ مگر میں تو اسے اس سے بھی زیادہ کھلے ڈالے

خلیے میں دیکھ چکا تھا۔ دوسرے اسے یوں دیکھ کر بھی مجھے کوئی احساس نہیں ہوا جب کہ میں پہلے سننا گیا تھا۔ اس نے اپنے کپڑے نچوڑے اور پھر ان کو جھٹک کر مکندہ تک پانی نکال دیا۔ وہ بلاشبہ نہایت حسین عورت تھی۔ بعض عورتوں کے نقوش حسین ہوتے ہیں اور بعض جسمانی لحاظ سے جاذب نظر ہوتی ہیں۔ مگر زینتی میں یہ دونوں خصوصیات تھیں۔ اس کے نقوش جتنے دل فریب تھے جسمانی زاویے اس سے زیادہ حسین تھے۔ اس نے دوبارہ کپڑے پہن لیے اور مجھ سے کہا۔ ”تم بھی اپنے کپڑے خشک کر لو۔“

میں ایک جھاڑی کی آڑ میں آیا اور لباس اتار کر نچوڑا۔ جوتوں میں پانی بھر گیا تھا انہیں جھٹک کر صاف کیا اور پھر پہن لیے۔ میں جھاڑی سے باہر آیا تو وہ جیکٹ پہن کر بیک پشت پر باندھ چکی تھی مگر اس نے اسلحہ نکال لیا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی اور پستول اس نے جیکٹ میں رکھا ہوا تھا۔ اگرچہ میں اس کا پورا ساتھ دے رہا تھا مگر اس نے اب تک اسلحے کے معاملے میں مجھ پر اعتبار نہیں کیا تھا۔ اس کے پاس اضافی اسلحہ تھا۔ دریا کے ساتھ ڈھلان تھی دراصل یہ دریا کا ہی حصہ تھا۔ کئی سالوں بعد جب سیلاب آتا ہوگا تو دریا کا پاٹ اوپر ہائی وے کے پاس پہنچ جاتا ہوگا۔ اسی وجہ سے یہاں صرف چھوٹی جھاڑیاں اور درخت تھے۔ ہم اوپر جانے لگے۔ مگر جھاڑیاں زیادہ نہیں تھیں اس سے اوپر کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دریا نزدیک ہونے کی وجہ سے انہیں آبپاشی کے لیے پانی آسانی سے مل جاتا تھا۔ اس لیے سیلاب کے خطرے کے باوجود یہاں کاشت کاری کی جا رہی تھی۔ ہم اوپر آئے تو ہائی وے پر ویرانی تھی۔ روشنی زیادہ ہو چکی تھی اور سورج کسی لمحے نکل سکتا تھا۔ ہائی وے کے پار بھی دور تک سیر می نما کھیت نظر آ رہے تھے۔ زینتی نے ان سے اوپر اشارہ کیا۔

”ہمیں اس طرف جانا ہے۔“

”درمیان میں لوگ مل سکتے ہیں۔“

”لوگوں کا مسئلہ نہیں ہے ان دشمنوں سے بچنا چھڑانا ہے۔“

”لوگ ان کو بتا سکتے ہیں کہ ہم کہاں گئے۔“

”ہمیں ایسی جگہوں سے گزرنا چاہیے جہاں لوگ نہ ہوں۔“

زینتی نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ سامنے کی بات ہے لیکن اس وقت میری عقل کام نہیں کر رہی ہے۔“



”ایسی عقل کا کیا فائدہ جو وقت پر کام نہ آئے۔“  
میں نے کہا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں۔“

”چلو میرے ساتھ۔“ وہ بولی اور ہم ہائی وے کے متوازی چلنے لگے۔ ممکن حد تک آڑ میں رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بلکہ یہ کہتا چاہیے کہ زنی کر رہی تھی تو اس کے حکم کا غلام بنا ہوا تھا۔ چند منٹ بعد ہم ہائی وے کے ایک ایسے حصے میں تھے جس کے پار دوسری طرف ویران پہاڑ اور کھائیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم نے ہائی وے کو اس کی اور دوسری طرف پہنچ گئے۔ ایک ایسی جگہ پہنچ کر جہاں ہمیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا زنی نے بیک سے ایک نقشہ نکالا اور اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ میں بھی دیکھ رہا تھا اس نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”میں یہاں پہنچتا ہے۔“

”اسد آباد۔“ میں نے غور کیا۔ ”ہم اس وقت کہاں ہیں؟“

”یہاں۔“ اس نے ایک اور جگہ انگلی رکھی۔ یہاں اسرار لکھا تھا۔ گویا اس قصبے کا نام اسرار تھا۔ یہ جگہ پاکستان کی سرحد سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اسرار سے اسد آباد تک وہی ہائی وے جاری تھی جو اصل میں پاکستان سے آرہی تھی۔ میں نے کہا۔

”لیکن اس علاقے سے ایک ہی ہائی وے جاتی ہے اور تمہارے دشمن تمہیں کہیں بھی روک سکتے ہیں۔“

”ہم پیدل اور ہائی وے سے ہٹ کر سفر کریں گے۔“ اس نے جواب دیا اور نقشہ تبہ کر کے واپس جیکٹ میں رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”چلو ہمیں گھوم کر جانے میں بہت وقت لگے گا۔“

”ہم شام تک پہنچ سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس طرف دریا اور سڑک کے ساتھ آبادی ہے۔“

”ہاں اسی وجہ سے مشکل ہو گی۔ مگر ہم دوسروں کی نظروں سے بچ کر سفر کر سکیں گے۔“

ہم چل پڑے۔ میری کیفیت ایسی تھی جیسے تجسس تک نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور زنی نے اپنے ہی ساتھیوں کو کیوں مروادیا تھا پھر یہ کون تھے جو اس کے حکم کے غلام بنے ہوئے تھے اور اب اس کے کچھ دشمن بھی نکل آئے تھے جنہوں نے ہمیں مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ علاقہ نہایت مشکل اور دشوار گزار تھا اس لیے آبادی کے پاس ہونے کے باوجود اسے استعمال میں نہیں لایا جاسکا

تھا۔ جیسے جیسے ہم اوپر کی طرف جا رہے تھے راستے کی دشواری بڑھ رہی تھی مگر یہی دشواری ہمیں پیچھے آنے والوں سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ مگر اس مشقت سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ بخ پانی میں رہنے سے جسم کی حرارت جو زائل ہوئی تھی دوبارہ لوٹنے لگی اور ہمارے کپڑے خشک ہونے لگے۔ سورج بلند ہونے کے بعد یہ عمل تیزی سے ہوا تھا اور ایک گھنٹے سے بھی پہلے ہمارے کپڑے خشک ہو گئے تھے۔ بلکہ اب کسی قدر گرمی لگ رہی تھی۔

ہم سڑمی دار کھیتوں کے اوپر موجود پہاڑی سلسلے تک پہنچ گئے تھے۔ یہ جگہ بلندی پر تھی اور یہاں سے برف پوش پہاڑ زیادہ دور نہیں لگ رہے تھے۔ دھوپ خاصی تیز تھی مگر جہاں سائے سے گزرتے تھے خشکی ایک لمحے کو کاٹنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ہم ویرانے میں سفر کر رہے تھے۔ تب پہلی بار میں نے اپنے اندر تبدیلی محسوس کی اور مجھے لگا کہ میری کیفیت بدل رہی ہے۔ میرا ذہن جو سن سا تھا اب بہتر ہو رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں زنی کے ساتھ اسٹن سکون سے سفر کیوں کر رہا تھا؟ جب کہ وہ مجھے قیدی بنا کر لائی تھی اور مجھے کسی کے ہاتھ فروخت کرنے کا ارادہ تھا۔ پھر مزید ذیلی سوالات ذہن میں پھرانے لگے کہ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیا کیا تھا اور یہاں کس پتھر میں تھی؟ مگر مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا یعنی یہ موقع نہیں ملا کہ میں زنی سے چھٹکارے کا سوچتا۔ کیونکہ اچانک زنی رک گئی اور اس نے کہا۔

”وقت ہو گیا ہے۔“

”کس چیز کا؟“

”بھئی۔“ اس نے حکمانہ انداز میں کہا اور میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے بیک سے میڈیکل پیک نکالا اور اس میں سے ایک چھوٹا انجکشن نکال کر مجھ سے بازو سامنے کرنے کو کہا اور میں نے بازو اگے کیا تب میں نے اس پراس کی جگہ انجکشن کا نشان دیکھا۔ مجھے پہلے بھی انجکشن لگا تھا اور زنی نے اسی جگہ یہ انجکشن بھی لگا دیا۔ یہ نروکا تھا۔ انجکشن لگنے کے چند منٹ تک میرا سر پکراتا رہا۔ زنی نے اس دوران میں مجھے نہیں چھیڑا۔ تقریباً دس منٹ بعد اس نے کہا۔ ”اٹھو۔“

میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے اگلا حکم دیا۔ ”اس چٹان پر جاؤ اور نیچے کود جاؤ۔“

میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ نیچے کودنے کی صورت میں میرے نیچے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چٹان کی طرف



بڑھا اور اس پر چڑھ کر کنارے جا رہا تھا کہ مقب سے زنی نے کہا۔ ”رک جاؤ۔“

میں رک گیا تو اس نے حکم دیا۔ ”واپس آ جاؤ۔“

میں واپس آ گیا۔ اس دوائے مجھے اس کا غلام بنا دیا تھا۔ یہی حربہ میں بھارت میں دشمنوں پر استعمال کر چکا تھا اور اس کا مجھے بہت فائدہ ہوا تھا۔ یعنی زنی نے میرا جوتا میرے پیسے برباد کر دیا تھا۔ اگرچہ اب ایسی ادویات کا استعمال کوئی انوکھی بات نہیں ہے لیکن میرے ساتھ پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ قبوے میں خیمہ کی دوا دینے کے بعد مجھے انگلشٹن دیا گیا تھا بھی جاگنے کے بعد اور موقع ملنے پر بھی میں نے فرار کی کوشش نہیں کی بلکہ زنی کا ساتھ دیتا رہا اور اس کی جان بھی بچائی۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اسے موت کے منہ سے بچھڑا لیا تھا۔ ورنہ اس کا سانس تو رک گیا تھا۔ گویا اپنے پاؤں پر میں نے خود کھانڈی ماری تھی۔ اگر وہ مر جاتی تو اس وقت میں آزاد ہو چکا ہوتا۔ میرے اس طرح رو پوٹ ہونے پر وہ خوش تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”تم نے دیکھا کہ میرے اشاروں پر کیسے ناکچ رہے ہو؟“

میرے اندر کوئی لہر نہیں اٹھی میں سن کر ہلکا سا اس لیے میں نے کوئی جواب بھی نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی، پھر میرے پاس آئی اس نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور ذرا چمک کر ہونٹ میرے ہونٹوں کے سامنے لے آئی۔ وہ اپنی من مانی کر رہی تھی اور میں اسے روک نہیں سکتا تھا مگر میں کچھ محسوس بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس نے بھی میرا سپاٹ پن محسوس کر لیا اور کسی قدر جھنجھلاہٹ کے ساتھ الگ ہو گئی۔ ”تم بالکل ٹھس ہو گئے ہو میرا ساتھ دو۔“ میں نے ساتھ دیا مگر اسے مزہ نہیں آیا۔ اسی نے ٹھس کیا تھا ورنہ اسے پاس آنے پر مشکل ہی آسانی اس کی گردن مروڑ دیتا۔ اس نے بیک سے ایک بول دھاتی ڈبا نکالا اور اسے کھول کر اس میں سے ایک درمیانے سائز کا بسکٹ نکالا اور اسے منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔ پھر اسے اٹلی سے اتارنے کے لیے اس نے پانی کا سہارا لیا۔ اس نے اب بھی ایک بسکٹ مجھے بھی دیا۔ میں نے اس بد مزہ سے بسکٹ کو بھکی مشکل سے پانی کی مدد سے پیچے کیا۔ مگر اسے کھاتے ہی مجھے لگا جیسے میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھالیا ہو۔ زنی بولی۔ ”یہ پانی پروٹین بسکٹ ہے سمجھ لو ایک بسکٹ میں ایک وقت کے کھانے کی حمل غذا سمیت ہوتی ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”مجھے لگ رہا ہے میں نے اچھی طرح کھایا ہو۔“

بیسویں صدی میں جینیاتی انجینئرنگ کی بنیاد رکھی گئی اسی صدی کے دوران انسان نے خلاؤں کو مسخر کیا چاند پر پہلا قدم رکھا اور مریخ کی طرف قدم بڑھائے۔ مواصلاتی سیاروں نے دنیا کے فاصلوں کو مٹا ڈالا۔ کمپیوٹر اور سپر کمپیوٹر کی ایجاد نے حیات انسانی کو ترقی کی ایک نئی شاہراہ پر لاکھڑا کیا۔ کیا طلب ہو یا کیسیا طبعیات ہو یا حیاتیات، فلکیات ہو یا ارضیات زمین سے آسمان تک، سطح زمین سے در زمین تک ہر جگہ سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے نقش ستاروں جیسے دیکھتے نظر آتے ہیں۔ جوہری ٹیکنالوجی ہو یا انفراریڈ ٹیکنالوجی، کمپیوٹر ٹیکنالوجی ہو یا بائیو ٹیکنالوجی، سب ہی بیسویں صدی میں انسانی فہم و فراست کی عظمت کی دلیل ہیں۔

”ہیں اب چلو۔“ وہ کھڑی ہو گئی مگر اس بار اس نے بیک مجھے تھما دیا اور میں نے اسے پشت پر باندھ لیا۔ یہاں ڈھلان اترتی تھی اور زنی نے دو عدد کھڑیاں تلاش کیں جن سے ہم اسٹک کا کام لے سکتے تھے۔ سہارے کے بغیر اترنا مشکل کام تھا۔ اسٹک سے یہ آسان ہو گیا۔ سورج سر پر آ گیا تھا اور اس کی چش اب بڑھ گئی تھی۔ خاص طور سے سر جیسے براہ راست حرارت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنا رومال سر پر باندھ لیا۔ زنی کے پاس ڈھیلی اونٹنی تھی اس نے وہی پہن لی۔ اگرچہ یہ گرم تھی مگر کرنی الحال دھوپ سے بچا رہی تھی۔ بلندی پر پانی نہیں تھا اس لیے ہمیں اسی بوتل پر گزارا کرنا تھا۔ دوپہر تک جب کہیں پانی نہیں ملا تو زنی بوتل خود استعمال کرنے لگی۔ اس نے مجھے پانی دینا بند کر دیا۔ ایک گھنٹے میں میرا حلق خشک ہو گیا اور اس میں کانٹے سے بڑے گتے تھے۔ یہاں گرمی سے زیادہ خشکی تھی جس نے پیاس کو ذرا سی دیر میں شدید کر دیا تھا۔ جب میرے لیے برداشت نہ رہی مشکل ہو گیا تو میں نے اس سے پانی مانگا۔

”مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“

”مجھے نہیں پانی نہیں ملے گا۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔

”جب میں پانی کہاں سے لوں؟“

”وہ کھوشا بد رکھتے ہیں کوئی ندی یا تالاب آئے گا تو لی



”چشموں کا پانی ایسے ہی نہیں چہتا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”بعض اوقات اس میں زہریلی معدنیات یا پودوں کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ ویسے یہ پانی ٹھیک ہے۔“

میں نے دل بھر کر پانی پیا اور زہنی نے اپنی بوتل بھی بھری۔ یہ ڈیڑھ لیٹر کی بوتل تھی۔ بلکہ اسے پانی اتنا اچھا لگا کہ اس نے اپنا پہلے والا پانی پھینک کر چشمے سے پانی بھر لیا۔ اس دوران میں میں نے اچھی طرح منہ ہاتھ دھوئے اور اپنا تپ جانے والا سر کچھ دیر کے لیے پانی میں رکھ کر ٹھنڈا کیا۔ اس ٹھنڈک نے مجھے بالکل تروتازہ کر دیا تھا۔ میرا پ روٹ ذرا بدل دیا۔ ہم واپس ڈھلان کی طرف جانے کی بجائے اسی چشمے سے اوپر چڑھنے لگے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”اس طرف سے کیوں جا رہے ہیں؟“

”یہ شارٹ کٹ ہے۔“ وہ بولی۔

مگر شارٹ کٹ خاصا طویل ثابت ہوا کیونکہ ترچھا ہونے کے ساتھ ساتھ یہاں راستہ اتنا زیادہ محوم رہا تھا کہ اس کی بجائے اگر ہم واپس ڈھلان پر جا کر چڑھتے تو اب تک دوسری طرف پہنچ چکے ہوتے۔ زہنی تھک گئی تھی اور میرا حال بھی اچھا نہیں تھا لگا تار تین دن سے پہاڑی راستوں پر سفر کر رہے تھے۔ جب ہم اوپر پہنچے تو دوسری طرف بھی اتنی ہی مشکل اترائی تھی اور شام سر پر تھی۔ اس اترائی کے بعد ایک وسیع میدان نما پلینو دکھائی دے رہی تھی۔ مگر یہ بھی پہاڑوں کے اوپر تھی۔ یہاں دور ہائی دے بھی نظر آ رہی تھی۔ میں نے زہنی سے کہا۔ ”اگر تم نے آج ہی اسد آباد پہنچنا ہے تو ہائی دے تک جانا ہوگا ہم کسی گاڑی میں ہی وہاں تک جاسکتے ہیں۔“

غالباً وہ بھی یہی سوچ رہی تھی اس لیے فوراً مان گئی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمیں ہائی دے کی طرف جانا چاہیے۔“

اس دشوار ڈھلان سے کسی نہ کسی طرح نیچے آئے تو سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ ہم نے شاید دس کلومیٹر کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا اور سارا دن گزر گیا تھا۔ میدان سے ہوتے ہوئے ہم ہائی دے کے پاس آئے۔ اس پر ٹریک گزر رہا تھا مگر اس طرح کہ چند منٹ بعد کوئی گاڑی آئی یا جاتی نظر آتی تھی۔ ہم ہائی دے کے نزدیک آئے تو خود کو چھپانے لگے۔ اس کا امکان تھا کہ پیچھا کرنے والے یہاں بھی ہوں۔ ایک موزوں جگہ ہم نے

ہم نے سفر جاری رکھا تھا مگر ہر گزرتے لمحے پیاس کی شدت بڑھ رہی تھی اور اگر جسم میں پانی ایک حد سے کم ہو جاتا تو ڈی ہائیڈریشن کی کیفیت ہو جاتی۔ مجھے چکر آنے لگتے اور نظر دھندلانا شروع کر دیتی۔ مگر فی الحال صرف ٹھنکی تھی۔ میں چلتے ہوئے ایسی جگہوں پر جھانک رہا تھا جہاں گڑھوں میں گزشتہ بارش کے پانی کی موجودگی کا امکان ہو سکتا تھا مگر قسمت کہ بارش کو اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ اگر پانی تھا بھی تو اب خشک ہو چکا تھا۔ ہمارا رخ نیچے کی طرف تھا اور اس کا امکان بڑھ رہا تھا کہ راستے میں کوئی ندی یا نال لٹ جائے۔ سبہ پہر تک ہم ایک ڈھلان عبور کر کے نیچے پہنچے تو اوپر چڑھائی منتظر تھی۔ بائیں طرف نشیب میں گہرائی تھی میں نے زہنی سے کہا۔ ”اب مجھ سے پیاس برداشت نہیں ہو رہی ہے وہاں نیچے پانی ہو سکتا ہے۔ مجھے پانی دو یا وہاں تک چلو ورنہ۔۔۔۔۔“

”ورنہ کیا؟“ اس نے تجر لہجے میں پوچھا۔

”مجھے ڈی ہائیڈریشن کی کیفیت شروع ہو جائے گی اس وقت بھی میرا سر ہلکا سا چکر رہا ہے۔“

اس نے سوچا اور سر ہلا کر پہلے بوتل میری طرف بڑھائی۔ ”اس سے دو گھونٹ لے لو۔“

میں نے دو گھونٹ لے کر بوتل اسے واپس کی اور اب میری حالت بہتر ہوئی تھی۔ زہنی میرے ساتھ اس نشیب کی طرف بڑھی۔ یہاں سبزہ مگر بے رنگ کا تھا جو اس بات کی نشانی تھی کہ یہاں پودوں کو زیادہ پانی ملتا تھا۔ پہاڑی علاقے پانی کے لحاظ سے صحرا سے زیادہ مختلف نہیں ہوتے ہیں یعنی ان کی زمین میں پانی زیادہ دیر نہیں ٹکتا ہے۔ اس لیے پودوں کو اب اس پانی محفوظ کرنا پڑتا ہے۔ البتہ پہاڑوں میں بارش کا زیادہ ہونا ہے اور پھر برف بھی پھسلتی ہے۔ اس لیے یہاں ہر جگہ پانی جاتی ہے۔ ہم ذرا نیچے آئے تھے کہ پانی کی جھلک دکھائی دی۔ یہ چشمہ تھا جو زمین سے اٹل رہا تھا مگر ایک ہی جگہ سے نکلتا تھا۔ میں تیزی سے پانی کی طرف بڑھا۔ پانی شفاف اور ٹھیک ٹھیک کا تھا اس سے نباتات کی مخصوص تھک آ رہی تھی میں نے پہلی میں لے کر پہلے اسے چکھا اور صرف پانی کا ذائقہ محسوس کر کے ایک بار منہ میں لیا۔ اس بار بھی پانی میں کوئی خرابی محسوس نہیں کی اس لیے چند گھونٹ پی کر دیکھا۔ زہنی میرے عقب میں موجود احتیاط پسندی کا مظاہرہ دیکھ رہی تھی اور جھنجھلا رہی تھی۔

قیام کیا۔ یہاں سے ہم ہائی وے پر دونوں طرف نظر رکھ سکتے تھے اور کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ویسے بھی اندھیرا تقریباً چھا گیا تھا۔ دن بھر کی گرمی کے بعد اب ہوا میں خلی محسوس کی جاسکتی تھی۔ مگر مجھے بھوک لگ رہی تھی عام حالات میں میں کبھی اپنے دشمن سے اس طرح کھانے کا سوال نہیں کر سکتا تھا مگر میں اس کیفیت میں تھا میں نے آرام سے ذیخا سے کہہ دیا۔ ”مجھے بھوک لگی ہے۔“

”کچھ دیر صبر کر لو اگر گاڑی مل گئی تو ہم کھانا بھی کھا سکیں گے۔ یہ انرجی بسکٹ ہنگامی حالات کے لیے ہیں۔“

”ہم یہاں کس کا انتظار کر رہے ہیں؟“

”بس کا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہم چھوٹی گاڑی والوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے وہ دشمن بھی ہو سکتے ہیں اور چور ڈاکو بھی۔“

”یہ دشمن کون ہیں؟“

”میں نہیں جانتی مگر اندازہ ہے۔ یہاں کا ایک طاقتور سردار میرے پیچھے پڑ گیا ہے یہ اسی کے آدمی ہیں جو مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔“

”یعنی یہ میرے پکڑ میں نہیں ہیں؟“

اس نے میری طرف دیکھا۔ ”یہاں تمہیں کون جانتا ہے؟“

”ہو سکتا ہے کوئی نکل آئے۔“ میں نے کہا۔ ”یقین سے مت کہو۔“

اس کا منہ بن گیا اس کے خیال میں میں نے اس کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”اس طاقتور سردار کو تم سے کیا مطلب ہے؟“

”یہ اس سردار کا بھائی ہے جسے میں نے قتل کیا تھا۔“ وہ بولی۔ ”وہ اپنے بھائی کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔“

”تم نے شیر خان اور ان کے ساتھیوں کو کیوں مارا؟“

”وہ سمجھتے تھے کہ میں ان کے بس میں ہوں۔“ زینبی کا لہجہ حقارت آمیز ہو گیا۔ ”اس لیے وہ مجھ سے جیسا چاہے سلوک کر سکتے ہیں۔“

”اگر تم ان سے خوش نہیں تمیں تو ان کے ساتھ کیوں جھیں؟“

”میں اصل میں تمہارے لیے پاکستان گئی تھی۔“ اس نے انکشاف کیا۔ ”وہ سمجھے کہ میں مجبوری میں ان کے ساتھ شامل ہوئی ہوں۔ یہ کام بھی یہ ظاہر میں نے ہی ان کو دلایا تھا۔ میں تم کو لے آئی اور ساتھ ہی ان کو بھی کیفر کردار تک

پہنچا دیا۔“

میں نے اس کی بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی۔ ”میرے لیے کیوں؟“

”کسی کو تمہاری تلاش ہے۔“

”میری تلاش کس کو ہے؟“

”یہ میں نہیں بتا سکتی۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔ ”میں تم کو اس کے پاس لے جانے کی کوشش کر رہی ہوں اگر کامیاب رہی تو تم دیکھ ہی لو گے۔“

”تم نے مجھے انجکشن کس چیز کا لگایا ہے؟“

”شریف بتائے رکھنے کا۔“ وہ ہنسی۔ ”اگر میں تمہیں یہ انجکشن نہ لگاتی تو اس وقت تم میرے قابو میں کہاں ہوتے؟“

میں نے سوچ کر کہا۔ ”ہاں میں بھاگ جاتا۔ آج تک کوئی دشمن مجھے زیادہ دیر قید نہیں رکھ سکا۔“

”تم بہت خطرناک آدمی ہو، مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ تم اتنی آسانی سے ہمارے ہاتھ آ گئے۔“

”یہ شیر خان اور اس کے ساتھی۔“

”انہیں بھول جاؤ۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”وہ گھٹیا درجے کے جرائم پیشہ تھے اور ان کا انجام یہی ہوتا تھا۔“

”میں نے شیر خان سے کہا تھا۔“

”تم نے ٹھیک کہا تمہارے پاس وقت ہوتا تو میں انہیں تڑپا تڑپا کر مارتی۔“

میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”دیکھنے میں اتنی ظالم نہیں لگتیں مگر تم نے کیسے آرام سے ان تینوں کو مار دیا۔“

”میں نے قسم کھائی تھی مجھے جب موقع ملا میں انہیں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گی۔“

”یہ چاروں جو ہمارے ساتھ آئے کیا تمہارے پرانے ساتھی ہیں؟“

”نہیں انہیں اس شخص نے ہار کر کے میری مدد کے لیے بھیجا جس کے لیے میں کام رہی ہوں۔ ورنہ میں ان کو جانتی بھی نہیں ہوں۔“

”شاید وہ چاروں مارے گئے ہیں۔“

اس نے بے پروائی سے سر ہلایا۔ ”حملہ آور زیادہ تھے میں انہیں اسی لیے ہار کیا گیا تھا۔ ویسے بھی اس ملک میں مرے جانے کے سوا اور ہے ہی کیا؟“

”جب تک وہ جیوں کیوں آئی ہوں؟“

”صرف اسی کام کے لیے اس کے بعد میں وہاں نہیں



چار جیا چلی جاؤں گی۔ وہاں میرا خاندان ہے۔“  
”تم نے جو وقت گزارا ہے کیا اس کے بعد نارمل زندگی گزار سکو گی؟“

”ہاں نہیں۔“ اس نے مجھے گھورا۔ ”تم کچھ زیادہ ہی بات نہیں کر رہے ہو اس انجکشن کے بعد آدمی چپ رہتا ہے۔ مگر تم ہو کہ بولے جا رہے ہو۔“

”میں زیادہ بولتا ہوں۔“ میں نے اعتراف کیا۔ زینبی نے سڑک کی طرف دیکھا اور بولی۔

”میرا خیال ہے بس آگئی ہے۔“

بس اسی سمت سے آ رہی تھی جس طرف سے ہم آئے تھے۔ زینبی نے رائل بیگ میں کرلی اور اب بیگ اپنے قبضے میں لے لیا البتہ اس نے ہسپتال جیکٹ تلے چلون کی چیلٹ میں اس لیا تھا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”آؤ۔“

ہم سڑک پر آئے اور زینبی نے خود کو نمایاں کرتے ہوئے بس روکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے پہلے ہی بریک لگا دی اور ہمیں بس تک جانا پڑا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو بس کچھالچ بھری ہوئی تھی اور اس میں خواتین اور حضرات کے ساتھ ساتھ چرند پرند بھی تھے۔ بس میں تیس چنڈ ایک تھیں جو دی آئی لی حضرات کے لیے مخصوص ہیں باقی سبھی نکال کر جگہ کشادہ کی گئی تھی جس میں زیادہ سے زیادہ افراد کو ٹھوسا ہوا تھا۔ اندر کا حال دیکھ کر زینبی نے آگے جانا مناسب نہیں سمجھا اور ڈرائیور نے فوراً اسے اپنے ساتھ والی نشست پیش کی اور اس پر براجمان کنڈیکٹر کو وہاں سے دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ زینبی بیٹھ گئی اور میں دروازے پر ہی کھڑا ہو گیا۔ آگے جانے کا کوئی چانس ہی نہیں تھا۔ بس آگے بڑھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر چچا کرنے والوں میں سے کوئی بس میں ہوا تو اس کا ریوئل کیا ہو گا؟ اس سے پہلے بھی ہم براہ راست فائرنگ کی تھی اور اب بھی امکان نہیں تھا کہ ہمیں مارنے کی کوشش کی جائے گی۔ مگر شکر ہے بس میں کوئی دشمن نہیں تھا اور ہم آرام سے اسدا کا پیچھے گئے۔

جس جگہ ہم بس پر سوار ہوئے وہاں سے اسدا آباد مشکل سے دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور ڈرائیور تیز رفتاری کا مریض تھا اس نے یہ فاصلہ مشکل سے چند منٹ میں طے کر لیا اور جب اسٹاپ پر ہم اترنے لگے تو ڈرائیور مایوس ہوا تھا کہ اس نے اتنی جلدی کیوں دکھائی مزید کچھ دیر زینبی کا ساتھ رہتا۔ زینبی نے راستے میں کھٹ لے لیے تھے۔ اسدا آباد بڑا قصبہ یا چھوٹا شہر ہے اور رات کے وقت بھی یہاں خاصی چہل پہل تھی۔ زینبی نے نیچے اترتے ہی

ایک عیسیٰ کو اشارہ کیا اور عیسیٰ والا اسے اڑا کر لایا تھا۔ یہ مشکل ہم اس کی زد سے بچے اگر عیسیٰ کے بریک بہت اچھے نہ ہوتے تو وہ ہم پر چڑھ جاتی۔ اس کے بریک تو اچھے ہونے لگے تھے کیونکہ یہ سنے ماڈل کی ٹویونا کرولا تھی اور یہاں عیسیٰ کے طور پر کام کر رہی تھی۔ افغانستان میں گاڑیاں اسمگل ہو کر آتی ہیں۔ کوئی ڈیوٹی، ٹیکس اور رجسٹریشن نہیں ہے اس لیے نہایت سستی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ اعلیٰ درجے کی گٹوری گاڑیوں سے عیسیٰ حتیٰ کہ بار برداری کا کام بھی لیا جا رہا تھا۔ اگر انہیں بنانے والی کمپنیاں اپنی گاڑیوں کا استعمال دیکھیں تو یقیناً صدمے میں آجائیں۔

کار میں کم نظر آ رہی تھیں جب کہ بڑی گٹوری فور وہیل ڈرائیور کی بھرمار تھی۔ بازاروں کی رونق بتا رہی تھی کہ فی الحال یہاں لوگوں کے پاس خاصا پیسا آیا تھا۔ زینبی نے عیسیٰ میں بیٹھ کر ڈرائیور کو کسی جگہ کا بتایا۔ اس نے سر ہلایا اور عیسیٰ آگے بڑھا دی۔ عام سی گلیوں اور سڑکوں پر وہ بہت تیز ڈرائیور کر رہا تھا اور یہاں لوگ اس کے عادی تھے کیونکہ کسی نے اسے گالی نہیں دی اور نہ لعنت دکھائی جیسا کہ ہمارے ہاں کا رواج ہے۔ شہر دو دریاؤں کے عظیم پر آباد ہے اور اس کا بڑا حصہ جزیرہ نما جگہ پر ہے جس کے تقریباً چاروں طرف پانی بہتا ہے۔ ہم اسی جزیرہ نما حصے میں اترے تھے اور اسی میں کھنک جا رہے تھے۔ مشکل سے پانچ منٹ بعد عیسیٰ ایک بڑے سے مکان کے سامنے رکی۔ یہ جدید طرز کا اور ماربل سے ڈھکا ہوا مکان تھا۔ یقیناً کسی دولت مند کا تھا۔ فولادی گیٹ پر نہ صرف دو عدد سگ کارڈز تھے بلکہ مکان کی چھت پر باقاعدہ سوراخ چھتا کر اس میں ایل ایم جی نصب کی گئی تھی۔ ہم نیچے اترے تو ایک گاڑی آگے آیا۔

”ادھر کیوں آیا ہے؟“

”رنی شاہ سے کہو زینبی آئی ہے۔“ زینبی نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔ گاڑی کچھ دیر اسے نظروں سے ٹوٹا رہا پھر مزکر گیٹ تک گیا اس نے آگے پیغام پہنچایا اور اس نے آگے کسی سے کہا کیونکہ پیغام خاصی دیر میں پہنچا اور نتیجے میں رنی شاہ خود آ گیا۔ اس نے والہانہ انداز میں زینبی سے ہاتھ ملایا۔

”تم ادھر کب آیا مجھے بتایا ہوتا میں گاڑی بھیجتا۔“

”میرے پاس گاڑی اور آدمی تھے۔“ زینبی نے اندر جانے کو کہا۔ ”لیکن سب راستے میں رہ گئے۔“

”کیا ہوا؟“

”میرا خیال ہے گہرام کے آدمی تھے۔ انہوں نے



رہی شاہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”وہ انڈیا والا۔“  
 ”پاکستانی۔“ زہنی نے سمجھ کی۔ ”ہاں وہی جس نے  
 انڈیا میں جا ہی پھیلائی تھی۔“  
 رہی شاہ کی آنکھوں میں بدستور شک تھا بس شک کی  
 نوعیت بدل گئی تھی۔ ”دیکھنے میں تو یہ عام سا آدمی لگ رہا  
 ہے۔“

”انسان کا کام ہی دھوکا دینا ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ہم  
 اندر آئے۔ مکان باہر سے جتنا شاندار تھا اندر سے اس سے  
 کہیں زیادہ شاندار تھا۔ ہر چیز غیر ملکی اور اعلیٰ درجے کی  
 تھی۔ یہاں بجلی تھی اس لیے پورا کمر جگمگ کر رہا تھا۔  
 زہنی نے اندر آتے ہی بے تکلفی سے کہا۔ ”اپنے باورچی  
 سے کہو جلد از جلد کھانا بنا دے اور کچھ پیٹے کو دو۔“

رہی شاہ نے دونوں چیزوں کا کہا۔ یہ جاننے کے بعد  
 کہ میں شہباز ملک ہوں اس کا رویہ کسی قدر بدل گیا تھا۔  
 میں اگر اپنی درست کیفیت میں ہوتا تو لازمی حیران ہوتا کہ  
 میری شہرت سرحد پار تک موجود تھی۔ ایک ملازم ام الغبانٹ  
 کی بوتل اور بطوریں جام ایک شیشے کی ٹرے میں رکھ کر لے  
 آیا اور اس نے سلیقے سے جام بنا کر سب کے سامنے رکھے۔  
 میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نہیں پیتا ہوں۔“

رہی شاہ کی رنگ خباثت پھڑکی اور اس نے زہنی سے  
 کہا۔ ”تم تو کہہ رہی تھیں یہ تمہارے قابو میں ہے۔“  
 ”ہاں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ اپنا ماضی  
 بھول گیا۔“

”لیکن ہے تو تمہارے حکم کا غلام اسے کہو کہ شراب  
 پیے۔“

”کیا ضرورت ہے جب کہ یہ نہیں پیتا۔“ زہنی نے  
 بے پروائی سے کہا اور ایک ہی سانس میں اپنا جام خالی کر  
 دیا۔ وہ بلا نوش لگ رہی تھی۔ ”ورنہ یہ حاسی حیرت شراب تھی۔“  
 ”تمہیں پتا تو چلے کہ یہ کچھ تمہارے قابو میں ہے یا  
 نہیں۔“

اس کی بات پر زہنی نے پہلے اسے گھورا اور پھر مجھے  
 دیکھنے لگی۔ رہی شاہ نے کسی شیطان کی طرح اس کے دل  
 میں وہم ڈال دیا تھا۔ میں سن کیفیت کے باوجود اندر سے  
 بیچ سا محسوس کرنے لگا۔ مجھے خوف آ رہا تھا کہ اگر زہنی  
 نے مجھے شراب پینے کا حکم دیا تو میں کیسے مزاحمت کروں گا  
 جب کہ مجھ میں کا حکم ماننا آیا تھا اور میں نے ایک بار بھی  
 مزاحمت محسوس نہیں کی تھی۔ مگر پہلی بار میں محسوس کر رہا تھا کہ  
 مجھے اس کا حکم نہیں ماننا چاہیے۔ زہنی کچھ دیر بعد

اسمار میں ہم پر حملہ کیا۔“  
 رہی شاہ متحیر ہو گیا۔ ”گہرام خان۔۔۔۔۔ ان دنوں وہ  
 بہت اونچا اڑ رہا ہے۔“  
 ”جو جتنا اونچا اڑتا ہے اتنی ہی ہندی سے نیچے گرتا  
 ہے۔“ زہنی نے جواب دیا۔ رہی شاہ پہلی بار میری طرف  
 متوجہ ہوا اور اس نے حاسدانہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ کون ہے؟“  
 ”ایک قیدی ہے۔“ زہنی بولی۔  
 ”خدا۔“ رہی شاہ نے کسی کو آواز دی۔ ”اسے نیچے  
 لے جا کر بند کر دو۔“

”یہ میرے ساتھ رہے گا۔“ زہنی بولی۔ ”میں اسے  
 ایک لمحے کے لیے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کر سکتی۔“  
 ”کیوں؟“ رہی شاہ کے انداز میں شک آ گیا۔ وہ  
 خشن فحشی واژمی اور بھاری جسامت والا پستہ قد شخص تھا اس  
 میں سوائے دولت مندی کے اور کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ  
 کوئی عورت اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا  
 کہ وہ زہنی کا نیاز مند تھا اور شاید اس کی دنواڑ قریب سے بھی  
 لطف اندوز ہو چکا تھا۔ اس لیے مجھ سے بلاوجہ خار کھا رہا تھا۔  
 زہنی کی بات پر اس نے نہایت کینہ تو نظر دوں سے مجھے  
 دیکھا۔

”یہ کیسا قیدی ہے جسے تم ساتھ رکھنا چاہ رہی ہو۔“  
 ”کیونکہ یہ میرا قیدی ہے۔“ زہنی نے ایک ادا سے  
 اپنے سینے پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”اگر میں اسے آزاد چھوڑ دوں  
 تب بھی یہ کہیں نہیں جائے گا۔“

”مجھ سے شاعری میں بات مت کرو۔“ رہی شاہ نے  
 لہجہ بدل کر کہا۔ ”تم جانتی ہو میں صرف ایک زبان جانتا  
 ہوں۔“

زہنی نے گہری سانس لی اور اپنے بیک سے انجکشن  
 نکال کر اسے دکھایا۔ ”امید ہے اب تم کچھ گکے ہو گے، ورنہ  
 یہ اتنا خطرناک آدمی ہے کہ تمہارے یہ آدمی اس کے سامنے  
 کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔“

”ایسا کون سا سورا پید ہو گیا ہے۔“ اس نے  
 حقارت سے کہا۔ واضح رہے کہ یہ ساری گفتگو افغانی پشتو میں  
 ہو رہی تھی۔ یہ کسی حد تک پاکستانی پشتو سے مختلف ہے لیکن  
 اسی طرح جیسے جنوبی پنجاب کی بولی پونہو ہار کی پنجابی سے  
 الگ ہے۔ میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ زہنی بہت روانی سے  
 بول رہی تھی۔ زہنی نے آگے جھک کر کہا۔

”شہباز ملک کا نام سنا ہے۔“



بولی۔ ”شہباز بچو۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم جانتی ہو میں نہیں چتا۔“  
رہی شاہ نے قہقہہ مارا۔ ”یہ تمہارا حکم ماننے سے انکار کر رہا ہے۔“

زینبی اب تشویش زدہ نظر آنے لگی تھی۔ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم میرا حکم ماننے سے انکار کر رہے ہو؟“

”تم جو کہتی ہو میں کرتا ہوں۔“ میں نے دفاعی انداز میں جواب دیا۔ ”لیکن شراب نہیں پی سکتا۔“

وہ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی پھر اس نے کہا۔ ”شہباز ملک یہ جام بچو۔ یہ میرا حکم ہے۔“

میری مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ بلکہ مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے اتنی مزاحمت بھی کیسے کی۔ میں تو کسی کٹھ پتلی کی طرح اس کے اشاروں پر عمل کر رہا تھا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے جام اٹھا لیا۔ مگر میں اسے منہ کی طرف نہیں لا پا رہا تھا۔ میرے اندر سے کوئی منع کر رہا تھا کہ میں اس حرام شے کو منہ نہ لگاؤں۔ اسے حلق سے نہ اتاروں۔ رہی شاہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میری ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہوئے زینبی نے پھر زور دے کر کہا۔ ”شہباز اسے پی لو۔“

میں بے ساختہ جام منہ کے پاس لے کر آیا اور اس سے اٹھتی کراہیت آمیز بوسے میرا دل مٹلایا اور میں نے بے ساختہ ہی ہنسنے لگا۔ ایک کالی لی اور الٹی کی پھوار میرے منہ سے نکل کر رہی شاہ تک پہنچی تھی۔ اس کی شلوار اور میض کا دامن داغ دار ہوا اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے منہ سے گالی اور زینبی کے منہ سے قہقہہ نکلا تھا۔ ایک کالی کے لیے جھکا تو جام تالین پر گر گیا تھا۔ رہی شاہ نے پاؤں صاف کر اپنے خادم کو پکارا اور خود وہاں سے چلا گیا۔ خادم آیا اور اس نے صورت حال کا اندازہ کر کے میری باتھ روم تک رہنمائی کی اور میں نے کالی کے منہ دھو یا۔ میرے لباس پر جہاں جہاں دھبے آئے تھے۔ ان کو صاف کیا۔ واپس آیا تو خادم نشست گاہ کو صاف کر چکا تھا۔ زینبی سکون سے بے نواہی میں مصروف تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ تر بہت چالاک ہو، تم نے جان بوجھ کر تے کی ہے۔“

”کوئی اس طرح جان بوجھ کر تے کر سکتا ہے؟“  
اس نے شانے اچکائے۔ ”کر بھی سکتا ہے۔“

میرا تو خیال تھا کہ اللہ نے مجھے اس حرام شے سے بچا لیا تھا۔ مگر ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ میری سن کرنے والی کیفیت ختم ہو رہی تھی۔ اب میں سوچ رہا تھا اور مجھے زینبی

اور رہی شاہ برعکس آ رہا تھا جنہوں نے میرے ساتھ ایسی حرکت کرنے کی کوشش کی۔ شاید تے کرنے سے دوا کا اثر قبل از وقت زائل ہو رہا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ ایسے انجکشن کا اثر بارہ گھنٹے رہتا تھا اور اس کے بعد دوسرا انجکشن دینا پڑتا تھا۔ زینبی نے مجھے دس بجے کے قریب انجکشن دیا تھا۔ لازمی بات ہے رات کا انجکشن بارہ گھنٹے پہلے دیا گیا ہوگا۔ میں تو بجے سے بھی پہلے سو گیا تھا بلکہ دوا کے اثر سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس وقت نو بج رہے تھے اور زینبی ایک گھنٹے بعد مجھے انجکشن دیتی۔ صبح میں دس بجے بھی سن والی کیفیت میں تھا اور زینبی کے احکامات کی پوری طرح تعمیل کر رہا تھا۔ مگر اب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کسی صورت انجکشن نہیں لینا چاہیے۔ ورنہ میں اس عورت کا غلام بن رہوں گا۔ واپس آ کر میں سعادت مندی سے کھڑا ہو گیا اور اس وقت تک کھڑا رہا جب تک زینبی نے نہیں کہا۔

”کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔“

میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”مجھے پانی چاہیے۔“  
زینبی کے اشارے پر خادم پانی لے آیا۔ چند منٹ بعد رہی شاہ آیا اور اس نے کیڑے تو نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کیا تم اسے پھر شراب پینے کا حکم نہیں دو گی۔“  
”میں حکم دوں گی اور یہ مانے گا۔“ زینبی نے بے پروائی سے کہا۔ ”لیکن کیا فائدہ تمہارا لباس اور خوب صورت ڈرائنگ روم پھر سے گندہ نہ ہو جائے۔“  
”اس کی فکر مت۔۔۔۔۔۔“

”پلیز۔“ زینبی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”میں یہاں صرف کھانے پینے نہیں آئی ہوں۔“  
رہی شاہ چونکا۔ ”کیا مطلب؟“  
”مجھے بہر صورت کامل پہننا ہے۔“

رہی شاہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”موجودہ حالات میں یہ آسان کام نہیں ہے تم جانتی ہو یہاں سے جلال آباد تک گھبراہٹ خانہ کے آدمیوں کی چیک پوسٹیں ہیں۔ ان سے گزرے بغیر کوئی کامل نہیں جاسکتا ہے۔“

”یہ کام تم ممکن بناؤ گے۔“ زینبی بولی۔ ”یہ بتاؤ یہاں آس پاس کوئی ائر فیلڈ ہے جہاں چھوٹا طیارہ اتر سکے۔“  
رہی شاہ نے اپنی شخصتی داڑھی سہلاتے اور سوچتے ہوئے کہا۔ ”روسیوں کے زمانے کی ایک ائر فیلڈ ہے مگر وہ استعمال نہیں ہوتی ہے۔“

”کامل استعمال ہے؟“

”ہاں کامل استعمال ہے۔“



”جب کام چل سکتا ہے۔ مجھے اور اسے لینے کا بل سے طیارہ آجائے گا۔“  
 رنی شاہ کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی تھی۔ ”لگتا ہے آج کل تم بھی بہت اونچا اڑ رہی ہو۔“  
 ”میں اپنی بلندی پر ہوں۔“ اس نے کہا اور میری طرف اشارہ کیا۔ ”سب اس کے لیے ہو رہا ہے۔ یہ اصل آدمی ہے۔“

”طیارہ کیسے منگواؤ گی؟“  
 ”کال کر کے۔“ زینی نے کہا۔ ”مجھے لوکیشن بتاؤ۔“  
 ”یہاں سے دور ہے نقشے پر بتا سکتا ہوں۔“ رنی شاہ نے کہا تو زینی نے نقشہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔  
 ”اس میں بتاؤ۔“

رنی شاہ نے اسدا آباد کے جنوب مشرق میں ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”یہاں ہے مگر یہ بہت چھوٹا ہے۔ روسیوں نے اسے چھوٹے طیاروں اور ہیلی کاپٹر کی ری فوٹنگ کے لیے بنایا تھا۔“

”رات کے وقت لینڈنگ ہو سکتی ہے؟“  
 ”میں معلوم کرتا ہوں۔“ رنی شاہ نے کہا۔ ”اس زمانے میں یہاں کا ایک سابق ایوی ایشن مین میرا جانتے والا ہے۔“

”تم معلوم کرو۔“ زینی بولی اور پھر اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ”یقین کرو تم خسارے میں نہیں رہو گے۔“  
 رنی شاہ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”کیسے تم تو چلی جاؤ گی۔“

”نوراً تو نہیں جا رہی ابھی چند گھنٹے یہاں رکوں گی۔“ زینی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ ”کیا چند گھنٹے کافی نہیں ہیں؟“  
 ”تمہارے ساتھ کے لیے تو چند دن اور بیٹھ بھی سکتے ہیں۔“

”میں واپس بھی آؤں گی۔“ زینی نے اسے یقین دلایا تو وہ اندر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی زینی نے زیر لب ایک ایسی گالی دی کہ میرے کان گرم ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے بیک سے ایک چھوٹا سا موبائل نکال کر آن کیا اور کسی کو کال کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ ”مجھے رات دو بجے اس لوکیشن پر چھوٹا طیارہ چاہیے۔۔۔۔۔ ہاں لوکیشن نوٹ کرو۔“  
 اس نے مخصوص اصطلاحات کے ساتھ لوکیشن نوٹ کرائی۔ یہ ہوا بازی کی زبان تھی۔ اس نے موبائل آف کر کے واپس بیک میں رکھ لیا۔ اس وقت خادم وہاں نہیں

تھا۔ یہ کام کر کے زینی نے بیک سے میڈیکل بیک نکالا اور اس میں سے انجکشن برآمد کیا تو میں سمجھ گیا کہ اگلے انجکشن کا وقت آ گیا ہے حالانکہ ابھی دس بجتے میں آدھا گھنٹا تھا مگر ہوشیار زینی نے قبل از وقت مجھے انجکشن لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اٹھ کر میرے پاس آئی اور سرخ پرائیگی مارتے ہوئے بولی۔ ”بازو سامنے کرو۔“

میں نے بازو سامنے کیا اور جیسے ہی اس نے انجکشن کے لیے ہاتھ آگے کیا میں نے اس کا انجکشن والا ہاتھ پکڑ کر اسے گھمایا اور وہ بل کھا کر بہت آسانی سے میرے بازوؤں کے پچھلے میں آ گئی۔ اس کا ہاتھ میں نے پکڑا ہوا تھا اور انجکشن کی سوئی اب اس کی گردن کو چھو رہی تھی۔ میرا دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر جما ہوا تھا اور اس کے پچھلے جسم کو میں نے ایک پاؤں سے قابو کیا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ ”ہماری زبان میں ایک محاورہ ہے آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔ اس کے علاوہ بھی بی شمار محاورے ہیں مگر فی الحال یہ بھی کافی ہے۔“

میں نے کہتے ہوئے انجکشن کی سوئی اس کی گردن میں داخل کر دی۔ وہ تڑپا لگی لیکن مجھے ہنسنا دبانے سے نہیں روک سکی تھی۔ دوا اس کی گردن میں اتر گئی۔ گردن میں کوشت میں گتے والا انجکشن بھی تقریباً زرد کے انجکشن کی طرح ری ایکٹ کرتا ہے۔ انجکشن گتے کے بعد بھی وہ مزاحمت کرتی رہی اور اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح اس پاس موجود افراد کو متوجہ کر لے مگر اس کی بد قسمتی اور میری خوش قسمتی کہ اس دوران میں کوئی نہیں آیا تھا۔ جب اس نے مزاحمت ترک کی تو میں نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ اس کے باوجود میں پوری طرح ہوشیار تھا اور ایک سیکنڈ کے نوٹس پر اسے دوبارہ دیو بچ سکتا تھا۔ مگر اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کی آنکھوں میں سپاٹ بن آ گیا تھا اور وہ یوں چلکیں جھپک رہی تھی جیسے الکو تیز روشنی میں بٹھا دیا جائے۔

میں نے میڈیکل بیک واپس زینی کے بیک میں رکھا۔ اس میں سے ہسپتال نکال کر اپنی ٹیبلٹ کے نیچے پتلون میں اڑسا اور واپس اپنی جگہ آ گیا۔ اب یہ ظاہر سب پہلے جیسا تھا مگر رنی شاہ اینڈ کمپنی کو قطعی خبر نہیں تھی کہ بازی پلٹ گئی تھی اب جو صیاد تھا وہ قیدی بن گیا تھا اور جو پہ ظاہر قیدی ہے وہ صیاد بن چکا تھا۔

”تم بالکل باطل رہو گی اور ابھی جو کچھ ہوا ہے اس کے بارے میں کسی سے نہیں کہو گی۔“ زینی نے کہا اور اسی



مجھے رنی شاہ وہاں آگیا۔ اس نے آتے ہی سرور لہجے میں کہا۔

”کام ہو گیا ہے۔ میرے آدمی زمین کل کا کھانا ہے کہ دن دے اس قافلے ہے کہ اس پر طیارہ اتر سکے اور وہاں روسیوں نے زیر زمین سیٹ اپ لگا یا تھا وہ بھی موجود ہے۔ اگر وہاں موجود کھجلی کا نظام کام کر رہا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے دن دے لائٹس آن کرنے کے لیے جزیئر لے جانا پڑے گا۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ وہ جزیئر کا بندوبست کرے۔ کیونکہ میں پچیس سال سے بند پڑا سسٹم کہاں کام کرے گا؟ ویسے تمہیں کب جانا ہے؟“ سوال کرتے ہوئے رنی شاہ کی آنکھیں گدھ نما ہو گئی تھیں جیسے اسے گوشت نظر آگیا ہو۔

”رات دو بجے۔“ زینی نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ نارمل تھا۔

”کافی وقت ہے۔“ رنی شاہ کی بائیں کھلم کھلیں۔ ”یہاں سے مشکل سے آدھے گھنٹے کا فاصلہ ہے۔“

”دو بجے طیارہ وہاں کبھی جائے گا۔“

”کوئی بات نہیں وہ کچھ دیر انتظار کر لے گا۔ ویسے زمین کل وہاں پہنچ جائے گا۔ انتظام تو اسے ہی کرنا ہے۔ آؤ کھانا لگ گیا ہے۔“

شاندار ڈائننگ روم میں بڑی میز پر کھانا لگا یا جا چکا تھا اور نہایت پر تکلف تھا۔ اس میں افغانی پلاؤ تھا۔ کمرے کی بھیجی جو ظاہر ہے کہ ہماری آمد سے پہلے بن رہی تھی اور کباب تھے۔ یہ خاص ڈشیں تھیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ چل چل کر معدے کی چکی بھی تیز ہو گئی تھی اور مجھے کئی دن سے ڈھنگ کا کھانا نصیب نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے تکلف کو بالائے طاقت رکھ کر کھایا۔ البتہ سیر ہوتے ہی ہاتھ روک لیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ معدے کی گرائی مجھے ست کر دے اور کی میز پر بازی میرے ہاتھ سے نکل جائے۔ کھانے کے بعد میٹھا اور نہایت میٹھا تھا اس لیے میں نے صرف چکھا البتہ خاص ہلکا ہوا ہے کی کئی پیالیاں خالی کر گیا تھا۔ رنی شاہ نے کسی رغبت سے کھایا تھا۔ وہ کھانے کی میز پر بھی بہت انگور سے دور ہوئے کیونکہ انہیں تھا اور یقیناً زینی کے لیے بے تاب تھا کہ وہ کب اپنا وعدہ وفا کرتی ہے۔

اگرچہ زینی کوئی پاکیزہ عورت نہیں تھی اور نہ ہی اسے اپنی عزت کی پروا تھی وہ اسے سکے رائج الوقت سمجھنے والی عورتوں میں سے تھی اس لیے اگر وہ رنی شاہ کے بیڈ روم سے

ہو آتی جب بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر میرے ضمیر کو گوارہ نہیں تھا کہ ایک عورت جو اصل میں اب میرے قبضے میں تھی میں اسے اپنی آزادی کے لیے یوں استعمال کروں۔ رنی شاہ بے خبر تھا کہ اصل بازی میرے ہاتھ میں ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اگر وہ زینی سے چلے کو کہتا تو وہ تیار ہو جاتی کیونکہ میں نے ہی اسے حالات کو نارمل ظاہر کرنے کا حکم دیا تھا۔ اگر میں رکاوٹ بننا تو راز فاش ہو جاتا کہ اب میں زینی کا معمول نہیں ہوں اور پھر مجھے رنی شاہ سمیت اس کے بہت سارے سبک کرکوں سے نمٹنا پڑتا جو بالکل بھی آسان کام نہیں تھا۔ جب میں نے زینی کو قافو کیا تو مجھے خود کو اس کام پر آمادہ کرنا پڑا تھا کیونکہ دوا کا کچھ اثر باقی تھا۔ البتہ کھانے کے بعد میں خود کو بالکل نارمل محسوس کرنے لگا تھا۔ خاص طور سے سیاہ رخ قبوے نے دوا کا رہا سہا اثر بھی ختم کر دیا تھا۔ اب میں چاک و چوبند تھا۔ گیارہ بجے تک طعام ختم ہو چکا تھا اور رنی شاہ نشے میں خاصا دھت ہو گیا تھا۔ اس نے زینی سے کہا۔

”اب مجھے اور مست تر پاؤ۔“

وہ کرسی کھسکا کر کھڑا ہوا تو میں بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”تم یہیں رکو گے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”زینی نے کہا ہے میں ہر وقت اس کے ساتھ رہوں۔“

”ہاں میں نے اس سے یہی کہا ہے۔“ وہ فرما کر داری سے بولی مگر رنی شاہ نہیں سمجھ سکا تھا اس نے پاؤں میچ کر کہا۔

”تو کیا اسے میرے بیڈ روم میں بھی لے جاؤ گی۔“

”نہیں جناب میں باہر رکوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تا زینی؟“

یہ ظاہر یہ سوال تھا مگر درحقیقت حکم تھا اور زینی اس سے سر تابی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے فوراً کہا۔ ”ہاں یہ باہر رک جائے گا۔“

رنی شاہ کا بس چلتا تو وہ مجھے اپنے محل نما گھر سے باہر پھنکوا دیتا۔ مگر وہ زینی کی وجہ سے مجبور تھا اور اس نے سوچا کہ کہیں وہ پورے کے پھر میں آدھی سے بھی نہ جائے۔ اس لیے بادل نا خواست مان گیا۔ ”ٹھیک ہے یہ باہر ہے گا۔“

وہ ہمیں لے کر اپنے خاص حصے میں آیا۔ اس کا اندازہ یوں ہوا کہ وہاں صرف عورتیں اور لڑکیاں تھیں اور وہ نہایت کھلے ڈالے چلیے میں تھیں۔ ظاہر ہے یہ اس کا حرم تھا مگر وہاں رنی شاہ کا حرم نہیں تھا ورنہ وہ انہیں اس چلیے



میں کسی انجی کے سامنے آنے کی اجازت کیسے دیتا۔ یہ آج کے جدید دور میں انسانی غلامی کی بدترین صورت تھی۔ وہ مجبور عورتیں تھیں جو اس طاقتور اور دولت مند شخص کے قبضے میں تھیں۔ ان کی صورتوں پر خوف اور بے بسی بتا رہی تھی کہ وہ اپنی خوشی سے یہاں نہیں نکلیں۔ زہنی کا بیک اسی کے پاس تھا اور میں نے یوں نہیں لیا کہ کہیں رنی شاہ کو شک نہ ہو۔ اس گھر کے عام حصے میں صرف مرد ملازم تھے۔ مگر یہاں کوئی مرد ملازم نہیں آسکتا تھا۔ میں بھی زہنی کی وجہ سے آ گیا تھا۔ جیسے ہی رنی شاہ زہنی کو لے کر اندر گیا میں حرکت میں آ گیا۔ میں پستول نکال کر اس طرف آیا جہاں رنی شاہ کے حرم کی عورتیں موجود تھیں ان کی تعداد نصف درجن تھی۔ ان میں سے دو تو نہ ہونے کے برابر لباس میں تھیں اور باقی بھی ناکافی کپڑوں کے ساتھ تھیں۔ یہاں موسم کا اثر نہیں تھا مگر ان عورتوں کو اس حلیے میں رکھنا سوائے نفسانیت کے اور کچھ نہیں تھا۔ میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھیں۔ میں نے ان سے کہا۔

”شاہ جی نے حکم دیا ہے کہ تم سب ایک کمرے میں چلی جاؤ یہاں خطرہ ہے۔ کمر اندر سے بند کر لیں۔ جب تک شاہ جی خود آواز نہ دیں باہر مت آنا۔“

وہ بے چاری عجم کی غلام تھیں۔ خطرے کا سن کر سب ہی افراتفری میں ایک کمرے میں جا کھیں اور کمر اندر سے بند کر لیا۔ میں نے اطمینان کیا کہ اب وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ پھر میں نے اس حصے میں آنے والا واحد دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں واپس رنی شاہ کے بیڈروم تک آیا تو اندر مجھے عجیب سی آواز آئی ایسا لگا جیسے کوئی خرخرار رہا ہو۔ یہ خراٹے لینے کی آواز بھی نہیں تھی۔ میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ اندر سے لاک لکلا۔ میں نے کھلی سی دستک دی۔ مجھے اُمید تھی کہ رنی شاہ جھنجھلائے مگر دروازہ کھل دے گا اور اس کے بعد وہ میرے قابو میں ہوگا۔ جب دروازہ کھلا اور کوئی آواز بھی نہ آئی تو میں نے پھر دستک دی۔ اب خرخراہٹ کی آواز بھی رک گئی تھی۔ ایک منٹ بعد میں یہ خرخراہٹ دہکنے دہکنے جا رہا تھا کہ دروازہ جھککے سے کھلا اور زہنی میرے سامنے اس ہیبت کدائی میں کھڑی تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک خون آلود چھری تھی اور اس کی شرٹ سامنے سے نہ صرف کھلی بلکہ خون میں لگی ہوئی تھی۔

”واؤ۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”یہ کیا؟“ اس نے کچھ بولے بغیر چھری سے اندر اشارہ کیا اور پیچھے ہٹ گئی۔ چھری معمولی سی تھی اور پھل کاٹنے کے لیے

استعمال کی جاتی تھی مگر زہنی نے اس کا استعمال رنی شاہ کی گردن پر کیا تھا۔ وہ بستر پر صرف شلوار میں یوں پڑا تھا کہ اس کے پاؤں نیچے تھے اور دونوں ہاتھ گردن پر پٹے ہوئے تھے مگر وہ اس خون کور وکنے میں ناکام رہا تھا جو چھری کے وار کے بعد کٹ جانے والی شرٹ کے بہہ رہا تھا۔ زیادہ خون بہنے کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ میں نے قریب سے اس کا معائنہ کیا اور پھر زہنی سے پوچھا۔ ”تم نے اسے کیوں قتل کیا؟“

”میں اس کام کے لیے بھی آئی تھی۔“ وہ سپاٹ لکچ میں بولی۔ ”یہ ان درندوں میں سے ہے جنہوں نے میری آبرو لوٹی تھی۔“

میں نے سوال کرنے سے گریز کیا کہ اس کے پاس اس نام کی کوئی چیز بھی تھی؟ یہ ذاتیات میں آ جاتا اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس کی بجائے میں نے کہا۔ ”اپنی شرٹ بند کرو اور جا کر یہ خون صاف کرو۔ ابھی ہمیں یہاں سے نکلتا بھی ہے۔“

وہ فرمانبرداری سے بیڈروم کے ساتھ موجود ہاتھ روم میں چلی گئی۔ بستر خون سے تر ہو رہا تھا۔ رنی شاہ کے پٹے پٹائے جسم میں خاصا خون تھا۔ میں نے اسے ہاتھ لگائے بغیر بستر کے دونوں طرف موجود سائیڈ وراژوں کی تلاشی لی۔ مجھے کسی ہتھیار کی تلاش تھی۔ اگر چہ زہنی والے بیک میں ایک رائفل بھی تھی مگر ہمیں زیادہ ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ ہمیں یہاں سے نکلتا تھا۔ رنی شاہ کے مرنے کے بعد صورت حال خراب ہو گئی تھی۔ اگر اس کے آدمیوں کو پتا چل جاتا تھا کہ وہ مارا گیا ہے اور زہنی نے مارا ہے تو یہاں سے بچ سلامت نکلتا محال ہو جاتا۔ اسلحہ مجھے ایک الماری میں ملا۔ اس کے ایک خانے میں جدید ترین ایم سولہ رائفلس اور ان کا بے شمار ایمنونیشن بھرا ہوا تھا۔ چند عدد گرنیڈز اور کچھ اسموک گرنیڈز بھی تھے۔ میں نے دو عدد رائفلس دسٹے الگ کر کے بیک میں رکھ لیں۔ ان کے اضافی میگزین، چند گرنیڈز اور اسموک گرنیڈز بھی بیک میں ڈال لیے تھے۔ زہنی ابھی تک ہاتھ روم سے نہیں نکلی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو اس نے اندر سے کہا۔

میرا خیال تھا کہ وہ شاک میں ہوگی اور شاید اب تک خود کو صاف کر چکی ہو مگر وہ تو حیرے سے جھاگ سے بھرے ٹب میں بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو گرم پانی کے حیرے اٹھا رہی تھی۔ اس نے نکلی نظر میں سے مجھے دیکھا۔ ”آؤ تم بھی



یہ بہت مرہ رہا ہے۔“

”وہ خراب ہو گیا ہے میں نہیں پہن سکتی۔“

”تب کیا پہنوں گی؟“

”یہاں کپڑے ہوتے ہیں۔“ اس نے معنی خیز انداز

میں کہا۔ ”تم نے دیکھا نہیں کتنی عورتیں ہیں یہاں۔“

”تب جلدی کرو ہمیں یہاں سے نکلتا ہے۔“ میں

نے بے تابی سے کہا۔ وہ باہر چلی گئی۔ دس منٹ بعد واپس

آئی تو اس کا منہ بنا ہوا تھا اس نے مقامی طرز کا شلوار سوٹ

پہنا ہوا تھا جو اس کے لحاظ سے بہت زیادہ تھا اسنے کپڑے

میں تو اس کے تین چار سوٹ آرام سے بن سکتے تھے۔ اس

نے بھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

”جی کپڑے ہیں یہاں۔“

میں نے ٹہنی میں سر ہلایا۔ ”اس لباس کے ساتھ

بھاگ دوڑ مسئلہ ہو جائے گی۔ ایسا کرو تم اپنی جینز اور اوپر

جیکٹ پہن لو شرٹ چھوڑ دو۔“

”یہ لھیک رہے گا۔“ اس نے خوش ہو کر کہا اور ہاتھ

روم چلی گئی۔ واپس آکر اس نے اپنے کیلے بالوں کی ہی

کنکھی کر کے ان کو پونی ٹیل کی صورت دے دی۔ بال

خشک کرنے کی کوئی تدبیر نہیں تھی۔ موسم بیڑ والا نہیں

تھا۔ ورنہ اس سے کام چلایا جاتا۔ دوا کے زیر اثر ہونے کے

باوجود اس کی فطرت نہیں بدلی تھی اس نے جان بوجھ کر

جیکٹ کی زپ خاصی نیچے کی ہوئی تھی اور اس کا گھاپی بدن

جھلک رہا تھا۔ میں نے زپ اوپر کرنے کو کہا۔ وہ بولی۔

”اس کی کیا ضرورت ہے؟“

”اس سے پتا چل رہا ہے کہ تم نے اندر شرٹ نہیں

پہنی ہے۔“ میں نے سمجھایا تو اس نے بادل نا خواستہ زپ

اوپر کر لی۔ میں نے بلیٹس کے بارے میں پوچھا۔

”پتا نہیں مجھے یہ سئل دیا گیا تھا یہ نہیں بتایا تھا کہ اس

میں بلیٹس کتنا ہے۔“

میں نے سوچا کہ ایک بار یہاں سے نکل جائیں پھر

میں موبائل استعمال کر سکوں گا۔ ایک بجے ہم باہر

نکلے۔ میں نے زینی والی رائفل اپنے شانے پر ٹانگ لی

تھی۔ رنی شاہ کے بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بند دبا کر

لاک کر دیا اب یہ صرف چابی سے کھل سکتا تھا۔ یہی سلوک ہم

نے باہر والے دروازے کے ساتھ کیا اور باہر آئے تو ایک

فلام موجود تھا۔ زینی نے اس سے کہا۔

”بیس گاڑی چاہیے۔“

”کھڑی۔“ اس نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ

کہا۔ ”پروہ جو بتائی کے کہنے پر مل سکتی ہے۔“

میں پہننے ہی لاجمل پڑھ چکا تھا۔ اس لیے اسے صرف

انتہا کہا۔ ”ابھی رنی شاہ کے آدمیوں کو علم ہو جائے گا کہ وہ

جنم رسید ہو چکا ہے تب زیادہ مزہ آئے گا۔ بہتر ہوگا تم غسل

صحّت سے جلد فارغ ہو جاؤ ہمیں ابھی یہاں سے نکلتا اور اتر

فیلڈ تک بھی جانا ہے۔“

کیونکہ میرا علم تھا اس لیے وہ سنجیدہ ہو گئی اس نے سر

ہلایا۔ ”میں بس ابھی آئی۔“

وقت بارہ بجے سے اوپر ہو چکا تھا۔ زینی نے دو بجے

کا وقت دیا تھا۔ مگر میرا ایئر فیلڈ تک جانے کا کوئی ارادہ نہیں

تھا۔ طیارے میں بھلا میں کہاں جاتا؟ دوسرے غیر ملکی فوج

اور اتر فورسز کے ہوتے ہوئے طیارے میں پرواز نہایت

خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ سرحد کے دونوں طرف میزائل

سسٹم تھے جو طیارے کو آسانی سے گرا سکتے تھے۔ اس لیے

میرا ارادہ اسی راستے سے واپسی کا تھا جہاں سے زینی مجھے

لے کر آئی تھی۔ لیکن حفظہ اللہ ہم کے طور پر طیارے کا آپشن

بھی برقرار رکھنا تھا۔ میں زینی کے ان دشمنوں کو نہیں بھولا

تھا جو اسار سے ہمارے پیچھے لگے تھے اور رنی شاہ کا کہنا تھا

کہ گہرام نامی اس دشمن سردار کی کاٹلنگ چیک پوسٹیں

تھیں۔ میں نے واپس آکر رنی شاہ کا موبائل تلاش کیا جو

اس کی قمیض کی جیب میں مل گیا۔ میں نے اس کی ڈائل

ہسٹری میں جا کر دیکھا تو دس بجے سے ذرا پہلے ایک ہی کال

کی تھی۔ میں نے وہ نمبر زینی کے موبائل میں نوٹ کر لیا۔

بستر کی ایک سائیز دراز میں دو عدد جدید موبائل اور بھی تھے

لیکن میں نے ان کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بعض

اوقات بلاوجہ کی پٹکے بازی انسان کے گلے پڑ جاتی ہے۔

اس کام کے لیے زینی کا موبائل کافی تھا۔ البتہ اس

سے بلیٹس کا پوچھ سکتا تھا کہ وہ اتنا ضرور ہو کہ یہ وقت

ضرورت کال کرنے سے مسئلہ نہ ہو۔ میں نے سوچا کہ اگر

بلیٹس کافی ہوا تو میں پاکستان کال کے اپنی خیریت کی

اطلاع دے دوں گا۔ اسلئے کے ساتھ واسے خانے میں ایک

لاکر نصب تھا اور اس کا جالہ نمبروں سے کھلتا تھا۔ یقیناً اس

میں مال و دولت تھی۔ مگر رنی شاہ کے برس اور سا بچہ دروازے

سے خاصی مل گئی تھی۔ یہ ڈالرز تھے اور تقریباً دو ہزار کی

پتی تھی۔ وہ میں نے جیب میں رکھ لی۔ اب میں زینی کا

انتظار کر رہا تھا پندرہ منٹ بعد وہ یوں باہر آئی کہ اس نے

اوپر صرف تولیہ باندھ رکھا تھا۔ جو یہ مشکل اس کی رانوں تک

آ رہا تھا۔ میں نے لباس کا پوچھا تو اس نے کہا۔



”میں اس کے بیڈروم سے آرہی ہوں۔“ زینبی نے  
واہیات انداز میں کہا۔ ”اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اس  
کی گاڑیوں میں سے جو چاہے لے جاؤں۔ کیا میں اسے  
اٹھاؤں کہ وہ تمہیں بھی کہہ دے؟“  
خادم ڈر گیا کہ کھل کر عیاشی کے بعد اس وقت رنی شاہ  
کھل آرام کے سوڈ میں ہوگا اور اس میں غلغلہ اندازی کے نہ  
جانے کیا نتائج نکلیں۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”شاہ جی نے  
آپ سے کہہ دیا تو ٹھیک ہے۔“

ہم باہر آئے جہاں پورچ میں کئی طرح کی گاڑیاں  
کھڑی ہوئی تھیں اور یہ سب اعلیٰ درجے کی گھڑی گاڑیاں  
تھیں۔ میں نے ایک چھوٹی فور ویکل ڈرائیو کی طرف اشارہ  
کیا۔ اس کا طاقتور انجن اسے ناممکن راستوں پر بھی بہت  
تیزی سے دوڑا سکتا تھا۔ ہمارے کام کے لیے یہ سوزوں  
تھی۔ میں نے سوچا کہ اس میں جتنی دور جاسکا جاؤں گا اور  
اس کے بعد باقی فاصلہ پیدل بھی طے کیا جاسکتا تھا۔ چابی  
انٹیشن میں لگی ہوئی تھی اور نینک فل تھا۔ میں نے ڈرائیونگ  
سیٹ سنبھالی اور زینبی میرے برابر میں آگئی۔ اس نے اسٹے  
والا بیگ عقبی نشست پر ڈال دیا تھا۔ میں نے رائفل بیروں  
کے پاس رکھ لی۔ خادم کے اشارے پر گاڑی نے گیٹ کھول  
دیا۔ میں نے گاڑی باہر نکالی تھی کہ اچانک ایک طرف سے  
دو تیز رفتار گاڑیاں نمودار ہوئیں اور تیزی سے اسی طرف  
آئے لگیں۔ میری چھٹی حس نے خیردار کیا اور میں نے گاڑی  
کارخ ان کے مخالف سمت میں سوڑ دیا۔ زینبی نے بھی خطرہ  
بھانپ لیا تھا اس نے مڑ کر دیکھا اور تشویش سے بولی۔

”یہ کون ہیں؟“

”پتا نہیں۔“ میں نے کہا تھا کہ عقب سے فائرنگ کا  
شور بلند ہوا۔ اگلی والی گاڑی نے فائرنگ کی مگنی تھی  
اور یہ کوئی بڑی اور بھاری گن تھی جس کی فائرنگ باور اور شور  
بے پناہ تھا۔ یہ گاڑی فائرنگ کے دوران میں ایک مگنی مکر  
دوسری اس کے پیچھے سے نکل کر ہمارے پیچھے آئے تھی۔  
”سیٹ بیلٹ باندھ لو۔“ میں نے کہا اور اپنی سیٹ  
بیلٹ باندھ لی تھی۔ زینبی نے بھی باندھ لی اور میں نے اسے  
رائفل اٹھا کر تھما دی۔ ”اسے سنبھال کر رکھنا۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے ایسی لیسر دیا اور تنگ  
گلیوں میں گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ مگر  
پیچھے آنے والی گاڑی بہت زیادہ رفتار سے آرہی تھی۔ پانچ  
منٹ سے پہلے ہم ہائی وے تک پہنچ گئے تھے۔ مگر اس پر آتے  
ہی بائیں طرف سے ایک گاڑی نمودار ہوئی اور ہماری طرف

آنے لگی تو میں نے اسٹیرنگ دائیں طرف کاٹا۔ مجھے دائیں  
طرف ہی جانا تھا مگر دشمن پیچھے آ رہا تھا پہلے اس سے چھٹکارا  
لازی تھا۔ زینبی کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ میرے  
قابو میں ہے لیکن پھر بھی میں نے اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا  
کہ ہم انٹر فیلڈ کی طرف نہیں جا رہے تھے۔ انٹر فیلڈ تک جانے  
کے لیے اوپر سے ہائی وے سے ایک لمبا دریاے کنہار پر نکلا  
تھا اور اس سے گھوم کر ہم انٹر فیلڈ کی طرف جاتے اس لیے اگر  
زینبی سمجھ رہی تھی کہ ہم اسی طرف جا رہے تھے تو وہ سمجھنے کے  
لیے آزاد تھی۔ مگر یہ دوا سب سے پہلے انسان کے سوچنے  
سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم کرتی ہے۔

دونوں گاڑیاں ہائی وے پر آگے پیچھے آچکی تھیں اور  
اب تنگ میں فاصلہ برقرار رکھنے میں کامیاب رہا تھا کیونکہ  
تنگ گلیوں میں بڑی گاڑی ایک حد سے زیادہ تیز نہیں دوڑ  
سکتی تھی۔ البتہ ہائی وے پر آتے ہی اس کے ڈرائیور کو اپنی  
گاڑی کی رفتار آزمانے کا موقع ملا تھا اور وہ اب نزدیک  
آ رہی تھی۔ پہلی گاڑی جس نے رنی شاہ کے مکان پر دھاوا  
بولا تھا اس پر بھاری مشین گن نصب تھی مگر اس گاڑی پر ایسی  
کوئی گن نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے باوجود اس میں موجود  
افراد کا مسلح ہونا یقینی تھا۔ میں نے زینبی سے کہا۔ ”تیار ہو  
جاؤ۔ سن روف سے نکل کر جواب دینے کے لیے۔“

”کس بات کا؟“ اس نے پوچھا۔  
اسی لمحے عقب سے پہلا برسٹ چلا مگر گولیاں گاڑی  
کے اوپر سے گزرتی تھیں۔ گاڑی کی دونوں کھڑکیوں سے دو  
افراد نمودار ہوئے تھے اور خود کار رائفلوں سے نشانہ بنانے کی  
کوشش کی تھی، میں نے کہا۔ ”اس کی بات، جلدی کرو وہ  
نزدیک آرہے ہیں۔“

زینبی نے اٹھ کر سن روف بٹایا اور سیٹ پر کھڑے  
ہو کر چھت پر رائفل نکالتے ہوئے جوابی برسٹ مارا اور عقبی  
گاڑی کی رفتار فوری کم ہو گئی اور وہ اب دور ہونے لگی تھی  
میں نے رفتار میں مزید اضافہ کیا اور اب اسپید میٹر کی سوئی  
ایک سو بیس کلو میٹر پر تھی۔ ہائی وے بہت اچھی تھی اور فی  
انچال سپیڈی جا رہی تھی اس لیے رفتار بڑھانے میں کوئی  
دکھلاؤ نہیں تھی۔ پھر رات کے اس پہر ٹریفک بھی نہیں  
تھا۔ ٹھیک کے پاس آتے ہی مجھے مخالف سمت میں ایک  
دین سڑک کی کھڑی نظر آئی۔ اس نے راستہ بند کیا ہوا  
تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ ایک گالی نکل اور میں نے  
رفتار کم کرتے ہوئے گاڑی الٹی کی طرف سوڑ دی۔ پہ کی حد  
تک سڑک ٹھیک تھی لیکن جب ہم دوسری طرف اترے تو



سڑک نارمل ہو گئی تھی۔ دائیں طرف یہ آبادی میں گم ہو رہی تھی اور اس طرف جانا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے میں نے بائیں طرف موڑ دی۔ آگے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہمیں کس طرف جانا ہے؟ زین کی فائرنگ سے نہ صرف گاڑی پیچھے ہوئی تھی بلکہ اس میں سے جھانکنے والے افراد بھی اندر پلٹے گئے تھے۔ میں نے زین سے کہا۔ ”نقشہ نکال کر دیکھو ہمیں کس طرف جانا چاہیے۔“

وہ اندر آئی اور پیچھے سے بیک اٹھا کر نقشہ برآمد کیا۔ پھر اسے دیکھ کر بولی۔ ”اسی سڑک پر چلو۔ ہمیں گھوم کر آنا ہو گا سڑک دریا کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے اور اسی پر انٹر فیلڈ ہے۔“

اگرچہ میرا انٹر فیلڈ کی طرف جانے کا ارادہ نہیں تھا مگر قدرت اسی طرف لے جا رہی تھی اور طیارے میں فرار ہونا پڑتا تب بھی یہ عقب سے آنے والے دشمنوں سے بہتر تھا۔ نصف کلومیٹر بعد سڑک گھوم کر آبادی کے اوپر سے ہوئی ہوئی دوبارہ دریا کے پاس آنے لگی۔ پیچھے آنے والی گاڑی اس لحاظ سے مشکل میں تھی کہ ناہموار سڑک پر اسے قابو کرنا مشکل تھا۔ اس کا وزن زیادہ تھا اور وہ بے قابو ہو کر الٹ سکتی تھی۔ ہماری گاڑی ہلکی تھی اور اس وجہ سے رفتار کے باوجود اس پر کنٹرول آسان تھا۔ پیچھے آنے والی گاڑی تقریباً تین سو میٹر دور تھی۔ پہلے برسٹ کے بعد اس کی طرف سے چند ایک برسٹ اور مارے گئے تھے مگر اتنی دوری سے نشانہ ٹھیک نہیں جینے رہا تھا۔ میں نے ٹیک میں ہاتھ ڈالا اور اس سے ایک گرنیڈ نکال کر اس کی پین مینجی اور گھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر اسے پیچھے اچھال دیا۔ زین نے چوکی۔

”یہ کیا تھا؟“  
”دیکھو۔“ میں نے عقبی آئینے میں دیکھا اور ٹھیک پانچ سینکڑے بعد گرنیڈ دھماکے سے پھٹا اور سڑک کے وسط میں بہت بڑا شعلہ نمودار ہوا تھا۔ دشمن کی گاڑی اس سے چند گز کی دوری پر تھی۔ دھماکے سے براہ راست تو اتنا نقصان نہیں ہوا تھا مگر اس کی شاخ دیوے گاڑی کے چاروں طرف پھیل رہی تھی اور پھر بے قابو ہو کر اس نے قلابازی کھائی اور سڑک کے وسط میں قلابازیوں کے بعد وہ دریا میں جا گری۔ زین نے خوشی سے چلائی۔

”شاندار، گرنیڈ کہاں سے آیا؟“  
”رہنی شاہ کے کمرے سے ملا تھا۔“ میں نے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ دوسری گاڑی پاس آ

رہی تھی اور اس کے پیچھے ذرا فاصلے پر ایک گاڑی اور تھی جو یقیناً وہی دین تھی جس نے پل کے بعد راستہ روکا تھا تھا۔ اب سڑک دریا کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کے ایک طرف کھیت تھے اور اب علاقہ کسی میدان کی طرح ہموار تھا۔ درندہ یہ سارا علاقہ پہاڑی تھا اور ہموار زمین بہت کم تھی۔ شاید اسی وجہ سے یہاں انٹر فیلڈ بنائی گئی تھی۔ میں نے زین سے کہا۔ ”اپنے سویچائل میں ڈائل پیلا نمبر ملاؤ اور اس پر موجود زمین کل نامی شخص سے بات کرو اس سے کہو کہ ہم انٹر فیلڈ کے پاس ہیں کیا طیارہ آ گیا ہے؟“

اس وقت پونے ایک بج رہا تھا۔ زین نے کال کی اور امین گل سے بات کرنے لگی۔ اس سے بات کر کے مجھے مطلع کیا۔ ”زمین گل نے لائسنس کا بندوبست کر لیا ہے۔ وہ جزیرے لے آیا ہے، مگر طیارہ ابھی نہیں آیا وہ دو بجے تک آئے گا۔“

”طیارہ نہیں آیا مگر دشمن پیچھے ہیں۔“ میں نے پھر عقب میں دیکھا۔ ”سوال یہ ہے کہ ہمیں اتنی آسانی سے پرواز کی اجازت دے دیں گے؟“  
”اس کا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ طیارے کے ساتھ میرے آدمی بھی آئیں گے اور وہ ان سے نمٹ لیں گے۔“  
میں چونک گیا۔ ”تمہارے آدمی؟ تم نے پہلے نہیں بتایا۔“

”تم نے پوچھا ہی نہیں۔“ وہ ساوگی سے بولی  
غیر یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا زین میرے قابو میں تھی اور میں اس سے کام لے سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم اپنے آدمیوں کو یہی تاثر دو گی کہ میں تمہارے قابو میں ہوں۔“

”میں ایسا ہی کروں گی۔“ اس نے سپاٹ لیج میں کہا۔ گل کھاتے دریا کے کنارے ایک نکلے پہلو کے ساتھ انٹر فیلڈ شروع ہو جاتی تھی۔ اس کے آغاز میں ایک بڑی سی عمارت تھی اور اس کے بعد رن دے تھا۔ عمارت تاریک نظر آرہی تھی۔ جب ہم اس کے پاس پہنچے تو اس پر اسکول کا بورڈ نظر آیا تھا۔ گویا یہاں اب اسکول تھا جب کہ عمارت کی اصل ساخت بتا رہی تھی کہ یہ فوجی مقاصد کے تحت بنائی گئی تھی۔ ہم اس کے ساتھ سے ہوتے ہوئے رن دے کی طرف آئے اور اس کے آخری حصے میں موجود دوسری عمارت کی طرف بڑھے تھے۔ وہاں روشنی نظر آرہی تھی۔  
”میں نے تقریباً پانچ سو گز لمبا تھا۔ جو عام پروں والے چھوٹے طیارے کی پرواز اور اترنے کے لیے کافی تھا۔ ایک بک اپ فلا گاڑی کے ساتھ دو افراد کھڑے تھے۔ اس کے



بچھلے حصے میں موجود جزیرہ چل رہا تھا اور اس کے ہونے پانپ سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ میں نے گاڑی ان کے ساتھ لے جا کر روکی اور نیچے اترتے ہوئے کہا۔

”تم میں سے زمین گل کون ہے؟“  
دونوں میں سے ادھیر عمر شخص اُٹھ اُٹھا۔ ”میں زمین گل ہوں اور یہ میرا بیٹا امین گل ہے۔“

”دشمن ہمارے پیچھے آرہے ہیں انہوں نے رنی شاہ کے گھر پر بھی حملہ کیا۔ اس وقت ہم وہاں سے نکل رہے تھے۔ ہم نے ایک گاڑی جاہ کر دی مگر دو پیچھے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم مسلح ہو۔“

زمین گل فکر مند ہو گیا۔ ”شاہ جی نے ایسا بات تو بتائی نہیں ورنہ اسلحہ لے کر آتے ابھی تو صرف ہتھول ہے۔“  
گویا ہتھول کوئی چھری چاقو جیسا اسلحہ تھا۔ پتا نہیں وہ کن ہتھیاروں کی صورت میں خود کو کسج بکھتے تھے۔ میں نے بیک سے ایم مولہ راکٹس نکال کر ان کے حوالے کیں اور پوچھا۔ ”انہیں استعمال کر سکتے ہو؟“

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”ادھر بچہ بچہ ہتھیار استعمال کرنا جانتا ہے۔“  
”تب تیار ہو جاؤ وہ آنے والے ہیں اور ہاں رن وے لائنیں آن کر دو۔“

وہ اپنی گاڑی میں ایک چھوٹا جزیرہ لائے تھے اور اس کی دائرہ گاندر بگلی کی تنصیبات تک پہنچا دی تھیں۔ فی الحال جزیرہ سے صرف عمارت کی روشنیاں جلائی گئی تھیں۔ رن وے کی روشنیاں بند تھیں۔ زمین گل اندر کی طرف بڑھ گیا۔ ادھر تعاقب میں آنے والی دوسری گاڑی نمودار ہوئی اور ادھر رن وے لائنیں آن ہو گئیں۔ میں نے اور امین گل نے بیک وقت فائر کیے۔ میں نے برس برس پھونک رہا تھا مگر زمین نے سنگل سوڈ پر فائر کیا اور بہترین نشانہ لگا دیا تاکہ گاڑی کی وینڈ اسکرین ٹکڑ ٹکڑ ہو جائے۔ گاڑی تیزی سے زبردست ہوئی اور اسکول کی عمارت کے عقب میں چلی گئی۔ وین بھی وہاں آگئی تھی اور اس سے نکل کر مسلح افراد پھیل رہے تھے۔ مگر وہ اس دور تھے کہ ان کا نشانہ لینا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح ہم بھی اتنے دور تھے کہ وہ آسانی سے ہمیں نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔

سوا ایک بج رہا تھا اور زمینی نے طیارہ دو بجے تک منگوا یا تھا مگر ضروری نہیں تھا کہ وہ ٹھیک دو بجے آتا وہ اس سے پہلے بھی آ سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ طیارہ آ بھی جائے تو وہ اسے لینڈ کرنے کی اجازت کہاں دیں گے؟ فضا اور رن وے پر اسے نشانہ بنانا بہت آسان ثابت ہو گا۔ میں

سوچ ہی رہا تھا کہ بالکی سی منگنا ہٹ کی آواز آئی اور پھر آواز طیارے کی صورت اختیار کر گئی۔ تاریکی میں اس کی نیچے کی جلتی بجھتی سرخ روشنی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی ساخت واضح نہیں تھی لیکن آواز سے یہ چھوٹا طیارہ لگ رہا تھا۔ زمینی نے موبائل نکال کر کسی کو کال کی اور اسے بتانے لگی کہ نیچے سب افراد ہیں اور کس پوزیشن پر ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کسے کال کر رہی تھی کیونکہ اس موبائل کی مدد سے طیارے سے رابطہ تو ممکن نہیں تھا۔ جیسے ہی اس نے کال ختم کی میں نے پوچھا۔

”کسے کال کر رہی تھیں؟“  
”کابل میں اپنے آدمی کو۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ طیارے کے پائلٹ کو صورت حال سے آگاہ کرے گا۔“

چند لمحوں بعد طیارہ جو رن وے کی سیدھ میں آچکا تھا اچانک بلند ہوا اور گھومتا ہوا اسکول کی عمارت کی طرف جانے لگا۔ ایک چکر لگا کر وہ اوپر سے گزرا تو نیچے سے اس پر مشین گن سے فائرنگ کی گئی مگر طیارے کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ رن وے کی روشنیوں کے پاس آیا تو میں نے پہلی بار اسے دیکھا۔ یہ ایک پروپلر انجن والا چھوٹا طیارہ تھا جس میں چار پانچ افراد کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ کابل میں موجود شخص نے یقیناً پائلٹ سے رابطہ کر کے اسے نیچے موجود خطرے سے خبردار کر دیا تھا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے نیچے موجود افراد کے خلاف کیسے کارروائی ہوگی؟ مگر جلد مجھے اس کا جواب مل گیا۔ دوسری بار طیارہ گھوم کر اسکول کی عمارت کی سیدھ میں آیا اور دریا کے دوسری طرف سے پرواز کرتا ہوا نزدیک آنے لگا۔ اچانک اس کے پردوں کے نیچے سے شعلے سے نکلے اور چند لمحوں بعد اسکول کے دوسری طرف دھماکوں کے ساتھ شعلے بلند ہوئے تھے۔

طیارے میں راکٹ پوڈ فٹ تھی۔ جواب میں نیچے موجود افراد نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی مگر اپنا کام کر کے طیارہ فوراً اوپر اٹھ گیا تھا اور واپس دوسرے حملے کے لیے جا رہا تھا۔ اب مجھے پتا چلا کہ زمینی اتنی مطمئن کیوں تھی کہ طیارے میں موجود افراد نیچے موجود دشمن کا بندہ بست کر لیں گے۔ مجھے معلوم تھا کہ طیارہ مسلح ہو گا۔ شعلوں کا مستقل انکاس بتا رہا تھا کہ کوئی گاڑی نشانہ بنی تھی اور اب جل رہی تھی۔ نصف گلوبل رن وے کے باوجود ان لوگوں کی چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ان میں سے کچھ افراد فری میں اسکول کے دوسری طرف بھاگ رہے تھے۔ میں نے اور امین



محل نے بیک وقت انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ زمین محل کو دشمن سے زیادہ رنی شاہ کی فکر تھی اور وہ بار بار اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا میں نے جھگڑا کر کہا۔ ”ہمیں کیا پتا، جب ہم نکلے تب دشمن آیا تھا۔ اب اللہ جانے وہاں کیا ہوا ہے؟“

زینی نے آہستہ سے انگریزی میں کہا۔ ”تم نے انہیں اسلحہ دے کر اچھا نہیں کیا۔“

”یہ رنی شاہ کے آدمی ہیں لیکن اس وقت ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس لیے تم فکرمات کرو۔“

ہماری طرف سے فائرنگ ہوئی تو ادھر پناہ کے لیے آنے والے مشکل میں پڑ گئے۔ وہ واپس بھاگے تھے مگر ان کے لیے کہیں امان نہیں تھی۔ اسی اثنا میں طیارے سے دوبارہ فائرنگ ہوئی اور شاید دوسری گاڑی بھی نشانہ بن گئی۔ کیونکہ اس بار دھماکے اور شعلے کہیں زیادہ بلند تھے۔ فائرنگ کے بعد طیارہ بلند نہیں ہوا بلکہ اس نے مزید نیچے آتے ہوئے مشین گن سے گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ گاڑیاں تباہ ہونے کے بعد کام آسان ہو گیا تھا مسلح افراد کے پاس اب بچنے کے لیے کوئی آڑ نہیں تھی۔ میں نے زمین گل سے کہا۔ ”ہمیں ان کا ساتھ دینا ہوگا۔“

”وہ کیسے؟“ زمین گل نے پوچھا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے کہا اور گاڑی کا میٹر نوٹرل کر کے اسے آگے دھکیلنے لگا۔ ”تم دونوں میرے دائیں بائیں سے ان لوگوں کو نشانہ بناؤ گے۔“

وہ میری حکمت عملی سمجھ گئے۔ میں درمیان میں رہ کر گاڑی کو دھکا لگا رہا تھا اور وہ میرے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ خود کار رائفلوں کے لیے پانچ سو میٹر زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کی مار اس سے زیادہ ہوتی ہے مگر پھر کوئی خطرناک نہیں رہتی ہے۔ ساڑھے تین سو چار سو میٹر کا فاصلہ مناسب تھا۔ طیارے کی مشین گن سے بچنے کے لیے دشمن کے نصف درجن آدمی اس طرف آ چکے تھے۔ جب ہم ان کے قریب آنے لگے تو ان کو یہاں بھی لالے پڑ گئے۔ چار سو میٹر کی دوری سے ان دونوں باپ بیٹے نے دو افراد کو نشانہ بنایا تو باقی افراد کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ اندھا دھند گولیاں برساتے ہوئے رن وے کے ساتھ کھلے میدان کی طرف بھاگ نکلے تھے مگر بد قسمتی سے وہ غلط وقت پر آڑ سے نکلے تھے۔ طیارہ پھر چکر کاٹ کر اس طرف آ گیا تھا اور اس نے بجھوڑوں پر مشین گن آزمائی ان میں سے دو اور گرے تھے اور باقی تارنی میں غائب ہو گئے۔ اب میدان صاف تھا۔

میں گاڑی میں آ گیا۔ میرے ساتھ زمین گل تھا اور امین گل پیچھے آ گیا۔ ہم نے اسکول کی عمارت کے گرد چکر لگایا۔ دونوں گاڑیاں راکٹوں کا نشانہ بن چکی تھیں۔ پائلٹ ماہر نشانے باز بھی تھا اس نے دونوں بار درست جگہ پر راکٹ مارے تھے۔ ہم واپس آئے اور زینی کو آئل کلینر کا ٹینکل دیا۔ اس نے پھر اسی شخص کو کال کی اور اس نے پائلٹ کو پیغام بھیجا کہ اب طیارہ لینڈ کر سکتا ہے۔ پائلٹ نے طیارے کو رن وے کی سیدھ میں لا کر نیچے کیا اور بہت آرام سے اتار لیا۔ چند منٹ بعد طیارہ ہمارے پاس آ کر رکا اور اس میں سے پائلٹ کے ساتھ ایک شخص اتر اٹھا۔ یہ چار نشستوں والا طیارہ تھا۔ اترنے والے دونوں افراد سفید قام تھے۔ انہوں نے زینی اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔ زینی سے ان کا انداز بے تکلفانہ تھا جیسے وہ اسے جانتے ہوں۔ البتہ مجھ سے رکھائی سے ملے تھے۔ میں نے امین گل سے کہا۔ ”جب ہم پرواز کر جائیں تو تم چلے جانا اور اس کا ذکر کسی سے مت کرنا رنی شاہ خود تم سے رابطہ کرے گا۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ اس نے جواب دیا۔

میں اور زینی طیارے میں آئے پائلٹ نے انجن بند نہیں کیا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے سیٹ سنبھالی اور طیارے کا رخ موڑنے لگا۔ میں پائلٹ کے برابر والی نشست پر تھا کیونکہ زینی اور وہ سارا آدمی مجھ سے پہلے چھٹی نشست پر آ گئے تھے۔ پائلٹ نے ہم سے کہا۔ ”جب تک فلائٹ لیول نہیں ہو جاتی تم لوگوں کو پریشر برواشت کرنا پڑے گا۔“ اگر ٹکی ہو تو سیٹ کے سائیڈ میں شارپ موجود ہے۔ زینی نے جواب دیا۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

پائلٹ نے سر ہلایا اور تھروٹل آگے کیا تو طیارہ تیزی سے آگے بڑھا اور رن وے پورا ہونے سے پہلے طیارہ فضا میں بلند ہو گیا۔ طیارے کے آگلی میٹر کے مطابق یہاں کی بلندی سولہ سو ساٹھ میٹر تھی اور اس میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ تین ہزار میٹر پر پہنچ کر پائلٹ نے طیارہ سیدھا کر لیا۔ انجن کا شور اور کانوں پر آنے والا پریشر کم ہو گیا تھا مگر یہاں کسی مسافر بردار طیارے جیسا آرام وہ ماحول نہیں تھا کیونکہ طیارے میں کیمین پریشر نہیں تھا۔ تین ہزار میٹر کا مطلب تھا کوئی دس ہزار فٹ کی بلندی اور یہاں فضائی دباؤ سطح سمندر سے نصف رہ جاتا ہے۔ انجن کا شور تھا اس لیے مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ زینی اپنے ساتھ بیٹھے سفید قام سے کیا بات کر رہی تھی مگر وہ دونوں آپس میں جو گفتگو تھے۔ گفتگو کرتے ہوئے ان کے سر کا حصہ مجھے نزدیک آ گئے تھے۔ مشرق



میں اسے برا سمجھا جاتا ہے مگر مغرب میں یہ عام سی بات ہے۔ انجینیئرز و عورت بھی دوران گفتگو ایک دوسرے کے بہت نزدیک آ جاتے ہیں۔

سفید فاموں کو دیکھ کر میرا ہاتھ ٹھنکا تھا کیونکہ اب تک اس معاملے میں کوئی سفید فام نظر نہیں آیا تھا۔ پائلٹ اور دوسرا شخص دونوں غیر فوجی تھے۔ افغانستان میں غیر ملکی افواج کے ساتھ بے شمار عام افراد بھی آئے تھے۔ ان میں اکثریت کنٹریکٹرز کی تھی جنہوں نے افغانستان میں مختلف کاموں کے ٹھیکے لیے ہوئے تھے۔ اس لیے یہ ظاہر ان کی موجودگی کوئی خاص تعجب انگیز نہیں تھی۔ طیارہ اڑانے جیسے فی کام زیادہ تر غیر ملکی کر رہے تھے۔ ان کی خدمات کرائے پر حاصل کی جا سکتی تھیں۔ اس کے باوجود مجھے کھلکا ہوا تھا۔ انہوں نے جتنی مہارت سے راکٹ جیسا پیچیدہ ہتھیار استعمال کیا تھا اور منوں میں زمین پر موجود دو گاڑیاں جاہ کر دی تھیں اس سے لگ رہا تھا کہ وہ باقاعدہ تربیت یافتہ تھے۔ زمینی کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ دو اے کے زیر اثر تھی مگر دوسرا تو ایسا نہیں سمجھ رہا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ زمینی کی باتوں سے بھانپ نہ لے کہ جو یہ ظاہر قیدی ہے وہی اصل ماسٹر ہے۔

اسد آباد سے کامل کا فاصلہ سو کلومیٹر بھی نہیں ہے اور طیارے نے مشکل سے نصف گھنٹے میں یہ فاصلہ طے کر لیا۔ کامل شہر کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ یہ خاصا بڑا شہر ہے اور سنا ہے کہ اس کی آبادی پچاس لاکھ سے زیادہ ہے۔ یعنی یہ دارالحکومت ہی نہیں افغانستان کا سب سے بڑا شہر بھی ہے۔ دریاے کامل کی وادی میں اس کے دونوں اطراف بسا یہ شہر گزشتہ چار عشروں سے جنگ دیکھ رہا ہے۔ یہ ظاہر روس 1979 میں یہاں وارد ہوا تھا مگر کابل کی جنگ اس سے پہلے شروع ہو گئی تھی۔ ان چار عشروں میں یہاں امن اور سکون کا دور بہت کم گزرا اور اس شہر کے باشندوں نے زیادہ تر وقت گولیوں کی ترزاہٹ اور گولوں کے دھماکے سنتے ہی گزرا رہا ہے۔ طیارے نے چکر لگایا اور پائلٹ نے دھماکا ڈالنا اور سے ہدایات لے رہا تھا ان ہدایات کی روشنی میں اس نے چکر لگایا اور ایک دن دے پر اتر گیا۔ اترنے کے بعد طیارہ رکنا نہیں بلکہ ٹپسی کرتا ہوا ایک بیگر میں داخل ہو گیا۔ یہ بیگر چھوٹے طیاروں کے لیے مخصوص تھا۔

میں نے طیارے کے ذریعے یہاں آ کر رسک لیا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اتر فیلڈ سے فرار ہونے کے بعد بھی وہ لوگ ہماری جان نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ان کا علاقہ تھا اور

وہاں سے ہمارا صحیح سلامت نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ کابل میں بھی خطرہ تھا مگر میں پاکستانی سفارت خانے میں پناہ لے سکتا تھا اور سفارت خانے کی مدد سے وہاں جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی نکلنے کے اور راستے تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ یہاں بھی پاکستانی مشکوک سمجھے جاتے ہیں اور انہیں فوری طور پر عسکری تحفظوں یا خفیہ اداروں کا آڈی تصور کر لیا جاتا ہے جیسا کہ انڈیا میں ہوتا ہے اور ان کے ساتھ تقریباً وہی سلوک بھی ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں ایسے واقعات بھی سننے میں آئے جب صرف پاکستانی ہونے کے جرم میں یہاں عام افراد کو قتل کر دیا گیا۔ حالانکہ وہ تاجر تھے یا کمپنیوں کی طرف سے یہ طور لیبر آئے تھے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ یہاں بدر اقتدار طبقہ پاکستانیوں کو زیادہ پسند نہیں کرتا ہے۔ سرکاری اہل کار عام طور سے پاکستانیوں کے ساتھ دوستانہ رویہ نہیں رکھتے ہیں۔ ہمارے مقابلے میں انڈینز کو یہاں نہ صرف پسند کیا جاتا ہے بلکہ انہیں افغانستان کی تعمیر نو میں کرداروں ڈالر کے ٹھیکے بھی ملتے ہیں۔

افغانستان میں پاکستانیوں کی تعداد شاید دس پندرہ ہزار سے زیادہ نہ ہو لیکن پاکستان میں کم سے کم پچاس لاکھ افغانی موجود ہیں اور ان میں سے بیشتر نہ صرف پاکستانی شناختی کارڈ بلکہ پاسپورٹ بھی رکھتے ہیں اور اس پر ساری دنیا میں سفر کرتے ہیں۔ پنڈی جیسے درمیانے شہر میں بہت سے محلے اور بازار ایسے ہیں جہاں صرف افغانی پائے جاتے ہیں اور محلے عام رہتے ہیں۔ انہیں کوئی صرف اس بنیاد پر کچھ نہیں کہتا کہ وہ افغانی ہیں۔ حالانکہ وہ پاکستان میں پائی جانے والی بیشتر خرابیوں کے ذمے دار ہیں۔ اسلحہ یہ لوگ لائے، منشیات کا پورا کاروبار ان کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے جرائم میں بھی یہ ملوث ہوتے ہیں۔ پنڈی اور اس کے گرد و نواح میں منظم دہشتیوں میں افغان گروہ ملوث ہیں جو حاصل ہونے والی رقم کو پھر دہشت گردانہ مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مذہب کے نام پر ہونے والی دہشت گردی کے تانے بانے بھی ان ہی لوگوں سے ملتے ہیں۔

ہمارے ہاں دہشت گردی میں ملوث اکثر افراد کا تعلق کسی بڑی ملک سے نکلتا ہے۔ اس کے باوجود افغانیوں کی غربت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا جب کہ افغانستان میں پاکستانیوں کا تاثر شاید انڈیا سے کچھ ہی اچھا ہو۔ آئے دن سرحد کے دوسری طرف سے زبان کے اور ملکی گولے : سائے جاتے ہیں۔ ہماری چپک پوسٹوں پر حملہ



ہوتا ہے۔ جب کہ ہمارے ہاں دہشت گردی میں مطلوب افراد افغانستان میں کھلے عام ٹھہرتے ہیں اور اس کے باوجود لعن طعن ہم پر کی جاتی ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی میں استعمال ہونے والا اسلحہ اور بارود افغانستان سے لایا جاتا ہے۔ پروسی ملک ہونے کے باوجود ہمارے یہاں اسے کونسلٹ نہیں ہیں جتنے کہ انڈیا نے کھول رکھے ہیں اور یہ کونسلٹ ہماری سلامتی کے خلاف دن رات کام کر رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اکثر افغانی پاکستان کے خلاف نہیں ہیں مگر وہ پاکستان کے بہت زیادہ حامی بھی نہیں ہیں۔ عام طور سے ان کا رویہ بھی سرد مہری لیے ہوتا ہے۔

آج میں اسی افغانستان کے دارالحکومت میں تھا جو آج بھی جنگ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اگرچہ دنیا کی اکلوتی (فی الحال) سپر پاور یہاں مزید تین درجن سے زیادہ ممالک کے ساتھ براجمان تھی۔ مگر حالات اس کے قابو میں نہیں آ رہے تھے اور آنے والے دنوں میں مزید ابتری کی پیشگوئی تھی۔ صرف افغانستان ہی نہیں بلکہ اس خطے کے دوسرے ممالک کے لیے بھی حالات کچھ اچھے نہیں ہیں جن میں سرب فہرست وطن عزیز ہے۔ مگر یہ وقت سیاست پر غور کرنے کی بجائے ذاتی فکر کرنے کا تھا کہ میں کس طرح جلد از جلد واپس اپنے ملک جاسکتا تھا۔ طیارہ بیگر میں رک گیا تھا اور اس کا انجن بند ہو گیا تھا مگر پر اب تک محمور رہا تھا۔ میں نے مرکز زینی کی طرف دیکھنا چاہا تھا کہ میری گردن میں کوئی چیز چھبی اور خواب آور سیال میری گردن میں اتر گیا کیونکہ فوراً ہی میرا دماغ پھلانے لگا تھا۔ میں نے مرکز دیکھا تو انجکشن لگانے والی زینی تھی جو مسکرا رہی تھی۔ میں نے یہ مشکل کہا۔ ”تم... یہ کیسے...؟“

”ایسے۔“ اس نے انجکشن کا ایک سیٹ میرے سامنے کیا۔ ”یہ انجکشن ڈوٹ ہے اس کا نام... کیا سمجھے؟“ بے ہوش ہونے سے پہلے میں سمجھا تھا کہ زینی نے دوا کے اثر سے کیسے چھٹکارا پایا تھا۔ اس نے طیارے سے کسی وقت انجکشن ڈوٹ لے لیا تھا جس نے دوا کا اثر ختم کر دیا اور اس کا اعتماد بحال ہو گیا اس کے بعد بھی وہ یوں بنی رہی تھی میرے قابو میں ہو اور جب حالات پوری طرح اس کے قابو میں آ گئے تو اس نے اصلیت پر آنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ طیارہ رکتے ہی اس نے میری گردن میں بے ہوشی کا انجکشن اتار دیا تھا اور آخری سوچ جو میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ میں خورشیدی میں مارا گیا۔

☆☆☆

مجھے ہوش آیا تو میں ایک سادہ کمرے میں سادہ لیکن آرام دہ بستر پر تھا اور میرے سر کے سین اور ایک پتیلی روشنی والا انرجی سپور روشن تھا۔ جاگنے کے بعد بھی کچھ دیر تک میرا ذہن غموگی کا شکار رہا اور پھر میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں آمدورفت کے لیے ایک ہی دروازہ تھا اور ایک طرف روشن دان نما جالی لگی تھی۔ یہ شاید اسے سی کا ڈکٹ تھا۔ میرے جسم پر اب بھی زخمی نلکائی ٹی ٹی ٹی اور اسی رنگ کا ٹراؤزر تھا۔ پاؤں خالی تھے البتہ بیڈ کے ساتھ میرے جوتے رکھے تھے اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ گردن میں جہاں انجکشن لگا تھا وہ جگہ دکھ رہی تھی مگر اس کے علاوہ میں بالکل فٹ فالت تھا۔ زینی نے مجھے پھر انجکشن نہیں دیا تھا جو اعتماد ختم کر دیتا ہے کیونکہ میں خود کو مارل محسوس کر رہا تھا۔ شاید اب اس کی ضرورت نہیں تھی اور ایک حد سے زیادہ ان انجکشنوں کا استعمال خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا اور مجھے بھوک لگ رہی تھی۔

میں نہ جانے کہاں تھا کیونکہ اس پاس مکمل سناٹا تھا اور کسی قسم کی معمولی سی آواز بھی نہیں تھی۔ ایک بار پھر میرے اندر بھارتیوں کا خوف سرسرا نے لگا کہ کہیں میں ان کے ہاتھ تو نہیں آ گیا تھا۔ اگرچہ زینی نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے کسی آدمی نے مارا ہے اس کے باوجود مجھے یقین نہیں تھا۔ وہ جھوٹ بول سکتی تھی اور میں بے بس تھا کہ کسی طرح اس کی بات کی تصدیق نہیں کر سکتا تھا۔ ایک خیال ڈیوڈ شا کا بھی آ رہا تھا مگر کچھ عرصے پہلے ہی وہ پاکستان میں مجھ سے دست بردار ہو کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد اسے اتنی عجلت میں اور اتنے گھماؤ پھراؤ کے ساتھ مجھے قیضے میں کرنے کی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی اور اگر کوئی تک تھی تو اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں کم سے کم چھ سات گھنٹے تک بے ہوش رہا تھا اور اس دوران میں مجھے کاٹل سے کہیں دور بھی لے جایا جاسکتا تھا۔

مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ میں کاٹل یا اس کے آس پاس ہی کہیں تھا۔ موسم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں نے دروازہ چیک کیا یہ پلائی کا بنا ہوا مضبوط دروازہ تھا جو باہر سے بند تھا اور اس کے اندر تو پینڈل تھا اور نہ ہی پینڈل تھی۔ میں نے دستک دی اور پھر زور سے بجایا مگر دونوں طرف میں کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا۔ اب میرے پاس انتھار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جب دروازہ کھلے اور صورت حال سامنے آئے۔ میں واپس بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ کم بختوں نے پانی کی ایک بوتل تک نہیں رکھی تھی اور

اب مجھے پیاس لگنے لگی تھی۔ میں نے بینڈ کا جائزہ لیا کہ یہ لوہے کا بنا ہوا چھ ہائی تین فٹ کا بیڈ تھا جس کے بائے فرش میں پیوست تھے اور اس کے وسط میں ہر چھ انچ کے بعد فولادی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان پر اسپرنگ میٹریس تھا اور یہ انتظام یقیناً ایک قیدی کے لیے کیا گیا تھا۔ گویا میں کسی ایسی جگہ تھا جہاں قیدی رکھے جاتے ہیں۔

یہ جان کر میری تشویش میں اضافہ ہوا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹا ہو گیا تھا مجھے بیدار ہوئے اور میں سوچ رہا تھا کہ اب کسی کو متوجہ کروں کہ دروازہ کھلا اور زینٹی قیامت بنی ہوئی اندر آئی۔ اس نے جسم سے چپکلی ہوئی مٹی کی شرٹ پہن رکھی تھی جسے جدید کم بلانڈز بھی کہا جاسکتا تھا۔ بازو بندھے اور گھافراغ دلی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ ایک مختصر سی پٹی کے بعد پیٹ شروع ہو گیا تھا جو ناف سے نیچے تک کسی بھی لباس کی گرفت سے آزاد تھا۔ اس نے جو مٹی اسکرٹ پہن رکھا تھا اس میں اس کی ٹانگیں نمایاں تھیں۔ اس کا قدمنا سب تھا یعنی پانچ پانچ ٹکڑوں میں تین انچ کی ٹیکل کے ساتھ اس میں مزید اضافہ کر لیا تھا۔ میری توجہ پا کر اس نے خود کو مزید مٹا جانے کے لیے پیش کیا۔ میں نے گہری سانس لی اور کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم میرے ساتھ کس قسم کا کھیل کھیل رہی ہو؟“

”بس اس کھیل کا آخری حصہ شروع ہو گیا ہے۔“

اس نے ٹارٹل انداز میں کھڑے ہوئے کہا۔ ”تم تیار ہو؟“

”کس کام کے لیے؟“

”ٹاٹھنے کے لیے۔“

”کیوں نہیں۔“ میں کھڑا ہوا تو وہ ذرا محتاط ہو گئی اور دروازے کے پاس ہو گئی۔ میں مسکرایا۔

”ڈر رہی ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے صاف کوئی سے کہا۔ ”میں تمہارے بارے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”حالانکہ میں عورتوں کا بہت احترام کرتی ہوں۔“

”مجھ جیسی عورتوں کا نہیں۔“ اس نے سچے لہجے میں کہا۔ ”اگر تمہیں اس وقت انجکشن میسر نہ ہو تو مجھ پر مگردن توڑنے میں دیر نہیں لگے گی۔“

وہ مجھے باہر لائی۔ یہ چھوٹی سی عمارت تھی اور یہاں کم سے کم چھ سٹاف افراد تھے۔ مجھے داش روم جانے کا موقع ملا اور پھر ریڈی میڈ ناشتا تقسیم ہوا۔ زینٹی نے صرف سیاہ چائے لی تھی۔ اس نے بہت نفاس سے میک اپ کیا ہوا تھا اور اس کی تیاری بتا رہی تھی کہ ہمیں کہیں جانا ہے۔ اس کے پاس

ایک چھوٹا بینڈ تھا مگر اس کی جسامت سے قطع نظر مجھے یقین تھا کہ اس میں کوئی ہتھیار لاری ہوگا۔ کمرے سے باہر آتے ہی دو افراد مجھ پر مسلط کر دیئے گئے تھے اور اس وقت میرے پاس تھے۔ یہ چہرے مہرے سے افغانی ہی لگ رہے تھے۔ زینٹی نے مجھ سے کہیں پوچھا کہ میں قبل از وقت انجکشن کے اثر سے کیسے نکلا اسی طرح میں نے اس سے نہیں پوچھا کہ قوت ارادی ختم ہونے کے بعد بھی اس نے اپنی ڈونٹ کیسے لیا۔ ہم عام افراد نہیں تھے۔ میں ناشتے کے دوران میں محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کسی چیز میں کوئی الگ سے ڈانڈہ آ رہا ہے مگر میں ناکام رہا اور ناشتے کے بعد بھی ٹھیک رہا۔ زینٹی سکون سے انتظار کر رہی تھی جیسے ہی میں نے ہاتھ روکا اس نے کہا۔

”چلو۔“

”کیا تم بذات خود مجھے بینڈ اور کر دے گی۔“

اس نے میری طرف دیکھا اور غنڈی سانس لے کر بولی۔ ”کاش کہ میں تمہیں اپنے پاس رکھ سکتی۔“

”میں کسی کے پاس رہنے والا شخص نہیں ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جلد یہ بات تم اور وہ شخص جان جائے گا جس نے مجھے بلوایا ہے۔“

”میری ذمے داری ختم ہو جائے گی۔“ زینٹی نے شانے اچکائے۔ ”میں چاہتی ہوں اب تم ٹارٹل رہو لیکن اگر تم نے مزاحمت کی تو مجبوراً تمہیں بے بس کرنا پڑے گا۔“

”میں تعاون کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو۔“

”کس بات کا اور کیا تم میرے جواب پر یقین کر رہے؟“

”ہاں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”کیا تم مجھے بھارتی حکومت یا اس کی کسی ایجنسی کے حوالے کرنے جا رہی ہو؟“

”نہیں اس شخص کا بھارتی حکومت یا اس کی کسی ایجنسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”وہ بھارتی ہے؟“

”نہیں وہ بھارتی بھی نہیں ہے۔“

میں اس کے لہجے اور الفاظ پر غور کر رہا تھا اور مجھے لگا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ میں نے سر ہلایا۔ ”مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔“

”چلو۔“

ہم عمارت سے باہر آئے یہ ایک وسیع احاطے میں تھی جو بڑی سی چھوٹی سی جھونپڑی جی اور خاص بات یہ تھی کہ وہاں



”اٹھ یا۔“ کرٹل نے کہا۔

”ڈیوڈ شاد ہیں ہے؟“

”ظاہر ہے۔“

معاملات اس طرف جارہے تھے جہاں میں سے جاتا نہیں چاہتا تھا یعنی اس پر اسرار وادی تک۔ مگر میں بے بس تھا۔ میں طیارے میں تھا اور اس کا رخ انڈیا کی طرف تھا۔ میں نے سیٹ بیلٹ کھولنا چاہی تب ہتا چلا کہ وہ نہیں کھل رہی تھی۔ کرٹل مسکرایا اور بولا۔ ”صرف دو گھنٹے کا سفر ہے پھر تم آزاد ہو گے۔“

زینی نے ایک توبہ شکن انگڑائی لی اور بولی۔ ”اب تم اور ہم آرام سے سفر کر سکیں گے۔“

اگلے دو گھنٹے تک میں اسی طرح بندھا بیٹھا رہا۔ طیارہ اتنی بلندی پر تھا کہ نیچے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا مگر جب برف پوش پہاڑ نظر آنا شروع ہوئے تو میں چونکا تھا۔ ہم ہمالیہ کے آس پاس تھے۔ پریشتر کہیں اور نہ سکون ہموار پرواز کی وجہ سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ طیارہ کس رفتار سے اڑ رہا ہے لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ کم سے کم آواز کی رفتار سے پرواز کر رہا تھا اور اتنی رفتار سے وہ دو گھنٹے میں بھارت کے دوسرے سرے تک پہنچ سکتا تھا۔ پھر طیارے کی بلندی کم ہونے لگی اور ڈراویر بعد وہ ایک عام سی انٹر فیلڈ پر اتر رہا تھا۔ یہ کوئی پبلک انر پورٹ نہیں تھا بلکہ شاید نجی یا کلب انر پورٹ تھا۔ طیارہ اتر ا اور رک گیا۔ ایک کار طیارے کی طرف آئی اس دوران میں انٹر ہوسنس نے دروازہ کھول دیا اور میری سیٹ بیلٹ بھی خود بہ خود کھل گئی۔ میں، زینی اور کرٹل نیچے اترے۔ کار کے ساتھ دو افراد تھے اور یہ مقامی تھے۔ انہوں نے دروازے کھولے اور ہم تینوں مقامی نشست پر آگئے۔ زینی مجھ سے لگ کر بیٹھی تھی اور اس نے میرے کان میں کہا۔ ”ہم بس جتنے واسے ہیں۔“

”اطلاع کا شکر یہ۔“

یہ نیم پہاڑی علاقہ تھا کار انر کلب سے نکل کر ٹل کھاتی سڑکوں پر سفر کرنے لگی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم ایک پہاڑی سیشن میں تھے اور کار رکھتے ہی میں نے ٹان میں دھوپ اور ٹریک سے لطف اندوز ہوتے ڈیوڈ شا کو دیکھ لیا۔ ہم کار سے اتر کر براہ راست اس کی طرف آئے تھے۔ زینی سب سے آگے تھی اور مجھے قطعی حیرت نہیں ہوئی جب وہ لپک کر ڈیوڈ شا کے کتے لپک کر آئی۔ مگر اس کے کہنے الفاظ پر میں اچھل پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ”ایسا میں شہباز کو لے آئی ہوں۔“

(جاری ہے)

سارے غیر ملکی نظر آ رہے تھے۔ یہ شاید کامل میں غیر ملکیوں کے لیے مخصوص کیاؤنڈ تھا جہاں وہ محفوظ زندگی گزار رہے تھے۔ یہ عام سویٹین لوگ تھے جو زیادہ تر مغربی اور مشرق بعید کے ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ میں ایک بڑی گٹھری وین کے پچھلے حصے میں ہوں آیا کہ میری دائیں بائیں دو افراد تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص بھی مسخ تھا۔ زینی اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے ایک شال نما چادر لے لی تھی۔ کامل کی گرد آلود سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم آدھے گھنٹے بعد کامل انر پورٹ پہنچے جہاں گاڑی براہ راست ایک پرائیویٹ جیٹ ڈیٹریکٹ پہنچی۔ یہاں ایک چھوٹا جیٹ طیارہ منتظر تھا۔ میں نے زینی سے کہا۔

”یہ میرے لیے ہے؟“

”بالکل خاص طور سے تمہارے لیے۔“

”ہمیں کہاں جانا ہے؟“

”آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے کہا اور گاڑی سے اتر گئی۔ میں بھی نیچے آیا میرے مگران پہلے ہی اتر گئے تھے۔ ان کے ساتھ میں طیارے کی سیڑھیوں تک آیا اور دروازے پر موجود شخص کو دیکھ کر چونکا۔ وہ ڈیوڈ شا کا خاص آدمی کرٹل جیمزیکسٹر تھا۔ وہ سوٹ میں تھا اور اس نے سر پر فلیٹ ہیٹ لگا رکھا تھا۔ تو بلی تھیلے سے باہر آگئی تھی۔ مجھے ڈیوڈ شانے بلوایا تھا اور وہی میرے لیے اس طرح کے انتظامات کر سکتا تھا۔ میں طیارے میں داخل ہوا۔ میرا خیال تھا کہ زینی وہیں رہ جائے گی مگر وہ بھی طیارے میں آگئی۔ ہم کل تین مسافر تھے اور ایک انٹر ہوسنس سمیت عملے کے کل تین افراد تھے۔ دروازہ بند ہوتے اور ہمارے نشستوں پر بیٹھتے ہی طیارے کے انجن اشارت ہوئے اور اس نے ڈیٹریکٹ سے نکل کر رن دے پر ٹیکسی شروع کر دی۔ میں اور کرٹل آگے سامنے بیٹھے تھے اور زینی کے صوفہ نمائشیت پر تھی۔ طیارے میں آتے ہی وہ مجھ سے بے نیاز ہو گئی تھی اور ٹائیگ بر ٹائیگ رکھے ایک رسالہ دیکھ رہی تھی۔ پوز بھی خاصا سنسنی خیز تھا مگر فی الحال میری توجہ کرٹل پر تھی جو طیارے کی پرواز سے پہلے سگار نوشی میں مصروف تھا۔ جیسے ہی طیارے نے پرواز شروع کی اور بلندی پر آیا سیٹ بیلٹ سائن بجھا اور اس نے سگار جلایا۔

”تو ڈیوڈ شا کو پھر میری یاد آگئی؟“

کرٹل نے سر ہلایا۔ ”وہ نہیں کبھی بھولا نہیں۔“

”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہائی

وی وے ہم کہاں جا رہے ہیں۔“

(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

برہان تسم..... سرگودھا  
اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے  
لڑا دے مولے کو شہباز سے  
اذا ان احمد..... لاہور

اسی محاذ پر مجھ کو شکست ہوئی ہے  
میں جب بھی ہارا ہوں اپنی اتا سے ہارا ہوں  
سندس جہالی..... ہالہ نید

اک نظر میں اس نے مجھ سے کر لیے اتنے سوال  
میں بھی کیا کرتا کہ بس نظریں جھکا کر رہ گیا  
نظیر حسن..... سکھر

اب اٹھیں، چھائی بولی  
دیں بچے ہیں دفتر جائیں  
انیس اچکڑئی..... پشاور

اسی رنگ کا پھول اس نے چنا  
جو ایک رنگ میری وفا میں نہیں  
جمیل احمد..... حضرو

آج بھی یاد کے دشت کا دامن کیوں گیلا کر جاتی ہیں  
آنکھ سے آنکھوں کی برساتیں صبح سے پہلے شام کے بعد  
نصیر احمد..... پشاور

اجنبی لگتا ہے سارا منظر  
اف خدا جانے کہاں ہیں ہم لوگ  
ناصر ارشد خان..... شادی پور

اہل دانش عام ہیں کیا اب ہیں اہل نظر  
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایمان  
(ایم افضل کمرل ننگانہ کا جواب)

عرفانہ مقصود جہلم  
بے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی  
نصوایت زن کا نگہبان ہے فقط مرد

(امیر جاوید بٹان کا جواب)

سیف الف..... ملک وال  
کیا اس لیے چنوائے تھے تقدیر نے تنکے  
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

مہتاب فاطمہ..... جہلم  
اجنبی لگتا ہے سارا منظر  
اف خدا جانے کہاں ہیں ہم لوگ

(رانا حبیب الرحمن لاہور کا جواب)

انیس امام..... لاہور  
نہ کوئی چارہ نہ حسرت نہ آرزو نہ طلب  
قر کے واسطے بس آپ کی دعا ہے بہت

(تکلیل الرحمن کھاناں کا جواب)

نسیم مرزا..... لاہور  
جب رسوائی نہ بن جائے ضرورت میری  
مجھ کو غلام نہ کر دے کہیں غربت میری  
صباحت بٹول..... لاہور

وقت کا فیصلہ ضروری ہے  
بھرمول کو سزا ضروری ہے  
جاوید احسن..... مظفر گڑھ

وہ دیکھ شام کے بستر پر گر گیا سورج  
بدن سے پھوٹ رہی ہے مکان کی خوشبو

(منشی محمد عزیز مئے لندن کا جواب)

فدا حسین ٹوری..... پانڈا چنار  
یہ راز سمجھ پائے ہیں اب تک کتنے  
اسرار کہیں اور کہیں مجرم بھی

مکرم حسن خان..... کراچی  
یک پہلو کے ساتھ وہ رہتا نہ تھا کبھی  
بیگانہ نہ تھا کسی تو وہ تھا آشنا کبھی



(آفتاب احمد نصیر اشرفی لاہور کا جواب)

نگار قریشی..... حیدر آباد

نفسا نفسی کا ایسا عالم ہے  
دایاں کھیلے ہے بائیں ہاتھ سے کھیل  
(وحید ریاست بھٹی ٹکرسیداں کا جواب)

نوازش علی..... لاہور

روپ ملتے ہیں خدو خال ملتے ہیں  
آدی نہیں ملتا آدی کے پیکر میں  
نصیر ممتاز..... ساہیوال

رات اک بچتے ہوئے جگنو نے مجھ سے یہ کہا  
پوچھ مت کتنا مجھے بھی روشنی کا شوق تھا  
اشرف بھٹی..... سرگودھا

روانی دل کے دریا میں کہاں تھی  
محبت نے رواں رکھا ہوا ہے  
(سلیم کامریڈ کھاناں کا جواب)

نوشین ملک..... جہلم

نت سنے خواب کے اشارے ہیں  
یہ محبت کے استعارے ہیں  
(مہوش سلطان سکھر کا جواب)

محمد فرقان..... ملائکہ سوداگر پورہ

تخیلات کی دنیا غریب سے لیکن  
غریب تر ہے حیات و ممات کی دنیا  
(آصفہ بتول واہ کینٹ کا جواب)

خوش بخت الرحمن..... لاہور

یہ زمیں کاتنوں سے مزین ہوتی تب بھی چلے آتے  
پتھروں پہ چل کے تیرے گھر آتے ہیں دشواری ہے  
(نزهت احمد گجرات کا جواب)

قرآن حسن..... ساہیوال

اک بار گلاب عارض و لب کے ترے گلے میں  
اک برق تبسم پھر جو چمک جائے تو اچھا  
عبدالرحمن..... میرپ

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ دے  
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے  
انصار حسین..... حامد پور کنور

نہ کر محبت سے اتنی ہی نفرت کہ سمجھے کوئی  
کہ تجھ کو بھی کوئی ٹوٹ کر چاہتا ہے

ماہنامہ سرگزشت

(محمد مدیم اختر ملکٹ کا جواب)

شکستہ مشاق..... لاہور

وقت نے وہ خاک اڑائی ہے کہ دل کے دشت میں  
قافے گزرے بھی ہیں مگر نقص پا کوئی نہیں

(عدنان مسین کراچی کا جواب)

ناصر تحریک..... کراچی

اور دنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا  
آنکھ میں نے دکھایا تھا کہ پتھر برے

(فرخندہ قاضی لاہور کا جواب)

رانا حبیب الرحمن..... لاہور

یہ خام خیالی ہے کہ یہاں تقدیر بنائی جاتی ہے  
ہم تو خود تقدیر کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں  
آصفہ بتول..... جھنگ

یہ مانا ضبط غم میں گریہ و زاری نہ کر پائے  
چھپایا کل مگر خوشبو کی نہ داری نہ کر پائے  
(ناصر حسین حیدر آباد کا جواب)

ضیا احمد..... ڈی آئی خان

غم کے دو انداز ہیں وجدان و عرفان  
دونوں کی تصویر ہے شاعر کا دیوان

(فدا محمد درک لاہور کا جواب)

نیاز منکھانی..... سکھر

جو آتش خاموش سلگتی ہے دلوں میں  
اٹھ اٹھ کے اسے اور ہوا دیتی ہیں آنکھیں

(اشفاق احمد ملتان کا جواب)

نازش سحر..... ملتان

لبو کا دریا عبور کرنے کو لازمی ہے جنوں لیکن  
جو صاحب ہوش بھی تھا تیرا کہ سب سے آگے نکل گیا وہ

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی  
لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس  
اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے  
جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام ..... ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی □ سسٹمز □ پاکیزہ □ مرکز نشٹ □ بھجوا دیا جائے  
کسی ایک پر ☒ آئیجی۔

اگرچہ کہ روپے جذبات نمبر 30 مارچ 2015 تک ملی گا 112 اسٹیمبر 982 گرامی 4200



ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ  
ماہنامہ سسٹمز ڈائجسٹ  
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ مرکز نشٹ

کے حصول میں وقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے  
علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور  
آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

**شکایت فیکس کریں**

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551



قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی  
تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی"  
شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر  
کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر  
ارسال کر سکتے ہیں۔

نام:

پتا:

محترم! متحرکہ ..... کے شعر کے جواب میں  
شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کریں  
(شعرا لگ کاغذ پر ہے) **72**

**مقابلہ بیت بازی**

بیت ہی نمبر 982 گرامی 4200

مارچ 2015ء

209

ماہنامہ مرکز نشٹ



# علمی آزمائش 112

انارہ

ماہنامہ سرگزشت کائنات و انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس مفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوا دیجئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سپینر ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک مئی سرگزشت" کے عنوان تلے مفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچئے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوہن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجئے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 مارچ 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

14 فردری کو چکوال میں پیدا ہوئے۔ 1938ء میں فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے وقت اسٹاف کالج کے واحد مسلمان انسٹرکٹر تھے مگر بعد میں وہ تاریخ پاکستان کے سب سے متنازع کردار قرار دیے گئے۔

علمی آزمائش 110 کا جواب

مولانا غلام رسول مہر 15 اپریل 1895ء میں پھول پور جالندھر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ گیارہ برس کے سن میں یتیم ہو گئے۔ تعلیم سے خصوصی دلچسپی تھی۔ لکھنے لکھانے کا شوق بچپن سے تھا۔ اپنی عمر پر چوتھے چوتھے کافی نام پیدا کر لیا اور صحافت کی آبرو کے خطاب سے نوازا گیا۔

انعام یافتگان

1۔ عنایت علی۔ لاڑکانہ 2۔ ذبیحہ بادی۔ چنیوٹ 3۔ انعام الحق جاوید۔ سکھر

4۔ زاہدہ ادریس۔ میرپور آزاد کشمیر 5۔ نیاز کھوکھر۔ لاہور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے نعمان اشرف، رسول بخش علیجو، ارباب حسین ہارون صدیقی، اسرار احمد، یاسط فاروقی، علی زبیر سید، زاہد حیات، نعمت گل، عنبرین احمد، کلیم صدیقی، عنایت کبیر، یاسین خان، مختار جت، کاوش ارشد، صدف طاہر، انعام حیات، خاقان احمد، فرحت عباس نقوی، علی نظیر، نیاز احسن، اکبر حسین، اشرف اللہ خان، عبدالحمید، سبطین سید، طفیل احمد، غلام حسن، مولا بخش برٹ، نبیل اختر، الیاس محمد، قیام الدین انصاری، توصیف احمد انصاری، محبت سجاد، صباحت مرزا،



سبیل احمد کھتری۔ سید توفیق امداد امام رضوی، مسز زبیدہ خاتون، سچائی کا دوائی، محمد فیضان، نیاز احمد، شاہد فاروقی، فتح، احسان، آس محمد، محسن اختر بلوچ، احمد اعزاز، اختیار الدین صدیقی، سلیم بیگ، شاہد بٹول، امجد سعید عطاری، عاصم ملک، شکیلہ فاروقی، خالدہ ادریس سلفی، شوکت علی، تسلیم ضیا، کوثر جہاں، آفتاب منصور، ملک غلام علی، سنجیدہ، احمد حسن خان، چکڑی، سید عزیز الدین، پروین کنول، جمیل عثمانی، نعمت مرزا، اختر عباس، اطہر حسین، تانیہ احسن، امیر الاسلام، زبیر ملک، جمینا کوثر، نوید حسن، زبیر اختر، جاوید اقبال، توقیر حسین، غلام شہر، عابدی، خاقان خان، نرجس فاطمہ، وردہ بٹول، انیس احمد، چاؤڈ، محمد فتح، یاب خان، چکڑی، محمد فیضان، محمد سلیم کھوکھر، ہارون محمد، سعید الدین مروت، فہیم بٹ، خواجہ خیر محمد، خیر پور سے احمد علی زیدی، نورین اصغر، قیام الدین، ارشاد انصاری۔ گجرات سے ذیشان علی سید، محمد طاہر، واثق علی، ارشاد زیدی، نعمان فاروقی۔ شادی پور سے احمد علی، نسیم نیازی، ہارون اشرف، نیاز بٹ۔ خانیوال سے ارشد علی، تقیر حسین، عابد سلطان، عمران حیات خان، ڈی آئی خان سے یاور حسین، زاہد علی، اللہ بخش، سلمان اشرفی، ڈی جی خان سے یونس احمد، نذر علی سید، خاقان اشرف، نصیر علی نصیر۔ جھنگ سے نورین ملک، انعام عباس، کائنات فاطمہ، زاہد علی، وقار علی۔ ملہ سنگ سے فصیح الدین، مرزا انعام، کلیم الدین، اختر عباس، توصیف حسین سید۔ شجاع آباد سے غلام فتحمن، عباس حیدر، نمیل خان، جنید علی صدیقی۔ چنیوٹ سے فتح یاب خان، ماہا زیدی، فرمان علی، صولت حیات، اشرف علی خان، سرگودھا سے محمد یامین، الیاس صادق بٹ، انعام حسین، محمد سلیم الدین۔ حاصل پور سے فرمان الیاس، فرہین، کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ لدن سے انیس احمد، غیاث الدین۔ سیالکوٹ سے شفیق شکی۔ بھکر سے محمد عارف قریشی، زکس خان۔ میرپور خاص سے نوشین فاطمہ زیدی، علی عباس، حیات محمد، رخسانہ چانڈیو، فرحین رضا، نعمان قائم خانی، شہر حسن۔ جھکین فرحت الاسلام، محمد عاقل، ارشد سلیم، شاہد اسلام خان، فرزا الدین، عبدالقیوم، شہزاد مصیو، صنوبر جوہر، فرحت اللہ بھٹو، انم خورشید، فاضل جوگی، نعمت جوہر، محمد عطاء اللہ، یاسین، نسیم، اشرف، نرہت، پروین، زینب فرید، انصہانی، کوبہ نسیم۔ سوئی بلوچستان سے محمد اکمل قرہ۔ فیصل آباد سے: شفیق، سلم، منور سلیم، نصرت جہاں، عباس علی انصہانی، خاقان خان، ذراغور، ولاور حسن، دلدار بھٹی، کاشف، شفیق خاقان، عرفان مروت، فہیم اختر، زبیر علی، ملک شفیق، نعمان حسن، شازیہ احسن۔ رحیم یار خان سے: ظہور الدین، پائلونی، نرینہ، کاشان، لاشاری، فاطمہ فرحت، نصرت اسماعیل، شیر حسین، شیریں اسماعیل، چانک، امتیاز احمد، نازش عمار، یاسر محمد عابد، کیف سردی، گل باز خان، زیب النساء، بدین سے: عباس علی، ساند، شاہد علی۔ چکوال سے: عارف احمد، جاوید، وسیم احمد، صاحب جان، سلفی ممتاز۔ راولپنڈی سے ظفر اسماعیل، سرفراز خان، قیام الحسن، کاظم جعفری، حیات محمد، یامین محمد، قیام الحسن، انصار الدین، احسن ممتاز، فرقان جعفری، صدف حسن، عنبرین عنایت علی، ذیشان مصطفیٰ، طفیل احمد، محمد ذیشان، رفیق مصطفیٰ، نظیر حسین، اہیہ جعفری، نیاز علی، گل فراز، کلیم رحیمانی، سلمان توقیر، ارباز خان، وردہ علی سید۔ اسلام آباد سے: نثار شاہین۔ لاہور سے: مسرت اسلم ملک۔ ظفر الحسنین، عباس علی سید، فیضان بٹ، عارف صدیقی، رشید علی، محمد یاسین، کائنات بٹ، نیاز چوہان، متین لاہوری، سلمان احمد بٹ، اشرف علی، طاہر احسن، رحیم بخش، فہیم احمد۔ علی مصطفیٰ، میاں ساجد، واگھڑی (کوٹرو) محمد نوید اختر، عبدالجبار (کمالیہ) خان بیلہ سے: عائشہ عبدالرشید۔ مسلم باغ (بلوچستان) سے: رحمت اللہ باغ۔ قصور سے: نرائے محمد، نوید کھل (بٹوکی) میرپور آزاد کشمیر سے: محمد حسین۔ ساہیوال سے: ارباز خان، زویا بٹول۔ شیخوپورہ سے: انیس احمد۔ پشاور سے: عباسی طور، الیاس گل، فرحان خان، نواز ش کاظمی، فصیح الدین، کبیر الحسن، رحیم اللہ، نجم الدین، نوشین ملک، ارشد مہدی، نیان محمد، فرقان سید، مظہر حسین بھیکو، شاہد خان آفریدی، سلمان اچکڑی، سلمان محمد، احمد شاہین، تنک، مرزا اسلم ملک، نسیم الحسن۔ پشاور خان گل عزیز، سرفراز گل۔ بہاولپور سے: کاظم علی، شاہ کوثر، رحیم داد چودھری، نور الہی فضل، فیضان مصطفیٰ، عباس علی، مظہر حسین، کاظم علی، انیس احمد صدیقی، ماہا نیازی، بلو نیازی، ثنا نیازی۔ میانوالی سے: عبدالخالق (کالا باغ)

بیرون ملک سے احمد خان، یاسین گل، احمد صدیقی (شارجہ)، علی خان (دہلی)، اسلم شاہد (جرجی)، محمد اسرائیل (مسقط)، ارباز خان (نویجاپان)، گل صنوبر (بحرین)۔



بچانے والا

محترم مدیر اعلیٰ

السلام عليكم

مارنے والے سے بچانے والا قوی ہوتا ہے۔ یہ معقولہ بچپن سے سنتی آئی ہو۔ میری زندگی میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ رونما ہوا ہے جو خود میں منفرد ہے۔ آپ یقین کریں میری زندگی دائرہ پر لگ گئی تھی مگر بچانے والے نے بچا لیا۔

(اسیر کو دشا)

جنگل کے کامبر تھا۔ بڑا ہوا تو بڑی صحبت میں پڑ گیا۔ تعلیم اس نے اسکول کے زمانے میں چھوڑ دی تھی۔ ایسے لوگوں کا آخری ٹھکانا منظرِ چودھری جیسے بد معاشرے کے ذریعے ہوا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بچپن میں سیکینہ اس کی منگ بھی مگر اس کے کزنوت دیکھتے ہوئے سیکینہ کے گھر والوں سے پہلے خود فضل کے باپ نے یہ رشتہ ختم کر دیا۔ حالانکہ شکل و صورت کا اچھا تھا اور سیکینہ کے ساتھ اس کی جوڑی بھی مگر اب سیکینہ اپنی خالہ کے گھر جانے والی تھی۔ اس نے انٹر کر لیا تھا اسی سال اس کی شادی متوقع تھی۔

ماضی میں ایسے واقعات ہو چکے تھے کہ گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں نرسراں طور پر غائب ہوئیں اور پھر پرمشور طور پر واپس آئیں۔ عزت کے لیے ان کے گھر والے دم سہا ہوا بیٹھ گئے یا پھر گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ دوبار ایسا ہوا کہ ان کو اپنے والدین کی لڑکیوں کی لاشیں ملیں۔ پولیس نے ان کی موت کو مشکوک قرار دیا اور ان میں سے ایک لڑکی کے بھائی نے منظر کے لیے جاکر اسے قتل کرنے کی کوشش کی اور خود مارا گیا۔ بعد میں ان کی لاش بھی غائب کر دی گئی۔ ان واقعات کے بعد گاؤں میں بے تحاشہ ہو گئے تھے مگر

سیکنڈ نے مجھے بتایا کہ چودھری مظفر کی مجھ پر نظر ہے تو میں پریشان ہو گئی۔ چودھری مظفر ہمارے علاقے کا نامی نگرانی بد معاش اور جرائم پیشہ تھا۔ چوری، ڈکیتی، مویشی چوری، شراب و نشے کی فروخت اور اسمگلنگ اس کے دھندوں میں شامل تھا۔ گاؤں کے باہر اس کا بڑا سا ڈیرہ تھا۔ جہاں وہ اور اس کے حالی موالی رہتے تھے۔ وہ سب بھی چھپے ہوئے بد معاش تھے۔ گاؤں کے لوگ چودھری مظفر اور اس کے گروہوں سے ڈرتے تھے۔ ان کے منہ نکلنے سے گریز کرتے تھے بلکہ سامنا ہونے پر راستہ بدل لیتے تھے۔ خاص طور سے عورتیں ان سے دور رہتی تھیں۔ عورتوں کے حوالے سے بھی ان کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ اس حوالے سے کہتے ہی واقعات گاؤں میں پیش آچکے تھے۔ اس لیے سیکنڈ کی بات سن کر میرے ہاتھ پاؤں منڈے پڑ گئے تھے۔ میں۔۔۔ پوچھا۔۔۔ ”تجھے کیسے پتا چلا؟“

”میرے چاہے کا لڑکا فضل بھی مظفر کے ڈیرے پر

بتاے اس نے سنا اور پھر مجھے بتایا ہے۔“

ہم فضل کے بارے میں جانتے تھے۔ وہ اچھے  
 نڈان سے تھا مگر مختلف فطرت کا تھا۔ مزاج کا خیز اور لڑائی

وہ کتنی احتیاط کر سکتے تھے۔ گاؤں  
دیہات میں عورتوں کو بھی گھروں سے  
نکلنا پڑتا ہے اور نچلے طبقے کی تمام ہی  
عورتیں کھیتوں کے کام اور جانور چرانے  
میں حصہ لیتی تھیں۔ اس لیے لوگ بس  
اتنی احتیاط کر سکتے تھے کہ ایکلی عورت یا  
لڑکی کو جانے نہیں دیتے تھے۔ بہت سوں  
نے تو معاشی مجبوری کے باوجود اپنی  
عورتوں اور لڑکیوں کو گھر بٹھالیا تھا۔ مگر  
سب ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی  
عورتیں اور لڑکیاں مجبوری کے عالم میں  
باہر جاتی رہیں۔

اس گاؤں میں ہماری بھی زمین  
تھی اور میرے بابا گاؤں کے ہائی  
اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اور ہمارا سارا  
گھرانہ پڑھا لکھا اور ملازمتوں سے  
مسلک ہے۔ میرے دو بڑے بھائی  
شہروں میں ہوتے ہیں۔ میری بڑی بہن  
جس کی شادی ہو گئی ہے وہ بھی ایک  
سرکاری اسکول میں نچر ہے۔ لڑکیوں  
کا پرانٹری، بابا کے اسکول کے ساتھ ہی

ہے مگر اسے نڈل کا درجہ نہیں ملا تھا۔ بلکہ لڑکیوں کے لیے بھی  
اسکول اس وقت بنا جب میں پہلی کلاس میں آئی اور اس کے  
بعد اسکول درجہ بہ درجہ آگے بڑھتا رہا۔ لڑکیوں کا ہائی اسکول  
ہمارے گاؤں سے ذرا دور ایک قصبے میں تھا۔ بابا نے مجھے  
وہاں داخل کرا دیا۔ میں تانگے میں دوسری لڑکیوں کے  
ساتھ اسکول آتی جاتی تھی جس سے انٹر پاس کیا۔ مگر اس  
پاس کالج نہیں تھا اس لیے بابا کے کہنے پر میں نے ابھی سے  
پرائیویٹ بی اے کی تیاری شروع کر دی تھی۔

میرے ساتھ میری سہیلیوں ماہم اور سہیلہ بھی انٹر  
کیا تھا۔ ماہم میری طرح پرائیویٹ بی اے کر رہی تھیں۔  
سینئر کونکریٹھنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس کا باپ زمیندار تھا  
اور ان کے ہاں لڑکیوں کو اسکول سے آگے پڑھانے کا  
رواج نہیں تھا۔ حالانکہ اس کی خواہش تھی کہ وہ آگے بھی  
پڑھے۔ زمینداری تو ہمارے ہاں بھی تھی لیکن ہمارے ہاں  
لڑکیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ بہر حال اب کالج

جائے نہیں تھا اس لیے ہم ساتھ ہی رہتے۔ میں نے سیکنڈ سے  
کہا کہ وہ بھی کتا میں حاصل کر لے اور ہمارے ساتھ پڑھ لیا  
کرے اس کی تیاری ہو جائے گی اور وہ شادی کے بعد بھی  
بیچر زوے سکتی ہے۔ مگر سیکنڈ نہیں مانی۔ ماہم کو تعلیم کا شوق  
نہیں تھا وہ صرف اپنے منگیتر کے کہنے میں بی اے کر رہی  
تھی۔ میرا ارادہ بی اے کرنے کے بعد بی ایڈ کرنے کا  
تھا۔ مگر ماں جی نے کہہ دیا تھا کہ بی اے کے بعد مجھے جو  
پڑھنا ہے وہ اپنے شوہر کے گھر جا کر پڑھوں۔ وہ مجھے صرف  
بی اے ہی کرائیں گی۔

ہمارا گاؤں شکر گڑھ تحصیل میں پاک بھارت سرحد  
کے پاس ہے۔ مشکل سے دو کلو میٹر کا فاصلہ ہوگا۔ جن  
دنوں دونوں ملکوں میں کشیدگی ہوتی ہے یہاں رہنے والوں  
کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ بھارتی بے دریغ  
آبادی اور فائرنگ اور گولہ باری کرتے ہیں۔ میرے بچپن  
میں یہاں سے جد تھی۔ جس پر نہ کوئی رکاوٹ تھی اور نہ کوئی  
باڑھ لگی ہوتی تھی اس لیے جب بھارتی فوج فائرنگ کرتی



تو ہمارا بہت نقصان ہوتا تھا۔ لوگ مارے جاتے تھے اور جانور بھی فائرنگ کی زد میں آتے تھے۔ بلکہ جانوروں کا جانی نقصان کہیں زیادہ ہوتا تھا۔ بابا بتاتے ہیں کہ ایک بار تو مسلسل فائرنگ کی وجہ سے ہم سرحد کے پاس کھیتوں سے گندم بھی نہیں کاٹ سکے تھے اور فصل خراب ہو گئی تھی۔ پھر کوئی دس بارہ سال پہلے جب دونوں طرف سے سرحدوں پر فوج جمع ہوئی تو ہماری طرف بھی سوراخے بنائے گئے اور سرحد کے ساتھ پٹے تعمیر کیے گئے۔ ان سے یہ ہوا کہ ہم براہ راست فائرنگ سے محفوظ ہو گئے تھے۔ مگر گولہ باری سے اب بھی محفوظ نہیں تھے۔ ایک بار چند گولے ہمارے گاؤں پر بھی گرنے لگے۔ اللہ نے کرم کیا کہ جانی نقصان نہیں ہوا مگر چند گھر گرے تھے۔

میرے دادا گورداسپور سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے اور وہاں اپنی زمینوں کے بدلے انہیں یہاں بارہ ایکڑ زمین مل گئی تھی۔ مشرقی پنجاب میں وہ اچھے خاصے زمیندار تھے مگر یہاں انہوں نے اپنی اولاد کو زمینداری پر لگانے کی بجائے تعلیم والا کر نوکریوں پر لگایا۔ میرے تایا اور چچا فوج میں گئے۔ ان کے بچے بھی فوج میں تھے۔ بابا نے تعلیم کا شعبہ پسند کیا۔ انہوں نے بی ایڈ کیا اور استاد بن گئے پھر نوکری کے دوران میں انہوں نے ایم ایڈ بھی کیا اور اب وہ اسکول پرنسپل تھے۔ روایتی سرکاری اسکولوں کی نسبت بابا نے اپنے اسکول کا ماحول اور تعلیمی معیار بہت اچھا رکھا تھا۔ اسکول کے بچے ہمیشہ سالانہ امتحانات میں کوئی نہ کوئی پوزیشن حاصل کرتے تھے۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بابا کا اسکول آگے رہتا تھا۔ یہاں کے لڑکے تقریری اور دوسرے مقابلوں میں بھی انعامات جیت کر آتے تھے۔ کئی سال تک بابا کے اسکول نے تحصیل کے بہترین اسکول کا ایوارڈ حاصل کیا تھا۔ یہ سب بابا کی محنت کا نتیجہ تھا۔

ہمارے گاؤں کی زمین زرخیز ہے۔ یہاں بہترین فصل حاصل ہوتی ہے۔ پانی بھی اچھا ہے۔ جب میں چھٹی تھی تب یہاں بجلی آئی، پھر فون اور ٹیکس کی سہولت بھی آگئی۔ آخر میں یہاں موبائل فون کی سہولت آئی۔ سڑکیں نہیں اور نزدیکی نہر پر بل بنے تو آنے جانے کے کئی راستے بن گئے۔ اس سے یہاں کے لوگوں کے لیے بہت آسانی ہو گئی تھی۔ نئی نسل کو اتنا محسوس نہیں ہوا لیکن بابا جانتے ہیں کہ ان کے زمانے میں بہت مشکل تھی۔ ہمیں کھانا بنانے کے لیے لکڑیاں خریدنا پڑتی تھیں اور کچا بادرنجی خانہ ہوتا تھا

کیونکہ جدید بادرنجی خانے میں لکڑی کہاں جلاتے۔ اسی طرح لائٹین کی روشنی ہوتی تھی۔ ٹی وی نہیں تھا۔ اخبار بھی ایک دن بعد آتا تھا۔ اب تو ٹی وی کھولو اور چھٹل لگاؤ تو پورے ملک کی خبریں ایک منٹ میں مل جاتی ہیں۔ انٹرنیٹ کی سہولت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دنیا جہان کی معلومات گھر بیٹھے مل جاتی ہیں۔

میرے بڑے بھائی عبدالرحمن اور عید الرحمن شہروں میں ہوتے تھے۔ عبدالرحمن بھائی ایک سیلور مینٹی میں اچھے عہدے پر تھے جب کہ عید بھائی اپنا بزنس کرتے تھے۔ میرے تایا اور چچا کے گھرانے پہلے ہی لاہور اور اسلام آباد منتقل ہو گئے تھے۔ اب گاؤں کی حویلی میں صرف بابا کا یعنی ہمارا خاندان تھا۔ وہ بھی کھل چار افراد پر مشتمل تھا۔ میں یعنی نازیہ، مجھ سے چھوٹا سیف الرحمن، بابا اور ماں جی۔ مجھ سے بڑی بہن رضیہ کی شادی میرے تایا کے لڑکے شہریار بھائی سے ہوئی تھی۔ میری نسبت چچا کے بیٹے وحید اللہ سے ملے ہوئی تھی۔ وحید ان دنوں کا کول اکائیڈ میں تربیت کھل کر رہا تھا اور آنے والے بہار میں اس کی پاسنگ آؤٹ پر بیٹھیں گی۔ بابا اور چچا کا ارادہ تھا کہ بی اے ملے ہوتے ہی ہماری شادی کر دی جائے۔ یہ ارشاد میرج ہوتی لیکن نسبت ملے ہونے کے بعد وحید خود بہ خود میرے دل میں گھر کرنا چلا گیا۔ اب اس کا نام بھی سنتی تھی تو دل کی دھڑکن خود بہ خود تیز ہو جاتی تھی۔

عید کے موقع پر عام طور سے پورا خاندان حویلی میں جمع ہوتا تھا اور اس وقت اگر وحید آیا ہوتا تو میں مشکل میں پڑ جاتی تھی۔ زیادہ تر اپنے کمروں تک محدود رہنا پڑتا تھا۔ صبح اور حویلی کے دوسرے حصوں میں بھی اس وقت جاتی جب مجھے پتا چل جاتا کہ وحید گھر میں نہیں ہے۔ مجھے بہت شرم آتی تھی۔ دو تین بار وحید سے اتفاقاً سامنا ہوا تو میری حالت خراب ہو گئی تھی۔ سب میری حالت دیکھ کر ہنستے تھے اور میرا مذاق اڑاتے، مجھے پرانی روح قرار دیتے۔ خود رضیہ بابا کی کہیں کہیں کہ اب لڑکیاں کہاں شرماتی اور مٹھیستروں سے ہنستی چھڑکتی ہیں اب تو وہ ان سے گپ شپ کرتی ہیں اور سو بائل پر بات کرتی ہیں۔ وحید نے دو تین بار مجھ سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی مگر مجھ سے بات ہی نہیں ہوئی۔ میں نے رضیہ بابا سے کہا کہ وہ ابھی مجھ سے بات نہ کرے۔

چاچا کی بیٹی بھائی عید پر ہمارے ہاں آئی تھی اور ہمیں قربانی کی تھی۔ وحید بھی آئے ہاں آتا تھا۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ



اس نے نہ صرف چھپ کر مجھے دیکھا بلکہ میری تصویریں بھی لی تھیں۔ مجھے بعد میں پتا چلا تو بہت شرم آئی۔ مگر ساتھ ہی اچھا بھی لگا۔ وحید نے بعد میں میرا موبائل نمبر کسی سے لے کر مجھے ایس ایم ایس کیا۔ ”قسم سے دل چاہ رہا ہے بس پاس آؤٹ ہوتے ہی تجھے لے جاؤں۔ نازو خدا کی قسم تو بہت خوب صورت ہے۔“

یہ ایس ایم ایس پڑھتے ہی میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے کیونکہ میرا موبائل بھی بابا بھی استعمال کر لیتے تھے۔ اگر وہ پڑھ لیتے تو نہ جانے دل میں کیا سوچتے۔ میں نے وحید کو منع کیا کہ بس وہ ایسے ایس ایم ایس نہ کیا کرے۔ مگر وہ باز نہیں آیا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ایس ایم ایس آتے تھے۔ ہمارے باپ ماحول ایسا نہیں تھا اور نہ ہی میری سہیلیوں میں ایسی کوئی تھی جو میری صورت سفل پر بات کرتی۔ ہمارے ذہن میں ایسی باتیں آتی ہی نہیں تھیں۔ حالانکہ ہم تینوں ہی صورتِ شکل کے اچھے تھے۔ مگر جب وحید نے کہا کہ میں بہت خوب صورت ہوں تب میں نے پہلی بار خود پر توجہ دی۔ نین نقش اچھے تھے۔ میرے برادریں بال بہت لمبے اور گھنے تھے۔ میرا قد پانچ فٹ چار انچ سے ذرا زیادہ تھا۔ میں نہ تو طویل قامت لگتی تھی اور نہ پست قامت۔ جسم متناسب تھا۔ اگرچہ وزن کسی قدر زیادہ تھا مگر گاؤں دیہات میں یہ عام ہی بات سمجھی جاتی ہے۔ پہنا اور حیا بھی چلتا تھا۔

وحید شکل و صورت میں بابا پر مکیا تھا۔ ان کی طرح سرخ و سفید اور کھڑے نعوش والا۔ مگر میں نے بھی اس کی شکل و صورت کے بارے میں نہیں سوچا۔ مجھے تو اس سے محبت تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی انتظار تھا کہ وہ کب آئے اور مجھے ہمیشہ کے لیے لے جائے۔ مگر مجھے تو یہ بات سوچ کر حیا آتی تھی وحید سے کبے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لیے اپنی محبت کا اظہار میں چیزوں سے کرتی تھی۔ عیدوں پر اس کے لیے خود کرتے کٹا کر بھیجتی تھی۔ اس کے لیے رومال بناتی تھی۔ سردیوں میں مٹی کی جوتیاں کرتی تھی۔ وہ جب حویلی آتا اس کے لیے تینوں وقت کا کھانا بھی ہی بناتی تھی۔ وحید یہ سب جانتا تھا اس لیے اس نے بھی اصرار نہیں کیا کہ میں عام لڑکیوں کی طرح اس سے بات کروں یا بے تکلف ہوں۔ بس وہ کبھی کبھی ایس ایم ایس کر دیا کرتا تھا اور میری جان پر ہن جاتی تھی۔

میں چھٹی کلاس سے پردہ کرنے لگی تھی۔ برقع یا عبا یا

نہیں پہنتی تھی مگر چادر سے خود کو پوری طرح ڈھک کر جاتی تھی۔ شروع میں چہرہ کھلا ہوتا تھا۔ مگر ذرا بڑی ہوئی تو چہرہ بھی چھپانے لگی تھی۔ صرف اسکول ہی نہیں بلکہ گاؤں میں بھی نہیں جاتی تو پردہ کر کے جاتی تھی۔ گاؤں کے سارے ذی حیثیت لوگ آس پاس تھے اور ان ہی سے ہمارے تعلقات تھے۔ یعنی مردوں کی مردوں سے اور عورتوں کی عورتوں سے۔ میری دوستی سکینہ اور مائیم سے زیادہ تھی۔ دو تین لڑکیاں اور بھی تھیں مگر ہم تین کا گروپ ایک دوسرے سے زیادہ قریب تھا۔ مائیم کا خاندان بھی زمیندار تھا اور ان کی گاؤں کے آس پاس اچھی خاصی زمینیں تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے کارخانے بھی تھے اور گاؤں میں ان کا شمار کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا تھا۔

حویلیوں کے درمیان ایک مشترکہ سی زمین تھی اور اس پر باغ بنا کر اسے عورتوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا یعنی حویلیوں کی عورتیں یہاں تفریح اور ہوا خوری کے لیے آتی تھیں۔ کناروں پر چارنٹ اونچی چار دیواری تھی اور اس میں آمد و رفت کے کئی راستے تھے۔ گھاس کے تھتھے تھے۔ پھولدار ہودوں کی کیاریاں تھیں۔ لکڑی اور مارٹل سے بنی نشستیں تھیں۔ درختوں پر خشکیں بندھی تھیں اور ہم لڑکیاں ان پر خشکیں لیتے تھے۔ عام طور سے شام کے آس پاس ہم یہاں آتے تھے۔ گپ شپ ہوتی اور پھر مغرب سے پہلے سب یہاں سے چلے جاتے تھے۔ حویلیوں کے محافظ نظر رکھتے تھے کہ کوئی باہر کا فرد اس طرف نہ آئے۔ اگر کوئی آنے لگتا تو وہ اسے پہلے ہی روک دیتے تھے۔ اس لیے ہم لڑکیاں یہاں کھل کر تفریح کرتے تھے اور آپس میں ہنستے بولتے تھے۔ ہمیں خوف نہیں تھا کہ کوئی وہاں آجائے گا۔ اتفاق سے اس روز میں اور سکینہ تھے اور سکینہ نے مجھے موقع پا کر خبردار کیا۔ میں مظفر چودھری کا نام سن کر سہم گئی تھی۔ وہ تھا بھی ایسا فرد جس سے انسان کو خوف آئے۔

اس وقت وہ تقریباً چالیس سال کا نومند اور صورت سے ہی خطرناک نظر آنے والا شخص تھا۔ وہ گورا چمکا تھا مگر اس کی آنکھوں کی سرخی اور مکروہ سے نفوش اسے ہیبت ناک بناتے تھے۔ میں نے اسے دو تین بار ہی دیکھا تھا اور ہر بار مجھے اس کی صورت سے خوف اور گراہیت آتی تھی۔ کھلے کمرے اور شلوار میں اس کا ڈیل ڈول اور زیادہ لگتا تھا ہمیشہ اس کے ہاتھ میں بڑی سی گن ہوتی تھی۔ وہ مکلی جیپ میں گاؤں اور علاقے کی سڑکوں پر دندناتا پھرتا تھا۔ اس کے



ساتھ اس کے چار پانچ کر کے بھی ہوتے تھے۔ پندرہ سال پہلے کوئی اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ اس علاقے کے بانی گرامی بد معاش اور اسمگلر صوفی شاہ کا آدمی تھا۔ مگر صوفی شاہ صرف اسمگلر تھا اور وہ عام لوگوں سے تعلق نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی عام افراد کو اس سے کوئی پریشانی ہوتی تھی۔ بلکہ سننے میں آیا ہے کہ وہ غریب غربا کی مدد بھی کرتا تھا۔ ایک بار سرحد پار مال لے جاتے ہوئے وہ فارنگ کا نشانہ بن گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ اسے پاکستان اور انڈیا کے سرحدی محافظوں نے مارا تھا اور بعض اس کا الزام اس کے دشمنوں پر لگاتے ہیں مگر آج تک پتا نہیں چل سکا کہ اس کا قاتل اصل میں کون تھا۔

مظفر چودھری صوفی شاہ کا معمولی درجے کا کارندہ تھا مگر اس کی موت کے بعد اس نے کچھ ایسا چکر چلایا کہ وہ چند سالوں میں گروہ کا سرغنہ بن گیا۔ شروع میں اس نے اسمگلنگ کی مگر اس کے بعد دوسرے جرائم بھی شروع کر دیے اور اس کی وجہ سے عام لوگوں کی زندگی متاثر ہونے لگی۔ اس نے نئی نسل کو شراب، منشیات اور دوسرے غلط کاموں پر لگا دیا۔ کہتے ہی مگر اس کی وجہ سے برباد ہو گئے۔ جب نشہ کی برائی آئی تو لوگوں میں شرم و حیا اٹھ گئی اور وہ اپنی عزتوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔ گاؤں میں تو بیٹیاں اور عزت سانبھی بچھی جاتی مگر دوسری بہت ساری قدروں کی طرح اب یہ بھی گاؤں سے غائب ہو چکی ہے۔ اب سب اپنی اپنی عزتوں کے خود ڈتے دار ہیں۔

ہماری حویلی کے گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں ہوتا تھا بس ایک ملازم راحت بابا تھا وہی گیٹ بھی کھولتا اور بند کرتا تھا مگر جب آس پاس ڈیکتیاں پھیل گئیں تو بابا نے ایک مسلح محافظ رکھ لیا۔ یہ راحت بابا کا بیٹا صاحب تھا اور ریٹائرڈ فوجی تھا۔ ہم اس خاندان کو نصف صدی سے جانتے تھے۔ اس کے پاس لائسنس بھی تھا۔ پستول اور شاٹ گن بابا نے اسے دلوا دی۔ اب وہ ہمہ وقت گیٹ پر رہتا تھا۔ رات میں گیٹ کے ساتھ ہی چوکی میں سوتا تھا۔ شروع میں ہماری حویلی کی دیوار مشکل سے سات فٹ اونچی تھی۔ جب حالات بد گئے تو بابا نے اس کی اونچائی دس فٹ کرا دی اور اس پر دونٹ کی خار دار تار لگوا دی جس میں بہ وقت ضرورت کرنٹ بھی دوڑ سکتا تھا۔ خود بابا بھی پستول اور ریوالور رکھتے تھے۔ شام ہوتے ہی مین گیٹ بند ہو جاتا تھا اور اس کے بعد صباحت کسی کے لیے بھی پورے اطمینان کے بعد ہی چھوٹا دروازہ کھولتے تھے۔

مسلح گارڈ گاؤں والوں کے لیے انوکھی چیز تھی۔ پہلے صرف بڑے جاگیردار مسلح گارڈز رکھتے تھے اور ان کا مقصد بھی حفاظت سے زیادہ اپنی شان و شوکت اور قوت کا مظاہرہ کرنا ہوتا تھا۔ مگر اب تو ہر صاحب حیثیت مسلح گارڈ رکھنے پر مجبور ہو گیا تھا اور یہ سب تبدیلیاں میرے دیکھتے دیکھتے آئی تھیں اور میں ان کے ساتھ ہی بڑی ہوئی تھی۔ اس لیے یہ سب مجھے نامانوس نہیں لگتا تھا پھر جب بابا اور ماں جی سے سنتی تو مجھے لگتا کہ واقعی تبدیلی آگئی ہے۔ مگر اس روز سیکند سے یہ خوفناک بات سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی اور تب مجھے صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ واقعی تبدیلی آچکے ہے۔ میں نے بھی سوچا نہیں تھا کہ کوئی میرے بارے میں بھی سوچ سکتا ہے۔ سوچنا تو دور کی بات ہے کسی نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

مظفر چودھری ہمارے علاقے کا ہوا تھا اور کوئی بھی اسے غیر سنجیدہ نہیں لیتا تھا۔ آغاز میں معمولی بد معاش نظر آنے والا مظفر چودھری اب اتنا طاقتور ہو گیا تھا کہ علاقے کے جدی پشتی جاگیردار بھی اس سے ڈرنے لگے تھے۔ وہ اس کے منہ کھلنے سے گریز کرتے اور اس کی سرگرمیوں سے نظریں چراتے تھے۔ شروع میں علاقے کے بااثر لوگوں نے پولیس اور انتظامیہ کی مدد سے اسے دھم ڈالنے کی کوشش کی مگر جلد ایک پڑوسی گاؤں کے جاگیردار کے گھر ایسا ڈاکا پڑا کہ ڈاکو مال کے ساتھ عزت بھی لے گئے تھے۔ تب سے ان طاقتور لوگوں نے بھی مظفر چودھری کا راستہ چھوڑ دیا۔ اب وہ جنگل کے کسی درندے کی طرح آزاد تھا جو چاہتا کرتا کوئی اسے روکنے والا نہیں تھا۔ پولیس والوں سے اس کے تعلقات تھے اور اس کی طرف سے انہیں باقاعدگی سے بھاری رقم ملتی تھی اس لیے اب پولیس بھی اس کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں تھی۔

ایسے شخص کے بارے میں جب کسی لڑکی کو پتا چلے کہ وہ اس پر بری نظر رکھتا ہے تو اس کا کیا حال ہو سکتا ہے؟ وہی حال میرا ہوا تھا۔ پھر مجھ سے باغ میں نہ ٹھہرا گیا۔ کئی بات ہے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں سیکند سے معذرت کر کے گھر آئی تو وہاں کے ابتدائی موسم میں بھی مجھے سردی لگ رہی تھی۔ ماں جی نے مجھے دیکھا تو فکر مند ہو گئیں۔ "نازی کیا ہوا ہے تیری رنگت بلی جھک ہو رہی ہے۔"

"کچھ نہیں ماں جی۔" میں نے کہا تو ماں جی نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ "تھک گئی۔"

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پھلجھیری

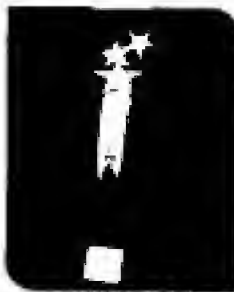
قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

کے لیے اور دنیا بھر کے لوگوں کے لیے

اجل زیدی

ملتی  
ایوارڈ  
بولڈ



AWARD OF  
BEST ACHIEVEMENT



ASIAN EXCELLENCE  
PERFORMANCE AWARD



AWARD  
PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9- اپریل 30 تا مئی  
9- اگست 30 تا ستمبر  
9- دسمبر 30 تا جنوری  
1962 تا 1967 عریضہ بر 20 تا 21 G-B  
سرکار کا طبی چیک اپ اسلام آباد  
فون: 2255880 - 2854595 (051)  
سویڈن: 0300-8566188  
تیس: 2251635

لاہور

گل ف سینٹر  
16 دسمبر  
نور احمد اور اس کے بچے  
نور احمد اور اس کے بچے  
سوال: 0300-8566188  
14- فروری 27 تا فروری  
14- جون 27 تا جون  
14- اکتوبر 27 تا اکتوبر

پشاور

ہیڈل لائٹ  
کیم فروری 11 تا فروری  
کیم جون 11 تا جون  
کیم اکتوبر 11 تا اکتوبر  
فون: 2218215-8 (0521)  
سوال: 0300-8566188

ملتان

پیشانی سینیٹر  
128-6 تا اپریل  
28 جولائی 6 تا اگست  
28 نومبر 7 تا دسمبر  
فون: 4518061-62 (061)  
4582603 (0300-8566188)

کراچی

لکڑی سینیٹر  
13-14 جولائی 27 تا مارچ  
13- جولائی 27 تا جولائی  
13- نومبر 27 تا نومبر  
فون: 706-706 (021)  
KFC 27 تا 27  
فون: 021-7017068-9  
سوال: 0300-8566188

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

http://www.pdfbooksfree.pk



”کیسے نہیں ہو رہا، تیرا ماں تھا گرم ہے۔ بخار ہو گیا ہے چل اندر میں تیرے لیے لالہ لگی والی چائے بنا کر لائی ہوں۔“

مجھے سچ بخار ہو گیا تھا۔ جب مظفر چودھری کا خیال آتا میرا جسم لرز اٹھتا تھا۔ پھر میں خود کو تسلی دیتی تھی کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے کہ کوئی میری طرف غلط نظر سے دیکھے۔ میرے بابا ہیں میرے بھائی ہیں۔ میرا بھتیجہ ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی کی جرات ہے میری طرف ہاتھ بڑھا سکے۔ اس کے باوجود میری بے چینی کم نہیں ہوئی تھی۔ رات تک مجھے تیر بخار ہو گیا تھا۔ بابا نے پریشان ہو کر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا فیصلہ کیا مگر میں نے منع کر دیا میں رات کے اس پہر باہر جانے کے خیال سے خوفزدہ تھی۔ اسپتال شکر گڑھ کے قصبے میں تھا اور وہ یہاں سے کوئی دس کلومیٹر دور تھا۔ کچی سڑک کی وجہ سے آدھے گھنٹے کا راستہ تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں جو بی بی محفوظ تھی یہاں سے نکلی تو کوئی مجھے اچک کر لے جائے گا۔ اس لیے میں نے انکار کر دیا۔

”میں باہر نہیں جاؤں گی۔“

”بیٹا ایک گھنٹے میں آجائیں گے۔“ بابا نے کہا۔

”آپ نے دوا دے دی ہے میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

پہلے ماں جی نے پٹیاں رکھ کر میرا بخار کم کیا تھا پھر بابا نے دوا دی تھی۔ میں باہر جانے سے اتنا ڈری کہ کچھ دیر میں سچ بخار میرا بخار اترنے لگا اور ایک گھنٹے بعد میں بسنے میں نہا چکی تھی اور بخار مکمل طور پر اتر گیا تھا۔ میں نے مجھے گھوڑ ملا دودھ دیا اور میں سو گئی۔ صبح اٹھی تو بی بی محفوظ تھی اور میں نے پہلی بار اللہ کا شکر ادا کیا کہ میری اسکول کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی ورنہ مجھے باہر جانے کے خیال سے بخار جڑھ جاتا۔ اب خوف بھی پہلے جیسا نہیں تھا بس مجھے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب میں سوچ رہی تھی کہ یہ بات ماں جی کو بتاؤں یا نہیں۔ مجھے شرم آرہی تھی اور اس سے زیادہ یہ خیال تھا کہ ماں جی پریشان ہو جائیں گی۔ وہ لازماً بابا کو بتائیں گی اور وہ بھی فکر مند ہو جائیں گے۔ بس اسی خیال سے میں نے زبان بند رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے اب میرا خیال زیادہ بہتر ہو گیا تھا کہ مظفر چودھری کتنا بڑا بد معاش سچ لیکن ہم بھی کوئی کرے پڑے نہیں تھے جو وہ اپنی مرضی کر جاتا۔ میرے گرد

مضبوط دیواروں اور ان سے زیادہ مضبوط بازوؤں کا گھیرا تھا۔

اب میں باہر جانے میں احتیاط کرنے لگی تھی۔ ہماری جو بی بی میں کئی ملازمائیں تھیں۔ ان میں ایک سفینہ بی بی بھی تھی۔ وہ تقریباً چالیس برس کی تنومند اور دلیر عورت تھی۔ مردوں کی طرح لالچی لے کر چلتی تھی اور اس کا استعمال بھی جانتی تھی۔ جب میں چھوٹی تھی اور گاؤں کے اسکول میں پڑھتی تھی تو اسی کے ساتھ آتی جاتی تھی۔ ایک بار سفینہ بی بی نے ایک پاگل کتے کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ وہ اچانک جھاڑیوں سے نکل کر ہم پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ ہم میں سے کسی کو کاٹ لے مگر سفینہ نے نہایت حوصلے سے اسے لالچی کی مدد سے ہم دونوں سے دور رکھا۔ اتنے میں میری چھین سن کر آس پاس کھینچوں میں کام کرنے والے لوگ آگئے اور انہوں نے کتے کو مار مار کر بھگا دیا۔ اگر اس روز سفینہ بی بی نہ ہوتی تو شاید کتا مجھے کاٹ ہی لیتا۔ مجھے اس پر اعتماد تھا۔ بڑے ہونے کے بعد میں نے سفینہ بی بی کے ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا مگر اب اسے ساتھ لے جانے لگی تھی۔ اسے ذرا تعجب ہوا تھا۔

”کیا ہوا تازی بی بی اب تک تو آپ اکیلے ہی چلی جاتی تھیں۔ پھر اب مجھے کیوں لے جا رہی ہیں؟“

”بس مجھے ڈر لگتا ہے آج کل حالات بھی ٹھیک نہیں ہیں اس لیے تمہیں ساتھ لے جاتی ہوں۔ تم بہت بہادر ہونا اس لیے۔“

”جیسی آپ کی مرضی بی بی۔“ وہ بولی۔

سفینہ بی بی کا اس دنیا میں سوائے ایک بیٹے کے اور کوئی نہیں تھا۔ ریحان سترہ اٹھارہ سال کا جوان لڑکا تھا مگر سفینہ بی بی کے برعکس اس میں ہمت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ نہایت بزدل اور ہر کسی سے دب جانے والا لڑکا تھا۔ بابا نے کوشش کر کے اسے اسکول میں اسی لگوا دیا تھا۔ مگر اس کی ملازمت کچی نہیں تھی۔ یہ کنٹریکٹ جاب تھی اور بابا نے کہا تھا کہ ریحان کے پکا ہونے کا امکان زیادہ نہیں تھا۔ اس پر بھی سفینہ بی بی بہت خوش تھی کیونکہ اس ملازمت سے پہلے ریحان کچھ نہیں کرتا تھا۔ اس نے بہ مشکل میٹرک تک پڑھا تھا اور اس کے لیے سے آوارہ محوم رہا تھا۔

سفینہ بی بی اس کے لیے بہت فکر مند رہتی تھی۔ اس نے بابا سے منت سماجت کر کے اسے نوکری پر رکھوایا تھا۔ ورنہ بابا کسی کی سفارش یا منت سے اسے نوکری پر نہیں تھے وہ تو



خلاف میرٹ کسی بچے کو پاس کرنا دور کی بات تھی اس کے سہرے تک نہیں بڑھاتے تھے۔ وہ اسکول کے ہر بچے پر نظر رکھتے تھے اور اگر انہیں شبہ ہو جاتا کہ کسی بچے نے کسی بچے کو پاس کی استعداد سے زیادہ نمبرز دیئے ہیں تو وہ خود اس کے پرچے نکلتا کر چیک کر لیتے تھے اور اگر بچے نے زیادہ نمبرز دیئے ہوتے تو اس کی شامت آ جاتی۔ ریسمان کے پارے میں بابا کا کہنا تھا کہ وہ ان کے اسکول کے ٹیچر ترین طلباء میں سے ایک تھا اور اس نے میٹرک کا امتحان نہ جانے کیسے پاس کر لیا تھا ورنہ وہ اس کا قاتل نہیں تھا۔ بہر حال ملازمت میں اپنا کام ٹھیک سے کر رہا تھا اسی لیے ملازمت پر برقرار تھا ورنہ بابا نے سفینہ کو خبردار کر دیا تھا کہ اگر اس نے ٹھیک سے کام نہیں کیا تو ٹھکے سے پہلے وہ خود اسے ملازمت سے نکال دیں گے۔ سفینہ بی بی نے یقین دلایا تھا کہ ریسمان دل لگا کر کام کرے گا۔

میں نے بتایا کہ میں اس پاس کی حویلیوں میں اپنی سہیلیوں کے پاس جاتی تھی یا پھر مشترکہ باغ میں چلی جاتی تھی۔ میں نے اب جانا کم کر دیا اور جانی بھی تو سفینہ بی بی کے ساتھ جاتی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی باغ میں رکتی تھی اور میں اسی کے ساتھ واپس آتی تھی۔ سفینہ بی بی کی وجہ سے ٹھکانا کم ہو گیا کہ اسے حویلی میں کام ہوتے تھے۔ وہ نہ تو ہر وقت میرے ساتھ نکل سکتی تھی اور نہ ہی میرے ساتھ زیادہ دیر تک سکتی تھی کیونکہ اور ماہم کے ہاں جانا ہوتا تو سفینہ بی بی مجھے چھوڑتی اور پھر مقررہ وقت پر واپس لینے آتی تھی۔ سیکڑ اور ماہم حیران تھے کہ میں نے اچانک آنا جانا کم کیوں کر دیا تھا۔ میں نے بہانہ کیا کہ میں بی بی اے کے پیپرز کی تیاری کر رہی ہوں اور کیونکہ خود سے پڑھ رہی ہوں اس لیے محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔

بابا نے میرا رجسٹریشن بکاپ بونورسٹی میں کرا دیا تھا اور مجھے تمام ضروری کتابیں منگوا دی تھیں۔ میں نے سال اول کے پیپرز کی تیاری شروع کر دی تھی۔ میں کئی گھنٹے بڑھنے میں مصروف رہتی تھی اس کے باوجود میرے پاس کئی گھنٹے رہتے تھے۔ مگر میں باہر کم ہی جاتی تھی۔ حویلی میں تفریح کی تمام سہولیات تھیں۔ ٹی وی اور کمپیوٹر تھا مگر میں کو پسند نہیں تھا کہ میں ایک جگہ سے زیادہ ٹی وی یا کمپیوٹر کے سامنے بیٹھوں اس لیے میں انہیں کم استعمال کرتی تھی۔ کمپیوٹر تو صرف انٹرنیٹ کے لیے استعمال کرتی تھی۔ ٹی وی بھی زیادہ تر حالات حاضرہ کے لیے دیکھتی تھی یا پھر کھانے بنانے والے پروگرام دیکھتی تھی، باقی مجھے ڈراموں اور شووز سے

کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ میرا اصل شوق مطالعہ تھا۔ جب میں فارغ ہوتی تو میرے ہاتھ میں کوئی کتاب اور رسالہ ہوتا تھا۔ عام گھرانوں کے برعکس جہاں بچوں کو ٹی وی، موبائل اور انٹرنیٹ استعمال کرنے کی پوری آزادی ہوتی ہے اور ماں باپ آنکھیں بند کر لیتے ہیں مگر جہاں بچوں کے ہاتھ میں کوئی کتاب یا رسالہ نظر آتا ماں باپ کو بچوں کی تربیت میں خرابی کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ مگر بابا نے ہم بہن بھائیوں کی حوصلہ افزائی کی کہ ہم پڑھیں اور سب پڑھیں۔ اس لیے ہم سب بہن بھائیوں کو مطالعے کا شوق ہے۔ کچھ پڑھے بغیر ہمیں نیند ہی نہیں آتی ہے۔

ایک مہینے بعد موسم بدل گیا تھا۔ سردی آگئی تھی۔ ایک دن ماں جی نے کہا۔ ”چل سردیوں کے کپڑے لٹاتے ہیں۔“ میں خود بھی ضرورت محسوس کر رہی تھی کیونکہ پچھلے ایک سال میں میرا قد اور وزن کسی قدر بڑھا تھا اور مجھے پچھلے سال کے کپڑے چھوٹے اور تنگ ہو گئے تھے اس لیے میں نئے کپڑے بنانا چاہتی تھی۔ میں تیار ہو گئی۔ ماں جی نے بابا سے کہہ دیا کہ اگلے روز ہم شاہجگ کے لیے جائیں گے۔ کپڑوں کی خریداری ہم سیالکوٹ سے کرتے تھے۔ وہاں ہر طرح کے کپڑے مل جاتے تھے۔ شکر گڑھ کی مارکیٹ اتنی بڑی نہیں تھی۔ اس لیے ہم سیالکوٹ جاتے تھے۔ بابا نے کہا کہ ہم صابحت کے ساتھ جائیں۔ جب بابا ساتھ نہیں ہوتے تھے تو صابحت کے ساتھ ہی بھیجتے تھے وہ ڈرائیو بھی کرتا تھا۔ ہم اگلے دن اسی کے ساتھ نکلے۔ ہمارے گاؤں سے سیالکوٹ کوئی پچاس کلومیٹرز دور اور راستہ مشکل سے ایک یا سوا گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے پہلے ہائی وے بہت خراب تھی مگر اب بہترین بن گئی ہے۔ وقت کا تقاضا نہیں چلتا ہے اور راستہ کٹ جاتا ہے کیونکہ دو پہر تک واپس آنا تھا اس لیے ہم نو بجے نکلے۔ مارکیٹ بھی اس وقت تک کھل جاتی تھی۔ دو سے تین گھنٹے میں خریداری مکمل کر کے ہم دوبارے بجے نکل واپس آ جاتے۔

جب میں نے میٹرک کیا تو بابا نے مجھے موبائل فون رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ پچھلے دنوں مجید بھائی آئے تو میرے لیے پاس ہونے کا گفٹ اسمارٹ فون کی شکل میں لائے تھے۔ سیکنڈ ہانڈ میں، میں نے بابا سے اسمارٹ فون مانگنے کا کہا مگر ماں جی نے منع کر دیا تو دل سوس کر رہ گئی۔ اب مجھے صاف طور پر بھائی نے گفٹ کر دیا تو میں خوش ہو گئی تھی۔ سفر کے دوران میں اسی میں لگی رہی اسی لیے مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ ایک جیب ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔



صباحت کے چوکس ذہن نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ گچاؤں سے نکلنے ہی یہ سیاہ جیب ہماری کار کے پیچھے لگ گئی تھی۔ اس نے راستے میں کئی بار رفتار بڑھا کر اور کم کر کے چیک کیا تو جیب کی رفتار بھی کم اور زیادہ ہوئی تھی۔ سیالکوٹ پہنچ کر اس نے ہمیں مارکیٹ میں چھوڑا اور کار کا آئل چیک کرانے کا کہہ کر چلا گیا۔ البتہ اس نے جاتے ہوئے کہا تھا۔ ”بی بی جی جب تک میں نہ آؤں مارکیٹ سے باہر مت آئیے گا۔ جب میں کال کروں تب آئیے گا۔“

ماں جی حیران ہوئیں۔ ”مگر کیوں پتر؟“ اس وقت صباحت نے ہمیں اصل وجہ نہیں بتائی اور بہانہ کیا۔ ”ماں جی آج کل یہاں وارداتیں بہت ہو رہی ہیں۔ اکیلی عورتوں کو دیکھ کر ڈاکو آجاتے ہیں۔ اندر مارکیٹ میں خطرہ نہیں ہے۔“

ہم مارکیٹ میں آئے اور خریداری میں لگ گئے۔ اس میں تین گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ اس دوران میں صباحت نے اس جیب کو اپنے پیچھے لگانے کی کوشش کی مگر وہ مارکیٹ کے باہر رہی۔ تب اس نے یہ کیا کہ مارکیٹ کے دوسری طرف آیا اور اس نے ماں جی کو کال کر کے اس طرف سے باہر آنے کو کہا۔ یہ کپڑا مارکیٹ کا بیرونی حصہ تھا مگر مارکیٹ کے اندر ہی واقع تھا۔ ماں جی اور میں حیران ہوئے تھے کہ اس نے ہمیں وہاں کیوں بلایا ہے؟ ہم باہر آئے تو وہ غلجٹ میں تھا۔ اس نے جلدی سے سامان رکھا اور ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ جیسے ہی ہم بیٹھے اس نے کار چلا دی تھی۔ مارکیٹ سے باہر آنے پر ماں جی نے پوچھا۔ ”پتر کیا بات ہے تو نے وہاں کیوں بلایا میں؟“

تب صباحت نے اصل وجہ بتائی۔ ”ماں جی گاؤں سے نکلنے ہی ایک سیاہ جیب ہمارے پیچھے لگ گئی تھی اور وہ مارکیٹ تک ساتھ رہی۔ میں یہی چیک کر کے لے گیا تھا کہ وہ صرف پیچھے آتے ہیں یا نہیں مگر وہ مارکیٹ کے باہر ہی رہے۔“ صباحت نے بتایا۔ ”اس لیے میں پیچھے کی طرف گیا اور آپ دونوں کو بھی وہیں بلایا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ صاحب سے کال کر کے مشورہ کر لوں۔“

ماں جی نے اپنے موبائل سے بابا کو کال کی اور انہیں صورت حال بتا کر موبائل صباحت کو تھما دیا۔ وہ بابا سے بات کرنے لگا۔ میں نے محسوس نہیں ہونے دیا مگر سیاہ جیب کا سن کر میں اندر سے سم گئی تھی۔ مجھے لگا کہ اس کا تعلق مظفر چودھری سے ہو گا۔ میں ماں جی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس

لیے دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ ہم خیر خیریت سے واپس جو ملی پہنچ جائیں۔ صباحت کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ بابا بھی یہ سن کر فکرمند ہو گئے تھے۔ انہوں نے صباحت سے کہا کہ وہ واپسی میں دوسرا راستہ اختیار کرے۔ اس نے سیالکوٹ سے پرسور جانے والی سڑک کھڑی اور بڑا ٹکا سے اسے شکر گڑھ کی طرف موڑ دیا۔ مظفر وال سے ہوتے ہوئے ہم شکر گڑھ کی طرف آئے۔ شکر ہے اس راستے میں ہمیں سیاہ جیب نہیں ملی۔

مگر جیسے ہی ہم شکر گڑھ سے آگے نکلے سیاہ جیب پھر ہمارے پیچھے آنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سیالکوٹ کی مارکیٹ میں ہمارا سراغ کھونے کے بعد انہوں نے اس جگہ انتظار کرنے کا سوچا تھا کیونکہ گاؤں کی طرف جانے کے لیے اس جگہ سے لازماً گزرتا پڑتا تھا۔ اس ہانکی وے کا سب سے سنسان حصہ یہی تھا اور یہاں دن میں بھی ٹریفک بہت کم ہوتا تھا۔ بابا نے دو سال پہلے یہ نشان کار لی تھی اس کا انہیں بہت طاقتور تھا۔ پھر صباحت ماہر ڈرائیور بھی تھا۔ اس نے رفتار تیز کی۔ اب گاؤں زیادہ دور نہیں تھا۔ عام طور سے شکر گڑھ سے تیس پچیس منٹ کا راستہ ہے لیکن اس روز صباحت نے اسے صرف پندرہ منٹ میں طے کیا اور ہم جو ملی پہنچ گئے۔ ان پندرہ منٹوں میں ہمارا یعنی میرا اور ماں جی کا ذمہ دار خون خشک ہوا تھا۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ سیاہ جیب گاؤں کے باہر تک پیچھے رہی پھر وہیں رک گئی۔ اس نے گاؤں والے راستے پر آنے کی کوشش نہیں کی۔

جو ملی میں آکر میں نے سکون کا سانس لیا۔ ماں جی پریشان تھیں۔ صباحت نے جیب کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ کچھ دیر میں بابا آگئے تو اس نے انہیں جیب کا نمبر بتایا۔ نمبر سیالکوٹ کا تھا۔ اتفاق سے بابا کا ایک شاگرد دیپل رجنٹریشن آفس میں کام کرتا تھا۔ بابا نے کال کر کے اسے نمبر بتایا اور جیب کے مالک کے بارے میں پوچھا۔ اس نے چھان بین کر کے اگلے دن بتایا کہ جیب کا مالک کوئی میاں نیاز احمد ہے اور پتا شکر گڑھ کا ہے۔ مگر جب مزید چھان بین کی گئی تو پتا چلا کہ جیب میاں نیاز احمد کے نام پر تھی لیکن یہ وہ جیب نہیں تھی جو ہماری گاڑی کے پیچھے لگی رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ جعلی نمبر پلیٹ استعمال کر رہی تھی۔ بابا اور ہم مزید پریشان ہو گئے تھے۔ بابا اور ماں جی کے ذہن میں وہی بات تھی کہ سیاہ جیب میں ڈاکو تھے مگر مجھے یقین تھا کہ اس میں مظفر چودھری خود یا اس کے آدمی تھے اور وہ میرے پیچھے



آئے تھے۔

سوار مشکوک افراد کے بارے میں بتا دیا تھا۔ سیف الرحمن ان دنوں بی بی اے میں داخلے کا ٹیسٹ دینے اسلام آباد عبید بھائی کے پاس گیا ہوا تھا۔ اگر اس کا داخلہ ہو جاتا تو وہ وہیں رہتا۔ گویا حویلی میں صرف بابا رہ جاتے۔ سیف اگرچہ صرف سولہ سال کا تھا مگر مرد تھا اس کے ہونے سے جو ڈھارس ہو سکتی تھی اب وہ نہیں تھی۔ بھائیوں نے بابا کو مشورہ دیا کہ وہ اضافی کارڈ رکھ لیں اور اب مجھے اور ماں جی کو باہر گھنچیں تو ہمارے ساتھ کم سے کم دو افراد ہوں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں بھی عبید بھائی کے پاس چلی جاؤں۔ بے شک کچھ عرصے کے لیے تو شاید میرے لیے بہتر ہو۔ میں نے ماں جی سے کہا تو انہوں نے منع کر دیا۔ ”میں اکیلی رہ جاؤں گی۔“

”ماں جی بس کچھ عرصے کے لیے۔“

ماں جی نے پھر انکار نہیں کیا مگر ان کے موڈ سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے شاید ہی اجازت دیں۔ میں نے بابا سے اجازت لینے کا سوچا مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے سوچا کہ سرما میں پیپر ز کی تیاری کر لوں اور بہار میں اسلام آباد جاؤں۔ ابھی تو وہاں یہاں سے زیادہ ٹھنڈ شروع ہو گئی تھی۔ سیف کی کال آئی تو اس نے بتایا کہ غضب کی سردی ہے اور کنبل سے نکلنے کو دل نہیں چاہتا ہے۔ سردی یہاں بھی تھی مگر اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ہاں شام کے بعد کھلے میں نکلنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ میں پیپر ز کی تیاری اور گھر کے کام دن میں نمٹا لیتی تھی۔ شام سات بجے ہم کھانا کھا لیتے تھے اور اس کے بعد حیرا وقت شروع ہوتا جب میں ہولی اور کتابیں رسالے ہوتے تھے۔

بابا نے نہ صرف ہمیں مطالعے کا شوق دلایا تھا بلکہ ہمارے گھر میں ڈیڑھ دوں کتابیں بھی تھیں۔ ایک بڑا سا کمر لاہری ری کاروپ اختیار کر گیا تھا اور اس میں بلاشبہ ہزاروں کتابیں تھیں۔ ہر مہینے درجنوں کے حساب سے نئی کتابیں، ورچن سے اوپر مختلف رسائل اور روزانہ کی اخبارات آتے تھے۔ ہفتہ وار رسائل اس کے علاوہ تھے۔ کتابیں بابا خود لاتے تھے۔ مجھے دقیق موضوعات پسند نہیں تھے۔ فلشن کے علاوہ جگہ جگہ موضوعات پر کتابیں پڑھتی تھی۔ رات کو پڑھنے کے لیے پہلے سے کچھ منتخب کر لیتی اور موڈ کے لحاظ سے اسے لے جاتے یا کافی بنا کر میں رضائی میں گھس کر مطالعے میں لگ جاتی تھی۔ اگر کوئی ایس ایم ویس آ جاتا تو اسے دیکھ لیتی، جواب دینے کا موڈ ہوتا تو دقیق ورثہ صبح تک

مجھے ایک بار پھر خیال آیا کہ بابا نہ سہی ماں جی کو بتا دوں کہ مظفر چودھری میرے چچھے ہے۔ مگر میں کہہ نہ سکی شرم، جھجک اور خوف سب مانع آئے تھے۔ سیکر نے جب مجھے یہ بات بتائی تو اس کو مہینے سے اوپر ہو گیا تھا اور میرا خوف کسی قدر کم ہو گیا تھا مگر آج کے واقعے نے اس خوف کو نہ صرف تازہ کر دیا تھا بلکہ بڑھا دیا تھا۔ بابا نے پابندی لگا دی کہ اب میں اور ماں جی ان کے بغیر حویلی سے باہر نہیں جائیں گے۔ صباحت کو حکم دیا کہ حویلی کا بڑا گیٹ اب دن میں بھی بند ہوگا اور چھوٹا گیٹ اچھی طرح دیکھ بھال کے بعد کسی کے لیے کھولا جائے گا۔ میں تو خود بھی چاہتی تھی کہ گھر میں رہوں اور باہر نہ جاؤں۔ اس لیے بابا کے فیصلے سے خوشی ہوئی۔ مگر بابا اور ماں جی دونوں سمجھ رہے تھے کہ یہ ڈاکوؤں کا چکر تھا۔ ماں جی نے بابا سے کہا کہ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ”آپ پولیس میں رپورٹ کریں آخر آپ کے اتنے شاگرد پولیس میں ہیں۔“

”وہ بھی کروں گا اور یہ مسئلے کا حل نہیں احتیاط ہے۔“ بابا نے سمجھایا۔

”بابا ٹھیک کہہ رہے ہیں ہمیں باہر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔“ میں نے بابا کی تائید کی تو وہ خوش ہو گئے۔

”میری بیٹی ماں سے زیادہ سمجھدار ہے۔“

ماں جی خفا ہو گئیں۔ ”ہاں، میں ہی نا سمجھ ہوں۔“

ہماری زمینیں ٹھیکے پر تھیں۔ دادا نے بارہ ایکڑ زمین لی تھی مگر بعد میں بابا اور ان کے بھائیوں نے کوشش کر کے اسے ایک مربع کر لیا تھا اور اب بھی زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی سے وہ نئی زمینیں لے رہے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ بے شک زمین پر زمت یا پرنس کیا جائے گا مگر ایک بنیاد کے طور پر زمین رکھی جائے اور اسے بڑھایا جائے۔ یہ اب تک مشترک تھی اور ان کو کوئی ایسے حصے سے دست بردار ہوگا تو دوسرا اسے خرید لے گا۔ ان کو فروخت نہیں کی جائے گی۔ مگر ساتھ ہی زمین کے معاملے کو برین رکھے جائیں گے ہر کسی کو معلوم تھا کہ اس کی زمین اتنی کم اور یہاں بھی۔ بعد میں تنازعات سے بچنے کے لیے بابا اور ان کے بھائیوں نے یہ انتظام کیا تھا۔ انہوں نے اگلی نسل سے کہہ دیا تھا کہ ان کے بعد زمین خاندان کی سطح پر تقسیم کر لی جائے اور ہر خاندان اپنی زمین کا خود سے دوار ہوگا۔

بابا نے دونوں بھائیوں کو بھی سیاہ جیپ اور اس میں



کے لیے ملتی کر دیتی۔ میں نے ماہ کا ایک ڈائجسٹ دیکھ رہی تھی کہ ایس ایم ایس نون بجی۔ میں نے صبح کھول کر دیکھا۔ اس میں لکھا تھا۔  
”تم مجھے اچھی لگی ہو۔ اس لیے تمہارا نمبر حاصل کیا ہے۔“

میرا دل ایک لمحے کور کا تھا۔ میرے پاس دو سال سے موبائل تھا اور مجھے آج تک ایسا کوئی ایس ایم ایس نہیں آیا تھا۔ میرے دل نے بے ساختہ گواہی دی کہ یہ صبح مظفر چودھری کی طرف سے تھا۔ میں اتنی خوف زدہ ہوئی کہ مجھے لگا کہ وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ میں عام طور سے رات کو دروازہ اندر سے بند نہیں کرتی تھی کیونکہ ماں جی رات کو چکر لگاتی تھیں اور مجھے دیکھتی تھیں مگر اس وقت میں نے اٹھ کر جلدی سے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ پھر میں نے صبح ڈیلیٹ کر دیا اور پھر اس نمبر کو بلاک کر دیا۔ میں نے بلاک سروں لی ہوئی تھی۔ موبائل رکھ کر میں نے پھر رسالہ اٹھا لیا مگر میرا دل اب مطالعے میں نہیں تھا۔ وہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ اگر یہ صبح مظفر چودھری کی طرف سے تھا تو اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ پوری طرح میرے پیچھے پڑ چکا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی چیز کے پیچھے پڑ جائیں تو اسے حاصل کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ وہ اس کی فوت بھی رکھتا تھا۔ میں اتنی ٹینشن میں تھی کہ ایس ایم ایس کی بجلی سی نون بجی تو میں اچھل پڑی تھی۔ میں نے ایس ایم ایس کھول کر دیکھا۔ اس بار یہ دوسرے نمبر سے آیا تھا۔ مگر کیا اسی نے کیا تھا۔

”تم کتنے نمبرز بلاک کر رکھی۔ یقین کرو میری جان تم بلاک کر کر کے تھک جاؤ گی مگر میرے پاس نمبرز ختم نہیں ہوں گے۔“

اس بار اس کے طرز خطاب نے میری جان نکال دی تھی۔ وحید میرا منگیترا تھا مگر اس نے آج تک مجھے ہوں مخاطب نہیں کیا تھا۔ ان الفاظ سے ظاہر تھا کہ وہ مجھ پر اپنا قبضہ حق سمجھ رہا ہے۔ پانی سر سے اونچا پورا تھا اور میں اب باپ اور ماں جی کو بتانے کا سوچ رہی تھی۔ مگر میں یہ سوچ کیسے دکھائی؟ شرم سے مر جاتی۔ دب میں پہچنتائی کہ یہ صبح کیوں ڈیلیٹ کیا۔ بے شک نمبر بلاک کر دیتی مگر صبح تو باپ اور ماں جی کو دکھا سکتی تھی۔ پھر یہ بھی واضح نہیں تھا کہ صبح نیچے والا کون ہے۔ اگر میں مظفر چودھری کا نام لیتی تو باپا مجھ سے پوچھتے کہ مجھے کیسے پتا چلا؟ اور جب میں سیکینہ کا بتاتی تو

پھر یہ سوال سامنے آتا کہ میں نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ بلا وجہ باپا کے ذہن میں شک آ جاتے۔ میرے حوالے سے ان کے ذہن میں شک آئے اس سے زیادہ بہتر میں یہ سمجھتی کہ مجھے موت آ جائے۔ میں نے محسوس کیا کہ اب ریت میں گردن چھپانے سے کام نہیں چلے گا مجھے اس مسئلے کا سامنا کرنا ہوگا۔ میں نے ہمت کر کے صبح کیا۔  
”کون ہو تم اور تمہاری جرات کیسے ہوئی یہ صبح کرنے کی؟“

ایک منٹ سے بھی پہلے اس کا جواب آیا۔ ”جانی میں تمہارا سب سے بڑا عاشق ہوں۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے دن رات کا چین حرام ہو گیا ہے اب تو تم پاس آؤ گی تو سکون ملے گا۔ ویسے میری اطلاع کے مطابق تمہیں پتا چل گیا ہے ناں کہ میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“  
مجھے سخت سردی کے موسم میں بھی پسینا آ گیا تھا۔ میں نے لکھا۔ ”تم سخت واہیات آدمی ہو اور تمہاری ماں بہن نہیں ہیں جو تم کسی غیر لڑکی کو اس طرح کے صبح کر رہے ہو۔ اب مجھے کوئی صبح مت کرنا میں جواب نہیں دوں گی اور میں اپنے ماں باپ کو بتا رہی ہوں۔“

”پتا دو گڑیا میں کسی سے ڈرنے والا شخص نہیں ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کے بعد بھی اس کے صبح آتے رہے لیکن میں نے انہیں کھولا نہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مزید بکواس کرے گا۔ میں نے موبائل آف کر کے رکھ دیا اور فیصلہ کیا کہ صبح ماں جی کو دکھاؤں گی وہ خود باپا کو دکھا دیں گی۔ یہ سوچ کر میں کسی قدر مطمئن ہو گئی تھی کہ میرے سر پر میرے بڑے میرے محافظ تھے اور وہ مجھے محفوظ رکھتے۔ اطمینان کے باوجود رات دیر سے نیند آئی۔ میرے سر میں درد بھی ہو رہا تھا۔ دیر سے سوئی تو صبح آٹکھ بھی دیر سے کھلی تھی۔ آٹکھ بھی دروازہ نیچنے سے کھلی۔ باہر ماں جی تھیں۔ پہلے انہوں نے دروازہ بند کرنے کا پوچھا کہ کیوں بند تھا اور پھر میرا چہرہ دیکھا اور فکر مند ہو گئیں۔

”تو ٹھیک ہے نا؟“  
”سر میں درد ہے ماں جی۔“  
”انہوں نے میرا ماتھا چھوا۔“ بخار بھی ہے۔ چل تو ہاشتا کر کے میں تجھے دوا دیتی ہوں۔“  
”بابا کہاں ہیں؟“  
”وہ آج جلدی چلے گئے۔ اسکول سے انہیں کسی میٹنگ میں جانا ہے کہہ رہے تھے آج دیر سے آئیں گے۔“

## مشیت سوچ

آپ کی شخصیت کو، آپ کی صحت کو، آپ کی تخلیقی صلاحیت اور آپ کی جرأت پر تعمیری اثرات مرتب کرتی ہے۔ آپ کی سوچ جتنی زیادہ مثبت ہوگی آپ کی زندگی اتنی ہی زیادہ خوشگوار ہوگی۔ منفی سوچ کا اثر بالکل الٹ ہوتا ہے۔ یہ آپ کو کمزور کر دیتی ہے اور آپ میں اعتماد کی کمی واقع کر دیتی ہے۔ جب آپ منفی سوچتے ہیں یا منفی گفتگو کرتے ہیں تو آپ اپنی طاقت کو ختم کر رہے ہوتے ہیں جب آپ ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں یا دفاعی انداز اپناتے ہیں تو اس طرح آپ مطمئن، دباؤ اور ناخوشگوار کی کھار ہوتے ہیں جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے۔ آپ جسمانی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں بلکہ منفی سوچ آپ کے لیے زہر ثابت ہوتی ہے مثبت سوچ آپ کی ذہنی صحت کو بہتر بناتی ہے اور آپ کی کارکردگی کو عروج پر لے جاتی ہے۔

مرسلہ: احسانِ حرم۔ میانوالی

کہا۔ ”ایک دن ذرا دیر سے رونی ملے گی تو مر نہیں جائے گا تیرا چتر۔“

ماں جی عصر سے ذرا پہلے چلی گئی تھیں۔ میں نشست گاہ میں بیٹھی ہوئی بی بی دیکھ رہی تھی۔ عصر کے بعد وقت تیزی سے گزرا تھا۔ ماں جی انھی تک نہیں آئی تھیں۔ بی بی دیکھ کر کے اٹھ رہی تھی کہ سفینہ بی بی اندر آئی اور اس نے مجھ سے کہا۔ ”آپ کو بی بی صاحبہ بلارہی ہیں۔“

وہ اسی کو بی بی صاحبہ کہتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”ای آگئی ہیں؟“

”نہیں جی وہ آپ کو ملک صاحب کے ہاں بلارہی ہیں۔“ سفینہ بی بی نے جواب دیا۔ میں حیران ہوئی۔

”ملک صاحب کے ہاں لیکن کیوں؟“

”مجھے نہیں پتا بی بی جی پر انہوں نے کہا ہے کہ آپ کو بھیج کر میں چھٹی کروں۔“

سفینہ بی بی کچھ بے چین سی تھی میں سمجھی کہ وہ چھٹی کے نام پر تباہ ہو رہی ہے۔ میں نے چادر لی اور باہر آئی تو سفینہ بی بی تھی میں موجود تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”بی بی آپ ہمیں ملکہ چاول اندر رکھ کر آتی ہوں۔“

اسی نے چادر اٹھال کر خشک ہونے کے لیے دھوپ

میں منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی۔ سورج نکل آیا تھا مگر بادلوں کی وجہ سے ابھی سی دھوپ تھی۔ مجھے سردی لگی تو میں اندر چلی آئی۔ ماں جی نے جبراً دودھ کا بڑا والا گلاس پلا دیا اور پھر دوا دی تھی۔ میں دوا لے کر لیٹ گئی۔ میں نے ماں جی کو بتانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا کہ جب بابا آئیں گے تب ماں جی کو بتاؤں گی اور پھر وہ بابا سے بات کریں۔ رات نیند پوری نہیں ہوئی تھی اس لیے سو گئی اور دوپہر تک سوتی رہی۔ ابھی تو طبیعت بہتر تھی۔ باہر آئی تو پتا چلا کہ ماں جی ہمارے ایک پڑوسی ملک اصغر علی کے گھر نہیں ہیں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ ملک اصغر علی ہمارے دور کے پڑوسی تھے، ان کی حویلی کئی مکانات چھوڑ کر تھی۔ بابا سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ ملک صاحب کے والد بہت بوڑھے اور حامی عرصے سے بیمار تھے۔ سفینہ بی بی نے بتایا کہ آج صبح اسپتال میں ان کا انتقال ہو گیا تھا اور عصر کے وقت تدفین تھی۔ پچھ دیر میں ماں جی آگئیں۔ انہوں نے کہا۔

”تیرے بابا کو اطلاع کر دی ہے مگر وہ دور ہیں انہیں آنے میں دیر لگے گی۔“

”تب آپ چلی جائیے گا۔“

”تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تجھے چھوڑ کر کیسے جاؤں۔“

میں ہنسی۔ ”میں بچی تھوڑی ہوں جو آپ کے بغیر رہ نہیں سکوں گی۔“

”سفینہ۔“ ماں جی نے سفینہ بی بی سے کہا۔ ”تو رک جانا جب تک میں نہیں آتی۔“

”ٹھیک ہے بی بی بی بی وہ بے دلی سے بولی۔ اسے شام کے وقت جانے کی جلدی پڑتی تھی کیونکہ ریحان چار بجے گھر آ جاتا تھا۔ سفینہ اسے گھر جا کر کھانا دیتی۔ ویسے سارا دن بہت پھر تیلی اور چاق و چوبند رہتی تھی جہاں شام کا وقت قریب آتا سفینہ بی بی سست ہو جاتی اور اسے چھٹی کا کام زیادہ ہو گیا ہے کسی تکلیف یا بیماری کے بہانے سے چھٹی جاتی تھی۔ ماں جی سمجھتی تھیں اس لیے اگر کام نہیں ہو تو اسے جلد جانے کی اجازت بھی دے دیتی تھیں۔ اس وقت بھی سفینہ بی بی کو فکر لگ گئی تھی کہ وہ کسی طرح جلد گھر چلی جائے۔ اس نے دبے لفظوں میں ماں جی سے کہا۔ ”بی بی ذرا جلدی آئیے گا وہ ریحان.....“

”پتا ہے، پتا ہے۔“ ماں جی نے تیز لہجے میں



میں رکھوائے تھے۔ میں گیٹ کی طرف بڑھی۔ صباحت نے مجھے آتے دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ میں باہر نکلی اور ملک صاحب کی حویلی کی طرف جانے لگی۔ پہلے میں نے سوچا کہ سفینہ بی بی کا انتظار کروں لیکن یہ سوچ کر کہ نہیں دیر نہ ہو میں خود ہی جانے لگی۔ ان کی حویلی کے راستے میں مشترک باغ آتا تھا۔ میں اسی سے گزرنے لگی۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ آسمان پر گہرے بادلوں کی وجہ سے تاریکی وقت سے پہلے بھاری تھی اور درختوں کے نیچے تو اندھیرا سا تھا۔ اس وقت باغ میں کوئی نہیں تھا۔ مجھے ڈر لگا مگر ہمت کر کے آگے بڑھتی رہی۔ جب تک میں باغ میں داخل ہوئی سفینہ بی بی حویلی سے نہیں نکلی تھی۔

میں باغ کے وسط تک پہنچی تھی کہ اچانک کوئی تاریکی سے نکل کر چھپنا اور اس سے پہلے کہ میرے منہ سے آواز نکلتی سائے نے میرا منہ ڈال لیا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑا تھا جس سے تیز بو اٹھ رہی تھی میں نے تڑپ کر اس کا ہاتھ منہ سے ہٹانا چاہا مگر وہ دوسرے ہاتھ سے مجھے جکڑ چکا تھا۔ وہ متوسط قامت تھا لیکن مضبوط مرد تھا۔ اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ کپڑے سے اٹھتی تیز بو میرے دماغ پر چڑھ رہی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں بے جان ہونے لگے۔ پھر میں پکرا کر گرنے لگی۔ مگر مگرئی کہاں سے کیونکہ مجھے تو اس شخص نے جکڑ رکھا تھا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ میں بے حس ہو گئی ہوں تو اس نے مجھے آرام سے نیچے لٹایا اور ہلکی سی سیٹی بھائی۔ میں نے کیونکہ کپڑا منہ پر لٹکنے کے بعد سانس روک لی تھی اس لیے بو مجھ پر اتنی اثر انداز نہیں ہوئی تھی کہ میں بے ہوش ہو جاتی۔ ایک دو ہلکی پھسکی سانسوں کی صفیں جن سے بو میرے دماغ پر چڑھ گئی اور اس کے ذریعے میں غشی کی کیفیت میں تھی۔ مگر بے ہوش نہیں ہوئی تھی اور اس پاس کی آوازیں سن رہی تھی۔ البتہ جسم یا زبان ہٹا نہیں سکتی تھی نہیں تھی۔ میرا جسم میرے اختیار میں نہیں تھا۔ اسے میں کوئی آیا اور اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

”اسے لے کر نہیں گئے۔ میرا پتہ کہاں ہے؟“

میں دنگ رہ گئی تھی کیونکہ آواز سفینہ بی بی کی تھی۔ مجھے جکڑنے والے نے بھی آہستہ سے کہا۔ ”فکر نہ کرو کہ کمر بچنے جائے گا۔ تم دونوں ماں بیٹے اپنی زبان بند رکھنا۔ اگر کسی نے زبان کھولی تو ہمیشہ کے لیے بند کر دی جائے گی۔“ اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔ اسی اثنا میں وہاں کوئی اور بھی آگیا اور ان دونوں نے مل کر مجھے اٹھایا اور نہیں لے جانے لگے۔ میں

تعلیٰ بے بس تھی۔ آج تک مجھے کسی غیر مرد نے ہاتھ نہیں لگا یا تھا مگر اب میں یوں بے بس تھی کہ وہ جیسے چاہے مجھے پکڑ اور چھو رہے تھے۔ مگر ان کے انداز میں سفینہ بی بی نہیں تھا اور نہ ہی وہ بات کر رہے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ مجھے خاموشی سے کہیں لے جائیں۔ میرا سر اب پہلے سے زیادہ پکھرا رہا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اندازہ تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ یہ یقیناً مظفر چودھری کا پلان تھا۔ اس نے کسی طرح سفینہ بی بی کو ساتھ ملایا تھا۔ شاید اس نے ریمان کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور پھر سفینہ بی بی کی مدد حاصل کی۔ اس کی مدد سے مجھے حویلی سے باہر آنے پر مجبور کیا۔ ملک صاحب کی حویلی تک جانے کا راستہ باغ سے گزرتا تھا اس لیے یہ لوگ وہاں میرے منظر تھے اور جب میں گزرنے لگی تو مجھے قابو کر لیا۔ پکڑ بڑھ رہے تھے اور آخری احساس یہ تھا کہ مجھے کسی کار کی ڈکی میں ڈالا جا رہا ہے۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

مجھے ہوش آیا تو میں ایک کھردری بان کی چارپائی پر بندھی پڑی تھی۔ نہ صرف میرے ہاتھ پاؤں سختی سے بندھے ہوئے تھے بلکہ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی باندھ دی گئی تھی۔ اوپر سے مجھ پر بھاری کبل پڑا ہوا تھا جس سے نہایت ناگوار ہوا تھا رہی تھی۔ مگر نیچے چادر بھی نہیں تھی اور کھلی بان سے رخ ہوا آ کر میرے جسم کو سرد کر رہی تھی۔ مگر مجھے سردی سے زیادہ اپنی عزت آبرو کی پروا بھی نہیں نے اپنا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ کسی نے اب تک میرے ساتھ نہیں بچھاڑ نہیں کی ہے۔ میرا لباس بھی ٹھیک تھا۔ البتہ دو بچا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے آواز نکالنے کی کوشش کی مگر بس ناک سے معمولی سی آواز نکلی۔ اپنی بے بسی اور اس سے زیادہ آنے والے وقت کے خوف نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ پھر میں نے کوشش کر کے سر سے کبل سرکایا۔ جس کی بدبو سے میرا دم ٹھٹھکا رہا تھا۔

اندازہ تاریکی تھی اس لیے جب سر نکالا تو معمولی سے سوا دھند کے پہلے بلب کی روشنی نے بھی آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ بلب کے سر پر روشن تھا۔ چند لمبے کے لیے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر کھول کر دیکھا تو خود کو ایک بچی دھڑی میں بند پایا۔ بچی دیواروں پر لکڑی کی بلایاں لگی تھیں اور ان پر مٹی لپ کر چھوٹے بچے کی مٹی تھی۔ کوٹھری زیادہ



بڑی نہیں تھی۔ مشکل سے دس فٹ لمبی اور سات فٹ چوڑی تھی۔ اس میں ایک سنگل چارپائی تھی جس پر میں پڑی تھی اور مخالف سمت میں ایک اور سنگل چارپائی تھی۔ درمیان میں کوٹھری کا دو پٹ والا دروازہ تھا جو بند تھا۔ پتا نہیں میں کہاں تھی اور میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ مجھے اتنا یقین تھا کہ مجھے اغوا کرانے والا مظفر چودھری تھا۔ میں اسی کے کسی ٹھکانے پر تھی۔ میں کاپٹے لگی تھی مگر سردی سے نہیں خوف سے۔ پھر مجھے ماں جی اور بابا کا خیال آیا ان پر میری کم شدگی سے کیا گزر رہی ہوگی۔

یہاں وقت بتانے والی کوئی چیز نہیں تھی اور نہ ہی باہر سے کوئی آواز آرہی تھی۔ ایسا سا چمکا جس میں دور کہیں بھیجنگر بول رہے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔ میری کم شدگی کے بعد یقیناً ماں جی نے سفینہ بی بی سے پوچھ بچھ کی ہو گی کہ میں کہاں گئی کیونکہ اُمی مجھے اس پر چھوڑ کر گئی تھیں۔ مجھے اُمید ہوئی کہ شاید بابا اور ماں جی اس سے سختی سے پوچھیں تو وہ اگلے دے کہ اس نے مجھے کن لوگوں کے حوالے کیا ہے۔ مگر جب مجھے اغوا کرنے والے کی دھمکی یاد آئی جو اس نے سفینہ بی بی کو دی تھی کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اسے اور اس کے بیٹے کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دیں گے۔ اس کے بعد سفینہ بی بی کے لیے زبان کھولنا بہت مشکل تھا۔ مظفر چودھری اپنی دھمکی پر عمل کرنے والا شخص تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میرے اندر اُمید کا جو چراغ جل اٹھا تھا۔ وہ بجھنے لگا۔

میں بے بس تھی میرے ساتھ کچھ بھی ہو جاتا کسی کو پتا نہیں چلتا۔ اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد شاید مظفر چودھری مجھے قتل کر کے خاموشی سے کہیں دفن دیتا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنی خوب صورتی سے نفرت محسوس ہوئی تھی نہ میں اتنی خوب صورت ہوئی اور نہ مظفر چودھری کی تخلیق نظریں مجھ پر پڑتیں اور وہ مجھے کم کرنے کا سوچتا اور اس پر عمل کرتا۔ کاش کہ میں عام سی تھیں۔ خوب صورت والی لڑکی ہوتی۔ کم سے کم اس آفت سے تو بچتی۔ اس وقت اس وقت گرفتار تھی۔ مگر یہ سب میری تقدیر میں تھا۔ شاید میں خوب صورت نہ ہوتی تب بھی میرے ساتھ یہی ہوتا۔ میرا ذہن میرے قابو میں نہیں تھا اور بے ربط سوچیں میرے دماغ میں پھرا رہی تھیں۔ کبھی میں سوچتی کہ کاش ایسا ہوتا تو آج میں یہاں نہ ہوتی اور کبھی مجھے اپنے گھر والوں کا خیال آتا۔ کبھی اپنے انعام کی فکر لگ جاتی۔

مگر رفتہ رفتہ میں خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے

لگی۔ میں نے خود سے کہا کہ اگر مجھے یہاں سے نجات حاصل کرنی ہے تو مجھے اس کے لیے خود کوشش کرنا ہو گی۔ سب سے پہلے مجھے خود کو آزاد کرانا تھا۔ میں نے ہاتھوں پر زور آزمائی کی۔ مجھے سوتی ری سے باندھا گیا تھا اور اس کی بندش بہت سخت تو نہیں تھی مگر جہاں جہاں گرہ لگی تھی وہاں سے یہ ذرا بھی نرم نہیں ہو رہی تھی۔ میں کوشش کرتی رہی اور جلد محسوس کر لیا کہ اس طریقے سے میں خود کو آزاد نہیں کر سکیں گی۔ میں کوشش کر کے اٹھ بیٹھی اور خود پر سے کبل ہٹا دیا۔ میرے جسم پر ویلوٹ کے شلوار قمیص کے علاوہ سوٹر تھا۔ حویلی سے نکلنے ہوئے دوپٹا اور گرم چادر بھی تھی اور یہ دونوں چیزیں غائب تھیں۔ کبل ہٹا تو میں ایک لمبے کولرز اٹھی تھی سردی بہت شدت کی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بارش ہوئی تھی جس سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔

باہر بادل پلکے سے گرہے تو بارش کی قصد یقین بھی ہو گئی۔ میرے پاؤں اس طرح بندھے تھے کہ دونوں پیروں میں ری سے الگ گرہ لگا کر ان کو آپس میں ملا دیا گیا تھا اور یوں میرے پاؤں کسی قدر آزاد تھے۔ میں کوشش کر کے چارپائی سے نیچے اتر آئی۔ مجھے کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جس سے میں ری کاٹ سکوں۔ مگر یہاں سوائے چارپائیوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں پیروں کو معمولی سی حرکت دیتی بخ بست زمین پر دوسری چارپائی کی سمت بڑھی۔ میرے پیروں سے چپل بھی غائب تھی۔ زمین جیسے برف کی ہو رہی تھی۔ کسا طرح میں دوسری چارپائی تک پہنچی اور اس پر پڑا کبل بندھے ہاتھوں سے سرکانے لگی۔ خوش قسمتی سے میرے ہاتھ سامنے کی طرف بندھے تھے ورنہ میں یہ معمولی سا کام بھی نہ کر پاتی۔ کبل ہٹا یا تو مجھے اس کے نیچے ایک پاؤں سا نظر آیا۔ میں نے بے تابی سے اسے اٹھا یا اور کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ اصل میں ریگین اور چپکنے والی پٹی سے بنی پاؤں تھی جس میں اوزار رکھے جاتے ہیں۔ میں نے اس کو کھولا تو اندر سے چھوٹے چھوٹے اوزار گرے۔ ان میں ایک نیل کٹر تھا۔ اس میں متعدد چیزیں تھیں۔ میں نے یہ مشکل ان میں موجود چھوٹا سا چاقو کھولا۔ اس چکر میں میرا ایک ناخن بھی ٹوٹ گیا۔ مگر مجھے ایک اُمید نظر آئی کہ میں خود کو تو آزاد کر سکتی تھی۔ چاقو زیادہ تیز نہیں تھا اور اس کا پھل بھی چھٹا تھا اس لیے میں نے بہت مشکل سے انگلیاں موز کر اسے ایک پینچا یا اور ری کاٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کام آسان نہیں تھا کیونکہ چاقو کی



دھار تیز نہیں تھی اور یہ جھوٹا بھی تھا۔ میں دیوانہ وار کوشش کر رہی تھی اور کئی بار چاقو میری کلائی میں بھی لگا۔ زخم آئے اور مجھے تکلیف ہوئی تھی۔ میرے آنسو نکل رہے تھے مگر میں نے کوشش جاری رکھی۔

نہ جانے کب تک میں رسی پر چاقو گرڑتی رہی اچانک رسی ڈھیلی ہوئی اس کے بل کا بڑا حصہ کٹ گیا تھا۔ اس لیے وہ ڈھیلی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کام آسان تھا۔ ایک منٹ میں میرے ہاتھ آزاد ہو گئے تھے اور میں کلائیاں مسل رہی تھی جن پر نشان بڑھ گئے تھے۔ پھر میں نے اپنے پاؤں آزاد کیے اور دروازے کی طرف بڑھی۔ اسے کھولنے کی کوشش کی تو وہ باہر سے بند نکلا۔ میں نے زور لگانے سے گریز کیا کیونکہ دونوں پٹ اٹل رہے تھے اور آوازیں نکال رہے تھے۔ مجھے ڈر لگا کہ کسی نے سن لیا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ میں ہاتھ پیروں سے آزاد ہو گئی ہوں۔ دروازہ باہر سے زنجیر لگا کر بند کیا گیا تھا۔ یہ پرانا طریقہ تھا جو اب گاؤں دیہات میں بھی بہت کم نظر آتا ہے۔ پٹ ہٹتے تو زنجیر ٹھنکتی گئی۔ میں جیسے ہٹ گئی اور چارپائی پر آ گئی کیونکہ زمین بہت سرد تھی اور میرے پاؤں بچ ہو گئے تھے۔ میں سمٹ کر بیٹھ گئی اور خاموشی سے آنسو بہانے لگی۔ آزادی کی کوئی اُمید نظر نہیں آرہی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ اب کیا کروں؟

اچانک میری نظر اس چاقو پر پڑی جس سے میں نے رسی کاٹی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا۔ یہ تیز دھار نہیں تھا لیکن اگر میں اسے اپنی کلائیوں پر آزمائی تو یہ میری کلائی کی نیس کاٹ سکتا تھا۔ مگر جب میں نے سوچا کہ میں اپنے ہاتھ خود کاٹوں گی تو میں لرز اٹھی تھی۔ میں اس معاملے میں بہت کم ہمت تھی۔ مجھے تو آنکھیں کی سوز سے خوف آتا تھا۔ بالکی سی چوٹ لگ جاتی تو میں رو دیتی تھی بہت مجھے جان کے مقابلے میں زیادہ پیاری تھی۔ مگر میں خود بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہمارے مذہب میں خودکشی حرام ہے لیکن اصل بات یہ تھی کہ مجھ میں خودکشی کی ہمت نہیں تھی۔ مجھے خیال آیا کہ میں خودکشی نہیں کر سکتی تھی مگر ان لوگوں کو دھمکی تو دے سکتی تھی کہ اگر میں نے میرے پاس آنے کی کوشش کی تو میں اپنی شرگ کاٹ لوں گی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مظفر چودھری جیسے لوگوں پر اس دھمکی کا کیا اثر ہوگا؟

میں ایک بار پھر منتشر ان خیال ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں؟ کیسے خود کو اور اپنی عزت کو بچاؤں؟ ابھی میں سوچ رہی تھی کہ کوٹھری کے باہر سے

زنجیر ٹھنکتے کی آواز آئی اور میری حالت خراب ہو گئی۔ میں نے چاقو مضبوطی سے پکڑ کر اپنے گلے کے پاس کر لیا مگر میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور مجھے لگ رہا تھا کہ جان کو تو نہیں مگر اس طرح میں خود کو چاقو مار لوں گی۔ آنے والا اجنبی ثابت ہوا تھا۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور پھر میرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر مسکرایا۔ ”مرتا چاقی ہے؟“ اس نے کہا اور دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ”چل اپنا گلا کاٹ کر دکھا۔“

میرے ہاتھوں کی لرزش بڑھ گئی تھی مگر میں نے ہمت کر کے کہا۔ ”مجھے جانے دو ورنہ میں مر جاؤں گی مگر کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔“

”یہی تو کہہ رہا ہوں چل شاہاش اپنا گلا کاٹ لے۔“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تو میرا حوصلہ جواب دینے لگا۔ اچانک چاقو میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں اپنے آپ میں سمٹ کر رو نے لگی تھی۔ میرے منہ سے التجائیں نکل رہی تھیں۔ ”خدا کے لیے مجھے جانے دو، تمہیں اللہ اس کے پیارے رسول ﷺ کا واسطہ مجھے جانے دو۔ میں شریف لڑکی ہوں۔ میرے ماں باپ مر جائیں گے۔“

”چپ کر۔“ اس نے اچانک انہ کر میری چوٹی پکڑ کر پھینکی تو میں بے اختیار اٹھتی چلی آئی۔ ”نعرے مت کر..... اگر تو نے کوئی حماقت نہیں کی تو صبح تک تجھے گھر چھوڑ دیں گے۔“

اس نے اتنی بے دردی سے بال پھینچے تھے کہ میرے سر میں شدید درد ہو گیا تھا۔ میں چلا اٹھی تھی مگر وہ اس کی پروا کیے بغیر مجھے پھینچا ہوا کوٹھری سے باہر لایا۔ میں خود کو پھنچانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ کوٹھری کے باہر جھوٹا سا کچا صحن تھا اور اس کے پار ایک جھوٹا سا کناج تھا جس پر کچھ میل کی چھت تھی۔ احاطہ زیادہ بڑا نہیں لگ رہا تھا۔ کم سے کم اس جگہ یہ مشکل سے چالیس فٹ چوڑا تھا۔ کناج کے آگے کیا تھا میں اس سے بے خبر تھی۔ وہ کچھ کر مجھے کناج کے برآمدے تک لایا اور پھر واحد دروازہ کھولتے ہوئے اندر دھکا دیا۔ میں لرز اٹتی ہوئی اندر قالین پر جا گری تھی۔ یہ سجا ہوا بیڈروم تھا اور شاندار کے بیڈ پر نیم دراز شخص ہاتھ میں شراب کا گلاس لیے ہوئے تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ مظفر چودھری نہیں بلکہ کینٹ کے چاکر کا فضل تھا۔



میں نے اسے بہت عرصے بعد دیکھا تھا اس کی شیوہ بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے پر مکروہ پن اور ایسے تاثرات تھے جیسے کسی بھیڑیے نے کوئی بھیڑ دیکھ لی ہو۔ میں بے اختیار خود میں سٹ گئی۔ مجھے لانے والا اندر آیا اور اس نے فضل سے کہا۔ ”یاد رکھنا تیرے بعد ہماری باری ہے۔ صبح سے پہلے یہ قصہ ختم کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ پولیس اپنا کام شروع کرے۔“

”فکر مت کر ابھی تو پوری رات پڑی ہوئی ہے۔“ فضل نے کہا۔ ”اب تو جا اور چوس رہنا کوئی آئے تو مجھے خبردار کرنا۔“

مجھے لانے والا سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی فضل اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ ایک طرف آتش دان میں آگ جل رہی تھی اور گرم تھا۔ آتش دان دیکھ کر مجھے خیال آیا اور میں اچانک اٹھ کر اس کی طرف بھاگی۔ مگر مجھے آتش دان تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا اس سے پہلے فضل نے میرا بازو پکڑ کر مجھے بستر پر پھینک دیا اور ایک گندی گالی دے کر بولا۔ ”تو کیا سمجھتی ہے بہت ہوشیار ہے تو..... دیکھ کیسے میرے قابو میں آئی ہے۔“

”میں تیری کزن کی سہیلی ہوں۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔ ”اس کا خیال کر لے۔“

”اس کا خیال بھی کروں گا۔“ وہ بھانک انداز میں مسکرایا۔ اسی لمحے باہر بادل گرے اور اس بار آواز بہت تیز تھی۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ کچھ لمبے کی چھت پر یونہی گرنے کی آواز بہت تیز تھی۔ فضل اپنی جیکٹ اتار رہا تھا۔ ”اچھا ہے بارش اور بجلی کے شور میں تیرا شور دب جائے گا۔ ویسے یہاں کوئی پکار سننے والا نہیں ہے۔“

”ہے۔“ میں نے چلا کر کہا۔ ”وہ تو ہے جو ہر جگہ ہوتا ہے اور سب کی سنتا ہے۔“

”تو بس اسی کو پکار، مگر میرا حراہ مت کرنا۔“ اس نے قیاس بھی اتار دی اور بستر کی طرف بیٹھا تھا کہ جب ہی سنسنائی آواز آئی۔ فضل ٹھٹک گیا تھا۔ آواز جیسے اس کی طرف سے آئی تھی۔ پھر اچانک کوئی چیز چھت توڑ لی ہوئی فضل کے عقب میں گری تھی۔ میں سرکھٹے ہوئے بید کے کنارے تک پہنچ گئی تھی۔ اسی لمحے جب خوف کا دھماکا ہوا اور فضل کے عقب میں بہت بڑا شعلہ نمودار ہوا تو میں جیسے خود بہ خود ہی بید کے دوسری طرف گری تھی۔ دھماکا ایسا تھا کہ میں نے زندگی میں کبھی نہیں سنا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے

میرے کان کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ میں دوسری طرف گری تھی اور مجھ پر نہ جانے کیا کیا چیزیں گر رہی تھیں۔ ان میں ٹھوس چیزیں بھی تھیں اور پانی بھی تھا جس نے مجھے شراہور کر دیا تھا۔ میں نے منہ فرش کی طرف کر لیا تھا اور خود میں سٹ گئی تھی۔

جب چیزوں کی بارش رکی تو میں نے حرکت کی اور خود پر آنے والی چیزیں ہٹانے لگی۔ یہ لمحہ تھا ہناتے ہوئے کوئی چیز میرے ہاتھ میں آئی اور میں نے محسوس کیا کہ انسان کا ہاتھ تھا مکروہ اتنی آسانی سے کیسے میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ یہاں لائٹ تھی مگر دھماکا ہوتے ہی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ البتہ جا بھ جا لگی آگ سے یہاں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بلند کیا تب دیکھا کہ وہ کہنی سے نیچے سے کٹا ہوا انسانی ہاتھ تھا جس سے نیس اور گوشت جھانک رہا تھا۔ یہ یقیناً فضل کا ہاتھ تھا میں نے چیخ مار کر اسے دور پھینکا۔ کمرے کی حالت بگڑی تھی بلکہ اب کمرہ کہاں رہا تھا کیونکہ اس کی چھت اور دو طرف کی دیواروں کا بڑا حصہ غائب ہو گیا تھا اور اس طرف سے باہر کی تار کھلا، بارش اور رہ رہ کر چٹکنے والی بجلی دکھائی دے رہی تھی۔ میں بہ مشکل اٹھی اور طے سے ہوئی ہوئی باہر آئی۔

یہ کالنج کے سامنے والا حصہ تھا۔ احاطے میں ایک گاڑی کھڑی تھی اور اس کے پارکٹ تھا۔ کالنج میں براہِ رو کمرے تھے۔ میں سامنے والے برآمدے میں آئی تھی کہ پھر وہی سنسنائی ہوئی آواز آئی۔ مجھے یاد آیا کہ دھماکے والی چیز جب کالنج کی چھت توڑ کر اندر آئی تو اس سے پہلے ایسی ہی سنسنائی آواز آئی تھی۔ یہ یاد آتے ہی میں بے ساختہ گاڑی کی طرف بھاگی۔ اسی لمحے عقب سے کسی نے چلا کر کہا۔ ”وہ بھاگ رہی ہے پکڑو اسے۔“

میں گاڑی تک آئی تھی کہ عقب میں ہونے والے دھماکے کی لہر نے مجھے اچھال کر کچے میں پھینکا۔ پانی اور کچرے میں گرنے کی وجہ سے مجھے معمولی سی چوٹ آئی اور گاڑی نے مجھے برسنے والے طے سے بچا لیا تھا۔ یہ دھماکا کم شدت کا لگا تھا کیونکہ میں کھلی جگہ تھی۔ اس کے باوجود دھچکا اتنی شدت کا تھا کہ مجھے سنبھل کر انٹنے میں وقت لگا اور جب میں نے مڑ کر دیکھا تو کالنج مکمل طور پر غائب ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ بس بچا جا رہے والی دیواریں رہ گئی تھیں اور اس کے طے سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ بہت تیز بارش ان شعلوں کو بجھاتی جا رہی تھی، شعلوں کی روشنی میں مجھے کوئی فرد نظر نہیں آیا۔ شاید



میرے بارے میں خبردار کرنے والا بھی مارا گیا تھا۔ آواز کا بیج کی طرف سے آئی تھی اور اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ میں کچھ دیر خالی ذہن کے ساتھ کھڑی کا بیج کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اوپر سے برستے بیج پانی نے مجھے چونکا دیا اور میں گیٹ کی طرف بڑھی۔

بڑا گیٹ بند تھا اور اس پر اندر سے تالا لگا ہوا تھا۔ لیکن چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا میں اس سے باہر آئی تو میں نے خود کو کھیتوں کے درمیان ایک دیرانے میں پایا۔ ایک طرف جھاڑیاں اور چھوٹے درخت تھے اور اس طرف روشنی بھی ہو رہی تھی۔ روشنی لمبی قطار کی صورت میں درختوں سے جھانک رہی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھی تھی کہ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ اس طرف جانا ٹھیک نہیں ہے۔ عقب میں تاریکی تھی۔ لیکن میں اسی طرف جانے لگی۔ کچھ دیر پہلے تک مجھے عزت خطرے میں نظر آ رہی تھی پھر اچانک ہی سب کچھ بدل گیا۔ وہ شخص جو فرعون بنا ہوا تھا مجھے سے بھی پہلے گڑوں میں بدل گیا اور اس کے ساتھ ہی جو مجھے کی بات کر رہے تھے ان کے مجھے میں بھی موت آئی۔ میں اب تک نہیں سمجھ سکتی تھی کہ ہوا کیا تھا؟ اوپر سے سنسنائی آواز کے ساتھ آنے والی چیز کیا تھی جس نے لمحوں میں اس جگہ کو تباہ کر دیا تھا۔

اللہ نے میری جان اور عزت دونوں کی حفاظت کی تھی۔ مگر اب میں سوچ رہی تھی کہ میں کس طرف جاؤں جو محفوظ رہ سکوں اور مدد حاصل کروں۔ میں کی نہیں سمجھتی بلکہ سوچنے کے دوران بھی بڑھتی رہی تھی۔ روشنی نہیں تھی مگر جب بجلی چمکتی تو چند لمحوں کے لیے ماحول روشن ہو جاتا تھا۔ یہاں کھیت تھے اور ان کے درمیان میں پگ ڈنڈیاں تھیں۔ کھیتوں میں مکدم کے پودے زمین سے سر نکال چکے تھے۔ میں کھیتوں کے درمیان سے گزرتی تھی۔ ایک بار بجلی چمکی تو مجھے دور چند بچے گھر وندے لگائے ہوئے اور میں اس طرف بڑھنے لگی۔ امید کے ساتھ خوف میں تھا کہ کہیں یہاں مجھے مدد کی بجائے فضل جیسے کسی شیطان سے مقابلہ کرنا پڑ جائے۔ مگر امید کے سہارے بڑھتی رہی۔ جب ترے بھائی تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ جگہ دیکھی بھالی ہے اور یہاں بابا کے ایک واقف کار زمیندار کے مزارع رہتے تھے آس پاس کی زمین بھی اسی زمیندار کی تھی۔ مسلسل بیج پستہ بارش میں بیٹھنے سے میری حالت خراب ہو گئی تھی اور میں پہ مشکل ایک مکان تک پہنچی اور اس کی زنجیر پکڑ کر بجانے لگی۔ میں پوری قوت سے بجا رہی تھی کہ اندر آواز پہنچے اور بالآخر اندر سے کسی

عورت کی آواز آئی۔ ”کون ہے اس وقت؟“ ”دروازہ کھولو۔“ میں چلائی۔ میری آواز نے کام کیا اور عورت نے دروازہ کھول دیا۔ اسے دیکھتے ہی میں لہرائی اور بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑی۔ پھر مجھے ہوش آیا تو میں حویلی میں تھی ماں، باپ، اور بابا میرے پاس تھے۔ ان کو دیکھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ وہ مجھے پیار کر رہے تھے اور تسلی دے رہے تھے۔ پھر ماں جی نے بتایا کہ میں جس گھر تک پہنچی تھی اس کا ایک آدمی بابا کے پاس آیا تھا کیونکہ عورت نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اس وقت میں صاف ستھری تھی ماں جی نے مجھے صاف کر کے میرے کپڑے بدل دیے تھے۔ مگر جب اس گھر تک پہنچی تو میں کچھڑ اور خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ میں گھر سے غائب ہوئی تو ماں جی اور بابا پاگل ہو گئے تھے۔ انہوں نے اسی وقت پولیس میں رپورٹ کی اور سب سے پہلے نصیر بی بی پکڑی گئی۔ پولیس کو دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے بتایا کہ مجھے مظفر چودھری نے اغوا کر لیا ہے۔

مگر جب پولیس نے اس کے ڈیرے پر چھاپا مارا تو مظفر چودھری اور اس کے آدمیوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ فائرنگ سے ایک پولیس والا مارا گیا تو پولیس نے مزید نفری سنگولی اور انتقامی جذبے سے مظفر چودھری کے ڈیرے پر چڑھائی کر دی۔ فائرنگ کے تباہی میں مظفر چودھری اپنے چھ ساتھیوں سمیت مارا گیا اور پولیس نے وہاں سونچو مزید ایک درجن افراد کو گرفتار کر لیا تھا۔ مگر میں وہاں سے نہیں گئی تھی۔

میں نے بتایا کہ مجھے فضل نے اغوا کر لیا تھا اور جہاں مجھے رکھا وہ جگہ نہ اسرار طور پر تباہ ہو گئی۔ بابا کی وجہ سے میں کھل کر نہیں بتا سکتی تھی کہ وہاں کیا ہونے والا تھا اور اللہ نے میری عزت محفوظ رکھی تھی۔ پولیس آئی اور مجھ سے بیان لیا۔ میں نے اس جگہ کے بارے میں بتایا تو بتا چلا کہ گزشتہ رات سرحد پار سے بھارتی فوج نے گولہ باری کی تھی جس میں وہ جگہ تباہ ہوئی جہاں میں قید تھی۔ وہ اصل میں مارٹر گولے تھے جو سنسنائی آواز کے ساتھ کان بیج پر گرے تھے۔ میں سن کر حیران رہ گئی تھی کہ اللہ کیسے اپنے مجبور بندوں کی مدد کرتا ہے۔ بات زیادہ پچھلی نہیں تھی اور بابا نے صرف پولیس کو بتایا تھا۔ مگر آنے والے دنوں میں یہ بات پھیل گئی۔ مگر کسی نے میری بات کی پر شبہ نہیں کیا تھا۔



## تشنگی

محفوظہ غزرا رسول  
السلام علیکم

ہم مصنوعی زندگی جینے کے عادی بننے جا رہے ہیں۔ ہمیں یہ تک احساس نہیں کہ مصنوعیت خوش حال زندگی کی موت ہے۔ یہ بظاہر پرسکون نظر آنے والی مصنوعی زندگی قیامی کے عمیق غار کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اگر مہری بات غلط لگے تو مرینہ اسد کے حالات دیکھ لیں اس کے مقابلے میں آسیہ کیسی آسودہ زندگی گزار رہی ہے۔ پیچ در پیچ والی یہ رُونا یقیناً آپ کو بھی پسند آئے گی۔

صدف آصف  
(کراچی)

نوٹے، وہ اپنے دل کی بات زبان پر لانے سے بالکل نہیں  
بچکپاتے اس کے والے کو نیچا دکھانے میں بھی ایک عجیب سی  
لذت محسوس ہوتی ہے۔  
مرینہ اسد کا اس وقت کچھ ایسا ہی حال تھا، وہ جو

روپوں کا اظہار چہرے کے تاثرات سے بخوبی ہوتا  
ہے، دل محبت، خلوص سے بھرا ہو یا رشک و حسد کے جذبے  
سے پُر ہو کچھ لوگ چاہتے ہوئے بھی چھپا نہیں پاتے یا انہیں  
دوسروں کی پروا ہی نہیں ہوتی، ان کی بلا سے کسی کا دل ٹوٹے تو



شروع ہوئی تو رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ آسیہ چپ چاپ بیٹھی اس کی لن ترانیاں سننے پر مجبور تھیں، کیوں کہ گھر آئے مہمان کی عزت کرنا اس کے مزاج اور روایت کا حصہ تھا۔  
”اوہ آس، تمہارا دم نہیں گھٹتا، تم اتنی قدیم تو نہیں ہو جتنا تم نے آثار قدیمہ جمع کر رکھا ہے“ مرینہ نے کاغذ سے اچکا کر منہ دباتے ہوئے لفظی کی انتہا کر دی۔

”کیوں بھی؟ فرنیچر میں بھلا کیا برائی ہے؟ میں نے ہمیشہ اس کی حفاظت کی ہے۔ جب ہی پرانا ہونے کے باوجود چمک دکھ مانت نہیں پڑی۔“ آسیہ نے سنہری پارڈر والے تازک سے گلاس میں ٹھنڈا پانی مرینہ کو پیش کرتے ہوئے دے لفظوں میں سفائی دی۔ اسے مرینہ کا بے باک تبصرہ بالکل پسند نہیں آیا تھا مگر اس نے برداشت کا دامن تھا سہہ رکھا۔

”آسیہ تم لوگ کس زمانے میں جی رہے ہو؟ میں تمہارے سامان کی برائی نہیں کر رہی بلکہ یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اب اس قسم کا فرنیچر آؤٹ آف فیشن ہو چکا ہے، ویسے بھی تمہاری شادی کو کئی سال گزر چکے ہیں ڈیڑھیاں تو فیشن ڈول میں تبدیل ہو جاتا ہے۔“ مرینہ نے اپنی ہانڈک سی ٹاک ناگوار سے سکھرتے ہوئے ایک دم پٹری بدلی۔ اس کی باتوں نے آسیہ کو گہری سوچ میں جتا کر دیا۔ کیوں کہ وہ خود بھی کئی مہینوں سے گھر کی تزئین و آرائش کے لیے فراز کے پیچھے پڑی ہوئی تھی مگر وہ مسلسل نالے جا رہا تھا۔

”اچھا ایک بات بتاؤ؟ ایک جھبی چیزیں دیکھ کر تم لوگوں کا دل بیزار نہیں ہوتا، نہ بابا نہ مجھے تو ایسی یکسانیت سے شدید کوفت ہوتی ہے۔ میں تو اسی لیے کچھ مہینے گزرتے نہیں ہیں کہ اسد کے پیچھے لگ کر پورے گھر کا رنگ و روغن تبدیل کر داتی ہوں۔ سارے کمرے کو دوبارہ سے جدید انداز میں ڈیکوریٹ کرواتی ہوں، گاڑی کا پراٹا ماڈل تبدیل کر کے نئی خریدتی ہوں، تب کہیں جا کر سکون ملتا ہے۔“ مرینہ اپنی نیوی بلیو قمیٹی ساڑی کا پلوٹیک کرتے ہوئے اتر لکی دوایکی ہی تھی جب تک اپنی غلط بات کو بھی دلائل سے منوانہ کسی جھٹ جاری رکھتی۔ آسیہ کو اس کا تسخیرانہ لہجہ ایک دم برا لگا۔

”اتنے سالوں سے ایک ہی ماڈل کے شوہر کے ساتھ کیسے گزارا کر رہی ہو؟ انہیں تبدیل کرنے کا نہیں سوچتیں۔“ آسیہ نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر مرینہ کی شیخیوں پر جل کر سوچا۔

”اب یہ کارپٹ دیکھو، کتنا پراٹا ڈیزائن ہے۔“ مرینہ اس کے جذبات کی پروا کیے بغیر بولے جا رہی تھی۔ آسیہ نے

اس کا جائزہ لیا۔ اس نے اپنے کالے بالوں پر سنہرا رنگہ کر دیا تھا۔ جسم تھوڑا بھر گیا تھا مگر اس کی دلکشی میں اضافہ ہو تھا۔ شیشے کی میز پر اس کی مخروطی انگلیاں مسلسل تھرک رہی تھیں۔

”مرینہ بالکل ویسے کی ویسی ہے۔ منہ کھولتے ہوئے بالکل نہیں سوچتی، جب ہی تو بونی درستی میں بھی سب اس سے چرتے تھے۔ جہاں بائی، پورا گروپ اس سے پیچھا چھڑانے کے چکر میں تھر تھر ہو جاتا۔“ آسیہ نے اپنی بونی درستی کی یادوں کو تازہ کیا۔

”تبدیلی میری جان، تبدیلی ہر انسان کو اچھی لگتی ہے۔ مجھے دیکھو، کتنی اپ ٹو ڈیٹ ہوں اور ایک تم ابھی تک پرانے زمانے میں جی رہی ہو۔“ مرینہ نے ایک ادا سے کہا۔ آسیہ نے لبوں تک آتے ہوئے قہقہے کو روکا۔ مرینہ کا حد سے بڑھا ہوا مصنوعی انداز۔ اس کی خوبصورتی پر دل بٹا جا رہا تھا۔ اس کی شخصیت کا بھدا پن نمایاں ہو رہا تھا۔

”تم بھی کیا ایک ہی چیز کو لے کر بیٹھ گئیں۔ چھوڑو ان باتوں کو میں تمہیں گرم کر دے گا۔“ آسیہ نے پرانے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ جس کی چولیس اب مل گئی تھیں۔ چ..... چ کی آواز لگی۔ کثرت استعمال کی وجہ سے اس کے اسپرنگ اب چٹختے والے کو جیسے لگے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے میوزک الگ بجتا تھا۔ مرینہ نے فوراً ہی اسے تسخیرانہ ہنسی سے نوازا۔

آسیہ کا دل ایک دم چھوٹا ہونے لگا۔ اس کے اندر ایک یہی خامی تھی۔ وہ سانسے والے کی برتری سے بہت جلد مغلوب ہو جاتی۔ فراز کی بے تحاشہ محبت کے باوجود اس میں اب تک اعتماد کا فقدان تھا، اسی لیے وہ مرینہ کی فضول باتوں کا منہ توڑ جواب دینے کی جگہ اس سے سناٹا ہونے لگی۔ چائے کا بہانہ بنا کر وہاں سے تیزی سے اٹھ گئی۔

مرینہ نے کمرے سے جاتی ہوئی آسیہ کے حسین چہرے کی طرف دیکھا۔ سبک نقوش پر اترتی اواسی، اور پچھلی پڑی رنگت دل کو ٹھنڈک کا احساس دلانے لگی۔ آسیہ فراز کی محبت اور رفاقت پا کر حسین ترین ہو گئی تھی۔

مرینہ کی نفسیات میں ایسی کئی تھی کہ وہ دوسروں کو دکھ دے اور لطف اٹھاتی۔ اس کے اندر بے چینیوں کا ایک جہاں آباد تھا۔ وہ اپنی ناکام زندگی کی ذمے داری ہمیشہ دوسروں پر ڈالتی آئی تھی۔ آسیہ کے لیے تو اس کا دل پہلے ہی غبار سے لالاب بھرا ہوا تھا۔



”اب کیا کروں..... مل کیسے ادا کروں؟“ آسہ نے مزید ابرو پر گراور کر لہو ڈرنگ کی ٹرے تھامنے کے بعد اپنے کالے بیک میں ہاتھ ڈال کر پیسے ٹولے تو یاد آیا کہ ممانے کو خود سٹی جانے کے لیے پانچ سو کا ایک کڑکنا نوٹ دیا تھا، وہ تو ٹھیل پر ہی بھول آئی۔ اب اسنے سے پیسوں کے لیے سب کے سامنے بے عزتی کا خوف جو طاری ہوا تو اس کا حسین چہرہ دھندلانے لگا۔

اس کا آج یونیورسٹی میں پہلا دن تھا، وہ اتنی ہڑبونگ میں گھر سے نکلی کہ ناشتا بھی نہیں کرسکی۔ ڈیپارٹمنٹ ڈھونڈنے میں الگ برا حال ہوا۔ بھوک عروج تک جا پہنچی تو اس نے کینے میرا کا رخ کیا۔ اب ایک نئی پریشانی لاحق ہوگئی۔ وہ سوچ میں کم تھی کہ آرڈر سرور کرنے والے لڑکے عارف نے اسے ٹوکا۔ وہ اسٹوڈنٹ کی ایسی شرارتوں سے بیزار ہو چکا تھا، جو اکثر مل دیے بغیر بھاگنے کے پکڑ میں رہتے اور بعد میں اسے مالک سے خوب ڈانٹ پڑتی۔

”جلدی کریں جی، رش بڑھ رہا ہے۔ آپ راستہ روکے کھڑی ہیں“ عارف ایک دم تیز لہجے میں بولا تو آسہ کی ہمت مزید جواب دے گئی۔

”پلیز..... ایک منٹ“ اس نے ٹرے وہیں کاؤنٹر پر رکھی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا پین ہونٹوں میں دبایا اور سائیڈ میں ہو کر بڑی جانفشانی سے بیک کی دوبارہ سے تلاش کرنے لگی، کچھ سکے ہاتھ لگے تو تھوڑا سکون محسوس ہوا۔

فراز جو چائے کی طلب میں یہاں آکر بیٹھا تھا، بہت دیر سے اس معصوم چہرے والی لڑکی کی حرکتوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی بوکھلاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ پریولس کی ہے۔ فاضل تک پہنچتے پہنچتے فراز ایسے کئی نظاروں کا عادی ہو چکا تھا۔ یونیورسٹی میں آنے والے نئے اسٹوڈنٹ کی بوکھلاہٹ کوئی نئی بات نہیں تھی مگر اس لڑکی میں کچھ تو الگ بات تھی جو فراز کی نگاہیں نہ جاتے ہوئے بھی بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

”اچھی بھی پیسے پورے نہیں ہوئے۔“ آسہ نے اپنی جیب کی تلاش پر سکون کو جمع کر کے گنا اور خود سے بولی۔ فراز پوری بات سمجھ گیا تو وہ مسکراتا ہوا اس کے قریب سے گزرا۔ اپنی پریشانی میں آسہ کو ہوش ہی کہاں تھا۔ وہ کم پیسے لے کر ڈرتے ڈرتے گاڑی کی طرف بڑھی۔

”مس..... اچھا ٹرے یہاں چھوڑ گئیں۔ ابھی۔۔۔ دھرا دھر ہو جاتی تو آپ شہر بجاتیں کہ ہم نے سامان

وہ ایک دم مڑی تو سائیڈ ٹھیل پر فراز کی مسکراتی ہوئی تصویر سنہری فریم میں دکھائی دی۔ مرینہ ایک تک دیکھے گئی۔ وہ اسی مسکراہٹ پر تو فدا ہوئی تھی، دل نا شاد ایک بار پھر تشنہ

”آس تمہاری وجہ سے میری زندگی کی بہار مجھ سے روٹھ گئی، میرے جذباتوں پر تا عمر خزاؤں نے ڈیرہ جمالیا۔ میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گی۔“

آسہ کو ازمنات سے بھری ٹرائل کے ساتھ ڈرائنگ روم میں لوٹی تو مرینہ کو کھوپا کھوپا سا پایا۔

”مرینہ یار۔۔۔ چلو بغیر تکلف کے شروع ہو جاؤ۔“ آسہ اس کے دل میں چلنے والے برسوں پرانے ناموس سے نا آشنا مسکراہٹ سجائے چائے پیش کرتے ہوئے چٹکی تو مرینہ کے خیالات کی مالا بکھر گئی۔

”مجھے لگتا ہے کہ تم شادی کے بعد بہت بورنگ ہو گئی ہو، کچی گھر والی بن گئی ہو..... یار باہر نکلو، دیکھو دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔“ مرینہ نے، اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے مزیدار کباب اور چکن رول ہری چٹنی میں ڈبو کر کھاتے ہوئے آسہ کو اسکا پایا۔

کافی وقت گزارنے کے بعد مرینہ چلی گئی مگر آسہ اس کے جانے کے بعد بھی ایک ہی جگہ بیٹھی رہی۔ اس کی باتوں کو سچ جانتی خواہشوں کے جال میں پھنستی چلی گئی۔

”نیا فرنیچر، پردے اور اسنے بڑے گھر کا رنگ و روغن، کوئی چھوٹی موٹی خواہش تو تھی نہیں کہ فراز پہ بھر میں پوری کر دیتے۔“ آسہ کے دماغ نے سمجھایا بھی۔ پھر بھی اس دل کا کیا کرتی؟ جس پر ایک ہی سودا سامایا ہوا تھا۔

”ایک دفعہ گھر کی حالت درست کر والوں پھر اس مرینہ کو ضرور انوائٹ کر دیں گی جو یونیورسٹی میں تو میرے آگے پیچھے پھرتی تھی، مگر آج کیسی باتیں بنا رہی تھی۔ اس کا غرور تو حد سے تجاوز کر گیا ہے۔“ آسہ کا معصوم دل اس طرح سے گھائل ہوا تھا، اسے یہ بھی فکر نہیں تھی کہ فراز گھر لوٹے والے ہے۔ دونوں بیچیاں اس کے چھوٹے بھائی کے ساتھ امی کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ وہ گھر کے سارے کام دام بھول کر نئے تانے بانے بننے میں مگن ہوگئی۔ آج سے پہلے وہ فراز کی محبت میں کم، اپنی زندگی میں مست ملنگ بنی جے جا رہی تھی۔ مرینہ کی کچھ دیر باتوں نے اس کا دماغ گھما کر رکھ دیا۔ وہ جیسے سب کچھ سمجھتی تھی دنیا کی نگاہوں میں تو وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے فراز سے پہلی ملاقات یاد آگئی۔



نہیں دیا۔“ عارف اسے دیکھتے ہی شروع ہو گیا۔

”وہ..... دراصل..... میرے پاس بل۔ میں۔ اگر کل.....“ آسیہ نے انک کر اپنا مدعا پیش کرنا چاہا مگر شرمندگی سے بولا نہیں گیا۔

”ہاں..... بل ادا ہو چکا ہے۔ بس اب یہ لے جائیں۔ برگر، ٹھنڈا اور ڈرنک گرم ہو گئی ہے۔“ لڑکے نے سر پر ہاتھ مار کر کہا اور رے نہ بردستی اسے تھما دی۔

”کیا؟“ میرا مطلب ہے..... کس نے بل ادا کیا؟“ حیرت کی زیادتی سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

”بس..... آپ کیوں بکری کے وقت ہمارا نام خراب کر رہی ہیں، وہ جو سامنے کالی شرٹ میں فراز بھائی بیٹھے ہیں..... اس نے بل دیا ہے۔“ عارف نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا، اس کی زبان سے تیز اس کے ہاتھ چل رہے تھے فراز سب کا ہر دلی عزیز تھا اسی لیے کافی لوگ اسے پہچانتے تھے۔ عارف مڑ کر جلدی سے دوسرے اسٹوڈنٹ کے آؤر کی تکمیل کرنے لگا۔ وہ کم صم کمزری رہ گئی، پھر اخلاقی تقاضے نبھانے کے لیے اس میز کی طرف بڑھی جہاں فراز تنہا بیٹھا ہتھکیوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”تھیک پو..... میں پیسے گھر بھول آئی تھی..... کل ہی لوٹا دوں گی۔“ آسیہ نے فراز کے قریب پہنچ کر جھکتے ہوئے کہا۔

”شکر یہ کی کوئی بات نہیں ہے..... اب ہم ایک جگہ پڑھتے ہیں.....“ بھی آپ بھی مجھے چائے پلاؤ بیچے گا، حساب برابر۔“ فراز نے اسے اپنی میز پر بیٹھنے کی آفر کی اور ہلکے پھلکے انداز میں اس کی شرمندگی دور کرنا چاہی۔

”وہ تو میں ضرور چائے کی ٹرے پہلے آپ کو بل کے پیسے لینے پڑیں گے“ آسیہ وہیں بیٹھ کر چپٹ پوچا کرتے ہوئے قدرے ریتکس انداز میں سر ہلا کر بولی۔

”چلیں، اگر آپ پیسوں کی واپسی کے لیے اتنی ہی بےحد ہو رہی ہیں تو کبھی کسی اور کو مشکل میں دیکھیں، وہ خاموشی سے اس کی مدد کر دیجیے گا..... بس میرا قرضہ اتر جائے گا۔“ فراز کے چہرے کی سحر انگیز مسکراہٹ اور سوچ کا مثبت انداز آسیہ کے دل میں گھر کر گیا۔ وہ پہلی ملاقات میں ہی اس سے کافی متاثر ہو گئی۔

فراز کو بھی آسیہ بہت اچھی لگی، سہری رنگت، کالی لٹ اس کی صندل جیسے پرلہار ہی تھی، شہابی نعل سے لب، آنکھوں میں ایسی چمک جیسے فانوس جل اٹھے ہوں، بے انتہا پرکشش

اور بولے سے قدر ایسی بھین کر دیکھنے والا ایک لٹکھ کوٹھکے جائے۔ فراز نے مکمل جائزہ لے کر اس کا عکس اپنے دل میں اتار لیا۔

”آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔“ آسیہ کی سریلی آواز اسے ہوش کی دنیا میں واپس لے آئی۔ وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تو فراز بے چین ہونے لگا۔ کچھ اور نہ سوچا تو اسے فوراً اپنے گروپ میں شمولیت کی دعوت دی۔ آسیہ کو کوئی اعتراض نہ ہوا تو اس نے بلا جھجک ہائی بھری۔

☆☆☆

”آسیہ یہ پکڑو..... کافی کا کپ..... اس کے بعد شاعری کے مقابلے کی تیاری شروع کریں گے۔“ زمیض نے فراز کے اشارے پر آسیہ کو کافی کا کپ تھمایا۔ جو وہ اپنے پیسے کے لیے لایا تھا۔ وہ سب یونیورسٹی میں ہونے والے ایک ادبی مقابلے کے انعقاد میں کوشاں تھے۔ آسیہ صبح سے مصروف تھی چہرے سے تھکان ظاہر ہو رہی تھی۔

”تم..... نہیں لپی رہے“ آسیہ نے تشکرانہ انداز میں ایک سب لیتے ہوئے پوچھا تو وہ فراز کو غصے سے دیکھنے لگا۔

”آس..... تم لپی لو..... اس کا سوڈ نہیں ہوگا۔“ فراز نے شوخی دکھائی تو زمیض نے اسے گھورا۔ پوری یونیورسٹی میں وہ واحد بندہ تھا جسے اپنے دوست کے دل کی خبر تھی۔

آسیہ کو یہاں، جلد ہی ایسے شخص دوستوں کا ساتھ میسر آ گیا۔ وہ بڑی شوخ اور چہل لڑکی تھی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اس کا نام سرفہرست رہتا۔ وہ پورے گروپ کی کرتا دھرتائی ہوتی تھی۔ سب اس کی اچھی عادتوں کی وجہ سے اسے بہت اہمیت دیتے تھے، ہوائے مرینہ کے جو فراز کی وجہ سے اس گروپ میں شامل ہوئی تھی مگر پیسے پر کھنڈ اور بد مزاجی کی وجہ سے اس کی دوسرے ساتھیوں سے کم ہی بنتی تھی۔

آسیہ کے آتے ہی مرینہ کی اہمیت مزید کم ہو گئی..... وہ اس کی مقبولیت سے جلتی تھی، مگر مجبور تھی، اگر معاملہ فراز کا نہ ہوتا تو ان لوگوں کو مزہ بھی نہ لگتی مگر اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ساری باتیں برداشت کر رہی تھی۔ وہ شروع سے ہی فراز کی سحر انگیز مسکراہٹ اور نشیلی آنکھوں پر مرستی تھی، اس کا خیال تھا کہ اس کے باپ کی دولت اور اثر و رسوخ سے متاثر ہو کر متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا فراز اس سے خوشی خوشی شادی کر لے گا۔ وہ بات نہیں جانتی تھی ان تینوں میں تیل نہیں۔

وہ فراز کا چمکا؟ آسیہ کی جانب ہوتا دیکھ کر کڑھنے لگی تھی، آسیہ مرینہ کے دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگی

اسے ایک گھونسا رسید کیا اور بولا۔

”میرے پیاروں..... راج دلاہوں..... مابدولت۔  
اپنے اور آسیہ کے نکاح میں شرکت کا دعوت نامہ دینے خاص  
طور پر یونیورسٹی آئے ہیں۔“ وہ چپکا تو سب دوستوں نے خوشی  
سے نعرہ لگایا۔

”اوئے..... اوئے..... جھمی رستم۔ تسی مگریت  
ہو..... کمال کرو یا یار۔ ہماری ٹاک کے نیچے سب چننا رہا اور  
ہمیں خبر ہی نہیں۔“ ناصرہ چیخ کر اس سے لپٹ گئی..... اب  
پورے گروپ کی توہوں کا رخ آسیہ کی طرف ہو گیا جس کے  
لبوں پر بڑی دلکشین مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”ویسے تو میری دوست بنتی ہو اس کے باوجود مجھ سے  
اتنی بڑی بات چھپائی۔“ مرینہ نے کمر پر ہاتھ رکھا اور آسیہ کے  
مقابل کھڑے ہو کر غصے سے چنگھاڑی، پورا گروپ ایک دم  
سنجیدہ ہو گیا۔ مرینہ کے انداز نے خوشی کے ماحول کو بدل کر  
رکھ دیا۔

”یار..... اس میں بتانے والی کیا بات تھی؟ مجھے  
دورانِ تعلیم ان فضولیات میں پڑنا نہیں تھا، اب رازی کی فیملی  
اچانک ہمارے گھر آئی اور دو دن میں یہ رشتہ طے  
پا گیا۔“ آسیہ اس کی نیت جانے بغیر ہاتھ پکڑ کر صفائی دینے  
لگی۔

”ہیلینز..... کول ڈاؤن۔“ فرناز کا چہرہ غصے سے سرخ  
ہو رہا تھا۔ وہ مرینہ کو کچھ سناٹا چاہ رہا تھا مگر مرینہ نے اس کا  
ہاتھ دبا کر سرگوشی کی۔

”اچھا..... سوری..... یار..... چھوڑو..... ان باتوں کو تم  
نکاح والے دن صبح سے میرے گھر آ جانا۔“ آسیہ اس کا ہاتھ  
تھام کر پیار سے بولی مگر مرینہ نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا،  
اپنا بیک اٹھایا، اور سر جھکانے بغیر کسی سے ملے تن کیٹ پار  
کر گئی، یونیورسٹی سے جاتے ہوئے۔ وہ صرف رازی کی اچھی  
یادیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ اسی لیے ہڑکر آسیہ کی  
جانب دیکھا بھی نہیں جو اس کے روپے پر سن ہی کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

”آس..... خانہ..... ہانیہ..... ارے سب  
کہاں ہو؟“ فرناز جیسے ہی گھر میں داخل ہوا۔ ایک اجنبی سا  
احساس دل میں جاگا، اس کی بے قرار نگاہیں بیوی اور بیٹیوں کو  
تلاش کرنے لگی۔

”پاپا..... پاپا..... کلکٹ دیں“ وہ دونوں جو تھوڑی  
دیر پہلے ہی ماموں کے ساتھ مل کر مونی خیس ماں کا موڈ آف دیکھ

ہی۔ مرینہ نے ایک دو بار آسیہ سے بدتمیزی کرنے کی کوشش  
کی مگر فرناز کا اتنا برادری انکشن سامنے آیا کہ اس نے مجبوراً اس  
با طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا، بھولی بھالی سی آس نے خوشی  
رشی اسے دل سے دوست مان لیا۔

فرناز بظاہر اس سے اخلاق سے ملتا..... مگر اس کے دل  
یا مرینہ کے لیے کوئی خاص جگہ نہ تھی۔ آسیہ سے ملنے کے بعد  
فرناز کے دل میں کسی اور کے لیے جگہ بنی ہی نہیں..... وہ  
ری کی پوری سامگتی۔

☆☆☆

ابھی ان لوگوں کا تعلیمی سال اختتام پر ہی ہوا تھا کہ  
ایک دن فرناز نے سب کو فون کر کے یونیورسٹی میں ملنے کے  
لیے کہا اور دھماکا کر ڈالا، کم از کم مرینہ کے لیے تو یہ دھماکا ہی  
ثابت ہوا جس نے اس کی ہستی کے پر نچے اڑا ڈالے۔

”دوستوں..... قدر دانوں..... مہربانوں..... اس  
اتوار کو میرے غریب خانے پر جمع ہو جانا“ فرناز کی خوشی  
چھپائے نہیں چھپ رہی تھی، آسیہ بھی ایک ہفتے سے یونیورسٹی  
نہیں آ رہی تھی، سب حیران و پریشان اس کے گرد جمع ہو گئے  
سوائے مرینہ کے جو فرناز کا یار غار تھا، وہ دور کھڑا دوست کی  
خوشیوں کے لیے دعا گو تھا۔

”یہ کیا نیا ڈراما ہے؟ حیراویسہ ہے جو سب کو اپنے گھر بلا  
رہا ہے۔“ ناصر نے سپاری کا پورا پیکٹ منہ میں ڈالتے ہوئے  
اسے پیچھڑا، مرینہ کا دل دھڑکا۔ وہ بغور فرناز کو دیکھنے  
لگی..... آسیہ بھی ابھی ابھی آکر ان لوگوں کے پاس کھڑی  
ہوئی تھی، اس کے چہرے کی شرمیلیں مسکراہٹ اور گالوں پر  
اندلی شرم دھپا کی لالی کوئی نئی داستان رقم کرنے جا رہی تھی۔  
”بھائی۔ اتوار کو میرا نکاح ہے۔“ ویسے کی دعوت  
ایک سال بعد کھلاؤں گا۔“ فرناز ایک دم شوخ ہو گیا۔ وہ  
مرینہ کی حالت سے بے پروا، سرشار سا دوستوں سے مبارک  
بادیں وصول لے لگا۔

”کیا..... کب..... اچانک..... کس سے؟“  
نے اس پر گھونسوں کی بارش کرتے ہوئے سوالات کی بوچھاڑ  
کر دی۔ وہ ہنستا ہوا وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔

”اس راز سے تو آس ہی پردہ اٹھائے گی۔“ فرناز نے  
معنی خیز نظروں سے آسیہ کو دیکھا جو چھوٹی موٹی ہوئی جا رہی  
تھی۔ مرینہ دل پر ہاتھ رکھ کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان کا ہنسی  
مذاق دیکھ رہی تھی۔

”کیوں تیرا منڈوٹ جائے گا..... جلدی بتا“ شاہد نے



کر اپنے کمرے میں جا کر کھلونوں سے کھیلے لگیں۔ باپ کی بکار پر یوں آکر لپٹ گئیں، جیسے سالوں کی چھتری ہوئی ہوں۔ فوراً فرمائش کر دی۔

”یہ لو اپنا بھتا..... جانتا تھا اس کے بغیر گھر میں انٹری تھوڑی ملے گی۔“ فراز نے ہنستے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دونوں کو چاکلیٹ پکڑائیں۔ ان دونوں نے ایک ساتھ باپ کا منہ چوما تو فراز نے سرشاری سے آنکھیں موند لیں، دن بھر کی نکان ہوا ہو گئی۔

”ارے۔۔۔ چلو خدا خالہ آئی بیٹھیں ہیں..... جلدی سے ڈرائنگ روم میں جا کر سیپارہ پڑھو۔“ آسیہ نے جھپکی سی مسکراہٹ سے شوہر کا استقبال کیا۔ اور بیٹیوں کو اس کا رقبہ پہنا کر تباہ کیدی، وہ دونوں سیپارہ سینے سے لگا کر سر ہلاتی ہوئی اندر کی طرف بھاگیں۔

”اوہو کیا بات ہے..... شوہر کے آتے ہی سب کو بھگا دیا۔“ فراز نے شرارت سے ایک آنکھ میچ کر بیوی کو دیوار سے چپکا دیا۔

”اف..... آپ کا کیسے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہو گیا ہے؟ فضول باتوں میں ماہر ہو گئے ہیں۔ جلدی سے فریش ہو جائیں۔ میں نے سینڈویچ بنائے ہیں۔“ آسیہ نے بے دلی سے اپنا آب چھڑایا اور باہر نکل گئی۔ فراز کو اس کی بے اعتنائی ایک دم بری لگی مگر سر ہٹک کر نظر انداز کرتا ہوا داش روم کی طرف بڑھ گیا۔

”سنیں، آپ کو مرینہ یاد ہے..... وہ جو، ہمارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی“ آسیہ نے فراز کو تویہ پکڑاتے ہوئے پوچھا، وہ ہاتھ منہ پونچھ کر ہنسنے پر دراز ہو گیا۔

”مرینہ..... وہ بھی سنسنی ملی نا۔ جس کی کسی سے نہیں بنتی تھی۔ مجھے یاد آیا وہ بھی کبھی ہمارے وقت اپنے باپ کے پیسے کا شواف کرتی رہتی تھی۔“ فراز نے فخر سے سر زور ڈالا اور کچھ سوچ کر کہا۔

”جی ٹھیک پچھانا۔ آج وہ اتنے سالوں بعد ہمارے گھر آئی تھی۔“ آسیہ نے پلیٹ میں کچپ نکال کر اسے حنفہ دج کے ساتھ پیش کیا۔

”ارے..... وہ محترمہ یہاں کیسے۔ خیریت۔ جو تھی؟“ فراز نے حیرت سے پوچھا۔

”پتا نہیں..... بتا رہی تھی کہ اس نے ہمارے سارے پرانے دوستوں کے ایڈریس حاصل کیے ہیں۔ اب سب سے مل کر پرانی یادوں کو تازہ کر رہی ہے۔ اصل میں وہ دو

سال سے بیویشن کا کوئی خصوصی کورس کرنے دینی لگی ہے، تھی، چند دنوں قبل پاکستان لوٹی تو پرانے لوگوں سے دو میل ملاپ شروع کیا ہے۔“ دھانی سوٹ میں لمبے بالور جوڑا بنائے آسیہ بہت پیاری لگ رہی تھی، فراز کو مرینہ بارے میں جاننے سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ تو بیوی حسن کی چمک میں کھونے کا طلب گار ہو رہا تھا۔

”تو پھر..... ٹھیک ہے نارازی۔۔۔ ہم اس بار ڈرائنگ روم کے صوفے اور فرنیچر تبدیل کر سکتے ہیں نا۔“ اس کی داستان حزمہ کب ختم ہوئی، فراز کو خبر نہیں، نیند سے اس آنکھیں پونچھ رہی تھیں فرنیچر کی تبدیلی کا سن کر چونک اٹھا بیٹھا۔

”کیا مطلب؟..... یہ مرینہ کا ذکر ہوتے ہوتے بار گھر کی سجاوٹ تک کہاں جا پہنچی؟“ فراز نے سنجیدگی سے پوچھا۔ آج کل کے حالات میں غم جاناں سے اہم غم روزگار ہوا تھا۔

”مرینہ آئی تھی، کچھ نہ کچھ تو برا ضرور ہونا تھا۔“ فراز دل اندیشوں میں گھر گیا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر سوچ نکیریں پھیل گئیں۔

”بس میرا دل چاہ رہا ہے کہ اب گھر کو نئے انداز میں سجایا سنو اور اجائے، بھلا اس میں کیا غلط بات ہے؟“ آسیہ گھبرا کر صفائی پیش کی، وہ اس کے چہرے کو دیکھ کر ہی سمجھ گڑ کر رازی کو اس کی بات سے اتفاق نہیں ہے۔

”میرا خیال ہے کہ فی الحال یہ بات قابل عمل نہیں ہے۔“ سمجھتا ہوا ہے کہ بڑی مشکلوں کے بعد تو ہمارا بزنس جما ہے۔ میں ابھی کسی قسم کی فضول خرچی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“ فراز نے نہ جانتے ہوئے بھی بیوی کے چہرے پر چھائے اشتیاق کو نظر انداز کیا۔ دو ٹوک الفاظ میں بات ختم کر دی، وہ اس معاملے میں اس کو جھوٹے خواب دکھانا نہیں چاہتا تھا۔

”یہ بات تو میں کئی سالوں سے سن رہی ہوں کہ حالات صحیح نہیں، حالات صحیح نہیں..... اب ایسا بھی کیا کہ انسان دلی مار کر بیٹھ جائے۔ مجھے نہیں پتا، اب..... گھر میں کچھ نہ کچھ تو فی تبدیلی ہونا چاہیے۔ کمروں کی حالت دیکھو..... گھر نارنگ و مین مارگ رہا ہے۔ اس بار تو میں پردے بھی تبدیل کروں گی۔“ وہ دھو دھو کر ان کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔“ آسیہ نے منہ بھلا کر مڑی لنگھ کر کہا۔

”میں نہیں کیا لگتا ہے۔ مجھے اپنے گھر کو اچھی حالت

## ایکٹراز جیل سے

### فرار معما بن گیا

امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر سان فرانسسکو کے ساحل سے ڈیڑھ میل دور ایکٹراز (Alcatraz) جزیرے پر قائم جیل سے اب تک 36 قیدی فرار ہونے کی کوشش کر چکے ہیں۔ ان میں دو قیدی ایسے بھی تھے جنہوں نے فرار ہونے کے لیے دوبارہ قسمت آزمائی لیکن دونوں مرتبہ ناکام رہے۔ فرار کی کوشش کرنے والے دیگر قیدیوں میں 23 قیدی فرار کے دوران پکڑ لیے گئے اور چھ محافظ کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ تاہم تین قیدی، فرینک مورس، کلینٹن اسٹینگلیں اور جون اسٹینگلیں گیارہ جون 1962ء کو اس جزیرے سے ایسے فرار ہوئے کہ ان کا آج تک پتا نہ چل سکا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔ آج بھی ان کے نام ایف بی آئی کی مطلوبہ افراد کی فہرست میں شامل ہیں۔ غالب گمان یہ ہے کہ تینوں مفروضہ قیدی فرار کے دوران سمندر میں ڈوب گئے۔ تاہم تلاش کی متعدد کوششوں کے بعد بھی ان کی لاشوں کا پتا نہ چل سکا۔ اس واقعے نے اتنی شہرت حاصل کی کہ 1979ء میں اس پر ہالی ووڈ میں ایکسپ فرام ایکٹراز کے نام سے ایک فلم بنائی گئی جس میں فرینک مورس کا کردار ادا کار کلینٹ ایسٹ وڈ نے ادا کیا۔

میرزا: احسان سحر۔ میانوالی

لگا۔ آسیہ کو کمرے میں رازی کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ چونک کر مڑی۔

”اچھا..... مرینہ میں تم سے کل بات کروں گی۔“ اس نے جلدی سے فون بند کیا اور نگاہ اٹھا کر فرار کو دیکھا۔ وہ جوتے پہننے لگا۔ چہرے کی شبیہ بڑھی ہوئی۔ لال آنکھوں کے ساتھ بہت تھکا تھکا لگ رہا تھا، ایک لمحے کو تو دل چاہا کہ جاری ناراضی بھلا کر اسے فکروں سے آزاد کر دے مگر وہ چپ چاپ بیٹھ رہی۔

”مرینہ! کتنی سچی ہے، اب تو یہ رازی کی محبت کا امتحان ہے، اسے میرا کتنا خیال ہے۔“ وہ سر جھٹک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

”اس کی خواہش نہیں..... مگر یہ کوئی دوسرا ہے تو کھیل نہیں۔ ایک بار ہاتھ تو لگا کر دیکھو پھر پتا چلے گا کتنے پیسے کھڑے دم رنج ہو جاتے ہیں مگر تم سمجھتی ہی نہیں ہو۔“ فرار غصے سے بولا: ”آسیہ رو نے بیٹھ گئی، مرد کو قابو میں رکھنے کے لیے آنسو عورت کا سب سے قدیم اور موثر ہتھیار ہے۔ یہ تدبیر اس وقت بھی کارآمد ثابت ہوئی۔ وہ ایک دم موم ہونے لگا۔

”آس..... میری جان، پلیز چپ ہو جاؤ۔ اچھا میری بات تو سنو..... مجھے ایک بڑا آرڈر ملنے کی امید ہے اگر اس میں منافع ہو گا تو یقین کرو یہ بندہ خطا کار فرمائش ضرور پوری کرے گا۔ پلیز جہاں اتنا صبر کر لیا وہاں تمہارا انتظار اور کرلو۔“ فرار نے پیار سے اس کے ریشمین بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے منانے کی کوشش کی۔

”رازی، میں جانتی ہوں آپ مجھے ایسے ہی بہلا رہے ہیں۔ شادی سے پہلے تو آسمان سے تارے توڑ لانے کی باتیں کرتے تھے۔ اب ایک چھوٹی سی گھر جانے کی خواہش پوری نہیں کر پا رہے ہیں..... اچھا خیر مجھے اپنے اور بچیوں کے گرم کپڑے خریدنے ہیں، اس لیے اضافی رقم چاہیے، اتنا تو کر سکتے ہیں نا“ آسیہ پر مرینہ کی باتوں کا ایسا گنج چڑھا کہ اسے رازی کی محبت کی شفافیت پر شبہ ہونے لگا، اس کے طنز یہ انداز پر فرار کو کھد مدہ پہنچا۔

”اف..... یہ مجھ سے آئی بدگمان ہو گئی ہے، اسے لگتا ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکتی گا۔ فرار کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کی اپنی آس ہے، جو بن کے ہر بات سمجھ جاتی تھی۔ بیوی کی بے رحمی پر اس کے دل میں درد سا اٹھا، وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

”بس یار فرار کا مزاج ایک دم مختلف ہے، وہ اسد بھائی کی طرح نہیں سوچتے، میری ناراضی سے ان پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا ہے۔“ آج بڑے دنوں بعد رازی کی جلدی گھر واپس ہوئی تو وہ دشمن جاں فون پر مصروف دکھائی دیا، اسے ہر حال میں منانا چاہتا تھا تا کہ ان کے گھر پر چھایا ہوا خوف جائے، بچیاں بھی ماں کی بد مزاجی سے پریشان تھیں۔ آس کی رونمائی ہی شکل اس پر الگ بھاری پڑ رہی تھی، کام پر بھی توجہ کم ہو رہی تھی مگر وہ کیا کرتا آس صرف بیوی ہی تو نہیں تھی، وہ تو اس کی زندگی تھی بھلا زندگی روٹھ جائے تو کیسے جیا جائے؟ وہ تانیہ ہانیہ کے لیے آکس کریم اور آس کے لیے گجراتے تھامے کمرے میں داخل ہوا تو وہ فون پر کسی سے دکھڑے رو نے میں مصروف تھی۔ فرار اس کی باتیں سننے



”اوہ تو بات اتنی سیدھی نہیں، جتنا میں سمجھ رہا تھا، یہ میاں بیوی کی معمول کی لڑائی نہیں، بلکہ اس کے پس منظر میں تو مرینہ کا ہاتھ شامل ہے، فراز میاں اب تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا، یہ نہ ہو کہ لیتے کے دینے پڑ جائیں۔“ اس نے آسیہ کو کمرے سے باہر جاتے دیکھا تو بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سوچنے لگا۔

☆☆☆

”مما..... تھک گئے..... اب گھر چلیں.....“ آسیہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ موسم سرما کے کپڑوں کی خریداری کرنے اس بڑے سے شاہنگ پلازا میں آئی ہوئی تھی جو اس کے گھر سے دور واقع تھا۔ کم بجٹ میں اچھے سوئٹرز لینے کا معرکہ دو گھنٹے میں جا کر سر کیا تو بچیوں کا بوریت اور تنگی سے برا حال ہو گیا۔ پچھلی رات کو ہی فراز نے اسے ماہانہ خرچے کے علاوہ کچھ اضافی پیسے دیئے تھے، وہ ہائیڈ اور ٹائیپ کے لیے گرم جری، اپنے لیے ایک گرم سوٹ اور فراز کے لیے بلیک رنگ کی ہائی ٹیک خرید کر فارغ ہوئی تو بیٹیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

”اچھا..... بات تو سنو پاس ہی ماما کی ایک فریڈ رہتی ہیں، تھوڑی دیر ان کے یہاں چل کر بیٹھتے ہیں، پھر واپس جا میں گے۔“ آسیہ نے بچیوں کو جوس اور چمچس کا پیکٹ دلاتے ہوئے کہا تو دونوں نے سر ہلا کر ہائی بھری۔ آسیہ بہت دنوں بعد گھر سے باہر نکلی تھی اسی لیے خوب انجوائے کرنا چاہ رہی تھی۔ اسے مرینہ کے گھریلو بغیر اطلاع دیے جانے پر پہلے تو انکچھاہٹ محسوس ہوئی۔

”کیا ہوا؟ یوں چلے جانے پر کوئی قیامت تھوڑی آجائے گی؟“ اس نے سوچا پھر سر جھٹک کر بے فکری سے چل دی مرینہ نے جو ایڈریس دیا تھا۔ وہ پچھلی گلی میں سڑک کے کنارے واقع بڑے بڑے گھر والے میں سے ایک کا تھا، بچیاں جوس پیتے ہوئے خوش خوشی ساتھ چلی گئیں۔

☆☆☆

”ارے..... اچانک..... فون کر کے آتی تو اچھا ہوتا۔“ مرینہ کی بے رخی پر آسیہ کا دل خراب ہو گیا، وہ جتنا جوش و خروش سے آئی تھی سب بھاپ بن کر رہ گیا۔ مرینہ انہیں بٹھا کر تیزی سے اندر واپس چلی گئی۔

آسیہ نے وسیع دھڑلے دار انگٹک روم کا اچھی طرح سے جائزہ لیا جو مرینہ کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھا، بے انتہا مہنگے ڈیکوریشن پیسز، جہازی سائز صوفے، کرسٹل کے لیپ شینڈ

دیواریں پر آویزاں شان و شوکت میں اضافہ کر رہے تھے۔ ”واقعی مرینہ کی اثراہٹ جائز ہے، ڈیکوریشن تو اسے کہتے ہیں۔“ آسیہ نے حسرت سے ایک ایک چیز کو تنگ ہوئے سوچا۔ اس کا احساس کتری کا شکار ایک دم عود آیا۔ ایک دم اندر سے شور کی آواز آئی۔ کوئی مرد گندی گندی گالیاں دے رہا تھا۔ مرینہ کے من من کی آوازیں بھی آسیہ کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔

”یہ اسد بھائی اس طرح مرینہ سے بات کرتے ہیں۔“ آسیہ کی نگاہوں سے بہت سارے پردے ہٹتے چلے گئے، اسد کا بیوی کے لیے متعفن لہجہ، اس کے اندر پھریری کی دوڑ گئی۔ فراز نے اتنے سالوں میں کبھی اس سے اس لب لہجے میں بات نہیں کی۔ مادی خوشی ہی سب کچھ نہیں ہوتی اصل چیز دل کا سکون ہوتی ہے۔ چند لمحوں میں ہی اس کا فلسفہ حیات بدل کر رہ گیا۔

☆☆☆

”شیراز بھائی کیا کہہ رہے ہیں؟ کب ہوا یہ حادثہ.... رازی کیسے ہیں؟“ آسیہ کی توجہ جان ہی نکل گئی، جب اس کے جینے نے اسے فراز کی گاڑی کے ایکسیڈنٹ کی خبر دی۔ وہ اسے اپنے ساتھ اسپتال لے جانے آئے تھے۔

”کفو تم چلو تو راستے میں ساری بات بتاتا ہوں۔“ شیراز خود بھائی کی وجہ سے پریشان تھا، اوپر سے آسیہ کا رونا، اسی لیے مجبوراً تھوڑا سخت لہجہ اختیار کیا اور اسے جلدی چلنے کے لیے کہا۔

”دوست.... رکے گا میں آتی ہوں۔“ اس نے تیزی سے چادر اوڑھی، دروازے کو لاک کیا، بچیوں کو پڑوس میں عذرا خالہ کے گھر چھوڑا اور جینے کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ شیراز نے گاڑی دوڑائی۔ راستہ صاف تھا، وہ لوگ پندرہ منٹ میں ہی اسپتال پہنچ گئے۔

دونوں بے قراری سے ایمر جنسی کی طرف بڑھے، ڈاکٹر فراز کے سر میں ٹانگے لگانے اور زخم صاف کر کے نئی کرنے میں مصروف تھا، زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے فراز کی رنگت چلی پڑ گئی تھی، آسیہ کا کھجور منہ کو آگیا، آنسو گالوں پر بہنے لگے تو فراز نے ہاتھ اٹھا کر اسے تسلی دینا چاہی تو منہ سے ”سی“ کی آواز نکل گئی، شیراز بھی بھائی کے کپڑے خون میں لت پت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

”اب لوگ باہر جائیں، مریض ڈسٹرب ہو رہا ہے۔“ ڈاکٹر نے فراز کو ننگے میں دیکھا تو انہیں باہر انتظار کرنے کا

کہا۔ وہ لوگ باہر نکل آئے تو فراز کا اسٹنٹ انور ایک شیج پر بیٹھا ملا، وہ بھی اسے اسپتال لے کر آیا تھا۔

”ہتا نہیں..... سر آج کل کن الجھنوں میں ہیں، مگر عین خوشی بھی شروع کر دی ہے، آفس کا مسئلہ الگ چل رہا ہے، شاید اسی لیے گاڑی چلاتے ہوئے چوک گئے، وہ تو مجھے ہوئے ڈرائیور ہیں مگر ہتا نہیں کیسے گاڑی ان سے بے قابو ہو گئی اور فٹ پاتھ سے جا ٹکرائی۔ وہ تو شکر ہے کہ میں گھر جانے کے لیے ہائیک پر ان کے پیچھے ہی دفتر سے نکلا تھا، لوگوں کا جھوم دیکھا تو رک گیا۔ ہتا چلا سر کی گاڑی کا ایک سیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ بے ہوش پڑے تھے۔ میں نے لوگوں کے ساتھ مل کر انہیں فوراً ہی اٹھایا اور اسپتال لے آیا۔“ انور شیراز کے برابر میں بیٹھا حادثے کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ ساری باتیں سنتے ہی آسیہ کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز اٹھا۔

”اچھا دفتر میں کس قسم کے مسائل چل رہے ہیں؟ یہ چھوٹا کچھ بتاتا بھی تو نہیں ہے۔“ شیراز کے لہجے میں بھائی کے لیے فکر مندی تھی۔ وہ انور سے تفصیلات جاننے لگے۔ آسیہ کے کان دوبارہ اوجھل گئے۔ اسے یاد آیا کہ فراز نے دو دن پہلے اسے کچھ بتانے کی کوشش تو کی تھی مگر وہ منہ پھلائے اس کی بات سننے بغیر اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی، اب دل کو ملال اور ہچکچتاؤں نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

”اصل میں فراز صاحب کو پہلی بار امریکا سے چادلوں کا ایک بڑا آرڈر ملا تھا، انہوں نے سارا جمع جتنا لگا کر مال تو باہر بھجوا دیا مگر وہاں سے وقت پر پیسوں کی ادائیگی نہیں ہو پائی۔ اسٹاف کو تنخواہ دینے کا وقت بھی سر پر آ گیا، پھر دوسرے بلوں وغیرہ کا بھی مسئلہ تھا۔ وہ بہت پریشان رہنے لگے تھے۔ مسلسل اپنے بائیر کو یاد دہانی کے فون اور ای میل کر رہے تھے مگر ابھی تک وہاں سے کوئی تسلی بخش جواب نہیں آیا ہے۔“ نواز نے تفصیل سے شیراز کو سارے حالات بتائے۔

”اچھا تو فراز کو یہ پریشانی مگی ہوئی تھی، شاید اس لیے اس نے غائب دماغی میں گاڑی فٹ پاتھ سے ٹکرائی ہوگی۔“ شیراز نے انور سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، کیوں کہ وہ اپنے گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا، کافی دیر ہو گئی تھی، اس کے گھر سے بھی فون آنے لگے تھے، کراچی کے حالات کی وجہ سے ہر شخص سہا سہا سا رہنے لگا ہے۔

”میرا نہیں خیال کہ حادثے کی صرف یہ ہی وجہ رہی ہوگی۔“ انور نے شیراز کے استفسار پر نفی میں سر ہلایا۔ آسیہ اپنی جگہ چوری بن گئی۔

”کیا مطلب، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ شیراز نے حیرت سے انور کو گھورا۔

”مجھے فراز صاحب کے ساتھ کام کرتے ہوئے، تین سال گزر گئے ہیں۔ ان کی رگ رگ سے واقف ہوں، وہ ایک کھرے کا رو باری آدمی ہیں، ایسے مسئلے مسائل تو بزنس کا حصہ ہیں، موتی پریشانی الگ بات ہے مگر وہ ان سے منہ بھی خوب جانتے ہیں، لیکن آج کل ان کی طبیعت کا چڑچڑاہٹن ہتا رہا ہے کہ بات کچھ اور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ذاتی پریشانی ہو، اب ہر بات کوئی اپنے دفتر کے ساتھیوں سے شیئر تو نہیں کرتا نا۔“ انور نے گہری نظروں سے ان دونوں کو دیکھا، آسیہ کو سلام کیا اور شیراز سے مصافحہ کیا۔

”انہی کیا بات ہو سکتی ہے؟“ شیراز نے اس سے ہاتھ ملایا، اور خود کھائی کی۔ ان کی سوئی اسی بات پر اٹک گئی۔

”اب یہ بات تو فراز صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔“ انور نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے، شیراز بھی اس کا شکریہ ادا کرتے اس کے پیچھے چل دیے۔

”آف یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے، میں نے اپنی بے وقوفی میں ایک فضول سی بات کو اتنا کا مسئلہ بنا کر رازی کو اتنی ذہنی اذیت دی کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔“ انور کی باتوں نے آسیہ پر سوچوں کے نئے دروازے کھول دیے۔ دل پر کھنکھناتے... کی کمی تو مطلع صاف ہو گیا، اسی لیے اس نے اپنا محاسبہ شروع کر دیا، ہر طرف سے اپنے آپ کو ہی مجرم پایا۔

”اے لڑکی... تم رازی کی پریشانی کے بارے میں کچھ جانتی ہو۔“ شیراز نے گاڑی چلاتے ہوئے سوچوں میں گم آسیہ سے پوچھا۔

”جی... نہیں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اسی میں عافیت تھی۔ شیراز اسے گھر چھوڑنے جا رہے تھے۔ فراز ابھی دواؤں کے زبر اثر سو رہا تھا، ویسے تو خطرے کی کوئی بات نہیں تھی، لیکن اسے ٹیسٹ کی رپورٹ آنے تک اسپتال میں رکنا ضروریات ہو چکی تھی، آسیہ کی خواہش تو تھی کہ وہ شوہر کے ساتھ گھر کے مگر شیراز نے حتیٰ سے منع کر دیا تھا، ایک تو وہ مردانہ وارڈ تھا، اس لیے انہوں نے خود رکنے کا فیصلہ کیا، پھر بچیوں کا بھی مسئلہ تھا، اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے گھر آنا پڑا۔

☆☆☆

آسیہ نے بچیوں کو کھانا کھلایا اور سلائے کے لیے لٹا دیا، چھوٹی ہانیہ جو فراز سے بہت ملی ہوئی تھی اس کے بغیر



سوئے کو تیار ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بہت دیر تک پاپا کو یاد کر کے روتی رہی، اسے گود میں لیے گھٹنا بھر ٹھلایا۔ وہ پھر نہیں جا کر سوتی۔

”فراز گھر پر نہیں ہیں تو لگ رہا تھا کہ جیسے دنیا کے سارے کام ہی ختم ہو گئے ہوں۔“ آسیہ سوچوں میں گم تھی۔ بچیاں سو گئیں، تو گھر میں اور سناٹا طاری ہو گیا۔ اس کی گھبراہٹ کم ہی نہیں ہو رہی تھی، رازی کا زرد چہرہ آنکھوں کے سامنے آتا تو رونا آ جاتا۔

اس نے وضو کیا اور عشاء کی نماز پڑھنے لگی، غصہ و خشوع سے اپنے سہاگ کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگیں، بچیوں پر ایک نظر ڈالی، جھوٹی والی نے ٹانگ مار کر چادر دور پھینک دی تھی، دونوں کو حج سے چادر اوڑھائی، کمرے کی لائٹ بجھائی اور قرآن شریف لے کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ دیر تک تلاوت کرنے سے دل کو سکون حاصل ہوا۔ چائے کی طلب ہونے لگی تو وہ چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر کچن سے باہر نکل آئی اس نے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا۔ فرنیچر، پردے، شوچیں سب اپنی اپنی جگہ تھے مگر شوہر کے نہ ہونے سے گھر گھر نہیں لگ رہا تھا، ایک ہی دن میں ہنستا ہستا آشیانہ جیسے گھنڈر میں تبدیل ہو گیا تھا، اسے ان سب چیزوں کو دیکھ کر دشت ہو رہی تھی، جن کی وجہ سے اس نے رازی کا دل دکھایا۔

مادی چیزوں کی چاہ میں ہی تو اس نے اپنے محبوب کو دینی اذیت پہنچائی، اسے احساس ہو رہا تھا کہ اصل حقیقت تو پیار، محبت، مہیاں بیوی کے درمیان پائی جانے والی ہم آہنگی، بچوں کی قلقاریاں اور گھر کا سکون ہوتا ہے جو ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ چیزیں تو کالی ہو جاتی ہیں، پھر ان سے ایسا بھی کیا لگاؤ کہ رشتوں کو داؤ پر لگا دیا جائے۔ مٹی، گارے سے بنا ہوا مکان چھوٹا ہوا باز آ کر وہاں رہنے والوں کے درمیان محبت پائی جائے تو اسے گھر بننے میں دیر نہیں لگتی۔ اس نے چائے ختم کی اور کمرے میں چلی آئی۔

بستر پر لیٹتے ہی سوچیں ڈنک مارنے لگیں۔ خراپا آجے دنوں سے اپنے کاروباری پریشانیوں میں گمراہ ہوا تھا کہ وہ کسی اس کے لیے باعث آزار بن گئی، بچھتاوے کا ناگ اسے رات بھر ڈستار ہا، اذیت کے مارے آسیہ کی ساری رات آنکھوں میں کئی۔

یہ اس کی زندگی کی طویل ترین رات تھی، ایسا لگتا تھا جیسے سویرا ہی نہیں ہوگا، وہ پہلی بار ایسی اندھیری تنہائی کا شکار

ہوئی تھی، اس کی زندگی کی ہر اندھیری رات میں فراز کی رفاقت اور محبت کی جان دنی نے روشنی پھیلائی تھی، آج وہ اکیلی ہوئی تو احساس ہوا کہ گھر تو گھر والوں سے بنتا ہے، سامان سے نہیں۔ فجر کی اذان نے اسے جیسے زندگی کی نوید دی، صبح کے اجالے کے ساتھ ہی وہ رات کی گھاگھوٹی کیفیت سے باہر نکل آئی، اس کے اندر جیسے بجلی سی بھرنی ہو، جلدی سے بستر سے اتر کر واش روم میں کھس گئی۔

وہ نماز پڑھ کر جائے نماز سے ہی کر رہی تھی کہ شیراز بھائی کا فون آگیا، کہ فراز کی ٹیبلٹ کی رپورٹس رات کو ہی آگئی تھیں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ سب کلیئر ہے۔ بس کچھ دنوں تک آرام کرنا پڑے گا تا کہ گھاؤ بھر جائیں۔ وہ تھوڑی دیر میں اسے ڈسچارج کرا کے گھر لارہے ہیں۔

آسیہ نے فوراً ہی شکرانے کے نفل ادا کیے، وہ کچن میں فراز کے لیے کھجوری اور چکن سوپ چڑھا رہی تھی کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ دوڑی کہ آواز سے بچیاں نہ اٹھ جائیں، وہ دونوں بھی رات کو دیر سے سوئی تھیں اسی لیے آسیہ نے انہیں آج اسکول نہیں بھیجا۔

اس نے چیک کیا تو مرینہ کا فون تھا، اس نے فوراً ہی لائن کاٹ دی، وہ اس وقت اپنی دوست نما دشمن سے بالکل بات کرنے کے سوڈ میں نہیں تھی جس نے اس کی ہستی ہستی دنیا اجاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

آسیہ نے خوشی خوشی فراز کی پسند کے کپڑے استری کیے اور نہانے کھس گئی، اس کے گھر پہنچنے سے قبل وہ فریش ہونا چاہتی تھی۔ اسنے دنوں کی بے رخی کا کچھ توارالہ کرنا تھا تا۔

☆☆☆

اسپتال سے واپسی کے بعد وہ چند دن بستر پر رہا، اس دوران میں جس طرح آسیہ نے گھر اور باہر کی ذمہ داریاں نبھائیں اس کے دل کے سارے کچے شکوے یوں دھل گئے جیسے بارش کے بعد سارا منظر دھل جاتا ہے۔ وہ آسیہ کی حیران دہی، محبت فراموشی نہیں کر پایا، جو اس نے ایکسپریٹ کے بعد نبھائی۔

وہ بستر پر منہ پھلائے پڑا رہتا، آفس کے معاملات کی فکر و کرر کو تنخواہوں کی ادائیگی کرنی تھی، ایسے میں وہ نہ صرف اس کے غم کو برداشت کرتی بلکہ شوہر کو جیسے پہلی کا چھالنا لگتا۔

شیراز بھائی بچوں کے ساتھ روزانہ چکر لگاتا۔ بھتا ہو سکتا، باہر کے کام سناٹا تھا۔ انور نے دفتر کے سارے معاملات



ایمانداری سے سنبھالے۔ اکثر وہ دفتر کا کام گھر ہی لے آتا تو وہ بھی بھالی کی کچھ نہ کچھ مدد کر دیتا، مگر روزانہ کے کئی کام ایسے ہوتے جو آسیہ کو خود کرنے پڑتے، سب سے خوش آئند بات یہ ہوئی کہ اس دوران میں جب بھی مرینہ کا فون آیا، یا تو آسیہ نے مختصر سلام دعا کر کے بند کر دیا، یا پھر دوبارہ بات ہی نہیں کی۔ فراز کے ایکٹیوٹ کا سن کر وہ محترمہ آنے کو جھل انھیں مگر آسیہ نے بڑے طریقے سے منع کر دیا، ویسے بھی رازی نے بیوی کو تنبیہ کر دی تھی کہ وہ مرینہ سے تعلقات کم سے کم رکھے گی۔ رازی کی بیماری کے دوران میں اسے خود بھی احساس ہوا کہ اس کے لیے دنیا میں اسے شوہر سے بڑھ کر کچھ نہیں، دوسروں کے درغللے میں آکر گھر کو جانی کے دہانے تک لے جاتا کہاں کی غصہ کی تھی۔

☆ ☆ ☆

”آس..... او..... آس“ مارے پیٹم صاحبہ سب کام کارج چھوڑ دیا کر میری بات سنو۔“ فراز کی آواز میں خوشیاں کھٹک رہی تھیں۔

”کیوں..... چیچ چیچ کر پورا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے۔“ آسیہ جو کچن میں بڑے انہماک سے رات کے کھانے کے لیے قیرہ بھوننے میں مگن تھی گفتگو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی، ہاتھ پونچھ کر باہر جاتے ہوئے بولی۔

”میں..... تمہیں بتا نہیں سکتا کہ کتنا خوش ہوں“ فراز نے اسے گھما ڈالا۔ آسیہ کا سر گھومنے لگا تو وہ چکراتے سر کو تھامے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”سو..... سواری میں تو بھول ہی گیا کہ تمہاری طبیعت خراب ہے، ڈاکٹر نے بہت احتیاط بتائی ہے۔“ رازی ایک دم اپنے جذباتی پن پر گھبرا اٹھا اسے چلا سے تھام کر زبردستی وہیں لٹا دیا۔ اپنی خوشی میں اس کے دل سے یہ بات تو نکل ہی گئی تھی کہ وہ آج کل دوبارہ ماں بننے کے مراحل سے گزر رہی ہے۔

”کیا ہوا..... کیوں اتنے خوش ہیں؟“ سب کا جوش ملی کر اس کے حواس بھال ہوئے تو زری سے پوچھنے لگی۔ رازی کے چہرے کی شوٹی لوٹ آئی۔

”تمہارے علم میں یہ بات تھی نا..... میں نے یہ چاؤلوں کا جو آرڈر امریکا بھیجا تھا، اس کی ادائیگی رکی ہوئی تھی، وہ تو شیراز بھائی کی مالی مدد کی وجہ سے میں درکار کی رکی ہوئی تنخواہیں اور بلوں کی ادائیگی کے قابل ہوا، اب مائیکل جو میرا بائیر ہے اس کا جواب آ گیا ہے۔ اس نے نہ صرف پوری

رقم بھیج دی ہے، بلکہ وقت پر ادائیگی نہ کرنے کا ہرجانہ بھی اگے سے ادا کیا ہے، اس لیے ابھی خاصی رقم میرے اکاؤنٹ میں آگئی ہے۔“ اس نے آسیہ کا ہاتھ سہلاتے ہوئے پیار سے کہا، جو سر کے نیچے کھن لگائے، منہ اونچا کیے مکمل طور پر شوہر کی طرف متوجہ تھی۔

”اچھا..... مگر آپ نے پوچھا نہیں کہ اس نے پیسے دیر سے کیوں بھیجے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ..... ایک طویل کہانی ہے جو اس نے مجھے فون پر بتائی، مجھ سے بزنس کرینے سے قبل اس نے ایک اور بڑی پاکستانی پارٹی سے ڈیل کی تھی، انہوں نے سیکم والا مال تو بہت اچھا دیا، مائیکل مطمئن ہو گیا۔ مگر جب مال یہاں سے آگے سپلائی ہوا تو پتا چلا کہ چاؤلوں میں وزن بڑھانے کے لیے کنگرو وغیرہ کی ملاوٹ کی گئی تھی، مائیکل کا کسٹمر تو ایسے گھٹیا مال پر ہتھے سے اکھڑ گیا۔“

مائیکل نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ اس کی سارکھ کا معاملہ تھا اس لیے اس نے وہاں اضافی رقم دے کر پہلے وہ چاول صاف کروائے، پھر انہیں آگے سپلائی کیا۔ وہاں کی لیبر پاکستان کے مقابلے میں بہت مہنگی ہے اسی لیے اسے ٹھیک ٹھاک جھٹکا لگا جس سے اسے فائدے کی جگہ نقصان ہوا۔

”اس بار اس نے اپنے ایک پاکستانی ورکر شیم کے توسط سے جو کہ میرا بہت اچھا دوست بھی ہے، بڑی کمپنی کی جگہ مجھ جیسے چھوٹے سپلائر کو بزنس دیا، شیم کے بھروسے پر اس نے مجھے پہلی بار آرڈر تو دے دیا مگر پھر بھی وہ اندر سے ڈرا ہوا تھا، بقول اس کے ایک پاکستانی سے چوٹ کھا کر بیٹھا تھا، اتنی جلدی اعتماد کیسے بھال ہوتا پھر اسے یہ بھی شبہ تھا کہ کیوں کہ میرا کاروبار بڑے پیمانے پر نہیں ہے، تو کہیں زیادہ منافع کی لالچ میں میں نے بھی ملاوٹ والا مال آگے نہ بھیج دیا ہو۔ اس لیے اس نے اپنی نسل کے لیے پہلے مال چیک کیا پھر سپلائی آگے بڑھائی، ان معاملات کی وجہ سے وہ منہب روکے ہوئے تھا۔ جب اسے وہاں سے پوری ادائیگی ہو گئی تو اس نے میرے پیسے بھیج دیے۔ اسے اکی میلو کے ذریعے میری معلومات کا اندازہ ہو رہا تھا اسی لیے بغیر کہے ہرجانہ بھی بھرا، مجھے کی بات یہ ہوئی کہ ہمارا چاول وہاں اتنا پسند کیا جا رہا ہے کہ مائیکل کا ایک اور بڑا آرڈر بھی مل گیا۔“

”آخر چھوٹے بھائی کی لالچ میں لوگ نہ صرف اپنا دین وایمان خراب کرتے ہیں بلکہ وطن سے بھی غداری کرتے ہیں، کیا فائدہ ہوا، اب اس رقم کو مائیکل تو نیا آرڈر نہیں دے گا



تا..... اگر ایمانداری سے چلتے تو وہ ان کے ساتھ کاروبار کر رہا ہوتا۔“

”جسہیں پتا ہے نا جان..... جہاں وطن کی عزت کا معاملہ آجائے وہاں میرے لیے ہر بات ختم ہو جاتی ہے، میں سب سے پہلے پاکستان کی ٹیک ٹائی کے بارے میں ہی سوچوں گا، اسی لیے میں نے کم منافع رکھتے ہوئے مائیکل کو سب سے اچھی کوائٹی کے صاف سترے چاول بیچے تھے، اب ان لوگوں کو نہ صرف ہمارا کام پسند آیا بلکہ مجھے اس سے بھی بڑا آرڈر مل گیا ہے، میں نے سب سے پہلے تو شیراز بھائی کے پیسے دیئے ہیں۔“ وہ سرشاری سے مسکرایا۔

”یہ..... تو بہت اچھا ہوا، بے شک اللہ نیکی کی راہ اٹھانے والوں کو کبھی بے آسرا نہیں چھوڑتا۔“ آسیہ نے آنکھ بند کر کے کہا اور خاموش ہو گئی۔

”کیا بات ہے..... تم اتنی خوش نظر نہیں آرہی ہو، جیسی میں توقع کر رہا تھا۔“ رازی نے اس کے چہرے کی جھنجکی سی مسکراہٹ دیکھی تو پوچھ بیٹھا۔

”بس..... ویسے ہی صبح سے طبیعت کمری کمری سی ہے۔“ آسیہ نے اسے ٹالنا چاہا اور اس کا دل رکھنے کو اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ڈیئر۔ میں تمہاری ہر اداسی اچھی طرح واقف ہوں، اصل بات بتاؤ۔“ رازی نے اسے دوبارہ زبردستی لٹایا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھنے لگا تو اس کی آنکھیں پھر آئیں۔

”صبح مرینہ کا فون آیا تھا، وہ آج کل بہت پریشان ہے۔ فون پر ہی روئے گی۔“ آسیہ نے ہاتھ مسکتے ہوئے بتایا، رازی اس کی طرف سے غور سے متوجہ ہو گیا تھا۔

”کیوں؟ خیریت تو ہے نا۔“ رازی کا لہجہ پُر جھمک تھا، وہ اندر سے ڈر گیا کہ اس عورت نے اسے جان کی ہستی ہوئی زندگی میں کوئی نیا تماشا نہ کھڑا کر دیا ہو۔

”آج کل وہ لوگ بڑے بڑے حالات سے گزر رہے ہیں۔“ آسیہ نے ٹھہر ٹھہر کر بتانا شروع کیا۔ ”اصل میں

اختیارات کے ناجائز استعمال کی وجہ سے جن افسران کی تنزیہ ہوئی ہے ان میں اسد بھائی کا بھی نام آیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ غضب بھی ہوا کہ اب ان کے اثاثوں کی بھی جانچ پڑتال شروع ہو گئی ہے کہ سرکاری تنخواہ دار ملازم کے پاس اتنی جائیداد کہاں سے آئی؟“ آسیہ نے افسرہ لہجے میں بتایا، صبح فون پر مرینہ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے کے بعد سے اس کا دل بہت

اداس تھا، وہ ایک نرم دل لڑکی تھی کسی کو یوں روکا دیکھنا اس کے لیے مشکل امر تھا۔

”مرینہ کے والد تو خود سرکاری افسر تھے، میں نے سنا تھا کہ ان کا اپنے وقت میں بڑا اثر رسوخ تھا، انہوں نے اس سلسلے میں داماد کی مدد نہیں کی۔“ فراز بھی افسردہ ہو گیا، بہر حال وہ ان لوگوں کی پرانی رفیق کاری تھی۔

”ساری بات کرسی کی ہوتی ہے..... جب وہ ہی نہ رہے، تو تعلقات بھی دم توڑ جاتے ہیں۔ جب تک آدمی بڑے عہدے پر ہوتا ہے۔ لوگ جھک جھک کر سلامی دیتے ہیں، بعد میں کون کسی کو پوچھتا ہے، اب ان سے جو ہو سکتا ہے وہ کر رہے ہیں، مگر اس بار ادھر سے بہت سختی ہو رہی ہے ویسے مجھے میں ان کی شہرت بھی کچھ اچھی نہیں رہی، ایسا پیسا جیسے آتا ہے ویسے ہی چلا جاتا ہے، وہ تو خود اب بچوں کے محتاج ہیں۔“ آسیہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”اللہ اس کی مشکل آسان کرے، خیر تم اپنی طبیعت مت خراب کرو۔ ایک اور خوش خبری سنو..... میں نے رنگ والے کو بلا لیا ہے، سب سے پہلے گھر میں رنگ و روغن کا کام مکمل کروالیتے ہیں، اس کے بعد نیا فرنیچر لے آئیں گے۔“ فراز نے بیوی کی خواہشات پوری کرنے کی ٹھانی۔

”نہیں..... اب مجھے اپنا گھر ایسے ہی پیارا لگ رہا ہے، کسی بھی طرح کی فضول خرچی کی کوئی ضرورت نہیں، میں سمجھ گئی ہوں کہ مکان کی رونق کیمپوں سے ہوتی ہے سامان سے نہیں۔“ آسیہ نے مسکرا کر شوہر کو دیکھا۔ اس کی حسین آنکھیں خوشی کے احساس سے جھلک کر نکلے گئیں۔ رازی نے محبوبیت سے بیوی کو دیکھا اور سر ہلا کر اتفاق کیا۔

”پاپا..... پاپا..... میری چاکلیٹ آبی نے کھالی۔“ چھوٹی والی ہانیہ ہانپتی ہوئی آکر باپ سے مگرائی۔

”نہیں پاپا میں نے تو یہ والی چاکلیٹ کھائی تھی..... اس پر ہانیہ کا نام کہاں لکھا ہے؟“ چھوٹی ہانیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ شرارت اس کی آنکھوں سے پک رہی تھی۔

”یہ لو پاپا آپ دونوں کے لیے بہت ساری چاکلیٹس لائے ہیں، اب تو میری شہزادیاں خوش ہیں نا۔“ فراز ان دونوں کا جھڑا مٹانے میں لگ گیا۔ آسیہ پاس کھڑی مسکراتی رہی، کچھ دیر میں ان چاروں کی ہنسی کمرے میں گونجنے لگی، مکان کو مٹا جانے میں اسے بہت سی آزمائشوں سے گزرنا تو پڑا تھا مگر اب وہ جینے کا کر پیمانہ لگتی تھی۔







”ہاں ماما! تھا کاٹ تو ہے کیوں کہ دن بھر کل کے پروگرام کے لیے ریہرسل ہوتی رہی۔ بار بار چیزوں کو درست کرنے کی خاطر ہمیں اپنے ٹیبلو کو دہراتا پڑا۔ پھر مجھے گھر کے لیے کام بھی دے دیا گیا ہے مگر نیند میں کچھ زیادہ ہی وقت ضائع ہو گیا۔“

”چائے پی کر کام بھی کر لیتا۔“ ماں بولی۔

اس نے ہاتھ منہ دھوے اور چائے پینے کے بعد اپنی ٹیبل پر جا بیٹھا۔

رات کے آٹھ بجے کا وقت ہو گا۔ گل فراز نے پکار کر کہا۔ ”کیپٹن صاحب! آجائیں کھانا کھا لیں۔“ وہ نہ جانتے ہوئے جی ڈانٹنگ ٹیبل پر آ بیٹھا مگر لا ابالی انداز میں کھانا کھایا۔ وہ اپنے والد کا تھا کہ باپ نے پوچھا۔ ”بیٹا! کیا سارے کارڈ بنانے کی ذمہ داری تم پر آن پڑی ہے۔“

مسکراتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ ”نہیں آدمیے کارڈ تاجش بننا رہا ہے۔ ہم دونوں کی خوشنظمی کے پیش نظر سر نے ہم دونوں کو کارڈ بنانے کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔“

ناہید نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا۔ ”بیٹا ہماری خواہش کب پوری ہوگی؟ وہ دن کب آئے گا جب تم پاک فوج کی وردی زیب تن کیے کاغذوں پر فیٹے سجائے ہمارے خوابوں کو تعبیر بخشو گے؟“

شاہ زیب بولا۔ ”ماما چند سال کی بات ہے! انگر کے بعد سلیکشن ہو گا اور پھر آپ کو خوابوں کی تعبیر مل جائے گی۔ بس یہ دو تین سال اہم ہیں۔ میں کیپٹن بنوں گا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ دونوں نے تو میری پرورش کے دوران ہی مجھے کیپٹن کہہ کر اپنی طور پر تیار کر دیا ہے کہ میرا مقصد حیات ملک و قوم کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔“

گل فراز بولا۔ ”بیٹا تمہارے دادا کی بھی یہی خواہش تھی مگر جب میں سلیکشن کے لیے گیا تو بہت قدامت گئی کی وجہ سے تمہارے دادا کے خواب کو پورا نہ کر سکا۔ بس میں سمجھتا ہوں کہ سلیکشن سے جہاں ہماری خواہش پوری ہوگی وہیں ہمارے بزرگوں کی روحوں کو بھی تسکین پہنچے گی۔“

کھانے سے فارغ ہو کر شاہ زیب ایک بار پھر اپنی ٹیبل پر جا بیٹھا۔ کارڈوں پر اشعار لکھتا۔ انہیں مختلف زاویوں سے دیکھتا اور کلرز کے ذریعے انہیں مزید جاذب نظر بنانے میں مصروف ہو جاتا۔ اتنی جواوت و خوب صورتی پیدا کرنے کے بعد بھی وہ بعض کارڈوں سے مطمئن نہ ہو پاتا۔

یوں خوب سے خوب تر کی تلاش میں وہ دوبارہ کارڈ بنانے لگتا۔ اس کام کو کرتے ہوئے اس کی محویت کا یہ عالم تھا کہ اسے وقت کا اندازہ ہی نہ رہا۔

”بیٹا! گھڑی دیکھو ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔“ ناہید نے پکار کر کہا۔

”بس ماما میں دو کارڈ اور مکمل کر لوں پھر سونے کے لیے آتا ہوں۔“

ماں اس کے قریب آ گھڑی ہوئی، کئی کارڈ اٹھا کر دیکھے اور ماشاء اللہ و سبحان اللہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ پوچھنے لگی۔ ”پروگرام کس طرح ترتیب دیا گیا ہے؟“

”پہلے ٹیبلو پیش کیے جائیں گے پھر نوٹس اور دسویں جماعت کے طلباء کے لیے ان کی شخصی خوبیوں کے مطابق اشعار پڑھ کر باری باری انہیں کارڈ دیں گے جس کے بعد دسویں جماعت کے طلباء بھی تمام اساتذہ کو اشعار کے ذریعے خراج تحسین پیش کریں گے۔ یوں پارٹی کے اختتام پر دعوت کا اہتمام ہے۔“

پشاور صدر کے ایک گھر میں تین نفوس پر مشتمل یہ چھوٹا سا خاندان تھا۔ گل فراز الیکٹرک دیک کے سامان کا تاجر تھا۔ بازار میں اس کی دکان تھی۔ ناہید اس کی پچازاد تھی۔ دونوں تعلیم یافتہ و خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ شادی کے کئی سال تک ناہید کی گود سونی رہی۔ طبی اعتبار سے زوہین مکمل تندرست تھے۔ پھر دعاؤں اور سنتوں کی نوبت آئی۔ اس پورے عرصے میں ناہید کا حسن خاصا ماند پڑ گیا۔ اس کی فکر مندی اور بے چینی اس کی صحت کو متاثر کر رہی تھی مگر پھر مشیبت ایزدی کے مطابق شادی کے ساتویں برس ان کے کمشن میں پھول کھلا جس کی آمد پر تمام خاندان میں خوشیاں سنائی گئیں۔ سٹھائیاں بنیں، دعوتیں ہوئیں اور شاہ زیب کی آمد سے ناہید کے چہرے کی بشارت اور حسن و رعنائی بھی لوٹ آئی۔ اب اس کی توجہ کامرکز و محمد اس کا بیٹا تھا جس کی پرورش اور نگہداشت میں کسی قسم کی کمی کا تصور بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ ہاں ابھی بھی یہ احساس کچھ کے لگا تا کہ شاہ زیب کے بعد کسی اور اولاد کی ولادت نہ ہوئی مگر وقت کے گزرنے سے یہ خلش بھی کم ہوتے ہوئے ختم ہو گئی۔ یوں ماں کی شفقت و محبت تھا شاہ زیب کے حصے میں آئی۔ اس کی اٹھان کی فوجی صورت تھی وہ صحت مند اور ڈبل ڈول کے اعتبار سے اپنے ہم عمروں میں نمایاں معلوم ہوتا تھا۔ ساڑھے تین سال کی عمر میں اسے آری پبلک اسکول کی راہ دکھائی گئی جہاں کے ماحول میں اس نے خوب خوب نام کمایا۔ وہ نصابی و غیر



نصابی .... سرگرمیوں میں ممتاز شمار کیا جاتا۔ پرائمری کے امتحان میں وہ تمام اسکول میں اول آیا۔ اس کی صلاحیتوں کے اعتراف میں ٹرائی سے نوازا گیا۔ آنکھوں جسامت تک بھی وہ اپنی کلاس میں اول آتا رہا۔ نویں جماعت کے نتائج میں بھی اس نے نوے فیصد نمبر حاصل کیے تھے۔ وہ ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی انعامات حاصل کرتا ہوں وہ اپنے والدین کے لیے ہی نہیں اساتذہ کے لیے بھی باعث فخر تھا۔ ماں کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ خود اس کے کپڑے استری کرتی، شوز پائش کرتی اور اس کی تمام خواہشات کو پورا کرتی۔ موسم سرما کی آمد کے ساتھ ہی وہ اس کے لیے سوئٹرز بننے شروع کر دیتی جسے دیکھ کر اکثر اس کا شوہر کہا کرتا۔ ”تم اتنی محنت سے سوئٹرز بنتی ہو حالانکہ بازار میں خوب صورت دودھ زیب سوئٹرز با آسانی مل جاتے ہیں۔“

”ان سوئٹرز میں ماں کی مٹا اور چند بانی داری تھی تو نہ ہوگی۔“ وہ بڑی محبت سے کہتی۔

16 دسمبر کی صبح گل فراز اور ناہید نے اٹھ کر نماز پھر ادا کی اور دونوں ہی جدا جدا مصروفیات میں لگ گئے۔ گل فراز نے پہلے قرآن کریم کا مطالعہ کیا اور بعد میں اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ ناہید نے بھی قرآن کریم کے مطالعے کے بعد کچن کی راہ لی۔ وہ ناشتا بنانے میں مصروف تھی کہ اسے اندازہ ہوا شاہ زیب شاید نہیں اٹھا۔ وہ کمرے میں گئی اور شاہ زیب کو آواز دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور اسکول جانے کی تیاری کرنے لگا۔ محنت سے تیار کیے کارڈز سنبھالے، ناشتے کے لیے ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے گھڑی پر نظر پڑی تو اس نے ماں کو پکار کر کہا۔

”ماما! میں اسکول جا رہا ہوں۔“

”ناشتا بالکل تیار ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ناہید نے لیے آگے بڑھی مگر اسی دوران کچن کا بارن بجا۔ شاہ زیب نے آگے بڑھ کر ماں کی پیشانی کا بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

”ماما کیا کروں گاڑی آگئی۔ آپ نے پھرے لیے ناشتا بنایا آپ یہ سمجھیں میں نے ناشتا کر لیا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر کی طرف چلا گیا۔

ناہید نے ٹیبل پر رکھ کر جویت کے عالم میں اسے جاہا ہوا دیکھتی رہی۔ اسی دوران گل فراز بھی آگیا۔ دونوں نے ایک ساتھ ناشتا کیا جس کے بعد گل فراز اپنی دکان کے لیے روانہ ہو گیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی کہ گھریلو ملازمہ آگئی جس سے مخاطب ہو کر وہ بولی۔ ”پہلے

## بچوں کو دودھ پلانے

### والی ماؤں کا بلڈ پریشر

ماؤں کی جانب سے شیر خواروں کو دودھ پلانے کا فائدہ صرف بچوں کو ہی نہیں ہوتا بلکہ خود ماں بھی اس سے مستفید ہوتی ہیں۔ ایک نئے طبی جائزے میں انکشاف کیا گیا ہے کہ دودھ پلانے کے کئی سال بعد بھی ماؤں کے بلڈ پریشر بڑھنے کا امکان کم ہوتا ہے۔ یونیورسٹی آف ویسٹرن سنڈنی اسکول آف میڈیسن کے ریسرچرز نے دیکھا ہے کہ خواتین اپنے بچوں کو جتنے زیادہ عرصے تک اپنا دودھ پلاتی ہیں 64 سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے تک ان میں ہائی بلڈ پریشر کا امکان اتنا ہی کم ہوتا ہے تاہم 64 سال کی عمر کے بعد اس فائدے کا امکان گھٹنے لگتا ہے۔ ریسرچرز نے بریسٹ فیڈنگ اور ہائی بلڈ پریشر میں تعلق کو سمجھنے کے لیے 74 ہزار 785 آسٹریلیائی خواتین کے بارے میں تحقیق کی جو 45 سال یا اس سے زیادہ عمر کی تھیں۔

مرسلہ: ذویا فراہ، جہلم

کچن میں برتن وصول پھر جھاڑو دے کر پو پھالگا لو اور ہاں آج مشین لگا کر کپڑے بھی دھولو۔“ یہ کہہ کر وہ خود انھی اور دوپہر کے کھانے کی غرض سے کچن کی طرف چلی جہاں اس نے کھانے کی تیاری شروع کر دی۔ کچن اور فی لاونج برابر برابر تھے۔ مارتھک شوز آر ہے تھے۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ وائٹ کچن کڑا اسی بنانے کی عملی ترکیب بتاتی جا رہی ہے جسے دیکھنے اور سمجھنے کی خاطر وہ کچن کی مصروفیات ترک کر کے فی وی لاونج میں آ بیٹھی۔ وہ آج پہلی بار اس طرح کھانے کی ترکیب نہ دیکھ رہی تھی بلکہ وہ تو اکثر انواع و اقسام کے کھانوں کی ترکیب سمجھ کر سننے سے بھرے کرتی تھی جس سے اس کا شوہر اور بیٹا خوب خوب ملاحظہ ہوا کرتے تھے۔ دن گیارہ بجے کا وقت تھا اچانک بریکنگ نیوز آئی شروع ہوئی جس کے مطابق آری پبلک اسکول پر دہشت گردوں نے حملہ کر دیا تھا۔ اساتذہ و طلباء پر غماز بنا لیے گئے تھے۔ دھماکوں اور فائرنگ کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ یہ خبر بار بار بار بار ترین خبر کے طور پر آتی رہی اور پھر پروگرام روک کر اس اندام ملک واقعے کی براہ راست کورج شروع ہوئی۔ اس نے ریسیوٹ اٹھا کر کئی چینل دیکھے ہر طرف یہی لرزہ خیز خبر تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند طلباء کی موت کی خبر بچاس سے



زیادہ کی تعداد تک پھیل گئی۔ اس دوران جب یہ خبر نشر ہوئی کہ دہشت گردوں نے اسکول کے اس ہال پر بمی قبضہ کر رکھا ہے جہاں نویں دسویں کے طلباء کی پارٹی ہو رہی تھی تو اس کی بے چینی و اضطراب بہت بڑھ گیا۔ وہ مٹھیاں بھیج کر اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کر رہی تھی۔ بظاہر ہی وہی اسکرین پر آرہی پبلک اسکول کے واقعات دکھائے جارہے تھے مگر وہ لاشعوری طور پر تصور میں اسکول کے اس ہال میں جا پہنچی جہاں پارٹی ہو رہی تھی۔ دہشت گرد فائرنگ کرتے اور بچے ان سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دل خراش چیخوں سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ قہام لیا۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اپنا موبائل اٹھا کر اس نے گل فراز کا نمبر ڈائل کیا۔ نیٹ ورک بڑی تھا۔ بمشکل تمام رابطہ ہو پایا۔ دوسری طرف سے گل فراز بولا۔ ”میں اسکول کی طرف جا رہا ہوں تم میرا انتظار کرو۔“ وہ لی وی کے سامنے کھینچنے کی حالت میں بیٹھی تھی۔ شہدا کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ملازمہ نے آکر کچھ پوچھا جس پر وہ بولی۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ یہ سن کر ملازمہ واپس چلی گئی۔ وہ کبھی اٹھتی کبھی بیٹھتی کبھی جھٹل بدلتی پھر موبائل اٹھا کر نمبر ملاتی، بڑی کوششوں کے بعد ایک بار پھر گل فراز سے رابطہ ہو پایا جس پر اس نے بتایا کہ وہ لیڈی ریڈنگ اسپتال میں ہے جہاں بے تحاشا دش ہے۔ مزید کوئی معلومات ہوئیں تو بتائے گا۔ اس نے اپنی ماں اور بھائی کا نمبر ڈائل کیا کچھ دیر بعد وہ بھی آگئے۔ انہوں نے بتایا۔ ”تمام بازار بند ہیں، ٹریفک بے تنظیم، افراتفری کا عالم ہے۔“ پھر یہ کہہ کر ”میں بھی لیڈی ریڈنگ اسپتال جا رہا ہوں... چلا گیا۔“

لیڈی ریڈنگ اسپتال کے باہر لوگوں کا اژدحام تھا۔ گل فراز کا برا اور طبیعتی زائد خان بھی اس نے جا مل سیکڑوں والدین تھے جو اسپتال کی ایمرجنسی میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ جھوم بے تحاشا تھا وہ دونوں بڑی مشکل سے ایمرجنسی میں پہنچے جہاں ہر زخمی بچے کے گرد اس کے عزیز واقارب کھڑے تھے۔ مختلف بچوں کو دیکھتے ہوئے ایک بچے حذیفہ کے پاس کھڑے ہو کر گل فراز نے اس کی طبیعت پوچھی۔ ”خف و کمزور آواز میں وہ بولا۔“ ”انکل ٹھیک ہوں۔“ جس کے بعد اس کا اگلا سوال یہ تھا۔ ”اور شاہ زیب.....“ جس پر حذیفہ نے کچھ کہنے کے لیے لب ہلائے اور یہ کہتے ہوئے کہ ”شاید وہ تو.....“ آنکھیں بند کر کے

آنسو بہانے لگا۔

ان دونوں نے مل کر تمام زخمی بچوں کو دیکھا اور پھر مردہ خانے کی طرف مڑ گئے۔ جن بچوں کی شناخت ہوتی جا رہی تھی انہیں ان کے درگا کے حوالے کیا جا رہا تھا۔ آہ و فغاں کی صدا انہیں گھیس۔ نالہ و فریاد ایسی کہ آسمان کو چھو رہی تھیں۔ ہر طرف کھرام مچا تھا۔ لوگ اپنے پیاروں کی لاشوں کے گرد کھڑے زار و قطار رو رہے تھے۔ گل فراز بہت سے چہروں کو پہچانتا تھا۔ اکثر شاہ زیب کے ہم جماعتوں کے والدین تھے مگر یہ وقت کسی کو تسلی دینے اور صبر کی تلقین کا نہ تھا۔ وہ خود بے چین و مضطرب تھا اس لیے کسی اور کو کیا تسلی دیتا۔ آگے کی جانب اس اسٹریچر کے گرد وہ اور زائد پھیر گئے۔ یہ کوئی اور نہیں اس کا اپنا بچہ تھا۔ اس کے سامنے شاہ زیب ہونٹ اور آنکھیں کھولے اس طرح لیٹا تھا کہ جیسے ابھی کہے گا۔ ”باباجی! آپ آگئے مجھے گھر لے چلے۔ بھوک لگی ہے۔“ مانا نے ناشتا بنایا تھا میں اب جا کر کروں گا۔“ مگر یہ سب کچھ ایک خیال تھا جس کا تصور بھی روکنے کھڑے کیے دیتا تھا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ زبان تنگ تھی پھر اچانک وہ شاہ زیب کے بازو پکڑ کر ہلانے لگا۔ ”کیپٹن صاحب! اٹھو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اسی پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ زائد نے اسے اٹھایا۔ طبی عملے نے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی جس کے بعد اسے ایک طرف بٹھا دیا گیا۔ زائد بھی بڑی مشکل سے اپنے اوسان قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ کسی کو تو اس وقت حوصلہ مندی کا ثبوت دینا تھا۔ کارروائی مکمل ہوئی۔ لاش ان کے حوالے کر دی گئی جسے اسٹریچر پر لٹا کر ایبویٹنس میں رکھ کر وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ ہر طرف سے ایبویٹنس کے سائرن بجنے کی آوازیں تھیں اگلی نشست پر زائد اور پیچھے اسٹریچر پر شاہ زیب ابدی نیند سو رہا تھا۔ گل فراز دیوانہ دار اسے تنگے جا رہا تھا۔ آنسو اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے۔ اسی حال میں گھر کے پاس پہنچے تو اہل محلہ بھی جمع تھے۔ لوگوں نے آگے بڑھ کر اسٹریچر نکالا کسی نے گل فراز کو سنبھالا۔ گھر کا دروازہ کھول کر جوں ہی اسٹریچر اندر کی طرف لے جایا گیا ناہید آہ و فریاد کرتے ہوئے آگے بڑھی اور اپنے بیٹے کی لاش دیکھ کر بے اختیار کہنے لگی۔ ”میرے کیپٹن صاحب! تم تو کہہ کر گئے تھے مانا آپ تنہا میں نے ناشتا کر لیا مگر کیا تھا تو اب تک رکھا ہے آؤ کھا لو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دیوانہ وار شاہ زیب کے ہونٹے لینے لگی اور اسی حالت میں ایک طرف گر کر بے ہوش ہو گئی۔



نرس نے آکر بتایا۔ ”سر اس مریض کی پھر وہی کنڈیشن ہوگئی ہے۔“  
 ”وہی جو پولیس کھڈی میں ہے سر۔“ اس نے بتایا۔  
 ”اس پر پھر رونے کا دورہ پڑا ہے۔“  
 ”اوکے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم چلو  
 میں اس وقت کسی کی رپورٹ دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس لیے بے وحیاتی سے پوچھا۔ ”کس مریض کی بات

## پشیمان

محترم مدیر اعلیٰ  
 میں اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں۔ جو واقعہ سناتے جا رہا ہوں یہ  
 تب کا ہے جب میں پریکٹس کرتا تھا۔ یہ واقعہ خود میں انوکھا ہے  
 اس لیے میں نے اسے بطور خاص سرگزشت کے لیے لکھا ہے۔ امید ہے  
 قارئین کو بھی پسند آئے گا۔  
 ڈاکٹر عبدالمجید  
 (کراچی)





میں ابھی آتا ہوں۔“

نرس کے جانے کے بعد میں اس مریض کے بارے میں سوچنے لگا۔ رحیم نام تھا اس کا، عبدالرحیم۔ وہ قاتل تھا اس نے ایک دکان دار کا قتل کر دیا تھا۔

دکاندار ساٹھ ساٹھ سال کی عمر کا آدمی تھا۔ اس نے اندرون سندھ سے آکر کراچی میں دکان کھولی تھی۔ شاید یہ رحیم بھی اسی علاقے کا تھا۔ جس نے نہ جانے کس وجہ سے دکان دار کا خون کر دیا تھا۔

چونکہ وہ رکتے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اس لیے گرفتار بھی ہو گیا تھا۔ اس دکان دار سے جھگڑے کے دوران اس کو چوٹ لگی تھی جو بہت شدید تھی۔ پولیس اسے زخمی حالت میں اسپتال لے آئی تھی۔ جہاں اب اس کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔

میں چونکہ ایک پولیس سرجن ہوں اس لیے اس قسم کے واقعات روزانہ کا معمول تھے۔

میرا ایک شوق اور بھی ہے اور وہ ہے قیدیوں کے حالات معلوم کرنا۔ ان کی کہانیاں سننا اور خود ان کی کہانیاں لکھنا۔ اس طرح میں نے درجنوں کہانیاں لکھ لی ہیں۔ ایسی جگہوں سے زیادہ سچی کہانیاں اور کہاں ملتی ہوں گی۔

بہر حال میں نے فائل بند کی اور اس وارد کی طرف چل پڑا جہاں اس قیدی رحیم کو رکھا گیا تھا۔ اتنے عرصے میں میرا یہ تجربہ ہو گیا کہ کون حادثاتی طور پر مجرم بنا ہے اور کون ایسا ہے جس کی فطرت میں جرم شامل ہے۔

رحیم ایسا آدمی نہیں دکھائی دیتا تھا جو اپنی فطرت میں برا ہو۔ وہ ایک دھیمے لہجے اور نرم چہرے والا آدمی تھا۔ اس نے پولیس والوں کو یہ بتایا تھا کہ اس کا کسی بات پر دکان دار دسایا ہے جھگڑا ہو گیا تھا اور اس نے دسایا کا قتل کر دیا۔

لیکن اس کی یہ کہانی مجھے مطمئن نہیں ہو رہی تھی۔ بات کچھ اور معلوم ہوتی تھی۔

چونکہ میں ایک بااختیار ڈاکٹر تھا اس لیے میرے کہنے پر رحیم کو بیڑیاں اور جھگڑیاں وغیرہ نہیں لگائی گئی تھیں۔

میں اس کے ساتھ بہت نرمی سے پیش آیا کرتا۔ اس لیے وہ میرا احترام بھی کرتا تھا۔

میں جب اس کے پاس پہنچا تو مجھے دیکھ کر اس نے بیٹھنے کی کوشش کی۔ ”نہیں بیٹھنے کی۔“ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تم ابھی کمزور ہو۔“

میں عبدالرحیم ہوں۔“ وہ پھر لیٹ گیا۔

”تم بہت جلد ٹھیک ہو کر چلے جاؤ گے۔“ میں نے بتایا۔

”لیکن جاؤں گا کہاں ڈاکٹر صاحب۔“ اس کے ہونٹوں پر ایک ہنسکی اداس سی مسکراہٹ آ گئی۔ ”یہاں سے نکل کر جیل ہی تو جانا ہے ناں۔ تو زخم ٹھیک ہوں یا نہ ہوں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ اس نے بہت دکھ بھرے لہجے میں یہ بات کی تھی۔

”عبدالرحیم تم مجھے ایک بات بتاؤ۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”تم پر جو یہ الزام ہے اس کی کہانی کچھ اور معلوم ہوتی ہے۔“

”نہیں ڈاکٹر صاحب۔ میں نے خود اس بندے کو مارا ہے۔ اس سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا۔“

”بس یہی بات میں نہیں مانتا۔“ میں نے کہا۔ ”اس آدمی کا قتل جھگڑے کی وجہ سے نہیں ہوا۔ بلکہ کوئی اور وجہ معلوم ہوتی ہے۔“

وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر دبی زخمی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ کیا ثبوت بھی ہیں؟“

”ارے نہیں بھائی بس یوں ہی میں نے اندازہ لگایا تھا۔“

کچھ دیر خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب بات تو کچھ اور ہی ہے۔“

”اگر تم مناسب سمجھو تو بتا دو۔“

”ہاں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”کسی نہ کسی کو بتانا تو پڑے گا۔ ورنہ اندر ہی اندر مر جاؤں گا ڈاکٹر صاحب مر جاؤں گا۔“

”تو چلو بتانا شروع کرو۔“

اس نے اپنی آنکھیں بند کریں۔ جیسے اپنی کہانی سنانے کے لیے خود کو سمیٹ رہا ہو۔

☆.....☆

”میں عبدالرحیم ہوں۔ ایک چھوٹے سے قصبے کا رہنے والا۔ بڑی دکھ بھری زندگی گزاری ہے صاحب۔ بہت پریشانی کی۔“

چھوٹی تھی۔ نیلماسی کا۔ میں اس کو پیار... سے رشتہ کہا کرتا۔ وہ بھی ہی رشتہ نہ تھی۔ ملائم ملائم خوب صورت۔ مجھ سے بہت لاڈ کرتی تھی۔ لیکن اس سے زیادہ میرا خیال رکھا

## جست کی کمی کی علامات

وہ انسان جن کے زخم ٹھیک ہونے میں زیادہ وقت لگتا ہو ان میں جست کی کمی ہوتی ہے۔ اس کی کو پہچاننا نہایت آسان ہے۔ ناخنوں پر سفید وجہ جست کی کمی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح شدید یا متعدی بیماری کے بعد مریض میں ذائقے کی پہچان ختم ہونے کی وجہ بھی جست کی کمی ہے۔ ایسے مریض کی بھوک میں کمی بھی واقع ہو جاتی ہے جس سے وزن کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ جست کی کمی کو پورا کر کے سب سے بہترین طریقہ خوراک ہے۔ سب سے زیادہ جست اوسٹر اور میٹ (گوشت) میں ہوتا ہے جبکہ جست کی مناسب مقدار خشک پھلوں، مٹر، لوبیہ اور دالوں وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔

مرسلہ: زرد یا فرہاد، جہلم

تھی۔ لیکن ابھی یہ عہد سامنے نہیں آیا کہ اس نے دکاندار کا خون کیوں کیا۔

”پھر یہ ہوا ڈاکٹر صاحب کہ شروع شروع میں جیتنا چلا گیا۔ یہ جو چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔ پہلے دانا دکھائی پھر جال میں پھنسا لیتی ہے اور انسان ساری زندگی اس میں پھڑ پھڑاتا رہتا ہے۔ ایسا ہی میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ میرے پاس پیسے آنے لگے تھے۔ میری زندگی کچھ اور ہو گئی تھی لیکن میں نے گھر والوں کو ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ بلکہ ان پر اپنے پیسے ظاہر ہی نہیں کیے تھے۔ چھپا کر رکھتا تھا۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اپنے قہبے میں زمین کا ایک ٹکڑا دیکھ رکھا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کو خریدنے کا ارادہ تھا۔ بس خواب تھے کہ کچھ دنوں کے بعد میں بھی چھوٹا موٹا زمیندار بن جاؤں گا لیکن قسمت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔“

”تم جوے میں بار گئے ہو گے۔“ میں نے کہا۔

”کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس کیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”جی صاحب اور بہت بڑی رقم ہار گیا۔ ہوا یہ کہ میں جیٹی صاحبہ بچیں ہزار روپے ہار تو میرے بیروں سے زمین نکل گئی۔ میں نے اپنے نوکن ہار گیا تھا۔ اب میری کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے جتنے پیسے بھی جمع کیے وہ زیادہ سے زیادہ ساٹھ ہزار روپے تھے۔ بتایا کہاں سے

کرتی۔ میں چاہے جتنی رات کو بھی کام سے واپس آؤں نیلما میرے انتظار میں ہی رہتی تھی۔“

”اور تم کرتے کیا تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمارے قہبے سے کچھ فاصلے پر کافن کی ایک فیکٹری ہے چونکہ ہمارے علاقے میں کپاس کی فصل زیادہ ہوا کرتی ہے اس لیے وہ فیکٹری ہمارے ہی علاقے میں بنائی گئی ہے۔ تو میں اس فیکٹری میں سپروائزر تھا صاحب۔ میری ڈیوٹی شفٹوں میں ہوا کرتی تھی، کبھی دن کو بھی رات کو۔ لیکن ڈیوٹی چاہے کسی بھی وقت کی ہو۔ نیلما میرا انتظار کرتی رہتی اور جب میں آتا تو مجھ سے لپٹ جایا کرتی۔“

”ہاں رحیم بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”میری بھی دو بیٹیاں ہیں۔ جن کو میں پھولوں کا طرح رکھتا ہوں۔“

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ نہ جانے اسے کیا یاد آ گیا تھا۔

نہ جانے کون سا لمحہ اسے بے چین کر دیتا تھا۔ کیسی کہانی تھی۔ میں نے اس کی زبانی جو کچھ کہا لکھا ہے وہ صرف ایک نشست کی بات نہیں تھی۔ بلکہ دو چار دنوں میں جا کر معلوم ہو سکا تھا۔

اس کے بعد اس نے تفصیل سے جو کہانی سنائی وہ بہت الم ناک تھی۔

اس نے بتایا۔ ”ڈاکٹر صاحب مجھ میں ایک بری عادت تھی۔ اس عادت نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا ہے۔ نہ جانے کیسے لت لگ گئی تھی۔ میں اپنے خدا کا بھی گناہ گار ہو گیا تھا اور اپنی نگاہوں سے بھی گر چکا تھا۔“

”اور وہ عادت کیا تھی رحیم؟“ میں نے پوچھا۔

”جوا کھیلنے کی عادت۔“ اس نے جھکتے ہوئے بتایا۔

یہ سن کر مجھے ایک شاک سا لگا تھا۔ عبدالرحیم ایسا تو نہیں لگتا تھا کہ وہ جوا کھیلنے کا عادی ہو۔ لیکن شاید جو شخص کسی کا قتل کر سکتا ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہوگا۔

”بس صاحب ایک دوست کے بہکاوے پر یہ لٹ لگ گئی تھی مجھے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں فیکٹری سے جب بھی شام کو نکلتا جوے کے اوڑے پر پہنچ جاتا۔ اس اوڑے کو چلانے والا بشیرا نام کا ایک بد معاش تھا۔ وہ بہت خطرناک آدمی تھا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔“

”ظاہر ہے ایسے اوڑوں کو چلانے والا ایسا ہی ہوگا۔“

میں تلخ ہو کر بولا۔ اس آدمی سے اب وحشت ہی ہونے لگی



لاتا۔ میں بہت پریشان تھا کہ آؤے کا بد معاش میرے پاس آ گیا۔

”کیا بات ہے عبد الرحیم۔ تو ایک طرف کیوں آ کر بیٹھ گیا ہے بچہ؟“ اس نے پوچھا۔

”اب کیا بتاؤں۔ میں پورے پچیس ہزار ہار گیا ہوں اور گھر میں بھی اتنے پیسے نہیں ہیں کہ ادا کر سکوں۔ چار پانچ گھنٹوں کی مہلت دی ہے اس نے۔“

”ارے تو اس میں ایسی کون سی بات ہو گئی۔ اس کھیل میں اوپر نیچے تو ہوتا رہتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”چل پریشان مت ہو۔ پچیس ہزار مجھ سے لے لے۔“

”تم سے؟“ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”تو کیا ہوا۔ تو پرانا بندہ ہے۔ پورا بھروسا ہے تجھ پر۔ جب کوئی لہا ہاتھ لگے تو وہاں کمر دینا۔“

”اس وقت اس کی یہ بات مجھے بہت اچھی لگی ڈاکٹر صاحب۔ وہ وقت پر کام آ رہا تھا لیکن میں کیا جانتا تھا کہ میں جال میں پھنسا جا رہا ہوں۔ میں نے اس سے پچیس ہزار لے کر جوے کا ادھار چکنا کر دیا۔“

”اس کے بعد جیت کے آسے پر تم نے پھر جو اٹھایا ہوگا۔“

”جی ڈاکٹر صاحب۔“ اس نے شرمندہ ہو کر گردن جھکا کی۔ ”پھر کھلایا، کھلتا رہا اور آہستہ آہستہ دولا کھ کا قرض ہو گیا۔ یہ قرض اس بد معاش کا تھا۔ میں جب بھی کسی سے ہارنا اس وقت وہ مدد کرنے میرے پاس آ جاتا۔ لیکن جب رقم دو لاکھ ہو گئی تو اس نے آنکھیں دکھائی۔“

”بس بھائی! اب بہت ہو گیا۔“ اس نے کہا۔ ”اب میرے پیسوں کی واپسی کی بات کر۔ دولا کھ بہت ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ میں نہیں کر سکتا۔“

”بھولا بھائی بس تمہوڑا سا موقع اور دے دو۔“ میں نے کہا۔ ”تم دیکھ لیتا قسمت میرا ضرور ساتھ دے گی۔“

”تیرے ستارے گردش میں ہیں عبد الرحیم۔ قسمت اب کبھی تیرا ساتھ نہیں دینے والی۔ تو یہ کہانی رہنے دے اور میرے پیسوں کی بات کر۔“

”ڈاکٹر صاحب میں نے اس کم بخت کی بہت منت سماجت کی لیکن ایک نفع سے زیادہ مہلت دینے پر وہ تیار نہیں ہوا۔ اب میں کہاں سے دولا کھ لے کر آتا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اس بد معاش کے پیسے واپس کیے تو وہ کچھ بھی

کر سکتا تھا۔ میرا گھر تھا، بیوی تھی۔ بچے تھے۔ پورے محلے میں بدنامی ہو جاتی کہ میں جو اٹھایا کرتا ہوں۔ خدا یا میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تھا۔“

”کیا تم اپنے گھر والوں کو اعتماد میں نہیں لے سکتے تھے۔“

”نہیں صاحب، گھر والوں کو میں کیا بتاتا۔ وہ تو بے چارے ویسے ہی میرے سامنے زبان نہیں کھول سکتے تھے۔

میں نے ان کو ایسا رکھا ہوا تھا۔“

اس شخص کی اس بات سے ۔۔۔۔۔۔ بے زاری اور نفرت کے جذبے مجھ میں کر دٹیں لینے لگے۔ وہ تو ایک بے رحم سا انسان تھا۔ بیوی بچوں پر ظلم کرنے والا۔ ان کو دبا کر رکھنے والا۔ پیا پیسوں کے لیے جو اکھینے والا۔ پھر کسی کا خون کر دینے والا۔ ایسا شخص تو رحم کے قابل ہی نہیں ہو سکتا۔“

”ڈاکٹر صاحب، دسایا میرے ہی علاقے کا رہنے والا تھا۔“ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

”کون دسایا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی دکاندار جس کا میں نے خون کیا ہے۔“

اوہ تو اب جا کر پتا چلا کہ عبد الرحیم اس دکاندار کو پہلے سے جانتا تھا اور اس قتل کا محرک کچھ اور تھا۔ جیسا میں پہلے سمجھ گیا تھا کہ عام جھگڑے کی واردات نہیں تھی۔

”دسایا میری جان پہچان کا تھا صاحب۔“ اس نے بتایا۔ ”ہم ہوش میں ایک ساتھ بیٹھتے تھے۔ اس کی بیوی مرچنگی تھی۔ ایک بیٹی تھی جس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اکیلا زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے مجھے پریشان دیکھ کر خود میرا حال پوچھا اور میں نے اسے بتا دیا کہ میں کس چکر میں پھنس گیا ہوں۔“

”عبد الرحیم میں نے اس بندے کے بارے میں سن رکھا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”وہ ایک خطرناک آدمی ہے۔ وہ تو تمہیں برباد کر دے گا۔“

”اس لیے تو پریشان ہو رہا ہوں۔“ میں پریشان ہو کر بولا۔ ”سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟ کون دے گا مجھے دولا کھ۔“

”میں دوں گا۔“ اس نے کہا۔

”تم؟“

”ہاں میں۔“ اس نے اپنی بات دہرائی۔ ”میں اس وقت قہار کے کام نہیں آؤں گا تو کب آؤں گا۔ تم کل شام کو مجھ سے دولا کھ لے لیتا اور منہ پر مارنا اس بد معاش کے۔“

”میں تو حیران رہ گیا تھا۔ اس دور میں کون کس کی مدد کرتا ہے اور وہ بھی پورے دولا کھ روپے۔ وہ تو مجھے اپنا احسان مند کیے دے رہا تھا صاحب۔ لیکن جب دوسری شام

# رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!

## ٹپ ٹریٹمنٹس

ٹی ٹی کی ٹپ ٹریٹمنٹس گولیوں کی صورت میں کھائی جاتی ہے اور خون کو صاف کرنے سے رنگت کو نکھار دیتی ہے۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے رنگت کھلتے ہوئے گھٹے ہوئے ہوتی ہے اور ساتھ ہی چہرے کے دائرہ بڑھے، آنکھوں کے گرد ملے، چہرے کو گردوں کی آلودگی سے پاک کرتی ہے۔ خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ مردوں کے لئے کراچی اور رکیس ملے پھر میں لیکن ٹپ ٹریٹمنٹس کھاتا ان کے لئے بہت مناسب ہے۔

f www.facebook.com/top1treatments

## چھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں!!

## گھروٹال

ٹی ٹی کی گھروٹال ایک ہومیو پیتھک دوا ہے جو معجز اثرات سے پاک ہے۔ اس میں شامل اجزاء انسانی جسم میں، سوماتوٹروپین، نشوونما کا ہارمون، کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں جس سے بڑیوں اور ڈھانچے کو تقویت ملتی ہے اور ان کے بڑھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے استعمال سے ہر وہ شخص جس کی عمر 30 سال سے کم ہے اپنے قد میں ممکنہ اضافہ کر سکتا ہے۔

اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو گھروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!

ملک بھر کے ہر ایچ جے میڈیکل سٹور، ہومیو پیتھک سٹور اور دوا خانہ پر دستیاب HELPLINE

042-35789145 & 0334-4266255

Email: toptreatments@gmail.com Website: www.toptreatments.net

دہلے کی صورت میں یا مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے

II

http://www.toptreatments.net



میں اس سے ملا تو اس نے ایک ایسی بات کر دی کہ میں پھر میں  
آکر رہ گیا صاحب۔“

”کیا کہا تھا اس نے۔“

”اس نے کہا تھا دیکھو عبد الرحیم۔ میں تمہیں دو لاکھ تو  
دے رہا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔“

”میں پیسے نہیں واپس کروں گا دوسایا۔“

”نہیں، میں پیسے تو مانگ بھی نہیں رہا۔ تم چاہے کبھی  
واپس نہ کرو۔“

”تو پھر۔“

”تم اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔“ اس  
نے کہا۔

میں تو بس سناتے میں رہ گیا تھا۔ کیا بات کر دی تھی  
اس نے۔ وہ عمر میں مجھ سے بھی دو چار سال بڑا ہو گا اور  
میری نیلما پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

”دوسایا! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں ہو سکتا تو رہنے دو۔“ اب اس کا لہجہ بہت بدلا  
ہوا تھا۔ ”کوئی کسی کی یوں ہی تو اتنی بد نہیں کرتا ہے۔“

”لیکن یہ تو سوچو کہ میری بیٹی اور تم میں کتنا فرق ہے۔“  
”تمہاری مرضی۔ مجھے جو کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا ہے۔“

اس وقت تو میں ناراض ہو کر واپس چلا آیا۔ پھر سوچتا  
رہا کہ کیا کروں اور تو کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ ایک طرف وہ  
بد معاش تھا اور دوسری طرف میری نیلما۔

”پھر ڈاکٹر صاحب میں نے وہی کیا جو ہمیشہ سے ہوتا  
آیا ہے۔“

”یعنی تم نے اپنی معصوم بیٹی اس کے حوالے کر دی۔“  
”جی ڈاکٹر صاحب۔“ اس نے اپنی گردن جھکا لی۔

”وہ بہت رورہی تھی ڈاکٹر صاحب۔ میرا فیصلہ سننے کے  
بعد میرا ہاتھ تھام کر روتی رہی تھی۔ بابا بابا کہہ رہی تھی

لیکن اس کی قربانی دے کر میری جان بچ رہی کیونکہ ڈاکٹر  
صاحب۔ اس لیے میں نے اسے قربان کر دیا۔“

”عبد الرحیم! میں تمہیں کیا سمجھا تھا اور تم کیا نکلے  
ہو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے تو تم سے نفرت ہونے لگی ہے۔“

”میں اسی قابل ہوں صاحب۔“ وہ پھر رونے لگا  
تھا۔ ”اسی قابل ہوں۔“

”چلو آگے بتاؤ کیا تمہاری بیوی نے کچھ نہیں کہا؟“  
”وہ بے چاری کیا بولتی صاحب۔ میں نے تو اس کو  
دبا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ صرف روتی رہی۔ اس بے چاری پر تو

سکتہ ہو گیا تھا صاحب۔ نیلما کو میں نے زبردستی دوسایا کے  
ساتھ کر دیا۔ مولوی کو بلا کر اس کا نکاح کروا دیا اور واپس  
کچھ دنوں کے بعد نیلما کو لے کر شہر آ گیا۔“

”اور تم نے اپنا قرض ادا کر دیا۔“

”ہاں صاحب! قرض ادا کر دیا اور کبھی اس طرف نہیں  
گیا لیکن کیا فائدہ تھا اپنی بیٹی کی بیہوشی تو دے ہی چکا تھا۔“

”اور تمہاری بیٹی کا کیا ہوا۔“

”پتا نہیں صاحب! بہت دنوں تک اس کے بارے  
میں کچھ نہیں معلوم ہوا کہ دکھی ہے، دوسایا اس کے ساتھ کیا

سلوک کر رہا ہے۔ کچھ نہیں معلوم۔ پھر ایک دن بیوی نے  
بے حالی ہو کر کہا کہ جاؤ خدا کے لیے شہر جا کر اس کی خیریت  
تو معلوم کر لو۔“

”اوہ تو تم اس طرح شہر آ گئے۔“

”ہاں صاحب! مجھے پتا چل گیا تھا کہ دوسایا نے یہاں  
دکان کھول لی ہے میں اس کو تلاش کرتا ہوا یہاں آ گیا۔“

”لیکن تم نے اس کو قتل کیوں کیا؟“

”وہی بتا رہا ہوں صاحب، مجھے کا دن تھا۔ مجھے کی  
نماز ہو رہی تھی۔ میں ایک مسجد میں چلا گیا۔ وہاں مولوی

صاحب خطبہ دے رہے تھے اور وہ واقعہ بتا رہے تھے کہ ایک  
بار ایک آدمی ہمارے نبی پاکؐ کے پاس آیا اس نے بتایا کہ

اس نے اپنی ایک بیٹی کو زندہ دفن کر دیا تھا۔ اس وقت اس کی  
وہ بیٹی رورہی تھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بابا بابا کہہ رہی تھی۔

یہی تو میری بیٹی بھی کر رہی تھی صاحب۔ میں بھی تو دوسایا  
باپ تھا۔ پھر جب مولوی صاحب نے بتایا کہ نبی پاکؐ یہ سن

کر رونے لگے۔ تو پھر مجھ سے برداشت نہیں ہوا صاحب۔  
میں نماز پڑھے بغیر مسجد سے باہر آ گیا اور سیدھا دوسایا کے

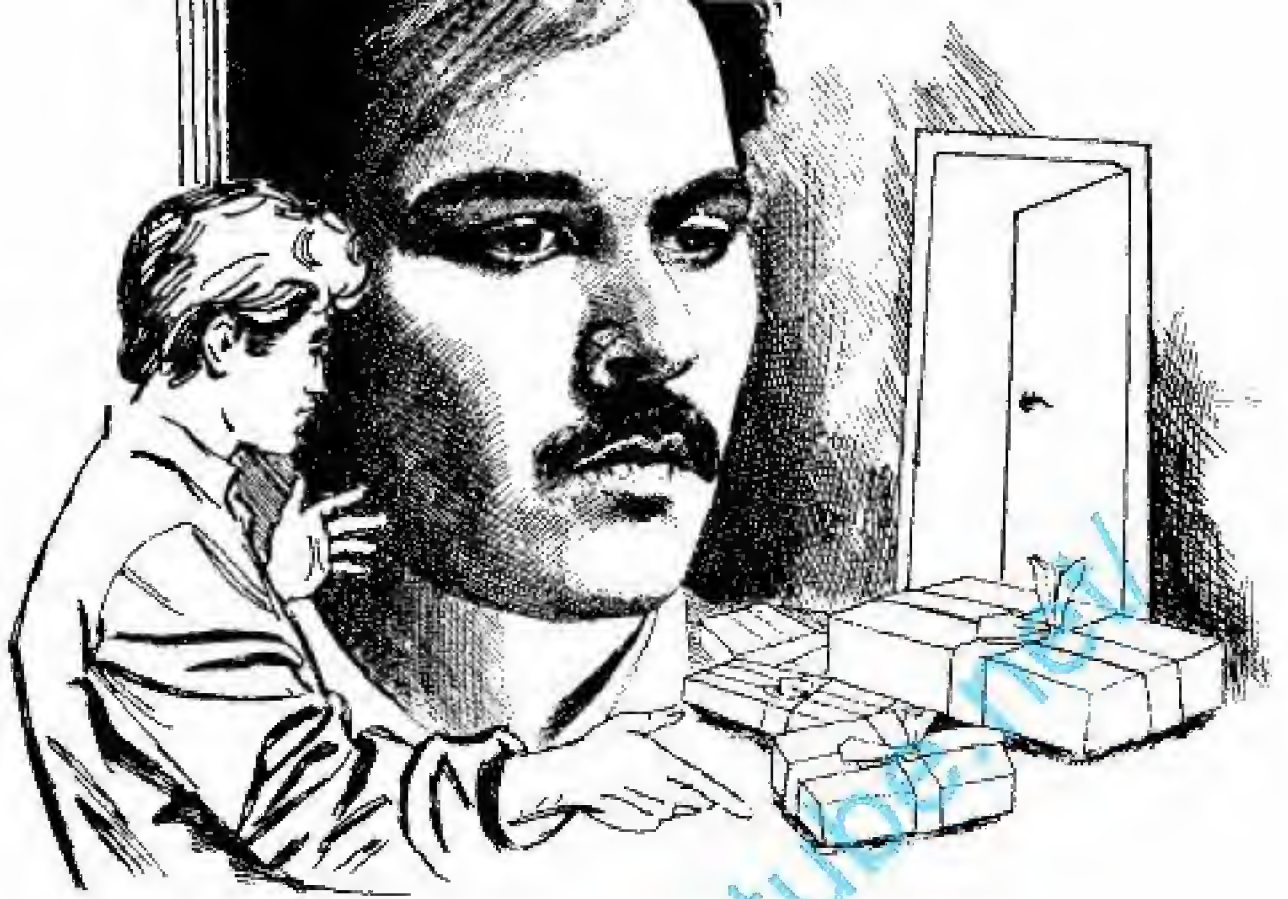
پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ پھر بیٹی کو چھوڑ  
دے۔ اس نے انکار کیا اور میں نے اس کا قتل کر دیا۔ یہ ہے

میری کہانی صاحب۔ خدا کے لیے اس کہانی کو لکھ دس اور  
لوگوں کو یہ بتائیں کہ آج بھی جب کوئی اپنی بیٹی پر ظلم کرتا

ہے، چاہے کسی طرح ہو تو نبی پاکؐ کی آنکھوں میں آنسو  
آجاتے ہیں۔ خدا کے لیے ان پاک آنکھوں میں آنسو نہ  
آئے۔ دین اور دنیا اور آخرت دونوں برباد ہیں۔“

یہ بھی عبد الرحیم کی کہانی۔ جو پہلی بار بہت اچھا آدمی  
معلوم ہوا پھر بہت بد آدمی بن گیا اور پتا چلا کہ وہ ایک بہت بڑا  
انسان ہے۔





تخفہ

مکرم و محترم مدیر

السلام علیکم

میں اپنی زندگی کا ایک اہم گوشہ بے نقاب کر رہا ہوں۔ اس گوشے کو میری بزدلی سمجھنے کی بجائے ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ اگر میں تحفے لیتا رہتا تو کیا ہوتا؟ میری آپ بیتی پڑھنے والے اپنے اس پاس بھی نظر نہ رکھیں کہ کہیں اس مرض کا کوئی مریض آپ کے اس پاس تو نہیں ہے۔

احسن سلیم

(اسلام آباد)

ایک معقول صورت انسان دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی۔

”معاف کیجئے جناب میں نے آپ کو زحمت دی۔“ اس نے بہت ہی مہذب انداز میں کہا۔ ”میں آپ کے اوپر والے فلیٹ میں رہتا ہوں۔“

”اوہ تو آپ بڑی ہوئے۔“

”جی ہاں۔“ وہ سر اویا۔ ”پڑوسی ہوں آپ کا، وجاہت

میں نہیں جانتا تھا کہ دروازے پر کون دستک دے رہا ہے۔

مجھے اس فلیٹ میں آئے ہوئے صرف چار پانچ ہی دن ہوئے تھے۔ کسی سے جان پہچان بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ابھی تک کوئی کام والی بھی نہیں رکھی تھی اور جعدار کے آنے کا وقت بھی نہیں تھا پھر یہ کون ہو سکتا تھا۔

بہر حال تیسری دستک پر میں نے دروازہ کھول دیا۔

مارچ 2015ء

251

ماہنامہ سرگزشت



کہتے ہیں مجھے۔“

”اور میں احسن سلیم ہوں۔“ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

”یہ نہیں، یہ میں آپ کے لیے لایا ہوں۔“ اس نے پلیٹ میری طرف بڑھا دی۔ ”اس میں ایک خاص قسم کا حلوا ہے اس قسم کا حلوا صرف میرے خاندان والے بنانا جانتے ہیں۔“

”ارے صاحب یہ کیا زحمت کی آپ نے۔“

”نہیں بھائی، اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔ آپ میرے سنے پڑوسی ہیں یہ تو میرا فرض بنتا ہے نا۔ پلیز انکار مت کیجیے گا۔“

اس کے لہجے میں ایسی بے چارگی تھی کہ میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے اس سے وہ پلیٹ لے لی۔ ”آئیں اندر تو آئیں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں جناب! اس وقت نہیں۔“ اس نے معذرت کر لی۔

”اس وقت ذرا جلدی ہے۔ پلیٹ پھر کسی لے جاؤں گا۔“

وہ پلیٹ دے کر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ چنانچہ کیسا آدمی تھا۔ بہر حال جو بھی ہو اس کا حلوا واقعی بہت لذیذ تھا۔

اس دور میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اس طرح اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ورنہ یہاں کون کس کو پوچھتا ہے۔

وہ شخص مجھے حلوا دے کر گیا تھا۔ اب میرا فرض بنتا تھا کہ میں بھی بدلے میں کچھ نہ کچھ دوں۔ لیکن میں اسے کیا دے سکتا تھا۔

بہت سوچنے کے بعد یہی بات کچھ میں آئی کہ اسے فلیٹ میں بلا کر اس کی خاطر تواضع کر دوں گا۔ اس طرح کچھ عزت رہ جائے گی۔

لیکن ہوا یہ کہ وہ چار دنوں تک وہ دکھائی نہیں دیا اور ایک دن اچانک بلڈنگ کے گیٹ پر کھڑے دیکھتے ہی میرے پاس آ گیا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا۔ اس نے بتانا شروع کر دیا۔ ”کیا بتاؤں جناب، دو چار دنوں کے لیے ایک ضروری کام سے کوئٹہ چلا گیا رات ہی کو واپس آیا ہوں۔“

”چلیں یہ تو اچھی بات ہے۔“

”آپ کا تھک میری جیب ہی میں پڑا ہوا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کیسا تھکا؟“

”یہ نہیں۔“ اس نے اپنی جیب سے ایک قیمتی سا رقم نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ ”یہ میں آپ ہی کے لیے کوئٹہ سے لایا تھا۔“

”ارے! وہ کیوں۔۔۔ کیوں اتنی زحمت کی۔“

”نہیں جناب اس میں زحمت کبھی آپ تو میرے پڑوسی ہیں اور ایک اچھا پڑوسی بھائیوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ یہ لیں رکھ

لیں پلیز۔“ اس نے اس انداز سے کہا کہ مجھے قلم رکھنا ہی پڑ گیا۔

اب میرے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ بے چارہ دوبار مجھے کچھ نہ کچھ دے گیا تھا۔ ایک بار اس نے حلوا دیا تھا اور دوسری بار ایک قیمتی قلم تجھے کے طور پر دیا تھا۔ حالانکہ اس سے میرا کوئی ایسا تعلق نہیں تھا کہ تجھے تھا تکف دے جائیں۔ لیکن جب وہ اتنا کچھ کر رہا تھا تو یہ میرا بھی فرض بنتا تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ دوں۔

دفتر سے واپسی پر ایک شام میں نے اس کے لیے ایک پرفوم خرید لیا۔ یہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ میں اس کے تحفوں کے احسانات کا بدلہ دے سکتا۔

پرفوم میں نے اس کے فلیٹ میں جا کر دیا تھا۔ وہ مجھے اپنے فلیٹ کے دروازے پر دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ ”ارے صاحب! میرے نصیب کہ آپ میرے پاس تشریف لے آئے۔۔۔ آئیں اندر آ جائیں۔“

”پھر بھی سہی، اس وقت تو میں آپ کو یہ دینے آیا ہوں۔“ میں نے پرفوم کی شیشی اس کی طرف بڑھا دی۔

”ارے یہ کیا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”جناب میں اپنے لیے پرفوم لے رہا تھا۔ پھر آپ کا خیال آیا میں نے سوچا کہ آپ کے لیے بھی لے لوں۔“

”اوہ، کیوں زحمت کی آپ نے؟“

”دیکھیں انکار مت کیجیے گا۔“ میں نے کہا۔ ”کچھ میرا بھی تو حق ہے پلیز۔“

اس نے کئی بار میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ پرفوم لے لیا۔ پھر اس سے کچھ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور میں اپنے فلیٹ میں آ گیا۔

کچھ دنوں تک پھر اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے کسی کام میں مصروف ہو گیا ہو۔

دو چار دنوں کے بعد وہ پھر ٹپک پڑا۔ اس بار اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا بکٹ تھا۔ ”ارے جناب ایک بار پھر اپنے کام کے سلسلے میں لاہور جانا پڑ گیا تھا۔“ اس نے کہا۔

”چلیں، یہ تو اچھی بات ہے کہ آپ بڑی رہتے ہیں۔“

”ہاں صاحب! کام تو کام ہوتا ہے۔“ پھر اس نے وہ بکٹ میری طرف بڑھا دیا۔ ”یہ لیں جناب انارکلی بازار سے آپ کے لیے لیتا آیا ہوں۔“

”خدا کا ہناؤ، یہ ہے کیا؟“

”یہ تجھ کے گلاسوں کا ایک سیٹ ہے۔“ اس نے بتایا۔

”تجھ کا بنا ہوا ہے۔“ میں نے نہیں ہے۔ آپ جیسے بازوؤں آدمی کے ذوق کے عین مطابق۔“

”لیکن کیوں، آپ کیوں اتنی زحمت کیے جا رہے ہیں؟“  
 ”پھر وہی زحمت کی بات کی آپ نے۔“ وہ بڑا مان گیا  
 تھا۔ ”اس میں کون سی زحمت ہوگی۔ میں اپنی محبت میں لے کر آیا  
 ہوں۔ پلیز انکار مت کیجیے گا۔“  
 اس بار بھی اس کا تھق قبول کرنا پڑا تھا۔

دو چار دنوں کے بعد وہ پھر آگیا۔ اس بار وہ میرے لیے  
 دو عدد قمیص لے کر آیا تھا۔ ”یہ لیں جناب یہ انکلینڈ کی قمیص ہیں۔  
 آپ کے لیے لایا ہوں۔“

”وجاہت صاحب! یہ آپ کیا کرنے لگے ہیں۔ اب  
 مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔“

”پلیز دل نہ توڑیں۔“ اس نے کہا اس کی آواز رندھ مٹی  
 تھی۔ ”میں تو بس محبت کا بھوکا ہوں۔ اگر قبول کر لیں گے تو  
 عثارت ہوگی۔“

مجھے وہ قمیص قبول کرنی پڑی تھی۔ کچھ شرمندگی سی  
 ہو رہی تھی۔ اس شخص نے اتنا بہت سمجھ دے دیا تھا اور میں نے  
 کیا دیا تھا، بس پرفیوم کی ایک شیشی۔

اس لیے میں نے اس کے لیے شیونگ کی ایک کٹ خرید  
 لی۔ پورے دو ہزار کی، بہت ہی شاندار۔ جب میں نے اس  
 کے حوالے کی تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ ”ارے یہ آپ کیا  
 کرتے ہیں۔ اتنا مہنگا تھق خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”وجاہت صاحب! آپ کے غلوں کے سامنے تو یہ کچھ  
 بھی نہیں ہے۔ پلیز قبول کر لیں۔“ اس نے قبول کر لیا۔

تیسری شام کو وہ پھر میرے دروازے پر تھا۔ اس بار وہ  
 ایک قمیص تھا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا۔ جو ایک بڑا سا  
 کارٹن اٹھائے کھڑا تھا۔

”سلیم صاحب! یہ آپ کی نذر ہے۔“ اس نے کارٹن کی  
 طرف اشارہ کیا۔

”وجاہت صاحب کیا ہے اس میں۔“  
 ”سلیم صاحب! ایک ڈنک ہے۔ یہ وہی ہے جو آپ کے  
 ساتھ آرام سے میوزک سنتے رہے گا۔“

”ڈنک!“ میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔  
 آپ مجھے تختے میں دے رہے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ اس نے انکساری سے گردن جھکا دی۔  
 ”اچھا سیٹل رہا تھا میں نے سوچا آپ کے لیے لے لوں۔“

”لیکن یہ تو کمال ہے۔ میرا مطلب ہے اتنا مہنگا تھق  
 اچھا نہیں لگتا۔“

”بھائی صاحب رہنے دیں۔ جب غلوں کا رشتہ ہو تو  
 ماہنامہ سرگزشت

مجھے اور سستے کی پروا نہیں کرتے۔ رکھ لیں پلیز۔“ اس نے پھر  
 اسے غلوں سے بات کی کہ ہے اس کا تھق رکھنا ہی پڑ گیا۔  
 اب پھر میرے سامنے ایک سوال آکھڑا ہوا تھا۔ اس  
 کے اس مجھے تختے کے عوض کیا دیا جائے۔ اس کم بخت نے تو  
 شرمندہ کرنے پر کوئی کسر نہ چھوڑی۔

بہت سوچ کر میں نے اپنے دفتر سے دس ہزار روپے  
 اینڈوائس کے طور پر لیے اور 13 کچ کا ایک کھرنی دی اس کے  
 حوالے کر دیا۔

وجاہت اس فی وی سیٹ کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔  
 ”ارے اب یہ کیوں لیا آپ نے؟“ اس نے کہا۔ ”یہ تو بہت  
 قیمتی ہے۔“

”وجاہت صاحب! آپ کے غلوں سے زیادہ قیمتی  
 نہیں۔ میں انکساری سے بولا۔ ”بس اسے قبول کر لیں۔“

”اب تو لینا ہی پڑے گا۔“ اس نے کہا۔ ”آپ نے تو  
 مجھے خرید لیا ہے۔“

میں نے وہ سیٹ اس کے حوالے کر دیا۔ اب میں مطمئن  
 تھا کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اور اب کچھ دنوں کے لیے  
 سکون ہو جائے گا۔

لیکن کہاں کا سکون، صرف چار دنوں کے بعد وہ پھر  
 میرے پاس آگیا۔ اس بار اس کے ہاتھ میں تو کچھ نہیں تھا لیکن  
 وہ بہت بڑے جوش دکھائی دے رہا تھا۔

”چلیں میرے ساتھ چلیں۔“ اس نے کہا۔  
 ”کہاں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”بس ذرا نیچے ٹنک۔ بس پانچ منٹ کا کام ہے۔“  
 ظاہر ہے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس کے

ساتھ میڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔ میڑھیوں کے پاس ہی ایک  
 جگہ گالی ہوئی بائیک کھڑی ہوئی تھی۔

”سلیم صاحب! یہ بائیک آپ کی نذر ہے۔“ اس نے کہا۔  
 ”کیا!“ اس دفعہ میں واقعی بے ہوش ہونے والا  
 تھا۔ ”یہ بائیک..... یہ نئی بائیک..... آپ نے میرے لیے  
 خریدی ہے.....!“

”جی ہاں، آپ ہی کے لیے۔“ اس نے بتایا۔ ”آج ہی  
 میوزم سے نکلوا کر لایا ہوں۔“

”لیکن وجاہت صاحب! یہ تو انتہا ہوگی، اتنی قیمتی  
 چیزیں میں کبھی قبول کر سکتا ہوں؟“

”پلیز! سنیں۔ یہ تو آپ کو لینا ہی ہوگی۔“ اس  
 نے میرا ہاتھ تھام لیا۔



اس کی اچھا کچھ ایسی تھی کہ میں انکار نہیں کر سکا۔ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے موٹر سائیکل کی چابی قبول کر لی۔

لیکن اب ایک بہت بڑا خطرہ میرے سر پر منڈلانے لگا تھا۔ اب تک یہی ہوتا آیا تھا کہ اس نے مجھے کوئی تحفہ دیا میں نے بواب میں اس سے قیمتی تحفہ دے دیا۔ اس نے جواب الجواب کے طور پر اس سے زیادہ قیمتی تحفہ دے دیا اور نوبت یہاں تک آچکی تھی کہ اس نے ہائیک تحفے میں دے دی تھی۔ لہذا جواب میں مجھے کوئی گاڑی تحفے میں دینی تھی۔ فرض کریں اس نے میری گاڑی کے جواب میں کوئی پلاٹ تحفے میں دے دیا تو پھر میں کیا کرتا۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ اس محلے سے ہی بھاگ لوں۔ ویسے بھی وہ فلینٹ تو کرائے ہی پر تھا۔ میری جب مرضی ہو وہاں سے نکل سکتا تھا۔

پھر میں نے یہی کیا۔ میں نے مالک مکان سے اپنا ایڈوانس واپس لیا اور راتوں رات خاموشی سے نکل آیا۔ لوگ تو اپنے پڑوسیوں کی بد معاشیوں سے تنگ آکر مکان چھوڑتے ہیں اور میرا یہ حال تھا کہ میں پڑوس کی مہربانی سے تنگ آکر بھاگ نکلا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد میرے کچھ پرانے دوستوں نے مجھے فون کر کے بتلایا کہ انہوں نے پرانے دوستوں کو ایک جگہ جمع کر کے ایک کلب بنالیا ہے اور بیٹے کی رات اس کلب کی طرف سے ڈنڈا جارہا ہے۔

یہ بہت اچھی خبر تھی۔ اس قسم کی بورڈ لائف میں اس قسم کی سرگرمیاں رنگ بھردیتی ہیں۔ میں نے شرکت کی یقین دہانی کرا دی۔ بیٹے کی رات میں ہوٹل کی کچھ برائے دوستوں سے مل کر دل خوش ہو گیا تھا۔ ہم کتنے دنوں کے بعد مل رہے تھے۔

پرانے زمانے پوری شدت کے ساتھ لوٹنے لگے تھے۔ اس تحریک کا بانی اسلم حسین تھا۔ اس نے ایک آدمی سے تعارف کروایا۔ ”سلیم ایہ ہمارے دوستوں کے حلقے میں تو نہیں رہے ہیں لیکن ہم نے اعزازی طور پر ان کو اپنی محفل پاراں کا ممبر بنالیا ہے۔“

”چلو یہ تو بہت اچھا ہوا۔“ میں خوش دلی سے بولا۔ ”اب ان کا مکمل تعارف میں کروادوں۔“

”یہ ڈاکٹر درانی ہیں۔“ اسلم نے بتایا۔ ”پاکستان کے صف اول کے سائیکاٹرسٹ۔“

”اوہ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”نفسیات سے میری بھی بہت گہری دلچسپی رہی ہے۔“ میں اور ڈاکٹر درانی باتیں کرنے لگے۔ اسلم حسین دوسرے دوستوں کے پاس چلا گیا تھا۔ میں نے یوں ہی باتوں باتوں میں اس بڑوسی کا ذکر پھینک دیا۔ جس نے تجھے دے دے کر مجھے بے حال کر دیا تھا۔

ڈاکٹر درانی نے ہنسنا شروع کر دیا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ یہ ایک نفسیاتی مرض ہے۔“

”نفسیاتی مرض ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں! اس کو نفسیات کی اصطلاح میں ڈورو مانیا (Doro mania) کہتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔ ”اس میں مبتلا حضرات بعض اوقات اتنے حساس ہو جاتے ہیں کہ اگر ان کا تحفہ قبول نہ کیا گیا تو شدید نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔“

”خدا کا شکر ہے ڈاکٹر صاحب۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”کہ میں وہاں سے بھاگ آیا۔“

”ہاں! یہ بہت اچھا کیا آپ نے۔“ ڈاکٹر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک خوب صورت سالاٹرنکالتے ہوئے کہا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ تمباکو نوشی کرتے ہیں۔“

”جی ہاں ڈاکٹر صاحب۔ یہ بری عادت چھچھا نہیں چھوڑی۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”میں پچھلے دنوں سنگاپور میں تھا۔ وہاں سے میں نے یہ لائٹ خریدی تھی۔“ ڈاکٹر نے لائٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میں ویہ میں آپ کو تحفے میں دے رہا ہوں۔“

”مجھے تحفے میں!“ مجھے شاک سا لگا تھا۔ ”یہ آپ مجھے تحفے میں دے رہے ہیں؟“

”جی ہاں رکھ لیں نا پلیز۔“

میں نے ایک نظر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور اچانک باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ ڈاکٹر پکار رہا ہی رہ گیا تھا لیکن میں کہاں رکنے والا تھا۔

ایک اور تحفہ ایک اور ڈورو مانیا کا مریض۔ ایک سے تو جان چھڑا کر بھاگا تھا اب یہ دوسرے سے ملاقات ہوئی تھی۔

تو وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں پلٹ کر دوستوں کے طلب کی طرف نہیں گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ مجھے جب بھی کوئی شخص ملتا ہے تو میں پہلے اس سے یہی پوچھتا ہوں کہ بھائی خدا کے لیے یہ بتا دو کہ تم مجھے کوئی تحفہ دینے کا ارادہ تو نہیں کر رہے ہو یا نہیں کہہ دیتا ہے تو میں دوبارہ اس کی صورت بھی نہیں دیکھتا۔

# طعن

محترم ایڈیٹر  
السلام علیکم

یہ روداد ہمارے ہی علاقے کی ہے۔ اس پوری روداد میں ایک سبق ہے۔  
ایک انوکھا پن ہے اور یہی انوکھا پن خود میں ایک خوب صورتی ہے۔  
میرا خیال ہے یہ روداد قارئین سرگزشت کو بھی پسند آئے گی۔

محمد سلیم اختر  
(راولپنڈی)



چوہدری محبت خان اور چودھرائی ریوڑاں بی بی نے  
محبت کی شادی کی تھی۔ محبت خان عمر پور کا رہنے والا تھا اور  
ریوڑاں علی پور کی۔ وہ علی پور کے ملک زمان کی بیٹی تھی۔ حسن  
اور خوب صورتی میں اس کا بھائی ثانی نہ تھا۔ محبت خان بھی  
کچھ کم نہ تھا۔ وہ مردانہ حسن و جمال کا نادر نمونہ تھا۔ اس کا نام  
بھی محبت خان نہ تھا، کروڑا بھی محبت بھائی نہ تھا، وسیع و عریض  
ارضی کا مالک تھا۔ بڑی سی حیثیت تھی، دھور دھور کر چاکر  
تھے۔ زندگی رواں دواں تھی۔ گاؤں میں بھی اس کی بڑی



عزت تھی اور اس کی واحد وجہ اس کا اعلیٰ اخلاق تھا۔ غریب تواری اس کی فطرت تھی۔ ان ہی اوصاف نے اسے مقبول بنا رکھا تھا۔ لیکن اس کی زندگی میں ایک کی تھی۔ شادی کے سات سال گزرنے کے باوجود ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ چودھرائن اس دکھ کو کچھ زیادہ ہی محسوس کرتی تھی۔ ڈاکٹر حکیم۔ ٹونا ٹونکے دوا اور دوا جو حیلہ اس کے بس میں تھا وہ کر چکی تھی لیکن اس کی کوادب بھی سوتی تھی اور اسی غم میں وہ اندر ہی اندر کھل رہی تھی۔ چودھری محبت نے بظاہر بھی کچھ نہ کہا تھا لیکن اندر ہی اندر اسے بھی اربابان تھا کہ ان کے آئینہ میں بچوں کی قلمکاریاں گونجیں۔

گاڈل کے غریب اور مزار سے بھی جھولی اٹھا کر اس کے لیے دعائیں مانگتے تھے کیوں کہ چودھرائن بھی سخاوت اور فراخ دلی میں محبت خان سے کم نہ تھی۔ مگر نہ جانے اس کی بھابی صغرا کو اس سے کیا بڑھا تھا کہ اس نے بھی زیوریاں کو اچھاندہ جانا۔ زیوریاں کا بھائی ملک سلطان اپنے گاڈل عمر پور کا پوز میسٹر تھا۔ اس کی شادی زیوریاں کی شادی کے چھ ماہ بعد ہوئی تھی اور اب وہ تین بچوں کے والدین تھے۔ صغرا اکثر زیوریاں کو بانجھ ہونے کے طعنے دیتی تھی مگر اس کے باوجود زیوریاں اس کی کوئی بات دل پر نہ لیتی اور اس کے طنز کو برداشت کر لیتی۔ وہ بھائی اور بھابی کا بے حد احترام کرتی تھی۔ ملک سلطان کو تو بہن کا بہت خیال رہتا تھا مگر صغرا کی وجہ سے وہ مجبور رہتا تھا۔

صغرا کے طعنے کبھی کبھی اس کو رلا دیتے۔ آٹھواں سال گزرا تو چودھرائن کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ ایک روز وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ چودھری کا دل دھن گیا۔ اس نے اسے تسلی دی اور اگلے دن ہی اس نے عمرہ پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ چند ہی دنوں میں سفر کے مراحل طے ہو گئے۔

اللہ کے گھر پر نظریں پڑتے ہی دونوں کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے اور پھر دونوں پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ ایک سیلاب ان کی آنکھوں سے بہہ نکلا۔ انہوں نے رو رو کر اور گڑ گڑا کر اپنے رب سے جانے انجانے میں سرزد ہوئے گناہوں کی معافی مانگی اور اپنی عرضی پیش کر دی۔ پھر وضو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جا کر بھی انہوں نے اپنی جھولیاں پھیلا دیں۔ آنسو ایک بار پھر ان کے دامن بھگونے لگے۔ ان کے یوں چھا چھوں پر سے آنسوؤں کی بارش نے رحمت الہی کے جذبہ رحم کو جوش دلا دیا۔ سفر سے واپس آنے

کے کچھ ہی ماہ بعد جب ڈاکٹر نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ چودھرائن کی گود بھرنے والی ہے تو اس حویلی میں اصلی تھی کے چراغ جلانے لگے۔ شیرینی عنی، مسجد میں ختم القرآن ہوا اور دعائیں مانگی گئیں۔

سارا گاڈل چودھری اور چودھرائن کی خوشیوں میں برابر کا شریک تھا۔ زیوریاں نے مصلے پر رو رو کر دعا مانگی کہ اسے بیٹا دینا۔ چودھری بھی رب کے آگے فریاد کرتا کہ اس کی دعا بھی کہ اسے بیٹا ملے۔

☆.....☆

مگر جب ولادت ہوئی تو محبت خان کی دعا کا پھل تھی۔ اس کا نام خوش بخت رکھا گیا۔ اس نے باپ بننے کی خوشی میں خوشیاں منانے کا اعلان کیا مگر چودھرائن تو بیٹے کی آمد لگائے جیٹھی تھی لیکن وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ ہو سکتا ہے اگلی بار لڑکا ہو جائے مگر ڈاکٹر افشاں نے جس کے ہاتھوں خوش بخت کی پیدائش ہوئی تھی اس نے یہ کہہ کر اس کے اربابوں پر اس ڈال دی کہ چودھرائن کے آئندہ ماں بننے کے امکانات ختم ہو گئے ہیں۔ خوش بخت اس کی پہلی اور آخری اولاد رہے گی۔ زیوریاں نے نہ جانے کس دل سے یہ خبر قبول کی مگر اس نے بیٹی کو بھی بھی اپنے اس دکھ کا احساس نہ ہونے دیا۔

خوش بخت کی پیدائش کے چند دنوں بعد صغرا ایک اور بیٹے کی ماں بن گئی۔ اس کا نام انہوں نے کاشان رکھا تھا۔ اس سے پہلے صغرا کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ زیوریاں کے بھائی سلطان نے بھی خوش بخت کی پیدائش پر بہت خوشی منائی تھی۔ بھائی کی خوشی میں اس نے اپنے گاڈل میں منھائی تقسیم کی کہ اس کی بہن کی گود بھی ہری ہو گئی ہے۔ اب کاشان کی پیدائش نے ان خوشیوں کو دو چند کر دیا تھا۔ لہذا سلطان نے صغرا سے پوچھے بغیر ہی خوش بخت اور کاشان کی نسبت بچپن میں ہی طے کر دی۔ محبت خان اور زیوریاں کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی تھی۔ لہذا انہوں نے اس رشتے کو دل سے قبول کر لیا۔ صغرا نے بھی سلطان کے فیصلے کی تائید کر دی اور خوش بخت کو کاشان کے نام کی بجائے بھی پہنا دی گئی۔

☆.....☆

خوش بخت اپنی ماں زیوریاں سے بھی بڑھ کر خوب صورت تھی۔ جب وہ مہر کی منزلیں طے کرتے ہوئے جوانی کی ویلیز پر پہنچی تو لوگ اسے دیکھ کر رنگ رہ جانے لگے۔ ایسا



لگتا تھا کہ کوئی حور رستہ بھول کر زمین پر آگئی ہو۔ گاؤں کی سب لڑکیوں کی رنگت سے اس کی رنگت صاف تھی۔ گاؤں پر لائی نمایاں تھی۔ گاؤں میں اس سے بڑھ کر حسین اور کوئی لڑکی نہ تھی۔ کاشان بھی کم نہ تھا۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ قصبے کے اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد وہ شہر چلا گیا اور کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہ بھی کبھار اپنی پھوپھی سے ملنے آتا تھا۔ خوش بخت سے بھی گفتگو ہو جاتی تھی لوگ اس جوڑی کو لاکھوں میں ایک کہتے تھے۔ صغراں بھی خوش بخت کو پسند کرنے لگی تھی کیوں کہ وہ بہت ہی خوب صورت تھی، نازک بھی اور سلیقہ شعار بھی۔ محبت خان اور زیوراں کی تو وہ جان تھی۔ صغراں کے طعنے بھی اب ختم ہو گئے تھے اور زیوراں بھی بانجھ ہونے کا لیبیل اتار چکی تھی۔ کاشان ایف اے پاس کرنے کے بعد گاؤں واپس آ گیا تھا اور اس نے اپنی زمینوں کا حساب کتاب سنبھال لیا تھا۔ سلطان اور صغراں سوچ رہے تھے کہ اب خوش بخت کی ڈولی لے لی آئیں۔ خوش بخت کے ماں باپ کا بھی یہی خیال تھا کہ اب بیٹی کو رخصت کر دیا جائے۔

خوش بخت اور اس کی سہیلیوں کو بھی خبر ہو گئی تھی کہ خوش بخت کو دلہن بنانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ان ہی دنوں خوش بخت کی طبیعت خراب سی رہنے لگی۔ جسم میں مستقل درد رہنے لگا تھا۔ رنگت بھی پیلی ہو گئی تھی اور چہرہ بھی اترنے لگا تھا۔ اس کی ماں نے اپنے طور پر خوش بخت کی دیکھ بھال کی۔ ٹوٹے ٹوٹے کھانے پکڑا کر اس کی حالت بہتر نہ ہوئی تو اس نے اس کے باپ کو بتایا تو وہ فوراً اسے شہر کے بڑے اسپتال لے گیا۔

لینڈی ڈاکٹر نے خوش بخت کا چیک اپ کیا اور پھر اسے شہر کے ایک مشہور سرجن کی طرف ریفر کر دیا۔ سرجن نے کافی دیر معائنہ اور مختلف قسم کے ہدایات کرنے کے بعد کچھ ٹیسٹ کرائے کو کہا جو ایک مشہور لیبارٹری سے کرائے گئے۔ رپورٹس اگلے روز ملتی تھیں لہذا محبت خان ایک عزیز کے ہاں ٹھہر گیا۔ خوش بخت بھی اس کے ہمراہ تھی۔ وہ دلت بھی اس نے خاصی تکلیف میں گزاری تھی۔ اگلے دن محبت خان رپورٹس لے کر سرجن کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے ساری رپورٹس پڑھنے کے بعد کہا۔ ”محبت خان! آپ کی بیٹی میں جسمانی تبدیلیاں آرہی ہیں۔“

”حیرت ہے جسمانی تبدیلیاں اور اس عمر میں۔“ محبت خان حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب! میری بیٹی

تو اس وقت پچیس سال کی ہو چکی ہے۔ اس عمر میں اب بھلا کیا تبدیلیاں آئیں گی اور پھر ابھی تو اس کی شادی بھی نہیں ہوئی بلکہ شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔“ محبت خان بولتے بولتے رک گیا اور ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی مانند کوندا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ خوش بخت گاؤں کے کسی لڑکے کے ساتھ۔۔۔۔۔ اگر ایسا ہوا تو میں ان دونوں کو گولی مار دوں گا۔ مگر نہیں میری بیٹی ایسی نہیں ہو سکتی۔ وہ تو شرم و حیا کا پیکر ہے۔“ آپ کی بیٹی لڑکا بن رہی ہے۔“ ڈاکٹر نے دھماکا کر دیا۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ میری بیٹی لڑکا بن رہی ہے۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے اور بھلا بھی ایسا ہوا بھی ہے؟ آپ رپورٹ کو غور سے پڑھیں۔ لگتا ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ ”چودھری صاحب! ایسا ممکن ہے، اس سے پہلے کئی ایسے واقعات ہو چکے ہیں۔ آپ کی بیٹی کی بھی جنس تبدیل ہو چکی ہے۔ میں اسے اسپتال میں داخل کر رہا ہوں۔ ایک معمولی سے آپریشن کے بعد وہ مکمل مرد بن جائے گی اور معمول کے مطابق زندگی بھی گزرے گی۔“

”نہیں ڈاکٹر صاحب! ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ آپ اس کو کوئی ایسی دوا دیں، کوئی ایسا نیکار لگا لیں کہ وہ لڑکی ہی رہے، ورنہ لوگ کیا کہیں گے۔ ان کو حقیقت کیسے تسلیم کر اؤں گا۔“ محبت خان افسردہ سا ہو کر بولا۔

”کمال کر رہے ہیں آپ! قدرت آپ کو پلا پلا یا بیٹا دے رہی ہے اور آپ ہیں کہ ناشکری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! اگر یہی بیٹا مجھے آج سے پچیس سال پہلے مل جاتا تو میں گاؤں میں شیرینی تقسیم کرتے نہ تھکتا۔ میں نے خوش بخت کی پیدائش پر بھی منہائی تقسیم کی تھی اور صبر بھی کیا تھا کہ یہ اللہ کی دین تھی۔ چودھری محبت خان بول رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں مستقبل کے مناظر تیزی سے گزر رہے تھے کہ وہ گاؤں کیسے جائے گا۔ زیوراں کو کیسے بتائے گا۔ بتا دیا تو اس کا رتھل کیا ہو گا؟ وہ عورت جو روزِ ازل سے اپنے دل میں بیٹے کی خواہش لیے ہوئے تھی۔ اب وہ اپنی اس خواہش کو انوکھے روپ میں پورا ہوتے کیسے برداشت کرے گی۔ اس خوشی میں دیوانی ہی نہ ہو جائے۔“

ڈاکٹر نے محبت خان کی فانی کیفیت کو جان لیا تھا۔ اس نے چودھری کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نرمی سے بولا۔



”چودھری صاحب! خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اس نے آپ کو بیٹی دی جسے آپ نے دل سے قبول کر کے سینے سے لگایا اور اب وہی آپ کو بیٹا دے رہا ہے تو آپ ناشکرے کیوں بن رہے ہیں۔“

”محبت خان گم صدم سا بیٹھا اکثر کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کو کیسے کہتا کہ بات صرف ان کے سمجھنے اور قبول کرنے کی نہیں ہے۔ گاؤں اور علاقے کے لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ کیسی کیسی باتیں سننے کو ملیں گی زیور اس کیسے سمجھائے گی جو بیٹی کو وداع کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ سلطان، صغرا اور کاشان کو ہم کیا جواب دیں گے۔ ہم کیسے ان کا سامنا کریں گے۔ صغرا تو آسمان سر پر اٹھالے گی۔ اس کی طنزیہ باتیں ہمیں پہنچنے ہی مار ڈالیں گی۔ کاشان پر کیا گزرے گی جو خوش بخت کا منگھیر ہے اس سے محبت کرتا ہے۔“

☆.....☆

صغرا اور سلطان دونوں ہی کاشان کے سر پر سہرا باندھنے کے لیے بے تاب تھے۔ صغرا اور اس کی بیٹی کھلی روزانہ ہی بازار کے چکر لگا رہی تھیں۔ وہ اس شادی کو مفرد اور یادگار بنانا چاہتی تھیں۔ خوش بخت اور سلمیٰ میں پیار محبت بھی بہت تھا اور اب تو خوش بخت سلمیٰ کی بھابی بن کر اس کے پاس ہی آرہی تھی۔ سلمیٰ کی خوشی تو دیدنی تھی کہ اس کی ہونے والی بھابی لاکھوں میں ایک تھی۔ صغرا نے زیور کا آرزو بھی دے دیا تھا اور اب کپڑوں کی خریداری ہو رہی تھی۔ حویلی کے سب نوکر بھی خوش تھے کہ سلطان کی حویلی میں خوشیوں کی برأت اترنے والی تھی۔

زیور اس بھی مصروف تھی۔ وہ بڑا سا بکس کھولے خوش بخت کے جہیز کے جوڑے چھاننے میں مصروف تھی مگر اس کا دھیان خوش بخت کی طرف ہی تھا۔ اس نے بکس بند کیا اور دالان میں بچھے تخت پر آئینہ اور خلا میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔ سامنے کام کرنے والی عورتیں کاج صاف کرنے میں مصروف تھیں۔ دوپہر کی دمپ ڈھل رہی تھی۔ فضا اداس اداس سی لگ رہی تھی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

”اے میرے رب! کوئی خیر کی خبر سنا۔“ اس نے دوپٹا پھیلا کر دعا کی۔ اس کی آنکھیں جھپکنے لگیں اسنے میں ملازمہ رضیہ اس کے قریب آئی تو اس نے پوچھا۔ ”خوش بخت کی خبر.....؟“

چودھرائن اداس ہو کر بولی۔ ”رضیہ! پتا نہیں آج میرا دل کیوں ڈول رہا ہے۔ اللہ خیر کرے، عجیب عجیب سے

خیالات دل میں آرہے ہیں۔ نہ جانے میری خوش بخت کس حال میں ہے۔“

”بی بی جی! دل چھوٹا نہ کریں۔ سوہنار ب خیر کرے گا۔“ رضیہ نے اسے تسلی دی اور اس نے آمین کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسنے میں ایک نوکرانی نے آکر اطلاع دی کہ چودھری صاحب واپس آگئے مگر خوش بخت ان کے ساتھ نہیں ہے۔

زیور اس اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اٹھی اور چودھری کے کمرے میں پہنچی۔ وہ بڑی بے چینی سے کمرے میں اٹھ رہا تھا۔ بیوی پر نظر پڑتے ہی ٹھٹھک گیا۔ اس کی رنگت اڑی ہوئی تھی اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ آنکھوں میں بے بسی نمایاں تھی۔ چودھری کی یہ حالت دیکھ کر چودھرائن کی ٹانگوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ دم سے فرش پر ہی بیٹھ گئی۔ محبت خان بھی اس کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر یوں ہی خاموشی رہی۔ وہ کوئی مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا اور چودھرائن اذیت کے مرحلوں سے گزر رہی تھی۔ بالآخر محبت خان نے ہمت کی اور اسے دھیرے دھیرے بتانے لگا۔ زیور اس منہ کھولے یوں سن رہی تھی جیسے محبت خان اسے الف لیلہ کی داستان سنا رہا ہو۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ سچ ہے۔ آنسوؤں کی لڑیاں اس کے رخساروں سے ٹپک کر دوپٹے کو بھگور رہی تھیں۔ محبت خان نے بات ختم کی تو وہ ہچکچاہٹ لے لے کر رونے لگی۔

”زیور اس! رب نے تیری سن لی ہے۔ تجھے بیٹے کی بہت چاہ تھی ناں۔ اب اللہ پلا پلایا بیٹا دے رہا ہے تو، تو رونے بیٹھ گئی۔“ چودھری نے کہا۔

”کون سی عورت ہے جسے بیٹے کی طلب نہیں، یہ بیٹا جو مجھے آج مل رہا ہے اگر اس وقت مل جاتا تو۔“ زیور اس تڑپ کر بولی۔

”تو..... تو ساری برادری میں مٹھائی باننتی۔ آج تو وہ حسرت پوری کر لے میں مٹھائی منگوا دیتا ہوں۔“ چودھری نے کہا۔

”اس وقت اور اب میں بہت فرق ہے۔ اس وقت اس مجھے پتہ نہ تھا تو میں اکیس گاؤں میں مٹھائی باننتی۔ میں شریں برادری میں سر اٹھا کر چلتی اور نکلے نکلے سے لوگوں کے طے بنتی۔“ یہ کہہ کر زیور اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ اس کے رونے کی آوازیں سن کر حویلی کے سارے ملازم بھی وہاں آگئے۔

چودھری نے سب کے سوالیہ چہروں کی طرف دیکھا اور لبوں پر مسکراہٹ سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”تم سب چودھرائن کو مبارک دو۔ اللہ نے ہمیں اس عمر میں اولاد دینے سے نوازا ہے۔ اب ہماری بیٹی خوش بخت نہیں بلکہ بخت خان بن گئی ہے۔“

ملازم ستانے میں آگئے کہ چودھری کیسی انہونی بات کر رہا ہے۔

چودھری محبت کمرے سے نکلا اور عمر پور روانہ ہو گیا۔ اس کا چہرہ سگ رہا تھا کہ وہ بالکل سچ کہہ رہا ہے۔ عمر پور جا کر اس نے سلطان کو یہ بات بتائی تو وہ حیران ضرور ہوا مگر اس نے سچائی کو تسلیم کر لیا۔ محبت خان کو مبارک باد بھی دی اور کہا کہ وہ اس کے ساتھ شہر جائے گا پھر وہ دونوں اکٹھے بخت خان کو ملے کر آئیں گے۔

☆.....☆

منوں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح گاؤں میں پھیل گئی جس نے بھی سنا حیرت سے دانتوں تلے انگلی داب لی۔ کئی ایک نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ مولویوں نے اسے قیامت کی نشانی کہا۔ جوانوں نے اسے سانسوی دور کا کرشمہ قرار دیا مگر عورتوں نے تو اس کی توجیہات کو اور ہی رنگ دیا۔ کسی نے خوشی کا اظہار کیا کہ چلو چودھرائن کی خواہش پوری ہو گئی۔ کسی نے کہا چودھری نے اپنی جایداد بچانے کے لیے ڈھونگ رچا پایا ہے۔ کوئی بولی چودھری نے شہر میں دوسری شادی کر رکھی ہوگی اور یہ بیٹا اس سے ہوگا۔ مگر اس کا سب سے زیادہ دیکھ منگراں کو تھا۔ کئی عورتیں تو اس کے ہاں باقاعدہ پرسہ دینے لگیں۔

☆.....☆

ادھر خوش بخت ان ہنگاموں میں بے خبر خواب آور دعاؤں کے زیر اثر اڑکھ رہی تھی۔ اسے اپنی بھلائی کا علم ہو چکا تھا۔ یقین نہ آنے کے باوجود اسے یقین کرنا بھی پڑا۔ وہ سوچنے لگی کہ ایسا کون سا لمحہ تھا جب اس نے لڑکا بچنے کی خواہش کی ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کو قبولیت بخش دی۔ اسے خوش بخت سے بخت خان بننے کے لیے کئی تکلیف وہ مراحل سے گزرنا پڑا مگر اب وہ مکمل طور پر لڑکا بن چکی تھی۔ اسپتال کے کاغذات میں اس کا نیا نام بخت درج کیا گیا تھا۔ بالآخر اسپتال سے رخصت ہونے کا دن آ گیا۔ چودھری محبت اور سلطان ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹے تھے کہ ایک نرس بخت خان کو ساتھ لیے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل

ہوئی۔ بخت خان کو دیکھ کر دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اتنا گھبرو جوان، محبت خان کا اچھا بیٹا تھا۔ اس کی کئی ایکڑ اراضی کا اگلو تا وارث اس کے بڑھاپے کا سہارا۔

قدرت کی عنایت کے رنگ بھی عجیب تھے۔ وہ بخت پر نظریں جمائے اس کی طرف بڑھا۔ سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا اور پھر جوش سے گلے لگا یا اور بولا۔ ”اے اب شیروں کی طرح اکڑ کر چل پڑ اب تو لڑکی نہیں۔ جو شرم رہا ہے۔“

بخت خان مسکراتے لگا اور سلطان خان کے گلے جا لگا۔ پھر وہ ڈاکٹر کی طرف مڑا۔ اس سے ہاتھ ملایا اور پھر اپنے باپ کی طرف مڑ کر بولا۔ ”میں ابا جان! اماں! راہ دیکھ رہی ہوگی۔“

”ہاں بیٹا! اس نے تیرا بڑا انتظار کیا ہے مگر تو نے بڑی دیر لگا دی۔“ بخت خان باپ کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکا اور چپ چاپ باپ اور ماموں کے ساتھ چل پڑا۔

☆.....☆

حویلی میں شادی کا سماں تھا۔ گاؤں کی سب عورتیں بخت خان کو دیکھنے کے لیے جمع تھیں۔ جوں ہی وہ تانگے سے اتر کر حویلی میں داخل ہوا تو اس پر پھولوں کی پتیوں برسنے لگیں۔ لڑکیاں بالیاں اسے دیکھنے کے شوق میں ایک دوسرے پر مگر پڑ رہی تھیں۔ بڑی بوڑھیاں آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ ”ہاں نقشہ بالکل ویسا ہی ہے۔“

”سچ سچ کا لڑکا لگتا ہے۔“

”لگتا ہی نہیں کہ یہ پہلے لڑکی تھا۔“ غرض جتنے مناساتی باتیں ہو رہی تھیں۔

بخت خان! اپنی ماں کے قریب جا پہنچا اور آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ زیور اس نے سر سے پاؤں تک اسے غور سے دیکھا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر بولی۔ ”واہ مولیٰ! تیرے رنگ۔“ یہ کہہ کر وہ بخت خان کے ہاتھوں کو وارنگی سے چومنے لگی۔ اس کے آنسو زار و قطار بہہ بہہ کر اس کا دامن بھگونے لگے۔ گاؤں کی عورتیں آگے بڑھ کر چودھرائن کو مبارک باد دینے لگیں کہ سوچے رہے تھے اسے گھبرو جوان بیٹا دیا ہے جو ان دونوں کے بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔

☆.....☆

محبت خان کے معمولات اب بدل گئے۔ کھیتوں پر جاتا اس نے کم کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ بخت خان اب کھیتوں



اور جاہلاد کا سارا حساب کتاب سنبھال لے۔ اس نے ایک غشی بھی رکھ لیا جو بخت خان کی رہنمائی کرنے لگا۔ اسے شروع میں یہ کام مشکل لگا مگر وہ آہستہ آہستہ سیکھنے لگا۔ مگر اس کا شرمیلہ پن نہ دور ہوا۔ اس کی چال اب بھی لڑکیوں والی تھی اور وہ نظریں جھکا کر ہی چلتا تھا۔ اس کی سہیلیاں اب اس سے باقاعدہ پردہ کرنے لگی تھیں۔

علی پور سے صرف کا شان ملنے آیا تھا۔ وہ پڑھا لکھا اور سمجھدار تھا۔ جب کہ اس کی ماں اور بہن بھائی ان پڑھ تھے۔ کا شان نے بخت خان کو مبارک باد دی اور کہا کہ قدرت جو فیصلہ کرتی ہے اس میں بہتری ہی ہوتی ہے۔ اب تم میرے کزن ہی نہیں بلکہ دوست بھی ہو۔ آج سے ہماری دوستی ہوگی۔ کا شان نے ایسی باتیں کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی اور پھر اپنے گھر میں کھانے کی دعوت دے کر چلا گیا۔ اگلے دن محبت خان نہ جانے کے باوجود بھی علی پور چلا گیا۔ اس کے ماموں سلطان اور کا شان نے اسے خوش آمدید کہا مگر اس کی ممانی صفراں اور اس کے دو بیٹوں نے اسے کوئی اہمیت ہی نہ دی۔ سکنی، بخت خان سے ملنا چاہتی تھی مگر اس کی ماں نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ بخت خان کے سامنے نہ آئے۔ لہذا وہ کسی سبکی سے ملنے اس کے گھر چلی گئی۔ کا شان کے بھائیوں، عرفان اور عمران نے بخت خان سے سرسری سا باتھ ملایا اور کسی قسم کی گرجبوشی کا مظاہرہ نہ کیا۔ صفراں نے بھی بادل غواستہ اسے خوش آمدید کہا اور کھانا لگا کر چلی گئی۔ پھر اس کے سامنے نہ آئی۔ بخت خان ان لوگوں کے طرز عمل سے حیران رہ گیا اور وہ یہ جان گیا کہ اس کے ماموں اور کا شان کے علاوہ کسی نے اس کے اس روپ کو قبول نہیں کیا۔ اس نے ان کی طنزیہ باتیں بھی سن لیں جو وہ آپس میں کر رہے تھے مگر ان کے برعکس کا شان کی دوستی نے اسے حوصلہ دیا اور اسے یقین سا تھا کہ زندگی کے اس نئے سفر میں وہ اس کا ساتھ دے گا۔ اسے یہ سمجھا کہ سکنی اس سے ملنے نہیں آئی۔

بخت خان جب ندی پار کر کے اپنے گاؤں کی حدود میں داخل ہوا تو اس نے کنویں والا راستہ اختیار کیا کیوں کہ وہ شارٹ تھا۔ عصر کے بعد کا وقت تھا۔ کنویں پر گاؤں کی لڑکیوں اور عورتوں کی قطاری لگی تھی جو پانی بھرنے آئی تھیں۔ دو لڑکیاں کنویں سے ڈول نکال نکال کر سب کے گھڑے بھر رہی تھیں اور آپس میں ہلسی مذاق بھی کر رہی تھیں۔ دور سے انہیں بخت خان گاؤں کی طرف آتا نظر آیا

تو ان سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں اور ان میں سے ایک بولی۔ ”ارے اب تو وہ بالکل لڑکا لگتا ہے۔ سچ سچ کا مرد بن گیا ہے، واہ مولا تیرے رنگ۔“

”تیرا کیا خیال تھا۔ آدھا تیر۔ آدھا بیڑ والی بات ہو گئی۔“ ایک لڑکی جس کر بولی۔

”تھوڑی سی بیڑ والی بات تو اب بھی اس میں رہ مہی ہے۔“ ایک اور لڑکی بولی تو سب ہمدن گوش ہو گئیں۔ ”تم دیکھو تو سہی اس کی چال وہی لڑکیوں والی ہے۔ سر جھکائے زمین کے ٹکڑ گنتا جا رہا ہے۔ کسی کی طرف دیکھتا تو ہے ہی نہیں۔“

”تو تمہارا مطلب ہے بخت خاص دلی نہیں بنا پتی ہے۔“ ایک اور لڑکی اپنا گھڑا اٹھاتے ہوئے بولی۔

”ہاں بنا پتی ہی سمجھو۔ آج کے ناخالص اور دو نمبری دور کی پیداوار۔“ ایک شرارتی لڑکی نے لہک لگائی تو سب کلکھلا کر ہنس پڑیں۔

ایسی باتیں اب روزانہ ہی کنویں پر ہونے لگی تھیں۔ بخت خان کو بھی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ گاؤں کے لوگ اس کے بارے میں عجیب عجیب طعنیہ باتیں کرتے ہیں۔ کچھ اسے چودھری کے گناہوں کی سزا کہتے اور کچھ اللہ کی طرف سے آزمائش۔ غرض جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں مگر بخت خان خاموش تھا۔ وہ کربھی کیا سکتا تھا۔ کسی کا منہ بند تو نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنے آپ کو بھی یقین دلانے میں عرصہ لگا تھا کہ وہ اب خوش بخت نہیں، بخت خان ہے۔ تو پھر لوگ اسے اتنی جلدی کیسے قبول کر لیں گے۔ ان ہی سوچوں کی وجہ سے وہ ہر ایک سے کٹنا کنار ہنے لگا۔ کمرے میں تنہا پڑا رہتا۔ کیوں کہ اس کا کوئی دوست جو نہ تھا، بس ایک کا شان ہی تھا جو اس سے ملنے آ جاتا تھا اور اس کو اپنے ہمراہ باہر لے جاتا۔ اسے وہ کھیل کھیلتے۔ شکار کرنے اور گھوڑے پر بیٹھنے کے مشورے دیتا۔ وہ ہر بات اس کو اپنے برابر لا کر کرتا تھا جس سے خوش بخت میں حوصلہ پیدا ہوتا۔

علی پور کا سالانہ میلہ نزدیک آ گیا تھا۔ کا شان ابھی سے کہہ گیا تھا کہ وہ تیار رہے۔ وہ خود اسے لینے آئے گا اور میلے میں لے جائے گا۔ اسے کھیل تماشے دکھائے گا۔

میلے والے دن کا شان آ کر اسے ساتھ لے گیا۔ کبڈی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ گاؤں کے جوان لڑکے ایک ٹولی کی صورت میں بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ کا شان اور بخت خان بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہاں موجود سب لڑکوں نے بڑی حیرت



اور زبوراں اب بخت خان کے سر پر سہرا دیکھنے کے لیے بے تاب تھی۔ جب اس نے کاشان کی بہن سکنی کا نام لیا تو ایک ہنگامہ پھا ہو گیا۔ صغراں نے تو آسمان سر پر اٹھالیا کہ میری بیٹی کا نام کیوں لیا۔ غضب خدا کا، زبوراں اپنے عذابوں کا پھندا میرے گلے میں ڈالنے چلی ہے۔ وہ تو زبوراں کے درپے ہوئی کہ تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ میری بیٹی کا نام لیا۔ اس آدھے تھرا اور آدھے ٹھیر کے لیے کیا میری بیٹی رہ گئی تھی۔“

زبوراں کی بچی ہو کر رہ گئی۔ جیسے اس سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد ہو گیا ہو۔ ”صغراں! بہن! تم نے جب میری بیٹی مانگی تھی تو اس وقت میں تو گمراہ نہیں اچھلی تھی۔ میں نے تمہارے دس دس نام نہیں رکھے تھے۔ میں نے تو اسے دل سے پیٹا بیٹا تھا میں نے تمہارا مان رکھا تھا کہ تمہارے ایک ہی بار رشتہ مانگنے پر ہاں کر دی تھی۔ ورنہ لوگ تو بیٹی اپنے وقت لڑکے والوں کو بیسیوں پھیرے لگواتے ہیں مگر میں نے.....“

”میرے بیٹے کا نام اب مت لو۔ وہ تو خالص گھبرو جوان ہے۔ تمہارے بیٹے کی طرح راتوں رات جنس بدل کر نہیں آیا۔“ صغراں طنز یہ لہجہ میں بولی۔

”مگر اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ یہ تو سوہنے رب کی دین ہے۔ جس کو جب چاہے اور جس رنگ میں دے۔“ ”ظاہر ہے تم نہیں کہو گی تو اور کون کہے گا۔“ صغراں کا لہجہ ابھی تک طنز یہ تھا۔ ”تمہیں بڑی آس تھی ناں بیٹے کی۔ وہ تو یوری ہوئی اور وہ بین اس وقت جب بیٹی کی رخصتی قریب تھی۔ جایدا پچھلے کا اچھا بھانا ڈھونڈا ہے تم لوگوں نے۔“

”تو اس بات کا مرد ڈانڈ رہا ہے تمہارے پیٹ میں۔“ زبوراں کے ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ گیا۔ ”تو تم خوش بخت کے ذریعے ہماری جایدا پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ اسی لیے اب تمہیں بخت خان کا وجود ٹھیک رہا ہے۔“ یہ کہہ کر زبوراں غصے سے باہر نکل آئی۔ گھر آ کر چودھراں نے اپنے دل کی ساری بھڑاس چودھری محبت پر اتار دی۔ رورہا کہ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں مگر اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بخت خان کے دل میں تیر کی مانند کھچا چلا گیا۔ اس نے ماں اور باپ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ اب وہ اپنے کمرے میں دل کا بوجھ

سے اس سے جوڑے کو دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں اشارہ بازیاں کیں۔ کسی نے کوئی طنز یہ جملہ بھی کس دیا۔ ”کبڈی تو مردوں کا کھیل ہے۔ عورتوں کا کیا کام۔“

بخت خان مزید وہاں نہ ٹھہرا اور کاشان کو چھوڑ کر گھر لوٹ آیا۔ کاشان نے برا نہ منایا اور اگلے دن پھر اس سے ملنے آ گیا۔ دونوں کا اکثر وقت ساتھ گزرنے لگا تھا اور یہی وقت بخت خان کو اچھا لگتا تھا۔ مگر کاشان کی ماں کو یہ سب کچھ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ خوش بخت اسے پسند تھی اسی لیے وہ اسے اپنی بیوی بنانا چاہتی تھی مگر اس کا یوں راتوں رات لڑکائیں جانا اس نے قبول نہ کیا تھا۔ وہ کاشان کو اس سے ملنے سے منع کرتی تھی مگر کاشان کہتا۔ ”ماں! تم تو خواہ مخواہ اس غریب کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ اس میں اس کا بھلا قصور کیا ہے۔ کل تو آپ اس کے کن گاتی تھیں۔ بیوی بنانے کا بھی فیصلہ کر لیا مگر آج.....“ کاشان ماں سے الجھ پڑا تو وہ بھی اسی انداز میں بولی۔

”پتر کاشان! کل اور آج میں بہت فرق ہے۔ تم اسے کوئی عذاب الہی سمجھو۔ جس کا سایہ میں تم پر نہیں پڑنے دوں گی۔ مجھے تو یہ قیامت کے آثار لگتے ہیں۔“ ”کیسی باتیں کرتی ہو۔ یہ سائنسی ترقی کا زمانہ ہے جس میں ہر بات ممکن ہے۔ یہ انہونی نہیں ہے۔ لڑکی سے لڑکا اور لڑکے سے لڑکی بن جانا عام سی بات ہے۔“ کاشان نرم لہجہ میں بولا مگر اس کی ماں کا غصہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”ہوش کی بات کر بیٹا! یہ انہونی نہیں تو کیا ہے۔ کبھی تم نے گندم کے پودے کے ساتھ بھنے گتے دیکھے ہیں۔ کبھی آم کے درخت پر خرپوزے لگتے دیکھے ہیں۔ کبھی سنا ہے کہ مرغی نے انڈے نہیں چوزے دیے ہیں۔“

”مگر اس میں بخت خان کا کیا قصور ہے۔ اس میں اس کی مرضی کا دخل تو نہیں ہے۔ ایسا تو کسی کے ساتھ کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کسی دن میرے ساتھ.....“ ”اللہ نہ کرے بیٹا! ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ مجھے بخت خان سے ہمدردی ہے مگر زمانہ خراب ہے۔ سنا نہیں تم نے گاؤں کے لوگ کیسی کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“ صغراں اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”اماں! آپ بھی تو ایسی باتیں کرتی ہیں۔“ کاشان یہ کہہ کر ناراض سا ہو گھر سے باہر نکل گیا۔ اسے بخت خان سے دلی ہمدردی تھی۔ وہ اسے لڑکی ہونے کے خول سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔



آنکھوں کے راستے بہا کر ہلکا کر رہا تھا۔ ساری رات اس نے جاگ کر گزار دی۔

اس دن سے بخت خان خاموش خاموش سا رہنے لگا۔ اس نے کاشان سے بھی ملنا کم کر دیا۔ علی پور نہ جانے کی تو اس نے قسم کھائی تھی مگر کاشان خود اس سے ملنے کے لیے آتا رہا۔

کاشان نے بھی اپنی ماں اور پھوپھی کے درمیان ہونے والی گفتگوں لی تھی۔ اس لیے اس نے پھوپھی سے اور بخت سے ان کے گھر آکر معافی مانگی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ تو خود بھی چاہتا تھا کہ بخت اور سلٹی کی شادی ہو جانی چاہیے مگر اس کی ماں تو ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ ایک روز کاشان زبردستی بخت خان کو ندی کے کنارے لے گیا اور اس کی ہمت بڑھا کر اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگا۔

”کاشان! میں سوچتا کہ مجھے پیدا کرنے میں رب کی کون سی مصلحت تھی؟ کاشان کو بخت خان سے ایسی فتح اور براہ راست بات کی توقع ہرگز نہ تھی مگر بخت خان اداس اور دھیمے لہجے میں بولتا رہا۔ ”میری ماں اس دنیا کی سب سے بد قسمت عورت ہے۔ پہلے اس کو اولاد کی تمنا تھی اور بیٹے کی آس تھی مگر اسے بیٹی ملی تو وہ اپنا دکھ چھپا گئی کہ بیٹا بھی مل جائے گا مگر وقت اور قدرت نے اسے یہ نعمت نہ دی۔ یہ نعمت اب ملی بھی تو کس روپ میں۔ نہ میں اس کا دکھ بانٹنے والی بیٹی ہوں اور نہ ہی اسے خوشیاں دینے والا بیٹا۔“

”کاش میں سلٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے سکتا۔“ کاشان معذرت بھرے لہجے میں بولا۔ تو بخت خان کی آنکھوں میں سلٹی کا معصوم چہرہ محسوس کیا۔ پہلے ان دونوں میں کتنی محبت اور دوستی تھی۔ اب وہ بخت خان کو شوہر کے روپ میں قبول کر لے گی مگر اس کا جواب تو کسی کے پاس بھی نہ تھا۔

☆.....☆

چودھرائن ابھی تک آگ میں جل رہی تھی اس نے صفراں کو نیچا دکھانے کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ اس نے ہر اس گھر کے چکر لگائے جہاں بھی جوان لڑکی موجود تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی نہ صاف انکار کیا اور نہ ہی ہاں کی پس گول مول سا جواب دے کر ٹال دیا۔ بخت خان تو ماں کو منع ہی کرتا رہا کہ اب وہ کہیں نہ جائیں مگر اس کی ماں بہو لانے کے لیے سرگرداں ہی رہی۔ بخت خان کوشش کے باوجود بھی سلٹی کی ماں کے طریقہ الفاظ نہیں بھلا سکا تھا اور اس

کے کانوں میں ہر وقت یہی الفاظ گونج رہے تھے۔ ”ہوں آدھا تیر آدھا تیر۔“

”کیا واقعی یہ سچ ہے۔ ڈاکٹر نے تو کہا تھا کہ اب مکمل مردانہ زندگی گزاروں گا۔ پھر یہ طعنے اور تحقارت بھرے جملے یہ سیکھتے فقرے اور دل میں آگ لگانے والی باتیں کیوں اچھالی جاتی ہیں۔ کیا میں واقعی اپنے ماں باپ کے کسی گناہ کی سزا ہوں۔“ بس اس دن سے بخت خان کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزارنے لگا۔ اس نے زمینوں پر جانا اور کاشان سے ملنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چودھری محبت نے اس بات کو محسوس کیا اور اس کی سرزنش بھی کی مگر اس کی خوش دلی شاید ہمیشہ کے لیے کھو گئی تھی۔ اس روز بھی چودھری محبت نے اس سے ذرا غصہ بھرے انداز میں بات کی تھی کہ وہ ہر وقت کمرے میں کیوں بند رہنے لگا ہے۔ باہر نکلو زمینوں پر جاؤ۔ محسوس پھر دو اور جائیداد زندگی بسر کرو۔ اتنا سنتے ہی بخت خان باہر نکل گیا۔ اس کا رخ زمینوں کی طرف ہی تھا۔ مگر بخت خان لوٹ کر گھر نہ آیا۔ دوپہر چلی تو اس کی ماں کھانے کے لیے اس کا انتظار کرنے لگی۔ وہ نہ آیا تو اس نے ملازموں کو ڈیرے پر بھیجا مگر بخت خان وہاں بھی نہ تھا۔ شام بھی ڈھلنے لگی تھی۔ چودھرائن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پھر رات آئی اور گزر گئی۔ چودھری محبت نے سارا گاؤں اور علی پور بھی چھان مارا مگر بخت خان کا نشان نہ ملا۔ حویلی اور گاؤں میں صف ماتم بچھ گئی۔

اگلے دن گاؤں کے چرواہے نے بتایا کہ گاؤں سے باہر کافی دور جا کر جہاں ندی کافی گہری ہو جاتی ہے وہاں پر پانی میں کسی کی لاش تیر رہی ہے۔ یہ سن کر چودھری اور گاؤں کے لوگ اس طرف دوڑ پڑے۔ وہ لاش بخت خان ہی کی تھی۔ اس نے گہرائی والی جگہ کود کر خودکشی کر لی تھی اس کی لاش بڑی مشکل سے باہر نکالی گئی۔ اس کی ادھ مٹی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں گویا بنانے والے سے پوچھ رہا ہو کہ اس کے بنانے میں اس کی کیا مصلحت تھی؟ چودھرائن کے بین کیچہر چیر رہے تھے۔ کاشان سر ہانے کھڑے رہا تھا اور صفرائں اس کی لاش کو دیکھ کر زار و قطار آنسو بہا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”چودھری محبت! تیرا بخت خان تو بڑا مہربان تھا سچا اور انمول۔“ اور کاشان اپنے آنسو پیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کاش میری ماں یہ بات بخت خان کی زندگی میں کہہ دیتی۔



## ڈیڑھ سیانا

جناب معراج رسول  
السلام علیکم

میں اس بار ایک منفرد نوعیت کی سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ اس لیے بھی عجیب ہے کہ اس کا مرکزی کردار بھی میں خود ہوں۔ جیسا کہ یہ میری اپنی سرگزشت ہے۔ میں نے جو قدم اٹھایا اس کی وجہ سے کچھ لوگ میرے غلط کہیں گے ان سے استدعا ہے کہ وہ میرے پورے حالات کو مد نظر رکھیں۔ سنار کی سو اور لوہار کی ایک۔ میں نے یہی کیا ہے۔

شاہنواز  
(ٹورنٹو کینیڈا)

کو قتل کر دیا۔ دیکھو دنیا تو یہ جانتی تھی کہ حق نواز نہ صرف میرا بڑا بھائی ہے بلکہ اس کی مقام پر تھا تو اس کی واحد وجہ نواز ہی تھا۔ یہ باتیں کسی نے پہچانی تھیں۔ مجھے دنیا کی پروا بھی نہیں تھی۔ اس دنیا نے مجھے دیا ہی کیا تھا جو میں اس کی

آج میرا بڑی شدت سے کسی کو قتل کرنے کو دل چاہ رہا تھا اور یہ ”کسی“ کوئی اور نہیں بلکہ میرا بڑا بھائی ہے۔ اگر میں اس ارادے پر عمل کر لیتا تو زمانہ مجھے براور کش اور شاہد شیطان کے القابات سے نوازتا جس نے اپنے بڑے بھائی



پروا کرتا۔ مصیبت یہ تھی کہ میں دیوانہ بزدل ہوں۔ اپنے بڑے بھائی تو کیا ایک چھٹکلی مارنے کی ہمت بھی نہیں رکھتا۔ اس لیے جس وقت میرے اندر نواز کوئل کرنے کی خواہش ابھری اسی وقت میں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ میں قیامت تک اس خواہش پر عمل نہیں کر سکوں گا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہوں گا۔ میرا خیال ہے بات اس طرح آپ کی سمجھ میں نہ آئے گی جب تک میں آغاز سے نہیں بتاؤں۔

میرا آغاز نواز کا اختتام تھا۔ یعنی مجھے اس کے بچے کے پر گزارہ کرنا پڑا تھا۔ مجھے پہلا کپڑا جو نصیب ہوا وہ اس کی اترن تھی۔ اس وقت غریب سے غریب بچہ بھی نیا کپڑا پہن ہی لیتا ہے مجھے زیادہ تر نواز کے اتارے ہوئے اس کے بچپن کے کپڑے ہی پہننے کو ملے تھے۔ پھر اس کے موزے، ٹوپے، سوئٹر، کپل، بستر اور جوتے پہننے کو ملے۔ حد یہ کہ مجھے ماں باپ سے پیار بھی وہ ملا جو نواز سے بچ جاتا تھا۔

وہ مجھ سے خاصا بڑا ہے یعنی پورے آٹھ برس اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کا اور میرا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ اسے بڑے بھائی ہونے کے ناطے مجھ سے شفقت اور محبت سے پیش آنا چاہیے تھا۔ بڑے بھائی کی طرح ایثار اور قربانی سے کام لینا چاہیے تھا مگر اس کے برعکس اس کی کوشش ہوتی تھی کہ مجھے کچھ نہ ملے یا ملے تو بہت معمولی سا اور نہ ہونے کے برابر۔ یہ کام وہ اتنی ہوشیاری سے کرتا تھا کہ میں تو کیا میرے ماں باپ بھی اس کی چال بازی نہ سمجھ پاتے تھے۔

جب میرے لیے نئے کپڑوں یا چیزوں کی بات ہوتی تو نواز نہایت ہوشیاری سے اپنے پرانے کپڑے اور چیزیں پیش کر دیتا تھا اور اس طرح مصمصیت سے غیر محسوس انداز میں ہڈگائی کو اجاگر کرتا کہ ماں باپ دونوں اس کی باتوں میں آجاتے۔ حالانکہ وہ ہمیشہ نئی اور عمدی چیز استعمال کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں دس برس کا اور پورا اتار ہارہ برس کا تھا تو اماں نے ابا کا ایک پرانا جوڑا اجراتا بھی پرانا نہیں تھا اسے نواز کے لیے سلائی کر کے اسے دیا تو اس نے بچہ سے کر دیا اور اتنا شور کیا کہ گھر سر پر اٹھالیا کہ اسے پرانا جوڑا دیا جا رہا تھا۔ اس نے نہایت جذباتی انداز میں ایک لمبی تقریر کی جس کا لب لباب کچھ یوں تھا۔ ”اب میری یہ اوقات رہ گئی ہے کہ میں دوسروں کی اترن پہنوں۔ نہیں پال سکتے تو بتا دیں میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔ اللہ نے ہاتھ پاؤں دیئے ہیں، محنت مزدوری کر لوں گا۔ بھوکا مر جاؤں گا مگر اب اس

گھر میں نہیں آؤں گا۔“

اسے اس تقریر کا صرف دسواں یا بیسواں حصہ سمجھیں۔ جسے سن کر اماں اور ابا کے ہاتھوں سے طوطے اڑ گئے تھے۔ پہلا بیٹا ہونے کے ناطے وہ اس سے پاگلوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ جب کہ مجھے اس پیار کا دسواں حصہ بھی نہیں ملا تھا۔ اماں دھاڑیں مار کر رونے لگیں اور ابا نے بلبلہ کر اماں پر چڑھائی کر دی اور انہیں بے نقط سنائیں کہ انہیں نواز کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیا میں مر گیا ہوں جو تم میرے بیٹے کو اترن پہنا رہی ہو۔

”آپ کا نیا سوٹ ہی تو ہے ایک دو بار پہنا اور پھر چھوڑ دیا۔“ اماں نے روتے ہوئے کہا۔ ”میں نے سوچا کہ پھر سے سلائی کر کے نواز کے سائز کا کر دوں۔“

ابا کا غصہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب انہوں نے وہ سوٹ اٹھا کر چولہے میں جھوک دیا۔ میں دس سال کا تھا اور اس وقت تک مجھی مشہور ہو گیا تھا (اس شہرت میں بنیادی کردار بھائی صاحب کا تھا)۔ مگر میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ میں جو بچپن سے اترن پر گزارہ کرتا آ رہا ہوں۔ کیا اماں ابا نے بھی اس طرح میرے لیے سوچا؟ مگر ذہن پر خاصا زور دینے کے بعد بھی ایسا کوئی واقعہ ذہن میں نہیں آیا کہ اماں ابا نے مجھے اترن پہنانے سے انکار کیا ہو۔ حد یہ کہ جب بچہ اسکول جاتا ہے تب تو اسے پہلی بار نیا بستہ، یونیفارم، جوتے اور کتا ہیں ملتی ہیں۔ مگر مجھے تو یہ بھی نواز کی برسوں پہلے چھوڑی ہوئی ٹی شirts۔ مجھے صرف کاپاں اور مینسل وغیرہ نئی ٹی شirts۔ ممکن ہے اگر نواز نے اپنی بچی بچی سنبھال کر رکھی ہوتیں تو یہ بھی مجھے پرانی ہی ہوتیں۔ اس اُمید پر کہ نواز کے اس داویلے اور اماں ابا کے اس پر تو عمل کے بعد پالیسی بدل جائے گی۔ چند دن بعد میں نے ہمت کر کے اماں سے کہہ دیا۔

”میں یہ شلوار قمیص نہیں پہنوں گا۔“

اس وقت اماں سلائی مشین پر حق نواز کا ایک دس سال پرانا سوٹ کانٹ چھانٹ کر میرے مطابق کر رہی تھیں۔ وہ آٹھ سال کی عمر میں اس سے زیادہ جسامت رکھتا تھا۔ پچھری دس سال کی عمر میں نہیں تھی۔ اماں نے حیرت سے زیادہ قہقہوں اور نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کیوں نہیں پہنے گا، چھٹا چھ سوٹ تو ہے۔“

اماں جسے اچھا خاصا کہہ رہی تھیں اس کا کپڑا بھی تمس



گیا تھا۔ اماں کو بہت احتیاط سے سلائی کرنا پڑ رہی تھی۔ میں نے مزید ہمت کر کے کہا۔ ”میں اتارن نہیں پاؤں گا۔“ ”ہاں ہاں، تو کسی نواب کی اولاد ہے۔“ اماں نے طنز یہ لہجے میں ایک طویل پتھر شروع کیا جس میں اپنی مالی مشکلات اور مہنگائی کا رونا رونے سے لے کر ان احسانات کی طویل فہرست کا ذکر بھی تھا جو وہ ماں باپ کی حیثیت سے اپنا پیٹ کاٹ کر ہمارے لیے کر رہے تھے۔ میں اتنا ملگ ہوا کہ یہ احتجاج بھی نہ کر سکا کہ وہ جن احسانات کا ذکر کر رہی ہیں وہ صرف نواز کے ساتھ ہوئے ہیں۔ بہر حال اس پتھر سے میرے اندر جو خوش فہمی آگئی تھی وہ فوراً رفع ہو گئی اور مجھے پتا چل گیا کہ میرے لیے پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ میں اب بھی وہی شاہ نواز تھا جسے دوسرے نہیں بلکہ نمبر دو بیٹے کی حیثیت حاصل تھی اور اس حیثیت میں ساری عمر کوئی فرق نہیں آئے گا۔ جب تک اماں بازندہ رہے میں دو نمبر ہی رہا۔

ابا کی علاقے کی مارکیٹ میں کرپانے کی دکان تھی۔ اگرچہ متوسط علاقہ تھا مگر جنرل اسٹور کا کام اچھا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ہماری مالی حالت (جس کی خرابی کا رونا صرف میرے لیے رو یا جاتا تھا) آس پاس کے پڑوسیوں سے خاصی بہتر تھی۔ ابا میٹرک پاس تھے اور اماں نے صرف پانچویں تک اسکول دیکھا تھا۔ مگر ان کی خواندگی تھی کہ ان کی اولاد بہت سارا پڑھے۔ اس لیے انہوں نے صرف چار سال کی عمر میں نواز کو نزدیکی سرکاری اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس وقت بھی اسکولوں کا رواج بہت کم تھا۔ نواز کو پڑھنے کا شوق نہیں تھا مگر اس نے بھانپ لیا تھا کہ اماں ابا کی کمزوری تعلیم ہے اس لیے وہ یوں پوچھنے لگا جیسے اسے بھی پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ حالانکہ وہ اسکول جاتا اس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ براہ راست انکار نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس نے دوسری ترکیب نکالی اور اس کے ذہن اسکول جانے کے وقت اسے جسمانی عوارض لاحق ہو جاتے تھے۔ وہ جانے سے انکار نہیں کرتا تھا مگر تیار ہوتے ہوئے یوں کرتا تھا اور اداکاری کرتا کہ بالآخر اماں کو ترس آ جاتا اور وہ اسے خود اسکول جانے سے منع کر دیتیں۔

ہو شیار نواز فوراً نہیں مانتا تھا بلکہ اپنی تکلیف کو مسلسل بیان کرتے ہوئے اسکول جانے پر اصرار کرتا اور پھر اماں کی است یوں مانتا جیسے صرف اماں کے کہنے پر اسکول نہیں جا رہا ہے ورنہ اس وقت اسے ملک الموت بھی اسکول جانے سے

نہیں روک سکتا تھا۔ پانچویں تک یہ بہانے چلتے رہے اور مزے کی بات تھی کہ تمام عوارض اور تکالیف صرف اسکول کے وقت تک ہوتی تھیں جیسے ہی وقت گزرتا نواز بھلا چڑکا ہو جاتا اور دوپہر ختم ہوتے ہی کھیلنے کے لیے نکل جاتا تھا۔ بڑی کلاسوں میں آنے کے بعد اس نے حکمت عملی بدل دی۔ اب وہ تیار ہو کر باہر نکلتا اور اپنے جیسے آوارہ لڑکوں کے ساتھ کسی میدان کا رخ کرتا جہاں وہ کرکٹ کھیلتے تھے۔ اماں گھر میں رہنے والی عورت تھیں اور ابا کو دکان سے فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ نواز پر نظر رکھتے۔ اس لیے وہ اپنی من مانی کرنے کے لیے آ کر تھا۔

پڑھائی میں رہ جانے والی کمی وہ دوسرے طریقے سے پوری کرتا تھا۔ شام کے وقت وہ کچھ دیر ابا کے ساتھ دکان پر بیٹھتا تھا اور جب ابا نماز پڑھنے جاتے تو چیزوں میں ہیرا پھیری کرتا تھا۔ یہ چیزیں بعد میں اپنے اساتذہ کے گھر پہنچتا اور اس کا فائدہ اسے امتحان کے دنوں میں ہوتا۔ اس کے اچھے اچھے نمبر آتے کہ اماں ابا نہال ہو جاتے اور منھائیاں بانٹتے نہیں جھکتے تھے۔ ان کو بھی پتا نہیں چلا کہ ان کا برخورد دار پاس کیسے ہوتا ہے؟ جب میری اسکول جانے کی عمر ہوئی تو اماں ابا نے اس لیے دیر سے داخل کرایا کہ یہ قول ان کے میں بھی تھا۔ حالانکہ میں غبی نہیں تھا۔ بچپن سے توجہ نہ پا کر میں چپ رہنے لگا تھا اور بلا ضرورت بات نہیں کرتا تھا۔ اماں ابا نے میرے یہ مشکل ہی کچھ لاڈ اٹھائے ہوں گے۔ میرے لیے ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس چپ کا نقصان یہ ہوا کہ حق نواز نے اماں ابا کے کان میں مسلسل ذانا شروع کر دیا کہ میں غبی ہوں اور کوئی عقل والا کام نہیں کر سکتا اس لیے کوئی مجھ سے توقع بھی نہیں کرتا تھا۔ وہ تو مجھے اسکول میں بھی داخل نہیں کر رہے تھے۔ مگر میری مثال کو بچا چلا تو انہوں نے اماں کو لتھاڑا۔ ”تو شاہ نواز کو اسکول کیوں نہیں بھیج رہی۔“

”آپا اسے عقل ہی کہاں ہے؟“

”عقل تم دونوں میاں بیوی کو نہیں ہے اچھا بھلا بچہ تو ہے جس آج کل کے بچوں کی طرح بہتیز اور چلبلا نہیں ہے تو تم مجھ سے عقل نہیں ہے اسے فوراً اسکول میں داخل کراؤ۔“

اماں خالہ سے ڈرتی تھیں اس لیے انہوں نے ابا سے بات کی اور ابا نے اپنے اسکول میں داخل کرانے کو کہہ دیا۔ سرکاری اسکول گھر سے دور تھا اس لیے طے ہوا کہ نزدیکی پرائیویٹ اسکول میں داخل کرایا جائے۔ مگر جب نواز کو پتا



چلا تو وہ جل بھن کر رہ گیا تھا۔ اس نے فوراً مخالفت کی اور نہایت چالاکی سے اماں ابا کو قائل کیا کہ اتنا پیسا ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے اور پرائیویٹ اسکول والوں کے منہ بھی کھلے رہتے ہیں۔ کتابوں اور یونیفارم سمیت ہر شے مہنگی ہوتی ہے اس لیے مجھے سرکاری اسکول میں داخل کرایا جائے جہاں سے وہ پڑھ رہا تھا اور جہاں تک دوری کی بات تھی تو وہ مجھے ساتھ اسکول لانا لے جاتا۔ اس کے پرانے یونیفارم اور کتابیں میرے کام آئیں۔ اماں ابا تو پہلے ہی اس کے کہنے میں آتے تھے فوراً مان گئے۔ اس وقت نواز نویں کلاس میں تھا۔ ایک دو سال بعد میں خود بھی آنے جانے کے قائل ہو جاتا۔

یوں میرا داخلہ سرکاری اسکول میں ہوا اور مجھے نوازی چھوڑی چیزوں اور اترتوں پر گزارہ کرنا پڑا تھا۔ نواز کو مجھ سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ سیری پیدائش کے بعد اس نے ایک بار بھی مجھے گود میں نہیں لیا تھا۔ باہر لے جانے اور کھلانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اماں ابا بھی میرے ساتھ اس کے روپے کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ جب اس نے مجھے ساتھ اسکول لانے اور لے جانے کا ذرا لیا تو وہ یوں اس کے ممنون ہو گئے جیسے وہ کوئی غیر ہو۔ ان کا بیٹا اور میرا بڑا بھائی نہ ہو۔ حالانکہ اس کے ساتھ آنا جانا یوں ہوتا تھا کہ گلی سے نکلتے ہی وہ مجھ سے بے نیاز ہو جاتا اور منہ اٹھائے تیز قدموں سے چلتا۔ اسے قطعی پروا نہیں ہوتی تھی کہ میں اس کے پیچھے آ رہا ہوں یا نہیں۔ نہیں رک گیا ہوں یا گرمیا ہوں یا کسی گاڑی کے نیچے آ گیا ہوں۔ میں بھاری بھر کم بیگ اٹھائے اس کے پیچھے بھاگتا تھا اور اس ریس میں میرا حشر نشر ہو جاتا۔

چند ایک بار کے بعد میں نے راستہ یاد کر لیا اور اب میں خود آرام سے جاتا اور آرام سے گھر آتا تھا۔ واپسی میں وہ چالاکی سے کام لیتا اور تیز قدمی چلنے کے بعد گلی کے کونے پر میرا انتظار کرتا اور پھر یوں میرے ساتھ گھر تک آتا جیسے اس نے سارے راستے میرا بہت ہی خیال رکھا ہو۔ پہلے وہ مجھے نظر انداز کرتا تھا اب اس نے مجھے اپنا خادم سمجھ لیا اور جب تک گھر میں ہوتا مجھ پر حکم چلاتا رہتا تھا۔ میں بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتا اور اگر ذرا سا بھی انکار کرتا تو وہ فوراً اماں یا ابا سے شکایت کرتا اور اس کے بعد میری شامت آ جاتی کہ میں بڑے بھائی کا حکم نہیں مان رہا جو میرے لیے اتنا کرتا ہے۔ حالانکہ وہ میرے لیے کیا کرتا تھا

یہ تو میں ہی جانتا تھا۔ ورنہ جب وہ گھر سے جاتا تب میں سکون کا سانس لیتا تھا ورنہ تو مجھے ہوم ورک یا نمیسٹ کی تیاری کرتے ہوئے بھی اس کے کاموں کے لیے دوڑنا پڑتا تھا۔ تعلیم کے معاملے میں، میں نواز سے بہتر ہی تھا کیونکہ میں روز اسکول جانے والا اور روز کا کام روز کرنے والا طالب علم تھا۔ غبی مشہور ہونے کے باوجود مجھے اپنا سبق یاد کرنے میں کبھی دشواری پیش نہیں آئی اور میں ہر نمیسٹ اور امتحان میں با آسانی پاس ہو جاتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے بہت اچھے نمبرز نہیں ملتے تھے کہ میں کلاس میں کوئی پوزیشن لیتا کیونکہ پوزیشن صرف ٹیچرز کے منظور نظر لڑکے لیتے تھے۔ میں خاموش اور اپنے آپ میں ٹکمن رہنے والا لڑکا تھا اس لیے ٹیچرز کی نظروں میں نہیں آتا تھا۔ پھر نواز نے اسکول میں بھی میرے بارے میں یہی مشہور کر دیا تھا کہ میں غبی ہوں۔ اس لیے دوسرے لڑکے مجھے چھیڑتے اور میرا مذاق اڑاتے تھے مگر کسی نے مجھے سنجیدہ نہیں لیا۔ پوری اسکول لائق میں میرے چند ایک ہی دوست بنے تھے۔ ان سے بھی دوستی بہت گہری نہیں تھی۔ اسکول کے بعد محلے میں بھی یہی حال تھا۔ بس چند ایک لڑکے تھے جن کے ساتھ میں کھیلتا تھا۔

جب نواز میٹرک میں آیا اور اسے بورڈ کے امتحانات سے واسطہ پڑا تو اسے پتا چلا کہ اب اس کی راتیں چلائی کی پالیسی کام نہیں آئے گی۔ پڑھنے کی اسے عادت نہیں تھی اس لیے اس نے متبادل حکمت عملی اپنائی۔ اس نے امتحانات میں پیسے کھلا کر غفلت کی اور یوں میٹرک کر لیا۔ اس کے نمبرز زیادہ اچھے نہیں آئے تھے اس لیے اسے عام سے کالج میں داخلہ ملا جہاں پڑھائی کے نام پر صرف چند ایک کلاسز ہی ہوتی تھیں اور زیادہ تر کلاسوں پر تالا پڑا رہتا تھا۔ یوں اسے نہ پڑھنے کا اصلی بہانہ مل گیا اور تین سال تک انٹر میں جھک مارنے کے بعد اس نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت میں نے پرائمری کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ جب ابا نے اس سے کہا کہ اگر وہ پڑھ نہیں رہا ہے تو اسٹور پر اس کا ہاتھ پٹائے تو اس نے چالاکی سے انکار کر دیا اور ابا سے کہا کہ وہ ٹیکنیکل کالج میں داخلہ لینا چاہتا ہے۔ ابا اگر چہ راہی نہیں تھے مگر اس کی بات سے کہاں انکار کر سکتے تھے۔

ابا نے مجھ سے کام کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ مج دس سے دواہٹ گیارہ بجے تک دکان میں کھڑے رہنا آسان کام نہیں تھا۔ لڑکے کے ملازم تھے مگر کیش کاؤنٹر پر



چھوڑا نہیں جاسکتا تھا۔ اس لیے ابا کی خواہش تھی کہ اب نواز دکان پر آئے۔ دوسری طرف نواز کا یہ حال تھا کہ اسے بن محنت کے رقم مل رہی تھی تو اسے کیا ضرورت تھی دکان پر جا کر محنت کرنے کی۔ کالج سے جان چھوٹی تو اس نے ٹیکنیکل کالج کا بیہانہ کر لیا اور ایک پرائیویٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہ انٹیکسٹریکل میں تین سال کا ڈپلومہ تھا۔ جب وہ ڈپلومے کا بیہانہ کر رہا تھا تو ابا نے اس سے کہا تھا۔ ”اب مجھ سے اتنی دیر دکان پر نہیں رہا جاتا ہے۔“

اس نے فوراً اپنی بلا میرے سر ڈال دی۔ ”ابا ایسا کرو کہ شاہجواز کو ساتھ رکھ لو۔“

”وہ تو ابھی پڑھ رہا ہے۔“ ابا کو زندگی میں شاید پہلی بار میرا خیال آیا۔

”کیا کرے گا پڑھ کر۔“ نواز نے بے پردائی سے کہا۔ ”اسے دکان پر لگا دو اچھا ہے کام سیکھ جائے گا۔ بعد میں اس کے کام آئے گا۔“

ابا کو نواز کی یہ بات لگی اور مجھے شام کے وقت دکان پر آنے کا حکم مل گیا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ میں زیادہ تر گھر میں ہوتا اور نواز کے کام کرتا تھا تو ابا کی دکان پر کام کرنے میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ بلکہ مجھے تو بچپن سے دکان پر جانا اچھا لگتا تھا۔ یوں میں نے شام کو دکان پر جانا شروع کر دیا اور چند مہینے بعد ابا نے میری طرف سے مطمئن ہو کر شام کو گھر جانا شروع کر دیا۔ میں نہ صرف دکان میں کام کرتا تھا بلکہ کیش کاؤنٹر بھی دیکھتا تھا۔ جب کہ میری عمر بارہ سال بھی نہیں تھی۔ میں نے یہ سارا کام اتنی خوش اسلوبی سے کیا کہ ابا حیران رہ گئے تھے کیونکہ انہیں مجھ سے توقع نہیں تھی کہ میں یہ کام اتنی جلدی سیکھ جاؤں گا۔ پہلے ابا نے مجھے سامان دینے پر لگایا۔ میں نے دیکھ ہی نہیں سکی کہ یہ کام سیکھ لیا۔ اس کے بعد کیش کاؤنٹر مجھے دیا گیا۔ ابا سر پر موجود رہے۔ جب ابا کو اطمینان ہو گیا کہ میں دکان سنبھال سکتا ہوں تو اب وہ تین مہینے کے لیے گھر چلے جاتے تھے۔ میں اسکول سے ایک بجے تک آتا اور شام چار سے سات بجے تک میں دکان دیکھتا تھا۔ دوپہر میں آرام کرتا تھا اور دکان سے آنے کے بعد اپنا ہوم ورک کرتا۔ دوسری طرف نواز کا یہ حال تھا کہ صبح دیر سے اٹھتا اور کالج کا بیہانہ کر کے گھر سے نکل جاتا۔ دیر سے جانے کے لیے یہ جواز پیش کرتا کہ کلاسز دیر سے ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ بیٹے میں دو تین دن ہی کالج جاتا تھا۔ میں نے خود دکان پر آتے جاتے

اسے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے یا کسی ہوٹل پر بیٹھے مپ شپ کرتے دیکھا تھا۔ وہ گھر سے جھوٹ بول کر اور اماں سے پیسے اٹھ کر چلا جاتا تھا۔ اماں اسے کبھی انکار نہیں کرتی تھیں اگر اپنے پاس نہیں ہوتے تو پاس پڑوس سے ادھار کر کے دے دیتی تھیں۔ جب نواز دو تین بار دکان پر بیٹھا تو اس نے خوب چوٹا لگایا۔ ابا جانتے تھے شاید اس لیے بھی انہوں نے اسے دکان پر بیٹھنے کے لیے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

اس کے برعکس میں نے گلے سے کبھی ایک روپيا نہیں نکالا۔ دکان میں کھانے پینے کی بیٹھار چیزیں ہوتی تھیں اور میں نے کبھی ایک سیاری کھجی نکال کر نہیں کھائی۔ اس وقت مجھے دو روپے جب خرچ ملتا تھا جب کہ نواز کو بیس روپے۔ اسے وہ بھی پورا نہیں ہوتا تھا۔ میں دو روپے میں گزارا کرتا تھا اور ابا کو کبھی خیال نہیں آیا کہ وہ مجھے کچھ زیادہ دے دیں۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ میں گلے سے مار کر اپنا حساب کر لیتا ہوں گا۔ یہ کام ایسا ہے کہ اس میں سو ڈیڑھ سو روپے کا پتا نہیں چلتا ہے اور ابا حساب کرتے تھے۔ جو کاتے گھر لے آتے۔ مزید سامان ڈالوا کر جو پچھا وہ گھر میں خرچ کے لیے دے دیتے اور یہاں سے جو پچھا وہ بینک میں ڈال دیتے۔ سال کے سال میرا جیب خرچ ایک روپے کے حساب سے بڑھتا رہا اور جب میں نویں کلاس میں آیا تو مجھے صرف چھ روپے مل رہے تھے۔ میٹرز کہ میں اماں ابا نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری اور مجھے دس روپے ملنے لگے۔

نواز کے ڈپلومے کا بھی وہی حشر ہوا تھا جو انٹر کا ہوا تھا یعنی وہ کبھی مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ چار سال اور لاکھ روپے سے اوپر ضائع کر کے اس نے اعلان کیا کہ وہ پڑھے گا نہیں بلکہ کاروبار کرے گا۔ اس وقت تک ابا اس سے کچھ فرٹ ہو چکے تھے مگر نواز اب بھی اپنی بات منوا سکتا تھا۔ اس نے ڈیکوریشن شاپ کا کہا تو ابا نے اسے ڈیکوریشن شاپ کھلوا دی۔ اس میں اچھا خاصا خرچہ آیا۔ کوئی لاکھ روپے کا تو سامان ہی پڑا تھا۔ پھر نواز کو دکان بھی اچھی جگہ دلوائی تھی۔ اس میں بھی خاصا خرچہ آیا تھا۔ آج سے کوئی سولہ سال پہلے یہ خامی ہوئی رقم ہوتی تھی خاص طور سے متوسط طبقے کے لیے۔ ابا نے برسوں میں جا کر یہ رقم جمع کی تھی جو نواز نے صرف ایک سال میں برپا کر دی۔ جی ہاں اس نے ایک سال بعد دکان بند کر دی تھی کیونکہ خسارہ کچھ بڑھ گیا تھا کہ دکان چلانا ممکن نہیں رہا تھا۔

نواز نے کچھ اس انداز میں کاروبار چلایا تھا کہ وہ بارہ



ایک بچے دکان کھولتا تھا اور اس کے فوراً بعد وہاں اس کے آوارہ دوستوں کا ہجوم جمع ہو جاتا۔ جن کے لیے دکان کے خرچ پر چائے اور ٹیج میں بریانی آرہی ہوتی تھی۔ سامان کرائے پر جاتا تو اس کی داپھی کی پروا نہیں ہوتی تھی کوئی چیز گرم جاتی تو اس کی تلاش کی زحمت نہیں کی جاتی تھی۔ چیزیں ٹوٹ پھوٹ جاتیں تو ان کی مرمت نہیں کرائی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ دکان ڈیکوریشن کی بجائے کباڑ کی بنتی چلی گئی۔ آمدنی اتنی کم ہوئی کہ کرایہ اور بل ادا کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ چائے اور بریانی بند ہوئی تو نواز کے آوارہ دوست بھی غائب ہو گئے۔ اس وقت اس نے کوشش کی کہ اپنا کام پھر سے بجائے اس نے ابا سے رقم مانگی مگر ابا پہلے ہی سب اسے دے چکے تھے اور اب خالی ہاتھ تھے۔ پھر بھی انہوں نے کہیں سے دس ہزار روپے کے اسے دے دیے اور یہ بھی دکان کے ساتھ ڈوب گئے۔ ایک سال سے بھی پہلے دکان بند ہو گئی اور وہ گھر آ کر بیٹھا تھا۔

دوسری طرف میں نے دکان میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ میٹرک کیا اور بہت اچھے نمبروں سے کیا اب میرا ارادہ آگے پڑھنے کا تھا مگر اس موقع پر نواز نے ہمیشہ کی طرح ٹانگ اڑائی اور اماں ابا سے کہا۔ ”یہ آگے پڑھ کر کیا کرے گا اسے دکان پر لگائے رکھو۔ اب ابا کی آرام کرنے کی عمر ہے۔ یہ جوان ہو گیا ہے پوری دکان سنبھال سکتا ہے۔ کام بھی سیکھ ہی گیا ہے اتنے سالوں میں۔“

میرا خیال تھا کہ اس وقت تو اماں ابا اسے آئینہ دکھائیں گے کہ اس نے کالج میں دوبار پڑھ کر کیا کیا تھا؟ جہاں تک دکان کی بات تھی تو اسے ابا کے بڑھاپے کا خیال کیوں نہیں آیا؟ سب سے بڑھ کر اسے ابا نے دکان کھلوا کر دی تو اس نے کیا تیر مارا تھا؟ انہوں نے ایک لفظ نہیں کہا۔ اس کی بجائے ابا نے کہا۔ ”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“

میرے کی بات تھی کہ یہ ساری گفتگویں بے سامنے ہو رہی تھی۔ اماں ابا اور نواز میرے بارے میں کوئی بات کرتے ہوئے اس کا قطعی خیال نہیں کرتے تھے کہ میں سامنے موجود ہوں۔ ان کے خیال میں ان کے تجربے میرے دل پر اثر نہیں کرتے تھے یا انہیں ہر طرح کی بات کہنے کا حق حاصل تھا۔ میرے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے سب کی رائے لی جاتی تھی سوائے میرے۔ جیسا کہ اس وقت ہو رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے کہا۔ ”میں آگے

پڑھنا چاہتا ہوں۔“ ”تم پڑھنا چاہتے ہو۔“ نواز نے تسخراں انداز میں کہا۔ ”کیا کر لو گے پڑھ کے تھرڈ ڈیڑن میں بی اے کر لو گے اور بہت تیر مارا تو نہیں ٹھکرک لگ جاؤ گے۔ کیا ملے گا دو ڈھائی ہزار روپے۔ اس سے زیادہ تو ابا دکان کے ملازموں کو دے رہا ہے۔“

نواز ٹھیک کہہ رہا تھا اس سے زیادہ دکان کا ایک ملازم لے رہا تھا مگر میں جو نام نہاد مالک تھا اور ایک ایک پیسے کا حساب رکھتا تھا مجھے آج تک ابا نے سو روپے بھی ساتھ نہیں دیئے تھے۔ مجھے بس ضرورت بھر مل جاتا تھا اور میری ضرورت بھی محدود ہوتی تھی۔ آج بھی مجھے نواز کی اترن لگتی تھی۔ وہ جو کپڑے، جوتے اور چیزیں چھوڑ دیتا تھا وہ میرے نام ہو جاتی تھیں۔ خاص میرے لیے کوئی چیز کم ہی آتی تھی۔ میں نے نواز کی مخالفت پر رحم طلب نظروں سے اماں ابا کی طرف دیکھا۔ مگر اماں نے نواز کی تائید کی۔ ”ٹھیک تو کہہ رہا ہے کیا کرے گا پڑھ کر۔“

نواز نے روپیٹ کر میٹرک میں سی گریڈ لیا تھا اور وہ بھی نقل کر کے میں نے اپنی محنت سے پڑھا تھا اور اے گریڈ لیا تھا۔ میری سیونٹی نو پر شیٹج آئی تھی۔ اماں ابا میرے رزلٹ سے بے خبر نہیں تھے۔ مجھے بہت اعلیٰ درجے کے کالجوں میں تو نہیں مگر کسی اچھے کالج میں داخلہ مل سکتا تھا۔ دکان پر کام کرنے کی وجہ سے مجھے از خود حساب کتاب سے رغبت ہو گئی تھی اور میں آگے کامرس پڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے یہی چیز ابا کے سامنے رکھ دی۔ ”اگر میں نے آگے پڑھا تو دکان کے کام آئے گا۔“

”تو اب کون سی مشکل ہے۔“ نواز نے پھر ٹانگ اڑائی۔ ”ٹھیک سے تو حساب اب بھی کر لیتا ہے۔ اس کے لیے آگے پڑھنا ضروری نہیں ہے۔“

”پڑھنا تو اچھی بات ہے آدمی کے کام آتا ہے۔“ میں نے ہنسی لہجے میں کہا۔ ”میں اسی طرح دکان پر بھی کام کرتا رہوں گا۔“

اماں ابا کا دل ذرا نرم ہوا تو نواز نے پھر وار کیا۔ ”اچھا اگر پڑھنا ہے تو پرائیویٹ پڑھ لے۔ کالج جانے کا تو ابا کو زیادہ کام کرنا پڑے گا۔“

”میں میں بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔“ میں نے احتجاج کیا۔

”نواز ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ ابا نے فیصلہ کر دیا انہیں۔



خیال اچھا لگا کہ میں صبح سے شام تک دکان سنبھال سکتا تھا۔" اب مجھ سے اتنا کام نہیں ہوتا ہے۔"

اس وقت نواز ڈیکوریشن کی دکان ڈبورا تھا اور اس کے پاس جینوپن بھانہ تھا کہ وہ ابا کی دکان پر نہیں بیٹھ سکتا ہے۔ یوں میں کالج جانے کی بجائے پرائیویٹ پڑھنے پر مجبور ہو گیا۔ اب میں صبح دکان جاتا اور اب صرف دوپہر اور رات کے وقت دوبارہ دوڑھائی کھٹے کے لیے آ جاتے تھے جب رش بڑھ جاتا تھا۔ اب سیل کے ساتھ دکان کے لیے سامان کی خریداری بھی میں کرنے لگا تھا۔ ابا سیلز مین سے سامان لیتے تھے میں نے یہ کیا کہ کوشش کر کے ڈسٹری بیوٹر سے رابطہ کر لیا اور ہمارے علاقے میں جس جس کی گاڑیاں آتی تھیں میں ان سے براہ راست سامان لینے لگا۔ اس میں زیادہ بچت ہوتی تھی۔ بہت سی چیزیں جو غیر ملکیوں سے آتی تھیں ان کو میں خود مارکیٹ سے اٹھانے لگا۔ میری کوششوں سے دکان کے نفع میں اضافہ ہوا تھا مگر اس کا فائدہ بھی نواز کو ہوا تھا۔ ابا نہ صرف اس کی دکان کے بل بلکہ اس کی جیب بھی بھر رہے تھے۔ آئے دن وہ ابا سے رقم لینے آ جاتا اور کچھ نہ کچھ لے لے کر ہی جاتا تھا۔

چند مہینے میں وہ دکان لٹا کر گھر بیٹھ گیا تھا۔ اب وہ صرف کھارہا تھا۔ پہلے اماں ابا سے لیتا تھا تو اب جب اسے رقم کی ضرورت ہوتی براہ راست دکان آ کر گلے سے رقم نکال لیتا تھا۔ مگر بہت ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اس وقت آتا جب ابا نہیں ہوتے تھے۔ بعد میں جب میں ابا کو حساب دیتا اور بتاتا کہ نواز رقم لے گیا ہے تو ابا کا سوڈ خراب ہو جاتا تھا۔ مگر وہ نواز کو کچھ نہیں کہتے تھے۔ بلکہ ایک دو بار جب میں نے ابا کو بتایا کہ آج نواز اتنی رقم لے گیا ہے تو ابا کا تاثر کچھ ایسا تھا جیسے انہیں میری بات یقین نہیں آیا ہے۔ میں دل میں کڑھ کر رہ گیا تھا۔ ابا کے سامنے پیرا کر دار بھی تھا اور نواز کا بھی۔ ماں باپ سے زیادہ کون اپنی گولہ لگاتا ہے۔ اس کے باوجود ابا میرے ساتھ ایسا رویہ رکھتا ہے جیسے میں بڑا بچہ ہوں۔ دل برداشتہ ہو کر میں نے سوچا کہ دکان چھوڑ دوں۔ مگر میری ازلی فطرت آڑے آئی جو مجھے کوئی آزادانہ قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

میں نے انٹر کامرس میں پرائیویٹ داخلہ لیا تھا۔ پہلے تو میں اپنے طور پر پڑھتا رہا پھر امتحان سے تمنا مہینے پہلے میں نے نکلے کے ایک لڑکے جاوید سے ٹیوشن کی بات کی۔ وہ بہت اچھا طالب علم تھا اور اس نے دو سال پہلے ہی انٹر

کا امتحان پاس کیا تھا۔ مگر وہ فیس اچھی خاصی مانگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے سب کے سامنے بات کی تو نواز لازمی ٹانگ اڑائے گا اس لیے میں نے چپکے سے ابا سے بات کی کہ میں ٹیوشن پڑھنا چاہتا ہوں تو ابا نے آگے سے جواب دیا۔

"تو جو کماتا ہے اس سے فیس دے دے۔"

میں حیران ہوا۔ "میں کہاں کماتا ہوں ابا؟"

"دکان میں بیٹھتا ہے وہاں سے جو لیتا ہے۔"

مجھے ایک بار پھر شدید صدمے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ "ابا خدا گواہ ہے میں نے دکان کے گلے سے آج تک تمہیں بتائے بغیر ایک روپہا بھی نہیں نکالا ہے۔"

مگر ابا کو میری قسم کا بھی یقین نہیں آیا تھا۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تو کچھ لیتا ہی نہیں ہے۔"

میں نے ابا کو اس بات کا علی جواب دیا اور اگلے دن مارکیٹ میں حاجی صاحب کی اجناس کی ہول سیل کی دکان پر ملازمت کے لیے پہنچ گیا۔ مجھے علم تھا کہ انہیں حساب کتاب کے لیے ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ وہ مجھے جانتے تھے۔ جب میں نے ملازمت کا کہا تو وہ حیران ہوئے۔ "شاہنواز بیٹا تمہیں ملازمت کی کیا ضرورت ہے۔ تمہاری تو اپنی دکان ہے۔"

میں نے بھانہ کیا۔ "حاجی صاحب میں یہاں کام کر کے حساب کتاب سیکھنا چاہتا ہوں۔ ابا سے اجازت لے کر آیا ہوں۔"

حاجی صاحب کو میری بات کا یقین آیا یا نہیں آیا مگر انہوں نے مجھے ملازمت دے دی۔ میں نے جاتے ہوئے ابا سے کہہ دیا تھا کہ آج وہ دکان دیکھیں مجھے کچھ کام ہے۔ ابا سمجھے کہ مجھے دکان کے حوالے سے کام ہے۔ مگر جب شام کو میں نے انہیں بتایا کہ میں نے ملازمت کر لی ہے تو انہیں یقین نہیں آیا۔ "تو نے ملازمت کر لی ہے مجھے بتائے بغیر مجھ سے پوچھے بغیر۔"

"ابا جب تمہیں مجھ پر یقین ہی نہیں ہے تو دکان میں کام کرنے کا فائدہ۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔ "اب تم دیکھ لینا میں کتنی رقم نکالتا تھا۔ دکان کا حساب خود تمہیں بتا دے گا۔"

"مارکیٹ میں میری بے عزتی ہو گی۔" ابا کو غصہ آ گیا۔



میں ڈر گیا مگر ہمت کر کے کہا۔ ”ابا تم نے مجبور کیا ہے۔ تمہارے خیال میں میں گلے میں ہاتھ مارتا ہوں اور اپنی ٹیوشن کی فیس خود دے سکتا ہوں مگر ایسا نہیں ہے اور مجھے فیس دینی ہے اس کے لیے رقم چاہیے۔ اس لیے میں نے نوکری کر لی۔“

ابا کو اب بھی دکان کی فکر تھی۔ ”دکان کون دیکھے گا؟“ ”نواز ہے نا۔“ میں نے یاد دلایا۔ ”وہ گھر بیٹھا ہے۔“ ابا نے اب نواز کو دکان لے جانا شروع کر دیا اور وہ بلبلاتا اٹھا تھا۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے چار بیٹے حاجی صاحب کی دکان پر کام کیا۔ ٹیوشن پڑھ کر میں نے پیپر ڈیجے اور پھر حاجی صاحب کی ملازمت چھوڑ دی۔ کیونکہ ابا کو اب میری ضرورت تھی۔ نواز چند دن تو ٹھیک سے جاتا رہا پھر اس نے نائے شروع کر دیے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ دکان کا بول کر گیا اور وہاں پہنچا نہیں۔ دکان ملازموں پر چلتی رہی اور جب ابا گیا تو پتا چلا کہ نواز وہاں پہنچا ہی نہیں ہے۔ یا اگر جاتا تو کچھ دیر بعد ہی بہانے سے غائب ہو جاتا۔ آخر میں تو یہ ہوا کہ ابا خود جانے لگا تھا اور پہلے کی طرح صبح سے شام تک دکان دیکھتا تھا۔ ایک تو عمر کا تقاضہ اور پھر ابا کو عادت بھی نہیں رہی تھی۔ جب میں دکان دیکھتا تو ابا دو بار میں کل چار پانچ گھنٹے آتا تھا اور اب ابا کو پھر سے بارہ سے چودہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ اس کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔ میں دیکھتا تو مجھے رحم آتا مگر ابا نے مجھ سے ایک بار بھی نہیں کہا کہ میں واپس آ جاؤں اور میں خود سے آ جاتا تو مجھے پھر فیس کا مسئلہ ہو جاتا۔ اس لیے دل پر جبر کر کے میں حاجی صاحب کے پاس کام کرتا رہا۔ پیپر کے دنوں میں کام چھوڑ دیا اور جس دن آخری پیپر دے کر آیا۔ سیدھا دکان پہنچ گیا۔ ابا نے طنز یہ کہہ کر میں کو چھوڑا۔ ”آج باپ کا خیال آ گیا۔“

”جی ابا۔“ میں نے صرف اتنا ہی کہا اور پھر سے اسی تنخواہ پر کام شروع کر دیا جس پر آج تک کر رہا تھا۔ ابا کو پھر بھی خیال نہیں آیا تھا۔ ہاں اتنا ہوا کہ جب سیکنڈ ہینڈ کے پیپر کا وقت آیا تو ابا نے خود سے مجھے ٹیوشن کا کہہ دیا اور دکان کے وقت میں بھی کمی کر دی تھی۔ نواز ان دنوں ایک ڈبو کلب میں کام کر رہا تھا۔ اسے خود بھی ڈبو کا شوق تھا۔ مگر وہاں سے جو مٹا تھا اس کا ایک روپيا بھی وہ گھر میں نہیں دیتا تھا بلکہ الٹا اب تک ابا اماں سے پیسے لے جاتا تھا۔ مجھے اس سے زیادہ اماں ابا پر غصہ آتا تھا جواب تک اس کے ہاتھوں

بے وقوف بن رہے تھے۔ اسے ایک لفظ نہیں کہتے تھے بلکہ اس کی غلطیوں اور مکاریوں کی پردہ پوشی کرتے تھے۔ دیکھا جائے تو اسے خراب کرنے میں ان دونوں کا ہاتھ تھا۔ نواز کی محبت میں وہ اسے ڈبو رہے تھے۔

انہی دنوں اس نے نیا شوشہ چھوڑا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ مگر یہ پہلا موقع تھا کہ ابا اس کی بات ماننے کو تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ ”تو کوئی ٹھیک سے کام کر سے تو تیری شادی بھی کریں۔“ ”ابا کرتور ہا ہوں۔“

”اس سے تجھے کیا ملتا ہے۔ دو ہزار روپے اس میں تو تیرا اپنا خرچ پورا نہیں ہوتا ہے، بیوی کا کہاں سے پورا کرے گا؟“

”عورت اپنے نصیب کا خود لاتی ہے۔“ نواز نے ڈھٹائی سے کہا۔

ابا کے برعکس اماں نے سنا تو نہال ہو گئی اور ابا کے سر ہونٹ کر نواز کی شادی کر دی جائے۔ دوطرف سے دباؤ پڑا تو ابا مان گئے اور اماں نے لڑکی تلاش کرنی شروع کر دی۔ نواز جہاں دوسرے معاملات میں خوش نصیب تھا۔ وہیں قدرت نے اسے خوش روئی سے بھی نوازا تھا۔ سرخ و سفید رنگت اور مناسب جسامت کے ساتھ خوب رو نقوش تھے۔ اسے خود لڑکیوں سے زیادہ دلی چسپی نہیں تھی درنہ اس میں دل چسپی لینے والیوں کی کمی نہیں تھی۔ اس کے مقابلے میں میری رنگت دلی ہوئی تھی اور مناسب نقوش تھے۔ پھر وہ خود کو کچا سنوار کر بھی رکھتا تھا۔ سینے میں دو بار کسی اتھے سیلون میں جاتا تھا جہاں ہیکر کٹ سے لے کر مردانہ فیشنل اور دوسرے کام بھی ہوتے تھے۔ میں نے سادہ کرپوٹ ہیکر اسٹائل رکھا ہوا تھا اور فیشنل جیسی چیز کا تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ جب شیو کا آغاز ہوا تو میں ہلکی شیور کھینے لگا تھا۔

بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اپنی سرگرمیاں محلے اور علاقے سے باہر رکھی تھیں۔ محلے میں اس نے اپنا تاثر ایک شریف لڑکے کا سا رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی جب اماں نے کوشش شروع کی تو اس کے لیے کئی اچھے رشتے آ گئے۔ میں نے بتایا کہ محلے میں ہمارا گھر انا کھاتا پیتا شمار ہوتا تھا۔ ہمارا کارز کا بڑا مکان تھا اور ابا کے چھوڑے گھر کے اوپر والی منزل بنوالی تھی اور اسے کرائے پر دیتا تھا۔ ابا کا ارادہ تھا کہ نواز کی شادی کے بعد اسے اوپر والا حصہ دے دیں گے۔ اگرچہ اماں اسے



ساتھ رکھنے کے حق میں تھیں۔ نیچے تین بیڑے روڑھے جو ہمارے لیے کافی تھے مگر ابا کا کہنا تھا کہ شادی کے بعد بیڑوں کو الگ کر دینا چاہیے اس سے پہلے کہ وہ خود الگ ہو جائیں۔ اماں کو گھر سجانے کا شوق تھا اس لیے ہمارے ہاں اچھا فرنیچر اور دوسرا سامان بہترین قسم کا تھا۔ کھانا پینا بھی اچھا تھا اس لیے جب اماں نے رشتوں کی تلاش شروع کی تو محلے میں ہی کئی گھر رشتہ دینے کو تیار ہو گئے۔

ان دنوں میرے بی کا کام پارٹ دن کے پیپر ز ہونے والے تھے۔ میں نے اس بار بھی ٹیوشن کے لیے جاوید سے بات کی تھی۔ ایک تو وہ بہت اچھا پڑھاتا تھا دوسرے وہ یوں تیاری کراتا کہ جو چیز امتحان میں آتی ہوتی تھی وہ مجھے اچھی طرح سکھا پڑھا دیتا۔ میں پڑھنے کے لیے اسی کے گھر جاتا تھا۔ جاوید کی ایک بہن سیما تھی۔ وہ جاوید سے ایک سال بڑی تھی۔ جاوید میرا ہم عمر تھا اس لیے وہ مجھ سے ایک سال بڑی تھی۔ مگر شکل صورت اور اپنے چہرے جسم کی وجہ سے اٹھارہ سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ وہ گوری چنی اور خوش شکل لڑکی تھی۔ خاص طور سے اس کی ہلکی براؤن آنکھیں دیکھنے والی تھیں۔ صورت اور تاثرات سے تیز مزاج لگتی تھی۔ مگر مجھے اس کی یہ بات بھی اچھی لگتی تھی۔ گھر میں وہ کئی بار میرے سامنے آئی اور ہر بار اسے دیکھنا مجھے اچھا لگا تھا۔ مگر میں نے یہ بات ظاہر ہونے نہیں دی کہ اسے دیکھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ کبھی کبھی وہ میرے اور جاوید کے لیے چائے بنا لاتی تھی۔ جب گھر میں نواز کی شادی کی بات چل رہی تھی تب مجھے خیال آیا کہ اس کے بعد میری باری ہوگی اور اگر اماں نے مجھ سے پوچھا تو میں سیما کا نام لوں گا۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں تھا کہ مجھ سے پوچھا جاتا لیکن اماں نے کیونکہ نواز سے پوچھا تھا اس لیے مجھے اُمید تھی کہ مجھ سے اس کا نام جائے گا۔ سیما مجھ سے ایک ڈیڑھ سال بڑی تھی مگر یہ ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔

مگر چند دن بعد جب اماں نے سرور سلجھ میں ابا کو بتایا کہ انہوں نے نواز کے لیے ہا ہا جی کی بیٹی سیما کو چن لیا ہے تو مجھ پر بجلی سی گری تھی۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اماں نواز کے لیے سیما کا انتخاب بھی کر سکتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سیما کا گھرانا بہت پڑھا لکھا تھا۔ اس کے والد جنید اکل سول انجینئر تھے اور انہوں نے اپنے سارے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ سیما بی اے کر رہی تھی اور جاوید نے بی بی اے میں داخلہ لیا تھا۔ ان کا ایک بڑا

بھائی انگلینڈ میں پڑھ رہا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ نواز اور سیما کا کوئی جوڑ ہو سکتا ہے۔ وہ صرف میٹرک پاس تھا۔ مگر اماں کا اطمینان بتا رہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی یقین دہانی حاصل کر چکی ہیں۔ دو دن بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ جب اماں ابا بات ڈالنے گئے اور واپسی میں خوش خوش آئے تھے کیونکہ سیما کے ماں باپ نے انہیں تقریباً ہاں کر دی تھی۔

میں دنگ تھا کہ انہوں نے کچھ نہیں دیکھا۔ نواز کچھ نہیں کرتا تھا۔ میٹرک پاس تھا اور وہ بھی نفل کر کے۔ ڈبو کی دکان پر معمولی سی جاب کر رہا تھا۔ ٹھیک ہے ہمارا گھر اچھا تھا اور ابا کا اپنا جزل اسٹور تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ صرف یہی چیزیں دیکھ کر لڑکی دے دی جائے۔ لیکن سیما کے ماں باپ نے یہی کیا تھا۔ پھر یہ جان کر مجھے مزید صدمہ ہوا کہ سیما بھی خوش تھی۔ شاید اس لیے کہ نواز خوب صورت تھا۔ کوئی بھی لڑکی اسے ناپسند نہیں کر سکتی تھی۔ شاید سیما نے اس میں بس یہی دیکھا تھا۔ اس کی خوشی کا اندازہ مجھے یوں بھی ہوا کہ جب میں جاوید سے پڑھنے گیا تو وہ خاص اہتمام سے تیار ہوئی اور اس نے میرے لیے بھی اہتمام کیا تھا۔ کیونکہ اب میں اس کا ہونے والا دیور تھا۔ ایک موقع پر جاوید اٹھ کر کہیں گیا تو وہ جلدی سے آئی اور مجھ سے نواز کے بارے میں پوچھنے لگی کہ اسے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے۔ سچی بات ہے میں نے کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا کہ نواز کو کیا پسند ہے۔ اس لیے میں نے چند لمبے سیدھے جواب دے کر جان چھڑائی۔ میرا دل اتنا خراب ہوا تھا کہ میں نے ٹیوشن بھی چھوڑ دی۔ اگرچہ کچھ تیاری باقی تھی مگر میرا دل نہیں چاہا کہ اب میں سیما کے گھر جاؤں۔

اماں ابا اور ان کے ساتھ سیما کے گھر والوں کو بھی اس شادی پر جلدی تھی۔ اس لیے جھٹ رشتہ اور بٹ شادی ٹھہر گئی اور چند مہینے بعد سیما رخصت ہو کر ہمارے گھر آ گئی۔ ابا نے اپنے کپے کے مطابق پہلے ہی مکان کا اوپری حصہ نواز کے لیے خالی کر لیا تھا اور اسے ری نیو بھی کیا گیا تھا۔ سیما کے والد نے بھی کھاتے پیتے تھے اس لیے انہوں نے ڈیڑھ دوں چیز ہا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز تھی اس لیے سیما کو نیچے کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ ادا والا لگ رہیں۔ شادی کے دوسرے دن اس نے نیچے آنا چھوڑ دیا تھا اور اگر آتی بھی تو بس ہوا کے جھوکے کی طرح۔ یعنی کھیل جاتے ہوئے یا کھیل سے



آتے ہوئے۔ اماں اپا اس کی روش پر حیران تھے اور انہوں نے ایک دو بار نواز سے کہا بھی تو اس نے آگے سے ترش جواب دیا۔

”کیا اپنے لیے شادی کر کے لائے ہو جو تمہارے گھنٹوں سے لگی بیٹھی رہے؟“

”جب تو نہیں ہوتا تب تو نیچے آ سکتی ہے۔“

”کیا تم نے اوپر نوکر لگا کر دیئے ہیں۔“ نواز نے

مزید بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ ”بے چاری اپنے گھر میں پانی

بھی نہیں ہنتی تھی اور یہاں اسے سارا کام کرنا پڑتا ہے۔“

ابا نے اماں سے کہا۔ ”اب سمجھ میں آیا کہ اسے الگ

کیوں کیا تھا؟“

مگر ابا نے اسے الگ کہاں کیا تھا۔ اب اس کے

ساتھ اس کی بیوی کا بوجھ بھی ابا پر آ گیا تھا۔ گھر کا سارا راشن

اور سامان اسٹور سے جاتا تھا۔ جب انہیں ضرورت ہوتی

نواز آتا اور یوں اٹھا کر لے جاتا جیسے سامان ہمیں فری میں

ملا ہو۔ ابا اسے ایک لفظ نہیں کہتے تھے اور دوسری طرف

میرے ساتھ وہی رویہ تھا۔ مجھے مینے میں ڈھائی تین ہزار مل

جاتے تھے۔ جب کہ ملازمن اب پانچ ہزار لے رہے

تھے۔ دس بارہ ہزار نواز لے جاتا تھا۔ صبح سے رات تک

دکان پر میں ہوتا اور وہ آکر جھانکتا بھی نہیں تھا۔ اس کا اور ابا

کا رویہ دیکھ کر میں سوائے جلنے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا

تھا۔ البتہ میں نے سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی میرا بی کام مکمل ہوگا

میں نوکری کی تلاش شروع کر دوں گا۔ مارکیٹ میں کوئی

مسئلہ نہیں تھا۔ حاجی صاحب ہی مجھے رکھ لیتے۔ مگر اب

میں کوئی باقاعدہ نوکری کرنا چاہتا تھا۔ مگر جیسا میں نے سوچا

تھا ویسا ہو نہیں سکا تھا۔

میں فائل کی تیاری کر رہا تھا کہ ابا کی طبیعت خراب

ہوئی۔ بخار ہوا اور انہوں نے شروع میں توجہ نہیں دی۔ نتیجہ

یہ نکلا کہ جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو انہیں اسپتال لے

گئے وہاں پتا چلا کہ ڈسٹنکی بخار ہے اور بڑ چکا ہے۔ ابا دو دن

اسپتال میں پھر دنیا سے گزر گئے۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ

ہم سب ششدر رہ گئے تھے۔ ہم سے مراد میں اور اماں

ہیں۔ نواز کا موقع پرست ذہن اس موقع پر بھی کام کر رہا

تھا۔ اس نے خاموشی سے مکان کی فائل ابا کی الماری سے

نکال لی۔ صرف مکان کی فائل ہی نہیں بلکہ ابا کی چیک بک

اور الماری میں موجود نقدی بھی پار کر لی جب کہ ابا کی میت

گھر میں پڑی تھی۔ پھر اس نے دکان کا گلہ صاف کرایا کہ

ابا کی آخری رسومات ادا کرنی ہیں۔ ابا میرے لیے کیسے ہی

سبکی، تھے تو باپ اس لیے میرا دکھ کم نہیں ہوا تھا۔ سوم والے

دن مجھے خیال آیا کہ آج میرا پہلا پیر تھا۔ میرا دل ٹکس چاہا

کہ میں پیر دوں اور شاید میں دے بھی نہیں سکتا تھا اس لیے

میں نے اس سال پیر نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ اماں بالکل کم صم

ہو گئی تھیں۔ میں ان کی دل جوئی کرتا رہتا۔ ان کا غم ہلکا

کرنے کی کوشش کرتا۔ میں نے سوم کے بعد دکان کھولی تب

مجھے پتا چلا کہ وہاں سے خاصا سامان بھی کم ہے۔ اجناس کے

علاوہ بھی خاصی چیزیں غائب تھیں۔ میں نے نواز سے پوچھا

کیونکہ چابیاں اسی کے پاس تھیں تو اس نے ڈھٹائی سے

کہا۔ ”کیا ابا کا سوم نہیں کرنا تھا۔“

”تو اپنے پاس سے خرچ کرتے دکان سے کیوں

لیا۔“

”اپنے پاس ہے ہی کیا جو خرچ کرتا۔“ اس نے کہا۔

”ابا کے سوم میں صابن اور ڈرجنٹ کا کیا کام؟“

میں نے پوچھا مگر مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اس

کی بجائے نواز مجھ پر غرائے لگا تھا۔ ہمارے پاس بھی کچھ

نہیں تھا میں نے اماں سے نقدی کا پوچھا تو اماں نے بس اتنا

کہا۔

”دو دن پہلے تیرے ابا نے الماری میں پچیس ہزار

روپے رکھے تھے۔“

مگر الماری سے ایک روپہ بھی نہیں نکلا تھا۔ میں سمجھ

گیا کہ یہ نواز کا کام ہے۔ اسے کہنا بیکار تھا وہ الٹا مجھ پر الزام

لگا دیتا۔ دکان میں بھی کمیشن نہیں تھا اور کچھ پارٹیوں کو رقم دینا

تھی۔ اس لیے مجھے خیال آیا کہ ابا اس مقصد کے لیے چیک

سائن کر کے رکھتے تھے۔ میں نے اماں سے چیک بک کا

پوچھا۔ تب پتا چلا کہ الماری میں چیک بک بھی نہیں تھی۔

مجبوراً مجھے نواز سے پوچھنا پڑا اور وہ پھر ڈھٹائی سے مگر

مگیا۔ ”مجھے کیا معلوم..... ہو سکتا ہے میت میں آنے والے

کسی فرد نے ہاتھ دکھا دیا ہو۔“

الماری کی تلاشی کے دوران میں مجھے مکان کی فائل

کی گم شدگی کا بھی پتا چل گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”لیکن گھر

میں آنے والے کو مکان کی فائل سے تو دل چسپی نہیں ہو سکتی

تھی۔“

جواب دیا۔ ”ابا نے میرے پاس رکھوائی تھی۔“

”کچھ پارٹیوں کو ادا کرنی ہے، اب بینک جانا ہو



غالباً نواز بھی یہی چاہتا تھا۔ مگر اس نے واضح کر دیا کہ اسے ہر مہینے پچیس ہزار چاہئیں۔ ورنہ وہ دکان بچا دے گا۔ پچیس ہزار خاصی بڑی رقم تھی کیونکہ دکان مہینے میں پچاس ہزار سے زیادہ نہیں کماتی تھی۔ دکان کرائے کی تھی اور مالک ہر سال باقاعدہ کرایہ بڑھاتا تھا۔ بجلی کے ریٹ بھی خاصے بڑھ گئے تھے۔ سب کٹ کٹ کر مشکل سے مہینے کا پچیس ہزار بچتا تھا۔ میں نے نواز سے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں تمہیں آمدنی میں سے نصف دوں گا مگر اب تم دکان سے کچھ نہیں لو گے۔“

اس وقت تو نواز خاموش رہا مگر اب وہ یہ کرتا تھا کہ جب میں اسے پچیس ہزار دے دیتا تو وہ آنے بھانوں سے دکان سے سامان لے جاتا۔ ادائیگی کا کپتا مگر اس نے بھی ایک روپیہ بھی نہیں دیا اور جب مہینے کی رقم لینے کا وقت آتا تو آنکھیں ماتھے پر رکھ کر آ جاتا۔ میں بد مزگی کی وجہ سے خاموش رہتا تھا۔ وہ اس چیز کا فائدہ اٹھاتا تھا۔ میں صبح سے رات تک دکان پر ہوتا تھا۔ اماں بے چاری گھر پر اکیلی ہوتی مگر سہما یا نواز کو تو تفتی نہیں ہوتی تھی کہ کچھ دیر ان کے پاس آ کر بیٹھ جائیں۔ ابا کا صدمہ، اکیلا پن اور پھر دل کی بیماری اماں کو اندر ہی اندر رکھا گیا تھا۔ اچانک انہیں ہارٹ ایکٹ ہوا اور وہ نیچے اکیلی تھیں۔ جب میں رات کے وقت گھر آیا تو اماں دنیا سے گزر چکی تھی۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا۔ اماں کا مردہ جسم اسپتال بھی لے گیا مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا ہاں یہ معلوم ہوا کہ اگر اماں کو بروقت طبی امداد مل جاتی تو وہ بچ سکتی تھیں مگر ان کا وقت آ گیا تھا میں کسی کو کیا کہتا۔ بس رو دھو کر رہ گیا۔

اماں کے بعد کچھ عرصے تو نواز اور سہما مجھ پر مہربان رہے۔ میں بھی خوش فہمی کا شکار ہو گیا کہ انہیں میرا خیال آ گیا ہے۔ مگر یہ دھوکا تھا اور ان کا مقصد مکان کا ٹیلا بورٹن خالی کرانا تھا۔ پہلے انہوں نے اصرار کر کے مجھے اوپر منتقل کرایا کہ نیچے میں اکیلا رہتا ہوں۔ حالانکہ میں صبح نو بجے جاتا اور رات گیارہ بجے واپس آتا تھا۔ تینوں وقت کا کھانا میں باہر کھاتا تھا اور رات کو جب بستر پر لیٹتا تو منٹ میں سو جاتا تھا مجھے تو خیالی محسوس کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ البتہ نواز اور سہما نے میری تنہائی محسوس کر لی تھی۔ جیسے نیچے تینا بینڈ رومز تھے اسی طرح اسی تینا بینڈ رومز تھے۔ جب میں اوپر آ گیا تو نواز نے اسے منہ منہ سے پرکھل شروع کیا۔ اس نے نیچے کھڑکرائے کے بہانے ظار پرانا سامان فروخت کر

بینک والے مجھے جانتے تھے کیونکہ اکثر میں رقم جمع کرائے بھی جاتا تھا۔ میں منیجر سے ملا اور اسے ابا کے انتقال کا بتا کر ان کے اکاؤنٹ کے بارے میں پوچھا۔ منیجر نے اکاؤنٹ سے ابا کے اکاؤنٹ کا معلوم کر لیا تو اس نے یہ حیرت انگیز اکتشاف کیا کہ اکاؤنٹ میں موجود رقم بپا پونے دو لاکھ روپے دو چیکوں کی مدد سے ایک دن کے وقفے سے نکلوا لیے گئے ہیں۔ میں دنگ رہ گیا۔ میں نے منیجر کو بتایا کہ ابا کی چیک بک میت والے گھر سے غائب ہو گئی تھی۔ منیجر نے دونوں چیک منگوا لیے۔ ان پر سو فیصد ابا کے سائن تھے۔ یہ ان ہی چیکوں میں سے تھے جو ابا سائن کر کے رکھتے تھے کہ کوئی ناگہانی ہو جائے تو ہم رقم نکلوا سکیں۔ مگر یہ کام کوئی اور کر گیا تھا اور مجھے اس کے بارے میں یقین تھا کہ وہ نواز ہی تھا۔ ابھی ابا کے انتقال کو دس دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس نے اپنی پرانی بائیک بچ کر نئی ڈیڑھ میٹر بائیک لے لی تھی۔ دونوں میاں بیوی بن ضمن کر شام کو نکل جاتے تھے۔ ان کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ اس گھر میں کوئی سوگ ہوا ہے۔ میں نے اماں کو بتایا مگر وہ حسب معمول چپ رہیں۔ وہ پہلے ہی نواز کو کچھ نہیں کہتی تھیں۔ میں ابا کے بعد ان صدموں سے دوچار تھا مگر پھر بھی دکان سنبھالنے میں لگ گیا۔ کیونکہ دکان چلائی تھی اور پیٹ بھی بھرنا تھا۔ ایک مہینے بعد میں نے نواز سے کہا۔ ”تم دکان پر کیوں نہیں آتے؟“

”یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”پہلے آتا تھے۔ اب صرف میں ہوں دکان چلانا اکیلے آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔“

شاید اس نے بھی محسوس کر لیا کہ کسی اکیلے دکان نہیں چلا سکوں گا دوسرے اسے میں ابا کی طرح رقم نہیں دوں گا۔ بلکہ دکان کی آمدنی آدمی آدمی ہوگی۔ یہ سوچ کر وہ دکان چلا اور مجھے پہلے مہینے ہی پتا چل گیا کہ اس کے آنے سے دکان چل نہیں سکتی تھی صرف لٹ سکتی تھی۔ سامان تو جاتا ہی تھا اب اس نے گھلے پر بھی یوں ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا جیسے ڈاکو بینک لوٹتے ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب مجھے بس اتنی رقم ملی کہ میں اماں کے ہاتھ پر گھر چلانے جتنی رقم رکھ سکا تھا۔ میں نے دوسرے مہینے ہاتھ جوڑ کر نواز سے کہا۔ ”میں دکان چلاؤں گا تم آرام کیا کرو۔ اگر دکان اسی طرح چلی تو ایک مہینے بعد ہم دونوں ہی گھر بیٹھے ہوں گے۔“



دیا اور کچھ سامان اوپر لے آیا۔ پھر اس نے خاموشی سے بیٹھے کا پورشن کرائے پر دے دیا۔ تب مجھے بتا چلا کہ میری تنہائی دور کرنے کے پیچھے اصل مقصد کیا تھا؟

جیسے ہی ان کا مقصد پورا ہوا۔ ان کا رویہ بدل گیا۔ اب خیال کی جگہ بدولی آگئی۔ مجھے دیکھتے ہی سیما کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں۔ کھانا پانی اس نے پہلے بھی نہیں پوچھا تھا۔ مجھے اپنے لیے چائے بھی خود بنانی پڑتی تھی۔ مگر اب میں چائے بھی بناتا تو وہ براہ منافی تھی۔ اس کی وجہ سے میں نے بچن میں جانا چھوڑ دیا۔ رات کو آتا اور اپنے کمرے میں گھس کر سو جاتا اور وہاں سے بھر مچ لکھتا اور سیدھا میڑھیاں اتر کر باہر چلا جاتا تھا۔ صرف مجھے کے دن دو پہر تک گھر میں رہنا تھا کیونکہ مارکیٹ اور میری دکان بھی مجھے کے بعد کھلتی تھی۔ مگر جسے کے دن بھی میں کمرے میں رہتا تھا۔ نواز اور سیما کا رویہ دیکھتے ہوئے میں نے بلاوجہ کمرے سے لکھنا ترک کر دیا تھا۔ اس لیے مجھے بتائیں چلا کہ میرے خلاف کیا کچھڑی پک رہی ہے۔ ایک دن نواز اچانک دکان پر آیا اور اس نے مجھ سے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا بندوبست کر لو۔“

میں چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

جب نواز نے مکان کا کمر چلا حصہ کرائے پر دیا تو اس نے نہ تو مجھ سے پوچھا اور نہ ہی مجھے کرائے میں سے کچھ دیا۔ وہ سب اس کی جیب میں چاتا تھا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ ہم بٹوارہ کر لیں۔“

”وہ کیسے؟“

”میں مکان لے لیتا ہوں اور تم دکان لے لو۔“

مکان کی مالیت اس وقت بھی کوئی تیس لاکھ روپے تھی جب کہ دکان بے شک میپے کے ساتھ ستر ہزار دے رہی تھی مگر اس کی مالیت گزول سمیت دس لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے اس سے یہ بات کی تو وہ بولا۔ ”مکان تو ابابا نے پہلے ہی مجھے دینے کی بات کی تھی اس لیے وہ میرا ہے۔“

شکر کرو کہ میں دکان میں اپنا حصہ نہیں مانگ رہا ہے۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”میں سوچ کر بتاؤں گا اور تم نے بندوبست کی بات کیوں کی؟“

”دیکھو تم جوان آدمی ہو۔ سیما کو تمہارے ساتھ رہنے ہوئے ابھن ہوئی ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اب تم اپنی رہائش کا خود بندوبست کر لو۔“

نئی بات ہے کہ مجھے خود ان لوگوں کے ساتھ رہنے ہوئے ابھن ہوئی تھی۔ مگر سیما کی بات سن کر مجھے غصہ آ گیا۔ ”میں نے بھی غیر ضروری اس کے سامنے آنے کی بھی کوشش نہیں کی پھر اسے کیا مسئلہ ہے۔ میں اپنے کمرے تک محدود رہتا ہوں۔“

”میں یہ سب نہیں جانتا۔“ نواز نے رکھائی سے کہا۔ ”بس تم جلد از جلد اپنا کتھن اور بندوبست کر لو۔“

میں نے بیٹھ کر سکون سے سوچا تو مجھے مناسب لگا کہ میں دکان لے لوں اور مکان نواز کے حوالے کر دوں۔ مکان لے کر میں کیا کرتا جب کہ دکان مجھے ساتھ ستر ہزار میپے کے دے رہی تھی میں چند سال میں اپنا گھر بنالیتا اور مجھے روزگار کے چکر میں بھٹکنا بھی نہیں پڑتا۔ اس لیے میں نے نواز سے کہا۔ ”مجھے منظور ہے لیکن ساری کارروائی پکی ہوگی۔ ایسا نہ ہو کہ تم بعد میں دکان پر بھی دعوئی لے کر آ جاؤ۔“

نواز کو افسوس نہیں تھی کہ میں اتنی آسانی سے مان جاؤں گا وہ بھی سمجھتا تھا کہ مکان دکان سے تین گنا زیادہ مالیت کا ہے اس لیے اس کی خوشی دیکھنے والی تھی اور وہ فوراً مان گیا۔ ہمارا مکان لیز تھا اور اسی طرح ابانے جنرل اسٹور کے کاغذات بھی بنوائے تھے اور اس کی قانونی حیثیت تھی۔ نواز نے نہایت پھرتی دکھائی۔ اسے خوف تھا کہ کہیں میں انکار نہ کر دوں اس صورت میں اسے مکان میں سے بھی مجھے نصف حصہ دینا ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر دکان کا بنوارہ ہوا تو میں ہی اسے لوں گا کیونکہ میں ہی اسے چلا سکتا ہوں۔ نواز میں اتنی اہلیت اور ہمت نہیں تھی کہ جنرل اسٹور چلا سکتا۔ مکان پک جاتا تو اسے اس قیمت میں اتنا بڑا مکان اور کہاں ملتا اور سب سے بڑھ کر اس کا بنوارہ کیسے ہوتا۔ اس نے دوران میں ایک وکیل سے کاغذات بنوائے اور ابتدائی کارروائی شروع کی۔ میں نے بھی ایک وکیل سے بات کی اور اس کی مدد سے کاغذات چیک کیے۔ مطمئن ہونے کے بعد میں نے مکان سے اور نواز نے دکان اور اس کے کاروبار سے دست برداری کے کاغذات پر سائن کر دیے۔

کارروائی ایک میپے میں مکمل ہوئی تھی۔ مگر اصل بنوارہ اس سے پہلے ہی ہو گیا۔ یعنی میں گھر سے نکل گیا تھا اور مکان کے نفع سے نواز کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ میں نے مارکیٹ کے پاس ہی ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور وہاں رہنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ نواز نے غفلت میں یہ فیصلہ کر لیا تھا مگر اب وہ چھٹانے کا کیونکہ اسے کمانا نہیں صرف لٹانا آتا

تھا۔ اسے بیوی بھی ایسی ملی تھی۔ صرف مکان کے کرائے سے ان میاں بیوی کی عیاشی پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ زندگی کے بارے میں ان کے رویے کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ سیمادو ہار اُمید سے ہوئی تھی مگر انہوں نے بات ختم کرادی تاکہ بچے کے جھنجھٹ سے بچ کر زندگی کو پوری طرح انجوائے کر سکیں۔ اگرچہ انہوں نے مجھ سے چھپانے کی پوری کوشش کی تھی مگر ایک گھر میں رہتے ہوئے اس قسم کی باتیں کہاں چھپتی ہیں۔ مجھے افسوس ہوا تھا مگر میں نواز سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ ایک مہینے میں نواز اور سیمادو کے دماغ ٹھکانے آ گئے تھے۔ کہاں تو وہ مکان کے کرائے کے ساتھ مجھ سے بھی تین تیس ہزار لے رہے تھے اور کہاں اب ان کے پاس صرف کرائے کے بارہ ہزار آ رہے تھے۔ اس میں گزارہ کہاں ہو سکتا تھا۔ مکان کے لالچ میں انہوں نے اپنے پاؤں پر کھانسی ماری تھی اور مجھے بلاوجہ کی غلامی سے آزاد کر دیا تھا۔ جب سے ہوا تھا نہ تو میں نواز کے پاس گیا تھا اور نہ ہی وہ میرے پاس آیا تھا اس لیے جب اسے دکان پر دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ اسے ضرورت پہنچ لائی ہے ورنہ مجھ سے دل چھپی یا محبت اسے بھی نہیں تھی۔ اتفاق سے اس وقت گاؤں میں بھی نہیں تھا اور ملازموں کو میں نے سامان ترتیب سے رکھنے پر لگایا ہوا تھا۔ نواز نے کہا۔ ”تم سے بات کرتی ہے۔“

”وہ مجھے کچھ رقم ادھار چاہیے۔“

”جو تم واپس نہیں کرو گے۔“ میں نے طنز یہ انداز میں کہا۔

”شاہنواز یقین کرو.....“

”خدا کے لیے تم بچپن سے مجھے یہ سمجھتے اور بتاتے آئے ہو اب تو میری جان چھوڑ دو۔“ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا تو اس کے تیور بدل گئے۔

”اتنی آسانی سے نہیں، ٹھیک ہے دکان اب تمہاری ہے لیکن گیارہ سال سے تم دکان چلا رہے ہو۔ اس کا حساب دو۔“

”میں صرف ایک سال سے دکان چلا رہا ہوں۔ کہو تو اس کا حساب دوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے تمہیں ہی دینا پڑ جائے۔“

اس نے دوبارہ تیور بدلے اور عاجزی سے بولا۔

”عاجل نامہ سرگزشت“

”شاہنواز اس وقت میں بہت مشکل میں ہوں سیمادو کی طبیعت خراب ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاسکوں۔“

سیمادو نے اگرچہ بھی میری طرف توجہ نہیں دی۔ جب میں اسے پسند کرتا تھا تب بھی وہ مجھ سے بے نیاز رہی۔ پھر اس سے رشتے کی نوعیت ہی بدل گئی۔ اب وہ میرے بھائی کی بیوی تھی اس لیے میں نے اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ مگر نواز نے اس کی طبیعت خرابی کا بتایا تو میرے اندر بے اختیار خیال آیا اور میرا دل چاہا کہ نواز کو کچھ رقم دے دوں۔ مگر ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہا ہے۔ اس خیال کے باوجود میں خود کو روک نہیں سکا تھا اور میں نے اسے دو ہزار دیے۔ اس نے کہا۔ ”یہ تو کم ہے.....“

”تمہیں یہی مل رہا ہے اس پر خدا کا شکر کرو اور دوبارہ میرے پاس کچھ مانگنے مت آنا۔ وراثت میں تمہیں مجھ سے تین گنا زیادہ ملا ہے۔“

”اس مکان کو لے کر کھاؤں کیا؟“ اس نے تلخی سے کہا۔

”مجھے لگ رہا ہے تم جلد ایسا ہی کرو گے۔“

نواز چلا گیا مگر اس کے چالاک ذہن نے محسوس کر لیا کہ وہ سیمادو کا نام لے کر مجھ سے رقم بھیج سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی وہ ہر دوسرے ہفتے چکر لگاتا اور کسی نہ کسی بہانے مجھ سے رقم لے جاتا۔ بہانے میں سیمادو کی شامل ہوتی تھی۔ پھر مجھ میں مردت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے میں اسے رقم دے دیتا تھا۔ ورنہ اب مجھے اس کی صورت دیکھتے ہی پزاری ہوتی تھی۔ نواز نے کہیں جواب کر لی تھی۔ اس کے باوجود اس کے خرچے پورے نہیں ہوتے تھے۔ اس کا اثر گھر پر پڑا اور اب اس کے اور سیمادو کے درمیان آئے دن جھگڑے ہوتے تھے اس کا چنا مجھے یوں چلا کہ ایک دن جاوید میرے پاس آیا۔ اس نے کہا۔ ”شاہنواز یا تم سے بات کرتی ہے۔“

میں اس کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا میں ملازموں کے دکان دیکھنے کا کہہ کر اسے نزدیکی ہوٹل لے آیا۔ ”ہاں کہو۔“

”یارو! بھائی نے باجی کو بہت جھگ کیا ہوا ہے۔“

”تو میں اس مسئلے میں کیا کر سکتا ہوں؟“ میں نے سرد لہجہ میں کہا۔ ”میرا اب نواز اور اس کی بیوی سے نام نہاد



تعلق رہ گیا ہے۔“

”پھر بھی تم نواز بھائی کے بھائی ہو انہیں سمجھاؤ کہ معاملے کو اس حد تک خراب نہ کریں۔ سیما باجی دو دن سے گھر میں ہیں کیونکہ ان کے گھر تو فالتے ہو رہے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے لیکن تمہاری باجی نے مجھے اس گھر سے بے دخل کر دیا کیونکہ میرے رہنے سے اسے الجھن ہوتی تھی۔ دوسرے نواز مجھے والا آدمی نہیں ہے۔ اگر اس نے دنیا میں کسی سے محبت کی ہے تو وہ سیما ہے اب اسے ہی اس سے شکایت ہوگئی ہے تو نواز کو پھر کون سمجھا سکتا ہے؟“

جاوید بھی یہ بات سمجھتا تھا۔ وہ مجبوراً میرے پاس آیا تھا اور اس نے بالآخر اصل بات اگل دی۔ ”مجھے سیما باجی نے بھیجا ہے وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔“

”وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہے؟“

”تم اس کے دیور بھی ہو اگر وہ تم سے ملنا چاہتی ہے تو یہ کوئی غلط بات تو نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن میں رات دکان بند کرنے کے بعد ہی آسکوں گا۔“ میں نے کہا۔ ان دنوں لی کام فائل کے پھر پیپر ز ہو رہے تھے اور میں نے امتحانی فارم بھی جمع کر دیا تھا گھر میں پیپر ز نہیں دے رہا تھا کیونکہ میری تیاری ہی نہیں ہوئی تھی۔ صبح سے رات تک میں دکان میں لگا رہتا تھا تو پیپر کی تیاری کہاں سے کرتا؟ میں عام طور سے رات گیارہ بجے تک دکان بند کرتا تھا مگر اس رات میں نے دس بجے ہی دکان بند کر دی تھی۔ ویسے بھی دس بجے کے بعد فروخت بہت کم ہو جاتی تھی۔ میں سیما کے ماں باپ کے گھر پہنچا۔ وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ جاوید نے مجھے فدا رنگ روم میں بٹھایا مگر جب سیما آئی تو وہ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے ماں باپ بھی نہیں آئے تھے۔ سیما نے اٹھ کر دروازہ بند کیا تو میں کسی قدر حیران ہوا تھا۔

”تم نے دروازہ کیوں بند کیا ہے؟“

”میں چاہتی ہوں یہاں ہونے والی گفتگو تم سے دور بیان رہے۔“ اس نے کہا اور دوپٹا جو پہلے اچھی طرح لپکا ہوا تھا اب شانوں پر ڈال لیا۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ وہ باقاعدہ تیار ہوئی تھی اور اس نے ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا۔ شادی کے دو سال بعد بھی وہ تقریباً پہلے جیسی ہی تھی۔ پھر نواز نے اسے بھی ہمیشہ و آرام سے رکھا تھا۔ بچہ نہیں تھا۔ وہ دیکھنے میں لڑکی جیسی لگ رہی تھی۔ وہ بڑے صوفے پر میرے پاس ہی آ بیٹھی۔ سچی بات ہے میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی

ماہنامہ سرگزشت

اگرچہ میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”تم گھر کیوں چھوڑ کر آئی ہو؟“

اس نے گہری سانس لی۔ ”اسی پر تو بات کرنے کے لیے تمہیں بلایا ہے۔“

”تمہارا اور نواز کا جھگڑا ہوا ہے؟“

”بات اس سے بھی بڑھ گئی ہے۔“ وہ بے چینی سے بولی۔ وہ انگلیاں مردوز رہی تھیں۔ پھر اس نے رو ہانے لہجہ میں کہا۔ ”نواز نے مجھے طلاق دے دی ہے۔“

میں دنگ رہ گیا تھا پھر میں نے بہ مشکل کہا۔ ”طلاق دے دی ہے مگر کیوں؟“

”بس وہ پاگل ہو گیا تھا۔“ اب سیما آنسو بہانے لگی۔ ”اس کے منہ سے نکل گیا اور پھر وہ پچھتا یا۔“

”حالانکہ وہ پچھتانے والا شخص نہیں ہے۔“

”نہیں وہ بہت رویا تھا خودکشی کرنے جا رہا تھا میں نے بڑی مشکل سے روکا۔ اب میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی اس لیے یہاں آ گئی لیکن میں نے گھر والوں کو طلاق کا نہیں بتایا ہے بس یہی کہا ہے کہ میں نواز سے جھگڑا کر کے آئی ہوں۔“

مجھے اس کی بات پر بالکل یقین نہیں آیا کہ نواز جیسا شخص جذباتی ہو کر اپنی زندگی ختم کرنے کی کر سکتا ہے۔ مگر سیما کے آنسو اور سکایاں میرا دل پگھلا رہی تھیں۔ میں نے التجائی۔ ”پلیز رومست۔“

”نواز نے تو خودکشی نہیں کی لیکن میں ضرور کر لوں گی۔ میں یوں ذلت کی زندگی نہیں گزار سکتی۔“ وہ جذباتی ہو کر بولی۔ ”دنیا والوں کو تو کیا اگر میرے گھر والوں کو بھی چاہل جائے تو میں ایک لمحے کو اس دنیا میں نہ رہوں۔“

”تم ایسی کوئی حماقت نہیں کرو گی۔“ میں نے دلی کر کہا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ طلاق یافتہ کہلانے سے بہتر ہے میں اس دنیا میں نہ رہوں۔ میں نے اسی لیے تمہیں بلایا ہے کہ تم اس مسئلے کا کوئی حل نکالو۔“

”میں نکالوں۔“ میں نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ”تمہیں تو میرے ساتھ ایک گھر میں رہتے ہوئے الجھن ہوتی۔۔۔۔۔“

”خدا کے لیے میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔ ہم نے تمہارے ساتھ جو کیا خدا نے شاید اسی کی سزا دی

2015

# کیا آپ لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ عداوت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

**المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)**

(دبئی طبی یونانی دواخانہ)  
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

**0300-6526061**

**0301-6690383**

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

ہے۔“ اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔“ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔“

”پلیز ایسا مت کرو۔“ میں نے بے ساختہ اس کے ہاتھ حام لیے۔ ”تم میری بھالی ہو۔ اس لحاظ سے میرے لیے محترم ہو۔ تم فکر مت کرو میں کسی مفتی یا عالم سے پوچھتا ہوں کہ اس مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے۔“

”میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔“ اس نے کہا۔ میں سیرا کے گھر سے نکلا اور نواز کے پاس آیا۔ وہ گھر میں تھا اور صورت و چلیے سے اجڑا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا تم میری بر بادی کا تماشا دیکھنے آئے ہو؟“

”اگر میں تمہاری جیسی فطرت رکھتا تو ایسا ہی کرتا لیکن میں تمہاری فطرت سے محروم ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی سیرا کے پاس سے آ رہا ہوں اس نے کہا ہے اس مسئلے کا کوئی حل نکالوں۔“

نواز نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے میں آرام سے بیٹھا ہوں۔ ان چند دنوں میں کتنے ہی عالموں اور مفتیوں سے پوچھ چکا ہوں سب کا ایک ہی جواب ہے۔“

”کیا جواب ہے؟“

”میری کہ واحد حل طلاق ہے۔“

”یعنی سیرا عداوت پوری کرنے کے بعد کسی شخص سے شادی کرے اور اس کے ساتھ رہے پھر وہ اسے طلاق دے تو سیرا دوبارہ تم سے شادی کر سکتی ہے۔“

”بالکل لیکن ایسا شخص کہاں سے ملے گا جو خاموشی سے سیرا سے شادی کر لے اور ملے گا بھی تو یہ شادی چھپی نہیں رہے گی۔ کم سے کم سیرا کے گھر والے فوراً جان چائیں گے۔“

”تو ہے۔“

”لیکن ایک صورت ہو سکتی ہے۔“

”مجھے کیا کہ وہ کس صورت کی بات کر رہا ہے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں اس آزمائش سے نہیں گزر سکتا۔“

”شاہنواز اللہ کے لیے میرا گھر اجڑنے سے بچا لے۔“ نواز نے بھی میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”تو میرا بھائی ہے اس گھر میں آکر رہے گا تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ سب خاموشی سے ہو جائے گا۔“

”اگر میں تمہاری مدد پر راضی ہو جاؤں تب بھی طلاق



اس طرح نہیں ہوتا ہے جہاں تک میں نے جانا ہے ہمارے ہاں حلالہ کے نام پر جو ہوتا ہے وہ دین سے مذاق کے مترادف ہے کہ لوگ اللہ کے بتائے ایک راستے کو غلط طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ میں کسی غلط کام میں شامل نہیں ہو سکتا۔“

”جب میرے پاس خودکشی کے سوا کوئی اور راستہ نہیں رہ جاتا ہے۔“ نواز نے مایوسی سے کہا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ نواز خودکشی نہیں کر سکتا ہے مگر مجھے سیما کی فکر تھی۔ وہ عورت تھی اور اس صورت حال میں وہی سب سے زیادہ متاثر تھی۔ اس لیے میں نے نواز سے کہا۔

”جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے میں معلوم کرتا ہوں۔“

”لیکن میں نے جہاں جہاں سے معلوم کیا یہی بات سامنے آئی کہ حلالہ کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے اور حلالہ بھی شرعی طریقے سے ہونا چاہیے۔ اس طرح نہیں جیسا کہ آج کل رواج پا گیا ہے۔ یعنی عدت کے بعد مطلقہ کی شادی ہوئی اور شوہر سے ایک بار قربت کے بعد اسے پھر طلاق دے دی اور وہ دوبارہ عدت گزار کر اپنے پہلے شوہر کے نکاح میں آگئی۔ میں نے صورت حال نواز کے سامنے رکھ دی۔“ اس نے پوچھا۔ ”اب کیا ہو سکتا ہے؟“

”مگر میں اس طرح طلاق دوں گا تو نہ میرا ضمیر مطمئن ہوگا اور نہ ہی یہ ٹھیک ہوگا۔ اس کا گناہ ہم تینوں کے سر جائے گا۔“

”تم کیا کہتے ہو؟“

”مگر میں سیما سے شادی کرتا ہوں تب بھی میں فوری طلاق نہیں دوں گا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ مجھ کو بولا۔ ”تم سیما پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔“

”لاحول ولا....“ میں نے کہا۔ ”ایسا خیال بھی میرے ذہن میں نہیں آیا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کوئی بار میرے سر نہ رہ جائے۔ دوسرے میں تمہارے پاس نہیں آیا ہوں تم میرے پاس آئے ہو۔ اگر تمہیں منظور نہیں ہے تو تم آزاد ہو اپنی مرضی کا بندہ تلاش کر لو۔“

مگر اپنی مرضی کا بندہ انہیں تا قیامت نہیں مل سکتا تھا۔ اس لیے مجبوراً انہیں مجھ پر ہی راضی ہونا پڑا۔ طے یہ پایا کہ مکان کے سب سے اوپری حصے میں ایک الگ کمر تعمیر کیا جائے گا اور وہ بظاہر میرے لیے ہوگا مگر درحقیقت اس

میں نواز رہے گا اور میں سیما کے ساتھ بیچے رہوں گا۔ مگر جب تک وہ عدت میں ہوگی ہم دونوں ہی اوپر رہیں گے۔ طلاق کو ایک مہینہ گزر گیا تھا۔ مزید ایک مہینے بعد نواز نے اوپر کمرہ اور واش روم بنوا لیا اور ظاہر ہے یہاں میں نے ہی خرچ کیا تھا بلکہ اب میں پہلے کی طرح کھر کا سارا خرچ بھی اٹھا رہا تھا۔ سیما واپس آگئی تھی مگر اب وہ سب سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ دنیا والوں کو بس یہ معلوم تھا کہ بالآخر بھائی کے خون نے جوش مارا اور وہ بنوارے کے باوجود مجھے دوبارہ گھر میں لے آیا۔ سب نوازی کی تعریف کر رہے تھے اور میں دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا کیونکہ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ نواز کتنا اچھا تھا۔

سیما بیچے رہتی تھی۔ میں اور نواز صبح دکان پر چلے جاتے اور پھر شام کو آتے تو خاموشی سے اوپری کمرے میں چلے جاتے۔ سیما پورے فلور پر اکیلی رہتی تھی۔ ہاں کوئی باہر سے آجاتا تو نواز شوہر کی طرح بیچے چلا جاتا۔ یہ ڈراما کامیابی سے چلتا رہا۔ حتیٰ کہ سیما کی عدت ختم ہوگئی۔ نواز نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ نکاح گھر میں نہیں ہوگا۔ ان دنوں میں نے گاڑی لے لی تھی۔ ہم گاڑی میں ایک دور دراز کے نکاح خواں کے پاس پہنچے اور میں نے سیما کو طلاق یافتہ ظاہر کیا۔ نواز کا کپے کاغذ پر طلاق نامہ موجود تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے نکاح میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور سیما با آسانی میری بیوی بن گئی۔ ہم جس طرح گئے تھے اسی طرح واپس آگئے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب میں اور سیما میاں بیوی تھے اور نواز سیما کا جینے بن گیا تھا جیسے پہلے میں اس کا دیور تھا۔

پہلی شب ہم دونوں ہی شرمندہ سے اور ایک دوسرے سے نظریں چار رہے تھے مگر اس کے بعد حالات نارمل ہوتے چلے گئے۔ بلکہ چند دن بعد مجھے لگا کہ سیما نے مجھے شوہر کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ وہ اچھے انداز میں پیش آتی۔ خدمت گزاری بھی کرتی تھی۔ جب میں جوش قدی کرتا تو اس نے بھی انکار نہیں کیا۔ نواز اب مستقل اوپر رہتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ دکان جانا بھی چھوڑ دیا تھا اور ہر وقت کمرے میں پڑا رہتا تھا۔ اس کی شید بڑھ گئی تھی اور طے سے بے چارہ کی وجہ سے وہ جوگی لگنے لگا تھا۔ میرے دل میں پہلی بار خواہش جاگنی کہ کاش وہ یہاں سے چلا جائے۔ بس میں اور سیما ہوں۔ بیچے جیسے وقت گزر رہا تھا میرے اندر خوف بڑھ رہا تھا کہ مجھے بالآخر سیما کو طلاق دینا پڑے گی

اور اب میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے ایک مہینے بعد نواز نے مطالبہ کیا۔ ”اب سیمہ کو طلاق دے دو۔“

”تم یہ مطالبہ نہیں کر سکتے۔“ میں نے کہا۔ ”میں سیمہ کو کیوں طلاق دوں وہ میری بیوی ہے۔“

”دھوکے باز۔“ نواز نے واہنت پیے۔

”میں نے کوئی دھوکا نہیں کیا میں نے پہلے ہی بتا دیا

تھا کہ میں اپنی مرضی سے طلاق دوں گا اور ابھی میری مرضی نہیں ہے اس لیے میں طلاق نہیں دوں گا۔“

”تم سیمہ پر قبضہ ہمارا ہے ہو۔“

”وہ کوئی مکان یا مکان نہیں ہے جس پر میں قبضہ ہمارا ہے وہ جتنی جاگتی عورت ہے اور اس نے مجھے یہ طور شوہر قبول کیا ہے۔“

”وہ اب تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔“

”یہ بات وہی کہے تو میں کچھ سوچوں گا، تمہارے کہنے پر تو ہرگز طلاق نہیں دوں گا۔“

نواز تھلے فلور پر ہی تھا۔ اس نے سیمہ کو آواز دی تو وہ آگئی اور نواز نے اس سے پوچھا۔ ”تم شہناز سے طلاق چاہتی ہو؟“

”ہاں میں اس سے طلاق چاہتی ہوں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں حیران رہ گیا۔

”لیکن تم نے مجھ سے تو بھی نہیں کہا۔“

”تو اب کہہ دیا ہے۔“ وہ بولی۔

”لیکن میرا طلاق دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”تب میں طلع لے لوں گی۔“

”اس کے لیے تمہیں عدالت جانا ہوگا اور عدالت تمہیں تو سب کچھ جانے گا۔“

”کھل جائے اب میں مزید تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“ سیمہ نے یوں کہا کہ میں ششدر رہ گیا اور نواز مسکرا رہا تھا۔

”اگر تم میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہو تو اب مجھ سے کیا اداکاری کرتی آئی تمہیں؟“

”تم جو چاہے سمجھو۔“ سیمہ نے بے باکی سے کہا۔ ”اب تم میرے شوہر نہیں اور تم مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔“

مجھے غصہ آنے لگا۔ ”تم مجھے نہیں روک سکتی ہو۔“

”دیکھو مسئلہ غصے سے حل نہیں ہوگا۔“ نواز نے کہا۔ ”اگر بات کھلی تو صرف ہماری نہیں تمہاری بدنامی بھی

ہوگی۔ ہم یہ مکان بیچ کر یہاں سے چلے جائیں گے مگر تم مکان بیچ کر نہیں جاسکتے تمہیں یہیں رہنا ہے۔ اب سوچ لو کہ طلاق دو گے یا نہیں۔“

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے نواز ساری عمر میرے ساتھ غلط سلوک کرتا آیا تھا وہی سلوک سیمہ نے کیا تھا۔ وہ بھی مجھے استعمال کرتا تھا اور سیمہ نے بھی استعمال کیا ہے۔ میں نے کہا۔ ”میں طلاق نہیں دوں گا۔“

”تب اس گھر میں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے ابھی اور اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔“ نواز نے حکم دیا۔ ”مجھے اس

کی پروا بھی نہیں ہے کہ تم ساری دنیا کو بتا دو گے۔ میں سیمہ کو بھی اس کے گھر بھیج دوں گا۔ لیکن اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتا کہ تم میری ہی چھت کے نیچے میری بیوی کے شوہر بن کر رہو۔“

”یہ میری بیوی ہے۔“

”جلد تم یہ بات نہیں کہہ سکو گے۔“

جب میں نواز کے پاس آیا تب بھی میں نے احتیاطاً وہ کمرہ نہیں چھوڑا تھا جہاں میں کرائے پر رہ رہا تھا اور یہ احتیاط میرے کام آئی۔ نواز کسی صورت میں رکنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا اور جب وہ مرنے مارنے پر اتر آیا تو مجبوراً مجھے وہاں سے نکلنا پڑا تھا۔ میں نے اپنا سامان لیا تھا

اس وقت ان کو خیال نہیں آیا کہ سیمہ کا طلاق نامہ اور مجھ سے نکاح نامہ میرے ہی پاس تھا۔ اگلے دن نواز صبح سویرے مکان پر آیا اور اس نے مجھ سے ان دو چیزوں کا مطالبہ کیا۔

میں نے جواب دیا۔ ”انہیں بھول جاؤ اب عدالت میں ملاقات ہوگی۔ سیمہ سے کہنا جلد کیس کر دے تاکہ میں اسے دنیا کے سامنے ذلیل کر سکوں۔“

نواز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے قتل کر دے حالانکہ یہ کام مجھے کرنا چاہیے تھا۔ نواز کے جانے کے بعد مجھے شدت سے خیال آیا کہ مجھے نواز کو قتل کر دینا چاہیے مگر

ساتھ ہی میں جانتا تھا کہ میں ایسا کر نہیں سکتا تھا اور اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اصل میں تو سیمہ ہی میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ نواز کے قتل کا ارادہ تھا۔ سیمہ کا ارادہ

جانے کے باوجود میرا غصہ کم نہیں ہوا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ان دونوں کو کوئی ایسی سزا دوں جو ان کے لیے سواہن روح بن جائے مگر فی الحال ایسی کوئی سزا ذہن میں نہیں

آ رہی تھی۔ جہاں تک طلاق نہ دینے کا تعلق تھا تو وہ خلع لے سکتی تھی اور یہ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ پھر نواز



سے شادی کر لیتی اور جہاں تک دنیا کی بات ہے تو اس کی پروا انہیں پہلے بھی نہیں تھی۔ صرف سیمائے گھر والوں کا کچھ مسئلہ تھا تو وہ بھی کبھی حل ہو ہی جاتا۔

ان چند مہینوں میں، میں نے اپنی خاصی رقم سیمائے پر لٹائی تھی اسے ایک سے بڑھ ایک لباس اور چیزیں دی تھیں۔ مہنگائی کے اس دور میں جب لوگ گولڈن جیج رہے ہیں میں نے اسے سیٹ بنا کر دیا۔ گھر کا بہت سا سامان لے کر دیا اور وہ سب میرا خسارہ بن گیا تھا۔ اس میں سے اب مجھے کچھ واپس نہیں ملتا۔ مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ جب سیمائے زندگی میں آئی تو مجھے لگا کہ میری بھی کوئی زندگی ہے۔ میں نے بھرپور کوشش کی سیمائے کو خوش رکھوں۔ میں اس کی ہر بات مانتا تھا۔ وہ جتنا مانگی اس سے زیادہ دیتا تھا۔ وہ بھی یوں بنی رہی جیسے مجھ سے خوش ہو مگر جب نواز نے طلاق کے لیے کہا تو وہ اس کی ہموار بن گئی۔ گویا وہ شروع سے نواز کے ساتھ رہنا چاہتی تھی تب اس نے مجھے کیوں دھوکے میں رکھا۔ میرے اندر خوش گئی پیدا کی اور میں اسے اپنا سمجھنے لگا تھا۔

اب میں ان دونوں کو سزا دینا چاہتا تھا۔ کئی دن تک میں اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ پھر ایک دن مجھے اچانک خیال آیا۔ میں نے اس پر غور کیا تو میں اچھل پڑا تھا۔ پھر میں نے کچھ عالموں سے اس بارے میں مشورہ کیا اور انہوں نے بھی میرے خیال کی تصدیق کی۔ میں نے اگلے دن ہی خاموشی سے مارکیٹ میں دکان کھل کرنے کی بات پھیلادی۔ یعنی ان لوگوں تک پہنچا دی جو مارکیٹ میں بیٹھے تھے اور یہی کام کر رہے تھے۔ دو تین آفرز آئیں مگر وہ میرے خیال کی نہیں تھیں اس لیے میں صبر سے انتظار کرتا رہا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ بس میں چاہتا تھا کہ دکان کی فروخت کی شہرت نہ ہو۔ اگر نواز اور سیمائے کے علم میں آ جاتا تو مجھ کو کوئی فرق تو نہیں پڑتا مگر جیسا میں چاہتا تھا پھر شاید ویسا نہ ہو جائے۔ اس دوران میں سیمائے کی طرف سے مجھ پر حملے کا بھی کر دیا گیا اور میں اسے بھی دیکھنے لگا۔ میں نے اچھا دھمکیا کیا تھا جو پھر باز یوں کا ماہر تھا اور وہ کیس کو طویل دینے لگا۔ دو مہینے بعد مجھے مطلوبہ آفر مل گئی اور میں نے دکان فروخت کرنے کی کارروائی شروع کر دی۔ میری پوری کوشش تھی کہ نواز کو اس کا علم نہ ہو اس لیے میں نے جس سے سودا کیا اس سے بھی بات خفیہ رکھنے کو کہا۔ مارکیٹ میں میری جان پہچان زیادہ تھی لیکن نواز کے جاننے والے بھی کم نہیں تھے

اور مجھے اصل خطرہ ان کی طرف سے تھا۔ ایک مہینے بعد کارروائی مکمل ہو گئی اور رقم مجھے مل گئی۔ مجھے رقم ملی اور میں اس کے اگلے دن روانہ ہو گیا۔ میں نے شہر ہی چھوڑ دیا اور شہر چھوڑنے سے پہلے نواز کو ایک خط کو ریٹر سے بھیجا جسے میں نے کمپیوٹر پر ٹائپ کروا کے اس کا پرنٹ نکالا تھا۔ اس کا مضمون کچھ یوں تھا۔

”نواز میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ سمجھ لو کہ تم شدہ ہو رہا ہوں اور اب سیمائے سے خلع لے لی۔ سات سال سے پہلے وہ عدالت سے بھی خلع نہیں لے سکتی اس لیے تم لوگ سات سال تک تو انتظار کرو۔ یاد رکھنا اگر تم دونوں نے ساتھ رہنے کی خوشی کی یا کوئی چکر بازی کی تو میں تم سے بے خبر نہیں ہوں دونوں حدود کے تحت جیل جاؤ گے اور سزا پاؤ گے۔ ہاں خاموشی سے گناہ کی زندگی بسر کرنا چاہو تو تمہاری مرضی ہے۔“

لفظ تمہارا بھائی۔

نوٹ: لازمی نہیں ہے میں سات سال بعد آؤں تو طلاق یا خلع دے دوں میں اپنی جھلک عدالت میں دکھا کر پھر غائب ہو سکتا ہوں اور سیمائے پر مزید سات سال کا انتظار لازمی ہو جائے گا۔“

میں نے خط کی دو کاپیاں کرا کے انہیں نواز اور سیمائے کے ماں باپ کے گھر بھیجا۔ تاکہ وہ ان سے بات چھپانہ سکیں۔ میرا واپس آنے اور ان کی مگرانی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر دھمکی دینے میں کیا حرج تھا۔ میں ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی سے نکل گیا تھا۔ ملا بیٹھا آکر میں نے چند مہینے حالات دیکھے لوگوں کے انداز اور رسم و رواج جانے۔ مقامی زبان سیکھی۔ پھر ایک عام مارکیٹ میں ایک جنرل اسٹور پر سیلز مین کی جاب کی۔ ایک سال بعد میں نے جمع پونجی سے اپنی دکان کھول لی اور دو سال بعد میں نے اپنا مکان لے لیا تھا۔ پھر ایک مقامی مسلمان لڑکی سے شادی کی اور اللہ نے مجھے اچھی بیوی کے ساتھ اولاد بھی دی۔ آج اس بات کو سات سال پورے ہونے کو آئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ نواز اور سیمائے نے پھر کیا کیا۔ ممکن ہے نواز نے دوسری شادی کر لی ہو مگر سیمائے نہیں کر سکتی تھی۔ جس وقت میں یہ سچ بیانی لکھ رہا ہوں سیمائے کے لیے طلاق نامہ میرے سامنے پڑا ہے اور میں بعد میں فیصلہ کروں گا کہ اس پر سائن کر کے اسے بھیجوں یا نہ بھیجوں۔





# برے کھنسے

محترم ایڈیٹر سرگزشت کراچی  
السلام علیکم

یہ واقعہ ایک عام بلکہ روز مرہ میں شامل ہے۔ اسے پاکستانی پولیس کا معمول سمجھ لیں کیوں کہ یہ مجھ پر ہی نہیں ہر ایک پر گزرتی ہے۔ انہی حالات سے پچاسوں لوگ گزرے ہوں گے۔ آپ یہی ملاحظہ کریں کہ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔

نعمان بدر  
(ملتان)



ہو سکتا ہے کہ آپ میری اس کہانی کو مذاق سمجھیں یا جھوٹ سمجھیں لیکن ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ بتائیں کہ کیا ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا؟ اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر یہ کہانی جھوٹ نہیں ہے۔ یہ ایک سونی صدی کی کہانی ہے۔

میں اپنے فلیٹ میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ بچے اس لیے نہیں تھے کہ بیوی نہیں تھی اور بیوی اس لیے نہیں تھا کہ شادی نہیں ہوئی تھی۔

میں اس رات ایک بہت رومانٹک سا خواب دیکھ رہا تھا کہ اچانک دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی جیسی دستک پولیس والے ہی دیا کرتے ہیں۔ بوکھلا کر دروازہ کھولا۔ دروازے کے باہر اندھیرا تھا۔ اس لیے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کون لوگ آئے ہیں۔ پھر ان میں سے کسی نے میرے چہرے پر کسی طاقتور نارنج کی روشنی ڈالی۔ میری تو آنکھیں ہی چندھیا کر رہ گئی تھیں۔

”کیا بات ہے، کون ہو تم لوگ؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”اوئے حیرانام نعمان بدر ہے نا؟“ کسی نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

”ہاں! میں نعمان بدر ہی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”لیکن بات کیا ہے؟“

”بات تو تھانے چل کر بتائیں گے۔ اوئے اس ڈالوسو باگل میں۔“

اس وقت ہتا چلا کہ آنے والے پولیس کے لوگ تھے۔ میں نے احتجاج کرنا چاہا لیکن مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے فلیٹ کے نیچے اتار کر لے آئے۔

ارد گرد کے فلیٹوں کی کھڑکیاں روشن ہونے لگی تھیں۔



لوگ کھڑکیوں سے جھانک کر طرح طرح کے تہرے کیے جا رہے تھے۔

”تو بہ ہے۔ دیکھنے میں کتنا شریف آدمی لگتا تھا۔“  
”ارے میں تو اس کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئی اونچی چیز ہے۔“ ایک طرف سے آواز آئی۔

”یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں بھائیو۔“ میں نے یہ آواز پہچان لی۔ یہ ان مولوی صاحب کی آواز تھی جو کنڈا ڈال کر اپنے گھر کو روشن رکھتے تھے۔

میں اس وقت بے پناہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ میری ساری عزت خاک میں مل گئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ سوال کیا کہ مجھے کیوں لے جا رہے ہیں۔ میں نے کیا قصور کیا ہے کہ اس کے جواب میں ایسی کراہ قسم کی گالیاں سننے کو طبیعت ہی صاف ہو گئی۔

پھر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خاموش ہی رہوں۔ شاید تھانے جا کر صورت حال واضح ہو جائے۔ مجھے اٹھانے والوں نے اتنی بے دردی سے اٹھا کر موہاگل میں پھینک دیا جیسے آٹے کی بوری جھینکتے ہیں۔

ان لوگوں نے مجھے سیٹ پر بھی بیٹھنے کو نہیں کہا۔ میں سیٹوں کے درمیان پڑا رہا۔ جب کہ دونوں سیٹوں پر پولیس کے جوان بیٹھ گئے تھے۔

موہاگل ابھی چلی ہی تھی کہ ایک پولیس والے نے میری گردن پر ہاتھ بٹھا دیا۔ میں ہلکا کر رہ گیا تھا۔

”ارے بھائی کیوں مار رہے ہو مجھے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔“

”اوسے چپ کر شریف دلچیز۔ تو موہاگل میں بیٹھنے والوں کی پہلی سلامتی ہے۔“

میں ہنسا کر رہ گیا۔ ایسی ذلت تو میں نے پہلے کبھی نہیں اٹھائی ہوگی۔

بہر حال کچھ دیر کے سفر کے بعد موہاگل تھانے کے کپڑاؤں میں داخل ہو گئی۔

”اوسے اتر۔“ ایک نے کہا۔ ”تیرا سفر ختم ہوا۔“  
”بھائی صاحب آپ لوگ کسی غلط فہمی میں مجھے اٹھا کر لائے ہیں۔“ میں نے کہا۔

ایس ایچ او ایک خون خوار صورت پولیس والا تھا۔  
”سرجی یہ نعمان بدر ہے۔“ مجھے ساتھ لائے والوں

میں سے ایک نے بتایا۔ ”بڑی مشکلوں سے ہاتھ آیا ہے۔“  
فلپٹ کی دیوار پھلانگ کر بھاگ رہا تھا۔

”ارے خدا کا خوف کرو تم لوگ۔“ میں ہلکا کر بولا۔  
”تم لوگ مجھے سوتے میں پکڑ کر لائے ہو اور کہہ رہے ہو میں دیوار پھلانگ کر بھاگ رہا تھا۔“

”خاموش۔“ ایس ایچ او نے مجھے جھڑک دیا۔ ”ہم جھوٹ نہیں بولتے۔ اب بتاؤ اسے دنوں سے کہاں چھپے ہوئے تھے۔“

”جناب! میں کیوں چھپنے لگا۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو سب کے سامنے ہوں۔“

”سرجی یہ بہت ہی ڈھیٹ قسم کا مجرم ہے۔“ ایک پولیس والا غصے سے بولا۔ ”اس کو ڈرائنگ روم بھیج دیں سر جی خود ٹھیک ہو جائے گا۔“

”دیکھو بھائیو، تم لوگ چاہے مجھے کسی بھی روم میں بھیج دو لیکن پہلے بتاؤ دو کہ میں نے کیا جرم کیا ہے۔“

”تم نے بینک میں ڈاکا ڈالا ہے۔“ ایس ایچ او نے کہا۔

”بینک میں ڈاکا؟“ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ ”ایس ایچ او صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا میں آپ کو بینک میں ڈاکا مارنے والا لگ رہا ہوں۔“

”تمہارا نام نعمان بدر ہے نا؟“

”جی ہاں! وہ تو ہے اس سے میں نے کب انکار کیا ہے۔“

”اور تم پیراڈائز اپارٹمنٹ میں رہتے ہو؟“

”جی ہاں، میں وہیں رہتا ہوں۔“

”تو بس۔ پتا چل گیا نا کہ تم ہی نے بینک میں ڈاکا ڈالا ہے۔“

”ارے صاحب اس سے کیسے پتا چلا؟ کچھ تو خدا کا خوف کریں۔“

ایک ہاتھ میری گدی پر پڑا۔ ”اوسے ہمارے صاحب کو خدا کا خوف کرنے کے لیے کہہ رہا ہے۔“

”کہہ میں اس طرح پتا چلا، ہمارے تجربوں نے ہمیں خبر دی ہے کہ بینک میں ڈاکا ڈالنے کا کام نعمان بدر نے کیا ہے اور وہ پیراڈائز اپارٹمنٹ میں رہتا ہے۔ تو ان دونوں نشانوں پر پورا اترتا ہے اس لیے تو نے ہی ڈاکا ڈالا ہے۔“

”ہے۔“ پولیس والے نے بتایا۔  
 ”کون! وہ اپنے مستقیم صاحب۔“  
 ”جی صاحب۔ وہی وہ ان کا سرگما بہنوئی ہے۔“  
 ”اوہ پھر تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ مستقیم صاحب کا  
 دامغ تو آج کل ویسے ہی خراب رہتا ہے۔“  
 ”سر جی ایک مشورہ دیتا ہوں جب تک معاملہ خفیہ نہ  
 ہو جائے اس بندے کو لاک اپ میں رکھیں۔ کچھ دنوں بعد  
 چھوڑ دیں گے۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔“ ایس ایچ او نے گردن ہلائی۔  
 ”واہ، یہ کیا مذاق ہے۔“ میں بھڑک اٹھا۔ ”تم لوگ  
 یوں ہی کسی کو لاک اپ میں کیسے رکھ لو گے۔ کوئی مذاق ہے۔  
 بھائی اس نعمان بدر کو پکڑ جس نے یہ جرم کیا ہے۔ اگر وہ کسی  
 مستقیم کا بہنوئی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔“  
 ”بات یہ ہے بھائی کہ ہم ابھی اس بندے پر ہاتھ  
 نہیں ڈال سکتے۔ اس کی پوزیشن بہت مضبوط ہے۔ بعد میں  
 اس کو گڑ دیں گے۔“  
 ”اور اس وقت تک میری جو رگڑ ہوتی رہے گی اس کا  
 کون ذمے دار ہوگا؟“

”ہم مجبور ہیں تم کو دس پندرہ دنوں کے لیے لاک  
 اپ میں رکھنا ضروری ہے ورنہ ہماری نوکریاں ختم ہو جائیں  
 گی۔“ ایس ایچ او نے کہا۔ پھر ایک پولیس والے کو حکم دیا۔  
 ”بھائی اسے لاک اپ میں ڈال دو۔“

پولیس والے نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس وقت ایک  
 دوسرا پولیس والا بول پڑا۔ ”سر جی! آپ کو یاد نہیں رہا جس  
 بندے نعمان بدر کی بات ہو رہی ہے وہ پہلے بھی تو اس چکر

”ایس ایچ او صاحب! آپ یقین کریں میں ایک  
 شریف اور بے گناہ انسان ہوں۔ پڑھا لکھا ہوں۔ ایسی کوئی  
 حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایک بہت بڑی فرم میں  
 ایک اچھے عہدے پر ہوں۔ معاشرے میں میری عزت  
 ہے۔ مجھ جیسا آدمی کسی بینک میں ڈاکا کیسے ڈال سکتا ہے۔“  
 اسی وقت ایک پولیس والا بول پڑا۔ ”سر جی یہ وہ بندہ  
 نہیں ہے۔“  
 ”کیا مطلب۔“

”ہاں سر جی! میں اس نعمان بدر کو جانتا ہوں۔ وہ کوئی  
 اور ہے۔ یہ بے چارہ تو خواہ مخواہ مارا گیا ہے۔“

”تو یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی۔“ ایس ایچ او  
 غرایا۔

”سر جی میں تو تھانے میں بیٹھا تھا۔ جو لوگ مجھے تھے  
 وہی اٹھا کر لائے ہیں اس بے چارے کو۔ میں نے تو ابھی  
 اس کی شکل دیکھی ہے۔“  
 خدا بھلا کرے اس پولیس والے کا اس کے لیے دل  
 سے دعا نکل رہی تھی۔

”سوری جناب۔“ ایس ایچ او نے میری طرف  
 دیکھا۔ ”میرے بندے کسی اور کے دھوکے میں آپ کو پکڑ  
 کے لے آئے ہیں۔“

”آپ نے تو سوری کر دیا۔ لیکن اتنی دیر میں میری جو  
 بے عزت ہوئی ہے۔ جتنی ٹھکانی ہوئی ہے اس کا کیا ہوگا۔“  
 ”اب اس کا تو کچھ نہیں ہو سکتا۔“ ایس ایچ او نے کہا۔

”سر جی میں تو پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ یہ آدمی کسی بینک  
 میں ڈاکا نہیں ڈال سکتا۔“ یہ وہ پولیس والا بول رہا تھا جس  
 نے مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے مو بائل میں پھینکا تھا۔

”لیکن سر جی ایک بات اور بھی ہے۔“ ایک دوسرے  
 پولیس والے نے کہا۔

”اب کون سی بات ہے۔“

”وہ جو اصل نعمان بدر ہے۔ وہ رہتا تو اسی ہلڈنگ  
 میں ہے۔ لیکن اس کا فلیٹ نمبر کچھ اور ہے۔ یہ بات مجھے  
 پہلے سے معلوم تھی۔“

”معلوم تھی تو اس شریف آدمی کے گھر کیوں چلے گئے  
 تھے؟“

”سر جی۔ وہ نعمان بدر، مستقیم صاحب کا بہنوئی

شمارہ فوری 2015ء کی منتخب سچ بیابیاں

ہفت روزہ شمس۔۔۔۔۔ آپ کا انتخاب

☆ اول: سفاک محسن۔۔۔۔۔ تنویر حسن

☆ دوم: سوکن۔۔۔۔۔ شیا

☆ سوم: خاندہ بدوش۔۔۔۔۔ انور ذکی

☆ چوتھ: اختر عارف۔۔۔۔۔ علیہ علیہ

☆ پانچواں: مہر علی۔۔۔۔۔ مہر علی



میں پکڑا جا چکا ہے۔“  
 ”نفس چکر میں؟“  
 ”اس نے اپنے آپ کو مستقیم صاحب کا بہنوئی شو کیا تھا صاحب جی۔“ پولیس والے نے بتایا۔ ”وہ بندہ تو بہت بڑا فراڈ یا ہے۔ مستقیم صاحب کے نام کو بدنام کرتا پھر رہا ہے۔“  
 ”اب تو میں جاسکتا ہوں نا؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”کیوں نہیں جناب۔ آپ بالکل جاسکتے ہیں۔“  
 ایس ایچ او نے کہا۔ ”ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن آپ ہماری بھی مجبوریاں دیکھیں۔“  
 ”ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں آپ لوگوں کی مجبوریاں۔“  
 ”آپ یقین کریں۔ جب آپ جیسا کوئی شریف آدمی ہمارے تھانے میں آتا ہے تو ہمیں خود شرمندگی ہوتی ہے۔“ ایس ایچ او نے کہا۔ ”اب آپ چائے پیے بغیر نہیں جائیں گے۔“

”سرجی۔“ ایک دوسرا پولیس والا بول پڑا۔ ”آپ تو بالکل بھولے ہیں سرجی۔ آپ کو تو کوئی بات یاد ہی نہیں رہتی۔“  
 ”کیوں اب کیا ہو گیا؟“  
 ”آپ کو یاد نہیں ہے سرجی۔ اس بندے نعمان بدرکی مستقیم صاحب سے ناراضگی چل رہی تھی۔ اس لیے صاحب نے اسے اپنا بہنوئی ما۔ نئے سے انکار کر دیا تھا گھر لیو جھگڑا تھا سرجی۔“

”اوہو، یہ تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔“  
 ”تو پھر کیا کیا جائے سرجی؟“  
 ”کرنا کیا ہے۔ اس بندے کو لاک اپ میں ڈال دو۔ بہت شریف بنا پھر رہا ہے۔ ہم صاحب سے تو جھگڑا نہیں لے سکتے نا۔“  
 ”ہاں سرجی۔“  
 ”تو پھر ڈالو اسے لاک اپ میں۔“ وہ دوسرا پولیس والا کہنے لگا۔

”آخر یہ کیا مذاق ہے۔“ میں غصے سے دہانے لگا تھا۔ ”تم لوگوں نے یہ کیا لگا رکھا ہے۔ جب تمہیں معلوم بھی ہے کہ میں ایک بے گناہ انسان ہوں تو پھر یہ تماشا کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ۔“  
 ”یہ مجبوری ہے ہماری۔“ ایس ایچ او نے کہا۔  
 ”ابھی مجبوری ہے۔“ میں بھنائے جا رہا تھا۔  
 ”تمہاری مجبوری تو میرے لیے موت ہو رہی ہے۔“

”سرجی ہم خواہ مخواہ اس شریف بندے کو اٹھا کر لے آئے ہیں۔“ ایک پولیس والے نے مداخلت کی۔ ”آپ یاد کریں سرجی مستقیم صاحب تو اس بندے سے خود اسنے پریشان ہیں کہ دوبار اسے بند کرنا چکے ہیں۔“  
 ”یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ یعنی وہ بندہ ہے اسی قابل۔“

”وہی تو میں بتا رہا ہوں سرجی۔ ہم خواہ مخواہ ایک شریف بندے کی بدعائیں لے رہے ہیں۔“  
 ”جائیں بھائی آپ چلے جائیں۔“ ایس ایچ او نے میری طرف دیکھا۔ ”اور ہمیں معاف کر دیں کہ ہم نے آپ کو پریشان کیا ہے۔“  
 ”خدا حافظ۔“ میں جلدی سے دروازے کی طرف لپکا اور اسی وقت ایک پولیس والے نے لپک کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”ڈومینٹ تورک جاؤ بادشاہو۔“

”اب کیا ہو گیا؟“ ایس ایچ او نے غصے سے پوچھا۔  
 ”سرجی کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ مستقیم صاحب ہر وقت اپنے بہنوئی سے ناراض ہی ہوں۔“ اس نے کہا۔  
 ”اگر انہیں پتا چل گیا کہ ہم نے ان کے بہنوئی کو پکڑ لیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ ناراض ہو جائیں انسان کے دماغ کو بدلتے ہوئے کہاں دیر لگتی ہے۔“  
 ”یہ بھی تم ٹھیک کہتے ہو۔“ ایس ایچ او نے کہا۔ ”چلو ڈال دو اس کو لاک اپ میں۔“

اور اس بار میں نے وہ حرکت کی جو مجھے پہلے کر لینی چاہیے تھی۔ میں لاک اپ میں ڈال دیا اسے جانے دو کے چکر سے نکل کر ایک کنارے ہو گیا۔  
 یعنی میں اب چھ مہینے سے جیل میں ہوں کیوں کہ میں نے ایک پولیس والے کا سر بھاڑ دیا تھا۔ جی ہاں میں نے میز پر بھی ہوئی ایش ٹرے اٹھا کر ایس ایچ او کے سر پر دے مارا تھا۔

اس کے نتیجے میں مستقیم صاحب سے بھی جان چھوٹ گئی تھی اور مجھے باقاعدہ گرفتار کر کے عدالت کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔ جہاں سے مجھے چھ مہینے کی سزا سنائی گئی۔  
 اور اب میں جیل میں رہ کر یہ کہانی لکھ رہا ہوں۔  
 ”ہو سکتا ہے کہ آپ کو میری یہ کہانی غلط معلوم ہو۔ کیوں کہ یہ ہے کہ میں لیکن آپ ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ایمان سے بتائیں کیا یہاں ایسا نہیں ہوتا؟“





## اسرار

جناب معراج رسول  
السلام علیکم

اس بار میں ایک انوکھی مخلوق کی زندگی کا قصہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ یقین کریں یہ مخالفہ نہیں اس مخلوق کی حشر سامانی کسی داستان جھمبیر اور جنگ شاہی کے بچے بچے کی زبان پر ہے۔ ان کی اخبارات میں بھی یہ خبر شہ سرخیوں کے ساتھ آئی تھی۔  
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی  
(جیکب آباد)

طوفانی بارشوں کا سلسلہ ختم چکا تھا۔ بستی والوں نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ لیکن اگر یہ سلسلہ مزید ایک روز جاری رہتا تو بستی کی مشرقی سمت سے آنے والے دریا میں زبردست طغیانی آجاتی اور پورا علاقہ زیرِ آب آجاتا۔ یہاں آس پاس دو تین بستیاں تھیں۔ ایک تو دریا کے کنارے پر آباد تھی جو پھیروں کی بستی کہلاتی تھی۔ گزشتہ دنوں ہونے والی طوفانی بارشوں کے باعث اس دریا کی جنوب مشرقی سمت سے نکلنے والی ایک شاخ



(کینال) پر آٹھ ستونوں والا جو ریلوے پلی بنا ہوا تھا اس کے چار ستون بہہ گئے تھے پلی ٹوٹ چکا تھا۔ وہاں ہنگامی بنیادوں پر مرمت کا کام ہو رہا تھا۔ یہ کینال دریائے سندھ سے چھوٹی تھی اور جنگ شاعی اور ٹھیکر کے درمیان سے گزرتی تھی۔

اور سیر کمال احمد اپنے پارہ درگروں کی ٹیم کے ساتھ وہاں خیمہ زن تھا۔ ٹوٹتے ہوئے پلی کے قریب چار خیمے نصب کیے گئے تھے۔ یہ ٹیکنیکل عملہ تھا جن کے ذمے اتنی برتن اور پٹریوں کی مرمت کا کام تھا جب کہ اینٹوں اور سیمنٹ کے ستونوں کا کام تقریباً چالیس مزدوروں اور پانچ راج مسٹریوں کے ہر دھما۔

یوں ان دونوں ٹیموں کو ”اے“ اور ”بی“ سیکشن میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ”اے“ ٹیم اور سیر کمال احمد کی تھی۔ ”بی“ سیکشن کی ٹیم نے بھی الگ الگ مقام پر اپنی جھونپڑیاں ڈال لی تھیں اور یوں بنجر ویران علاقے میں باقاعدہ ایک کالونی بن گئی تھی۔

کام ہنگامی بنیادوں پر جاری تھا کیوں کہ ایک بڑے شہر کا رابطہ دیگر شہروں سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا۔ پہلے متبادل راستہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی مگر وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

اور سیر کمال احمد ایک ہفتیس سالہ شخص تھا۔ وہ خود دن رات کام کی نگرانی کرتا تھا۔ پارٹوں کا سلسلہ ابھی پوری طرح ختم تو نہیں ہوا تھا تاہم اس میں خاصی حد تک کمی ضرور واضح ہو گئی تھی۔

اور سیر سارے عوامل پر سوچ بچار کرنے کا عادی تھا۔ وہ مزدور پارٹی کے ٹھیکیدار راجا شفیق کو بھی کام کے سلسلے میں مفید مشورے دیا کرتا تھا۔

ایک روز صبح چھ بجے حسب معمول دونوں ٹیموں نے بیداری کے بعد کام سنبھالا تو ایک لرزہ خیز ڈانچے کا انکشاف ہوا۔ تین افراد کی لاشیں کینال کے قریب تھوڑے فاصلے پر پڑی تھیں۔ ان تینوں بد نصیبوں میں سے دو مزدور تھے اور تیسرا اے ٹیم کا درگرو تھا۔

کام روک دیا گیا۔ پورے عملے میں خوف اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ اور سیر کمال احمد اور ٹھیکیدار راجا شفیق جائے مقام پر پہنچے۔ تینوں لاشوں کو الگ الگ تین چار پارٹیوں پر ڈال دیا گیا تھا۔ لاشوں کی حالت بہت بری تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی

خونخوار درندے نے انہیں چیر پھاڑ ڈالا ہو۔ اکثریت کا خیال تھا کہ یہ کام جنگلی کتوں اور خونخوار بھیڑیوں کا ہے۔ اس علاقے میں ٹھیکر تھانے کی حد لگتی تھی۔ چنانچہ فوری طور پر چند افراد کو ایک جیپ میں روانہ کر دیا گیا۔ پولیس پارٹی آئی تو اس نے لوگوں کے بیان قلمبند کیے۔ لاشوں کا جائزہ لیا اور وہی ہوا یعنی اس حادثے کو جنگلی کتوں اور بھیڑیوں کا شکار نہ قرار دے کر ضابطے کی کارروائی کرنا دی گئی۔ لاشیں شہر بھجوا دی گئیں کیوں کہ ان کے ورثا وہیں رہتے تھے۔

یہ اسی رات کا ذکر ہے۔ صبح کے واقعے کی وجہ سے عملے نے دو گھنٹے پہلے کام روک دیا تھا۔ وجہ معقول تھی۔ اس لیے اور سیر کمال احمد اپنے خیمے میں آ گیا۔ یہاں ہائیر میس کا ایک لیپ روشن تھا۔ ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ اس کا ملازم بختیار علی کھانا لے آیا مگر کمال کو بھوک نہ گئی۔ اسے ان بد نصیب مزدوروں کی عبرت ناک موت کا رنج تھا۔ بختیار بھی آڑوہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک لمبی عمر کا آدمی تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے ”صاحب“ نے کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا تو اس کا بھی کھانے کو جی نہیں کیا تھا۔

”یار مجھے ایک کپ چائے بنا دو۔“ کمال نے کہا۔ ”ابھی لایا صاحب!“ وہ یہ کہہ کر خیمے سے باہر چلا گیا۔ وہیں میس کا اسٹور کھلا تھا۔ ہلکی پھلکی چائے، کافی یا دووہ وہیں گرم کیا جاتا تھا۔ اس کے ملازم بختیار کو گئے ابھی ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ کسی کے ٹھٹھکارنے کی آواز ابھری۔

”کون؟“ کمال احمد نے پوچھا۔ ”میں ہوں جناب! ٹھیکیدار شفیق۔“ باہر سے آواز آئی۔

”آ جاؤ..... آ جاؤ.....“ کمال احمد نے فوراً کہا۔ ٹھٹھکار نے تھوڑے لمحے میں راجا شفیق کے درمیان میں داخل ہوا۔ اس نے شلوار قمیص کے اوپر واسٹ بکن رکھی تھی۔

”آؤ بیٹھو مگر پہلے ذرا بختیار علی سے کہہ دو کہ ایک کپ چائے کا پانی اور.....“

”وہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے۔“ راجا شفیق نے مسکرا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور پھر اس کے سامنے دھری ایک چھوٹی سی فولڈنگ چیر بریڈ گیا۔ دونوں صاحبان کے ہونے کی وجہ سے بے تکلف دوست بن چکے تھے۔

”کیا بات ہے اب تک سوئے نہیں آپ؟“ اس نے کمال احمد کی طرف دیکھ کر پوچھا۔  
 ”ہاں یار! آج واسے واسے کی وجہ سے دل بڑا خراب ہے، نیند ہی نہیں آ رہی۔“ کمال احمد نے افسردہ لہجہ میں کہا۔

”دکھ تو واقعی مجھے بھی بہت ہوا کمال صاحب! بے چارے محنت مزدوری کرنے والے ان تین بد قسمت آدمیوں کے ساتھ اچھا نہیں ہوا مگر کمال صاحب میرے حلق سے ایک بات نہیں اتری ہے اب تک.....؟“ راجا شفیق نے چونکا کر دیکھا۔

”اگر ان تینوں مزدوروں کو کتوں اور بھیر یوں نے چیر پھاڑ ڈالا تھا تو کم از کم جینے چلانے کا شور تو آنا چاہئے تھا؟“

”یار شفیق! ہم سب لوگ سارے دن کے تھکے بارے سوئے ہیں۔ بستر پر پڑتے ہی بے سدھ ہو جاتے ہیں پھر صبح تڑکے ہی آنکھ کھلتی ہے۔ بھلا شور کی آواز کون سنتا۔“ کمال احمد نے ہنسی مسکراہٹ سے کہا۔

”پھر بھی کمال صاحب! تمہیں چالیس افراد پر مشتمل محلے کے لوگوں میں کسی ایک کو بھی خبر نہ ہو سکی۔“ راجا شفیق کے لہجے میں حیرت پنہاں تھی۔

بخارا علی چائے کی ٹرے اٹھائے آگیا۔ دونوں کو چائے کا ایک ایک کپ تھمانے کے بعد خود بھی ایک قریب دھرے اسٹول پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ ایک گم اس کے ہاتھ میں تھا۔

”میرے ذہن میں تو کوئی اور بات ہے۔“ کمال احمد نے چائے کی چمکی لے کر نہ سوچ لہجہ میں کہا۔

”کیسی بات؟“ راجا شفیق نے توجہ سے چوک کر اس کی طرف دیکھا۔

”جس مقام پر وہ تینوں مزدوروں کی لاشیں پائی گئی تھیں وہاں آس پاس زمین پر کسی جانور کے قدموں کے نشانات نہیں ملے تھے ماسوائے انسانوں کے قدموں کے۔“ کمال احمد نے کہا۔

راجا شفیق بولا۔ ”ہو سکتا ہے بارش کی وجہ سے نشانات معدوم ہو گئے ہوں۔ برسات بھی تو دیکھو ناں۔ جیسے جمعرات کی چھڑی لگی ہوئی ہے۔ بالکل معمولی ہلکی ہلکی اور کبھی ایک دم تیز.....“

”ہوں یہ بات تو ہے مگر راجا! پھر بھی جانے کیوں میرا دل نہیں مان رہا ہے کہ اتنی بڑی واردات یوں چپ چاپ ہو گئی۔“ کمال احمد اس بار اچھے ہوئے لہجہ میں بولا۔ راجا شفیق خاموش رہا۔

تینوں اب خاموشی سے چائے پینے لگے۔ باہرات کا تاریک سناٹا پھیل چکا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار کے ساتھ تیز ہوا کے جھونکے بھی چل رہے تھے۔

”مرمتی کالونی“ سے ذرا دور ایک بستی کی آبادی میں جس کے ایک طرف کھجوروں کا بڑا سا باغ تھا۔ وہاں ایک بچی اور سرخ اینٹوں کا مکان بنا ہوا تھا۔ مکان باغ کے مالک رحمت اللہ کا تھا۔ بستی کی معتبر شخصیت بھی یہی تھی۔

آج سے کئی سال پہلے جب رحمت اللہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا اس کے دادا نے یہاں ایک کھجور کا درخت لگایا تھا اور آج اس کی دوسری نسل تقریباً چالیس درختوں پر مشتمل ایک باغ کی شکل میں اس کا پھل کھا رہی تھی۔ رحمت اللہ کی بیوی امیر زادی ایک خوش اطوار خوش جمال خاتون تھی۔ شادی کے سات آٹھ سالوں بعد بڑی منتوں اور مرادوں سے ایک بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ وہ اب دس بارہ سال کا ہو چکا تھا۔ رحمت اللہ اب اس چھوٹے سے گوشہ میں زمیندار کہلاتا تھا..... باعزت زمیندار۔

یہ تینوں الگ الگ چار پائیوں پر کھلے محن کے ایک کونے میں بڑے سے چھپرنا سا تان تانے گہری نیند سو رہے تھے۔ درمیان میں ان کے بیٹے شاہ رخ کی چھوٹی چار پائی تھی۔ اس بڑے مکان کی کل کائنات یہ تین افراد ہی تھے۔

باہر ہو کا عالم تھا۔ تاریک رات اپنے بھرپور جوہن پر تھی۔ ہلکی ہلکی بارش کے ساتھ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

اچانک باہر کسی گیدڑ کے زور سے رونے کی آواز ابھری۔ یہ آواز گیدڑ شاید دروازے کے قریب پہنچ کر اپنی منخوس آواز میں رویا تھا۔ مگر رحمت اللہ اور شاہ رخ کی آنکھیں نہیں کھلی تھیں البتہ امیر زادی ضرور جاگ گئی تھی۔ باہر گیدڑ دوبارہ چلایا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ امیر زادی نے اس آواز پر گیدڑ کو کونسا دیا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لی مگر اس کی چھڑی ایسی تھی کہ ایک بار آنکھ کھل جانے کے بعد دوبارہ نہیں آتی تھی۔ پھر بہت دیر سے آتی۔ بہر طور..... وہ کافی دیر تک کروٹیں پھینک رہی تھی پھر اچانک ہی وہ ایک آواز پر



چونک پڑی۔

آواز بڑی عجیب سی تھی۔ صحن کا دروازہ قریب ہی تھا اور یہ عجیب اور نامعلوم سی آواز دروازے کے باہر سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ مچا ہولے سے دروازے کے دونوں پٹ آواز کے ساتھ ہلے۔ امیر زاوی دروازے کو کھٹکے لگی۔ پھر نما سانبان کے ایک بد نما پانس سے بھولتی ہوئی لائین کی دھبی رقائق زدہ روشنی میں اس نے بدستور اپنی نظریں جمائے رکھی تھیں۔ آواز دوبارہ نہیں ابھری۔ امیر زاوی بھی کہ دروازہ ہوا سے ہی ہلا ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ جیسے ہی دوبارہ لینے کی کوشش کرنے لگی تو اچانک دروازے کے باہر سے ایک خرائے دار حیوانی آواز ابھری۔

اب تو امیر زاوی کا ہاتھ ٹھٹکا۔ وہ ایک بہادر عورت تھی تاہم پھر بھی یہی سمجھی کہ باہر کوئی آوارہ جانور یا جنگلی سور ہوگا کیوں کہ مجوروں کا باغ قریب ہی تھا۔ یہ سوچ کر اس نے ایک گہری سانس لی۔

دفعتاً باہر ہولے ہولے خرخرانے کی آوازیں بتدریج ابھرنے لگیں۔ اس پاس کا علاقہ جنگل تھا۔ وہ اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ کوئی آوارہ جانور ہے لیکن اب متواتر خرخرانے کی آواز کے ساتھ ہولے ہولے دروازے کے کھٹکنے پر امیر زاوی چار پائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے پہلے باورچی خانے میں جا کر مسالا پیسنے والا ڈنڈا اٹھایا اور دھیرے دھیرے دروازے کی طرف بڑھی۔

”اسے اب بھگاتا ہی پڑے گا۔“ وہ ڈنڈا تھاے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دانت نہیں کر بڑبڑائی۔

قریب پہنچ کر اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں ڈنڈا پکڑا اور بائیں ہاتھ سے دروازے کی کھڑکی کھول دی پھر فوراً دروازے کا ایک پٹ وا کر دیا۔ اس نے تاریکی میں ایک انسانی بیولا دور جاتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس انسانی بیولے کو دیکھ کر چونکی بھی مٹی اور حیران بھی ہوئی تھی۔ وہ بیولا غائب ہو گیا تھا۔ امیر زاوی کو حیرت اس بات پر تھی کہ وہ کسی جانور کی توقع کر رہی تھی پھر یہ انسانی بیولا کہاں سے آگیا؟ آخر کون تھا یہ؟ پھر اس نے سر جھٹک کر دروازہ بند کر دیا۔ کھڑکی چڑھائی اور مسالے کا ڈنڈا واپس باورچی خانے میں رکھنے کے بعد وہ اپنی چار پائی پر آکر لیٹ گئی۔ باہر اب گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش بھی رک گئی تھی۔

اگلے روز سب بیدار ہوئے۔ امیر زاوی ناشتا وغیرہ

پنانے باورچی خانہ میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد رحمت اللہ اور اس کا بیٹا شاہ رخ غسل وغیرہ کر کے چار پائی پر بیٹھ گئے تب تک امیر زاوی نے چار پائی پر ناشتا لگا دیا اور خود بھی شوہر اور بیٹے کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کرنے لگی۔

”بابا! آج میں بھی آپ کے ساتھ باہر جاؤں گا۔“ شاہ رخ نے اپنے باپ سے کہا۔

رحمت اللہ نے شفقت بھری نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ وہ اس کی کوئی بات رد نہیں کرتا تھا۔ آخر کو اکلوتا اور لاڈلا تھا لہذا پیار سے بولا۔ ”ہاں بیٹا چلتا میرے ساتھ۔“

”تم اسے اپنے ساتھ ہی رکھنا ہاتھ پکڑ کر، نوکروں کے حوالے نہ کرو بیٹا میرے چاند کو۔“ امیر زاوی نے اپنے بیٹے کی پیشانی چوم کر شوہر کو بھیج دیا۔

”میں بھلا اپنے جگر کے ٹکڑے کو خود سے دور کیوں کروں گا تو فکر نہ کر۔“ رحمت اللہ نے بیوی سے کہا۔

امیر زاوی نے اچانک اس سے پوچھا۔ ”شاہ رخ کے بیو! آج بڑ دن مجھے بتا رہی تھی کہ مرستی کا لونگی کے تین مزدوروں کو جنگلی کتوں نے چیر پھاڑ ڈالا ہے؟“

بیوی کی بات سن کر رحمت اللہ بولا۔ ”ہاں، بستی کے لوگ وہاں گئے تھے۔ پولیس بھی آئی تھی لیکن حیرت ہے ہمیں یہاں رہتے ہوئے برسوں بیت چکے ہیں۔ پہلے تو کبھی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔“

”اب جنگلی جانوروں کا کیا بھروسہ، بھوک کی وجہ سے کب خونخواری پر اتر آئیں۔ تم شام ہونے سے پہلے لوٹ آیا کرو۔“ امیر زاوی نے کہا۔ اس کے لہجے سے تشویش مترشح تھی۔

رحمت اللہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”اری نیک بخت! مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ میرے پاس ڈبل بیرل ہندوق ہے اور پھر یہ جانور بے چارے مجھے کیا کہیں گے۔“ وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ امیر زاوی نے اپنے بیٹے شاہ رخ کی بلائیں لیں پھر اسے دعا میں دیتے ہوئے چہرے پر پھونک ماری، اس کے بعد رحمت اللہ نے جیسے ہی دروازہ کھولا باہر کچھ لوگوں پر نظر پڑی جن میں چند افراد زمین پر جھٹک جھٹک کر مکان کے دروازے کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے جیسے کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ ایک چونک گئے۔ امیر زاوی نے فوراً سر پر چادر رکھ کر اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

”کیا بات ہے بھائیو! کیا چور آیا تھا؟ کسی کا کھورا

اس پورے علاقے میں یہ دوسری لرزہ خیز واردات تھی۔ بہتی میں یہ افواہیں تیزی سے گردش کرنے لگیں کہ یہاں کوئی خوبی بلائیں آئی ہے۔ جو دن میں تو کہیں چھپی رہتی ہے مگر رات ہوتے ہی شکار کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔

کھوجوں کے مطابق یہ درندہ عجیب و غریب تھا جس کے بھاری بھرکم پنجوں کے نشانات چار کی بجائے دو تھے۔ وہ ریت کی طرح کا کوئی خونخوار جانور ہے جو دو پیروں پر انسانوں کی طرح کھڑا ہو جاتا ہے۔

ادھر ادھر سفر کمال احمد اور ٹھیکیدار راجا شفیق کو تلے اوپر ہونے والی ان دو وارداتوں نے خاصا پریشان کر ڈالا تھا۔ کیوں کہ مزدوروں اور ورکروں میں کام کے معاملے میں وہ پہلے جیسی تیزی اور تندہی دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔ کام بھی متاثر ہو رہا تھا۔ صورت حال کو دیکھ کر کمال احمد اور راجا شفیق سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

”سچی! اس طرح تو ہمارے کام کو مہینے لگ جائیں گے۔ ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔“ راجا شفیق نے شکر لہجے میں کہا۔

راجا شفیق کی بات سن کر ادھر سفر کمال احمد نے بھی مہرے نظر کے ساتھ کہا۔ ”تم صحیح کہتے ہو۔ میرا خیال ہے اب اس کی رپورٹ حکام بالائیک پہنچانا ہوگی۔“

”جی جناب! نہ صرف یہ بلکہ مدد کی بھی درخواست لکھ دیں اور صاف صاف واضح کر دیں کہ اگر اس کا فوری طور پر سد باب نہ کیا گیا تو کام کا بہت حرج ہوگا۔“

یہ دونوں حسب معمول رات کو سر جوڑے بیٹھے تھے۔ باہر بھتیار اسٹو پر چائے کا پانی چڑھائے ہوئے تھا۔ ہر سو تاریکی اور سنائے کا راج تھا۔

اچانک انہیں باہر بھتیار کی لرزہ خیز سٹائی دی۔ کمال احمد اور راجا شفیق خیسے سے باہر آ گئے۔

کمال احمد کے ہاتھ میں نارنج تھی جب کہ راجا شفیق نے پیٹر ویکس اٹھا لیا تھا۔ ان کی جو سامنے نظر پڑی تو بری طرح لرزائے۔

چائے کا اسٹو اٹھا ہوا تھا اور قریب ہی خون میں لت پت ان کا لٹم بھتیار بری طرح تڑپ رہا تھا۔ کمال احمد فوراً اس کی طرف لگا جب کہ راجا شفیق متوحش نظروں سے چرکی میں آس پاس گھومنے لگا مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔

تلاش کر رہے ہو؟“ رحمت اللہ نے وہیں کھڑے کھڑے پا آواز بلند ان سے پوچھا۔ لوگ کافی تعداد میں تھے اور ان کے چہروں پر خوف اور پریشانی کے تاثرات مترشح تھے۔ وہ اب قریب آگئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے رحمت اللہ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ ”سائیں! آپ کے گھر میں تو خیریت ہے نا؟“

”اللہ کا کرم ہے۔ کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا؟“ رحمت اللہ نے پوچھا۔

”خیریت کہاں..... سائیں!“ ایک دوسرا دیہاتی بولا۔

”کل رات ایک عجیب و غریب اور خونخوار جانور نے خدا بخش کے گھر کا دروازہ توڑ کر اس کے سارے خاندان کو پھاڑ ڈالا ہے۔ پورے چار افراد تھے۔ ماں، باپ اور بہو بیٹا۔“

”کیا..... ایہ..... تو بڑی ہی افسوس ناک اور بری خبر سنائی تم نے؟“ رحمت اللہ نے پریشان ہو کر کہا۔ دروازے کے عقب میں کھڑی امیر زادی بھی یہ سن کر دھک سے رہ گئی تھی۔

”سائیں! اس سے بھی بری خبر ہمارے پاس ہے۔“ ایک تیسرے شخص نے کہا۔ یہ ان دونوں افراد میں سے ایک تھا جو جھکے جھکے زمین پر کسی کے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے۔ یہ کھوجی تھے۔

”وہ کوئی دو پیروں والا جانور ہے۔ یہ دیکھو سائیں کتنے واضح نشانات ہیں اس کے قدموں کے۔“ انہوں نے زمین کی طرف اشارہ کیا۔ ”لگتا ہے وہ یہاں تک پہنچ کر واپس لوٹ گیا تھا۔“

اب رحمت اللہ کے ساتھ امیر زادی کا بھی ہاتھ تھا اسے فوراً رات والا وہ پراسرار انسانی بولا یاد آ گیا تھا۔ امیر زادی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر متوحش ہو کر سوچا کہ اس نے رات میں جس پراسرار بیولے کو دیکھا تھا وہی تو نہیں جن کی یہ لوگ باتیں کر رہے تھے مگر وہ تو بالکل انسان جیسا دکھائی پڑتا تھا۔ وہ دہل گئی۔ اس نے فوراً امیر ہاتھ بڑھا کر اپنے بیٹے شاہ رخ کو اندر کھینچ کر اپنے ساتھ چلا لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد رحمت اللہ نے اپنی بیوی کو دروازہ بند کرنے کا کہا اور پھر خود ابھی آنے کا کہہ کر ان لوگوں کے ساتھ چلا ہٹا۔



”بب..... بختیار..... ملک..... کیا ہوا؟ کس نے تمہاری یہ حالت.....!“ فرط غم سے وہ اپنا جملہ پورا نہ کر پایا۔ بختیار کا ہیٹ اور سینہ بری طرح چاک تھا گردن بھی آدمی ادھیڑ دی گئی تھی۔ چہرہ خون آلود ہو رہا تھا۔ وہ اپنے لب واکر کے کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا۔

”و..... وہ..... جج..... جانور..... جن..... نہیں.....“ وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ اس کی روح تقسّٰی عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ کمال احمد کو اپنے ملازم کی وردیاک موت پر بہت دکھ تھا۔ وہ یوں تو مضبوط دل گردے کا آدمی تھا مگر مرتے وقت اپنے ملازم بختیار کے ان الفاظ نے اسے بھی ایک عجیب قسم کے خوف میں جلا کر دیا تھا۔ بختیار نے مرتے وقت اس خوبیِ معرفت کے بارے میں بتانے کی جس طرح کوشش کی تھی اس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ کوئی درندہ یا جانور نہیں تھا۔

”تو پھر کون تھا وہ.....؟“ کمال احمد سوچنے لگا۔ اوھر راجا شفیق ذرا کمزور دل واقع ہوا تھا۔ اس نے کمال احمد سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ اندر آجائیں کمال صاحب! کہیں وہ خونخوار جانور قریب ہی گھات لگائے نہ بیٹھا ہو، ہمارے پاس تو کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے۔“

”شفیق! ہم اس کی لاش کو بے گور و کفن کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟“ کمال احمد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ایک اور لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ یہ ذرا قریب سے بنے مزدوروں کے غیموں کی سمت سے آئی تھی۔

راجا شفیق اپنا دل تمام کر جیسے کہ اندر دوڑ گیا جب کہ کمال احمد اپنی تاریخ سنبھالے فوراً آواز کی سمت بڑھا۔ مزدوروں میں بھکڑ مچ گئی تھی۔ کمال احمد اسی لمحے کے بل کر پڑا۔

تاریخ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی وہ بھگمئی تھی مگر کمال احمد نے اپنے میں ذرا دیر نہیں لگائی تھی اسے اپنے بالکل قریب ایک خیمے کے باہر کسی انسان کی کھنکھنی چیخوں کے ساتھ خونخوار غراہوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ وہ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے وہے نما ہونے لگا نظر آ رہے تھے۔

تب اچانک ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح انسانی خرخراہٹ ابھری اور ساتھ ہی دھب کی آواز سے کوئی گرا۔ اس وقت کمال احمد کو ایک بھاری بھر کم دھبہ نما کوئی شے اپنی طرف بڑھتی محسوس ہوئی۔ ساتھ ہی زور زور سے خرخراہٹ کی آوازیں ابھریں۔ خطرہ محسوس کر کے کمال احمد نے اس لئے تدبیریں بھانگنے میں ہی عافیت سمجھی اور اندھیرے میں اندھا دھند اپنے خیمے کی طرف دوڑ لگا دی۔

اسے تھوڑی دور تک کسی کو اپنے تعاقب میں آتی ہوئی بھد بھد کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اس کے بعد وہ معدوم ہو گئیں۔ کمال احمد نے اپنے خیمے میں پہنچ کر ہی دم لیا۔

☆.....☆

ایسے پے در پے ہونے والی پراسرار خوشی واقعات کا جادو بہشتی سے لے کر مرتی کالونی تک ہونے لگا تھا۔ گویا خوف و ہراس دونوں طرف تھا۔

بہشتی میں ایک باقاعدہ پکھری قائم کر دی گئی۔ رحمت اللہ نے بہشتی کے چند لوگوں کے ساتھ اپنے زیرے پر ایک نشست لگائی۔ سب لوگ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رائے دینے لگے۔

اکثریت کی رائے یہی تھی کہ یہ خوشی حرکت کسی خونخوار جانور کی ہے تاہم ان لوگوں میں ایک شخص ویسا تھا جس کی رائے برآور کوئی تو متفق نہ ہوا تھا مگر رحمت اللہ کو اس کی بات دل کو لگی تھی۔ اس شخص کا نام خوشی محمد تھا۔ اس نے سب سے آخر میں اپنی رائے دیتے ہوئے کہا تھا۔

”تم سب لوگ ایک اہم بات کو فراموش کر رہے ہو۔“ اس کی بات سن کر سارے لوگ اس کا چہرہ ہنسنے لگے۔

خوشی محمد ایک بچی عمر کا صحت مند شخص تھا۔ بولا۔ ”تم لوگ وزیر خان کو کیوں بھول رہے ہو۔“

”وزیر خان.....؟“ اس کی بات سن کر کئی لوگ زیر لب بڑبڑائے۔

”ہاں! وزیر خان! کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ وہ ایک پانا شکاری ہے؟“ خوشی محمد گویا انہیں یاد دلاتے ہوئے بولا۔ ”تو ایک نے جیسے اپنے تئیں اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے ہنسنے لگا۔“

”مجھے خوب، اب ہم سمجھے تمہارا مطلب..... چونکہ وہ ایک شکاری ہے اس لیے ہمیں اس خون خوار جانور کو ہلاک کرنے کے لیے اس کی مدد کرنی چاہیے۔“

”تم لوگ اب بھی میری بات کا مطلب نہیں سمجھے۔“

خوشی محمد نے اسرار بھرے لہجے میں کہا تو اس بار تعریباً سب ہی چونک کر اس کا چہرہ ٹکٹے لگے۔

خوشی محمد ہولے سے کھٹکھار کر بولا۔ ”وزیر خان کے ڈیرے میں بھانت بھانت کے جانور ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کے ڈیرے کا کوئی جانور کسی وجہ سے باگل ہو کر درندگی پر اتر آیا ہے اور اپنی درندگی کی پیاس بجھا کر واپس وہیں لوٹ جاتا ہے۔“

اس کی بات سن کر پہلے پہل تو سب کو جیسے یلخت ساپ سونگھ گیا۔ اس کے بعد سارے ہی لوگوں نے نفی میں سر ہلا دیے اور یہ خدشہ ذکر دیا۔

مگر رحمت اللہ وہ واحد شخص تھا جسے خوشی محمد کی بات سے خاصی حد تک اتفاق تھا لیکن چونکہ اکثریتی رائے نے خوشی محمد کے اس خیال کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ اس لیے وہ بھی خاموش ہی رہا۔ پھر متفقہ رائے کے مطابق یہ طے پایا کہ دس بارہ افراد رات میں باری باری چہرہ دیں گے جن کے پاس اپنے ذاتی ہتھیار ہیں۔ وہ ہتھیار اٹھا سکتے ہیں وہ نہ ڈٹے، سوئے اور لالچیاں تو سب کے پاس موجود ہی ہوتی چاہئیں۔ نیز یہ لوگ پورے ٹولے کے ساتھ پوری ہفتی کا ساری رات گشت لگاتے رہیں گے اور اس خون خوار جانور کو گھیر کر ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس کے بعد نشست برخاست ہوئی اور لوگ اٹھ کر جانے لگے تو رحمت اللہ نے خوشی محمد کو وہیں روک لیا پھر جب سب لوگ چلے گئے تو رحمت اللہ نے اسے مخاطب کیا۔ ”بھائی خوشی محمد، میں نے وزیر خان کا نام تو سنا ہے اور یہ بھی کہ وہ ایک شکاری ہے لیکن کیا تم مجھے اس کے بارے میں ذرا تفصیل بتا سکتے ہو؟“

”ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں؟“ رحمت بولا۔ پھر بتانے لگا۔

”وزیر خان ایک قریبی بستی میں رہتا ہے جو پانی جھیل کے قریب واقع ہے۔ مجھے ایک بار اس کے ڈیرے کا دورہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ بھی آپ ہی کی طرح مجبوروں کا بیوپاری ہے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں۔ میاں بیوی تھا ہی رہتے ہیں۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی بھی چل رہی ہے۔ صولت خان نامی ایک زمیندار ہے اور وہ بھی وہیں رہتا ہے۔“

رحمت اللہ نے ایک ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔ ”خیر ہمیں بھلا ان دونوں کی دشمنیوں سے کیا لینا دینا۔ تم یہ بتاؤ

کہ اس نے اپنے جنگل ڈیرے پر کس قسم کے جانور پال رکھے ہیں؟“

”زیادہ تر تو میں نے چھوٹے موٹے جانور ہی دیکھے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”ان میں صرف بارہ سنگھ، آئی ٹیکس اور جنگارہ کے علاوہ دیگر چھوٹے موٹے چرند پرند ہیں مگر بڑے بڑے شجرے جن کے نیچے چار پوسے لگے ہوئے ہیں اور دروازہ سلاخ دار ہے میں چند بڑے جانور بھی ہیں مگر انہیں الگ تھلک رکھا گیا ہے جنہیں باقاعدگی کے ساتھ خود وزیر خان خوراک کھلاتا اور انہیں کبھی کبھی باہر بھی نکالتا ہے۔“ اتنا بتا کر وہ رکا اور پھر دائیں بائیں دیکھ کر رحمت اللہ کی طرف جھٹکتے ہوئے اسرار بھری سرگوشی میں بولا۔ ”میں نے تو یہاں تک بھی سنا ہے کہ اس کے پاس ایک ایسا اونٹ بھی ہے جو گوشت خور ہے۔ یہی نہیں بعضوں کے مطابق وزیر خان نے ایک ”مم“ بھی پال رکھی ہے جسے اس نے گھمیر کے شجر ویرانوں سے پکڑا تھا، لوگ کہتے ہیں یہ وہ کوڑ کیر کے گنجان پہاڑی سلسلوں گورگوں سے شکار کیا۔ اللہ جانے سائیں! سچ کیا ہے؟“

”ان خطرناک درندوں کے بارے میں تمہیں کبھی کوئی غموس شواہد ملے؟“ رحمت اللہ نے پوچھا۔

”اسے کچھ لوگوں نے غصے میں آکر یہ کہتے سنا تھا کہ میں ایک روز اپنے دشمن کو قتل کر کے اپنے اس اونٹ کے آگے ڈال دوں گا۔ پھر اس کی لاش کا بھی کسی کو پتا نہیں چلے گا۔“

”دفع کرو۔ یہ سنی سنائی باتیں ہیں تم ایسا کرو کبھی میرے ساتھ وزیر خان کے جنگل ڈیرے تک چلنا۔ ذرا میں بھی وہاں کا جائزہ لوں گا۔“

اس کی بات پر خوشی محمد نے فوراً اپنا اثبات میں ہلا دیا۔

☆.....☆

راجا شفیق ذرا سہا چار پائی پر بیٹھا تھا۔ کمال احمد کو ہانپتا ہوا اندر داخل ہوتے دیکھ وہ فوراً چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کک..... کیا ہوا؟ خیریت تو ہے ناں؟“

”خیریت نہیں ہے! اس درندے نے ایک اور مزدور کا خون گرد کیا ہے۔“ کمال احمد نے ہانپتے ہوئے یہ مشکل کہا۔ ”اور.....“ درندے نے میرا بھی پیچھا کیا تھا مگر میں نکل بھاگا۔“

اس کی پوری بات سن کر راجا شفیق کا چہرہ فق ہو گیا اور



گنت زدہ لہجے میں اس سے بولا۔

”گنگ..... کہیں..... ایسا حق..... تو نہیں کہ.....“

وہ..... یہاں بھی آن دھمکے؟“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اجاگک راجا شفیق کی آنکھیں خوف و دہشت کے مارے پھیل گئیں۔ کمال احمد نے اس کی نظروں کے تعاقب میں اپنے عقب میں دیکھا تو بیڑ ویکس کی روشنی میں خیمے کی دیوار پر ایک بدویت بیولے کا سایا ابھرا اور ساتھ ہی غراہٹ ابھری۔

راجا شفیق نے مارے خوف کے ایک زور دار چیخ ماری اور بدحواس ہو کر خیمے سے باہر دوڑ گیا۔

خیموں میں شور مچ چکا تھا مگر کسی کو یاہر نکل کر صورت حال کا جائزہ لینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اگلے روز ہی مزدور باہر نکلے۔ ان کے خیموں سے کچھ دور راجا شفیق کی لاش کھلے آسمان تلے پڑی تھی۔

☆.....☆

ریلوے پل کی مرمت کا کام اب مکمل طور پر بند ہو چکا تھا۔ مزدوروں اور ورکروں نے احتجاجاً ہڑتال کر دی تھی۔ بلکہ کچھ تو اب واپس شہر اپنے گھروں کی طرف لوٹنے کے لیے پرتولنے لگے تھے کیونکہ سب ہی کو اپنی جانوں کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس انتہائی مخدوش صورت حال نے اور سیکر کمال احمد کو بری طرح پریشانی سے دوچار کر دیا تھا۔ اپنے ملازم، بھتیجا اور ٹھیکیدار راجا شفیق کے عبرت ناک انجام پر اسے بے حد دکھ تھا۔ اس جگر خراش واقعے کے بعد مزدوروں نے شور مچانا شروع کر دیا اور وہ سب کمال احمد کے خلاف نعرے لگانے لگے کہ اس نے پہلے واقعے کے بعد حکام بالا سے مدد لینے پر جان بوجھ کر تامل سے کام کیوں لیا تھا۔

اپنے انجینئر کو مشغول مزدوروں کے پھرے مجمع سے بچانے کی خاطر کئی ورکر بھی زخمی ہو گئے۔ مشغول مزدوروں نے جیب کو بھی آگ لگا دی اور یوں ریلوے پل کی تعمیر کا پورا عملہ تخریب ہو گیا جس کو جدھر راستہ ملا۔ منہ اٹھائے وہ ڈنوا۔ اس شور شرابے پر بستی کے لوگوں نے بڑی مشکلوں سے مشغول مزدوروں کے ہجوم پر قابو پایا۔

☆.....☆

متعلقہ محکمے کے دو آدمیوں کے ساتھ تین سپاہیوں اور ایک انسپکٹر پر مشتمل تفتیشی ٹیم بھی زیر مرمت ریلوے پل کی مرمتی کالونی آ پہنچی تھی۔ انہوں نے کمال احمد اور چند

مزدوروں کا تفصیلی بیان لیا۔ یہ لوگ پولیس کی ایک موبائل ڈانس گاڑی میں آئے تھے۔

متعلقہ محکمے کے دونوں افسروں کا نام زیر درانی اور شمشاد بیگ تھا جب کہ انسپکٹر غلام علی تھے۔

”حالات بہت خراب ہو گئے ہیں جناب! ٹھیکیدار راجا شفیق کی ہلاکت کے بعد تو مزدوروں اور ورکروں نے احتجاجاً کام بھی بند کر دیا ہے۔“ کمال احمد نے تفتیشی ٹیم کو یہاں کے مخدوش حالات سے آگاہ کرتے ہوئے تشویشناک لہجے میں کہا۔ ”اگر اس صورت حال پر جلد قابو نہ پایا گیا تو مین لائن کا کام شدید متاثر ہو سکتا ہے۔“

افسر شمشاد بیگ نے پوچھا۔ ”کیا کسی نے اس خون خوار ورنہ کو دیکھا ہے؟“

”نہیں سر! بس ہلکی سی جھلک ہی دیکھی ہے۔ میں نے بھی اس کا ہیولا دیکھا تھا مجھے تو وہ دو بیروں والا کوئی گوریلا ٹائپ چاٹور لگا تھا۔“

”حیرت کی بات ہے کیا وہ خون خوار چاٹور اتنا چالاک اور پھر پتلا ہے کہ خاموشی کے ساتھ یہ کارروائی کر کے فوراً ہی غائب ہو جاتا ہے؟“ دوسرے افسر زیر درانی نے خاصے حقیر آمیز لہجے میں کہا۔

”جی ہاں جناب! کچھ ایسی ہی بات ہے۔“

”یہاں تو آس پاس بستیاں بھی ہیں، کیا وہاں کے لوگوں نے اپنے طور پر کچھ نہیں کیا ابھی تک؟“ انسپکٹر غلام علی بولا۔

جواباً کمال احمد بولا۔ ”ہو سکتا ہے وہ اپنے طور پر کچھ نہ کچھ تدارک کر رہے ہوں۔“

”کیا یہ خونیں وارنٹیں ایک ہی بستی تک محدود ہیں؟“

”جی سر! وہ سامنے والی بستی، کھجوروں کے باغ والی۔“ کمال نے سامنے اشارہ کیا۔ یہ لوگ پھولدار یوں کے باہر بھی فولڈنگ چیئرز پر بیٹھے تھے۔ کمال احمد نے مزید بتایا۔ ”مگر ہم بھی اس درندے کی بربریت کا نشانہ بنے ہیں۔“

”انسپکٹر صاحب! مجھے تو لگتا ہے یہ کسی پراسرار درندے کا کام نہیں ہے بلکہ یونہی کسی نے دانستہ دہشت پھیلا دی ہے۔ آج کل دشمنیاں نکالنے کا یہی ڈھنگ رائج ہے۔ کیا آپ جج سے کچھ سال پہلے ہتھوڑا گروپ کی ایسی لرزہ خیز اور پراسرار کارروائیاں بھول گئے۔ کسی نے اپنے

ڈکرانے لگے۔ جوان شخص جس کا نام روشن خان تھا وہ بیلوں کو کھدڑنے کے لیے ان پر چابک مارنے لگا۔  
 ”تاہت! نا! اسے چابک نہ مار، یہ بے زبان ہیں پیارے انہیں کھدڑ۔“ اس کے بوڑھے باپ نے بیٹے سے کہا۔  
 بیٹا غصیلے مزاج کا تھا۔ جھٹا کر بولا۔ ”بابا! پتا نہیں کیا ہو گیا ہے ان کو آگے بڑھنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔“  
 ”اچھ تو ادھر ہو رو شو! میں سنہاتا ہوں۔“ بوڑھے نے کہا اور بیٹے کی جگہ سنہال لی۔

دشمن کا سر بھاڑ کر ہلاک کر دیا تو ایسی وارداتیں پے در پے ہونے لگیں اور ہر کوئی اپنی دشمنیاں نکالنے لگا اور جرم اتھوڑا گروپ کے کھاتے میں ڈالا جانے لگا۔ ”زہیر درانی نے کہا۔ اس کی بات سب کو معقول لگی تھی۔

”میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔“ انسپکٹر غلام علی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”میں بستی جا کر لوگوں کے بیانات قلمبند کروں گا پھر متعلقہ تھانے کی پولیس سے ملوں گا۔ اس کے لیے کوئی لائحہ عمل اختیار کرنا پڑے گا۔“  
 اس کی بات سن کر کمال احمد نے اپنے افسر شمشاد بیگ سے کہا۔ ”سر! آپ ذرا ورکروں اور مزدوروں کو مطمئن کر دیں تاکہ وہ کام تو شروع کر دیں اور میرا خیال ہے اب یہاں سکیورٹی کا انتظام بھی کرنا پڑے گا۔“  
 شمشاد بیگ اور زہیر درانی نے ورکروں اور مزدوروں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے انہیں سلی تقاضی دیتے ہوئے اس بات کا یقین دلایا کہ انہیں اب گھبرانے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پولیس کو ان کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا جائے گا۔ ساتھ ہی انہوں نے مزدوروں سے کام شروع کرنے کی بھی درخواست کی۔  
 متعلقہ محکمے کے افسروں اور اسپیشل پولیس ٹیم کی آمد سے مزدوروں اور ورکروں میں کچھ حوصلہ ہوا اور رکا ہوا کام پھر سے شروع کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ تفتیشی ٹیم باقی کام نمٹانے کے لیے پولیس موبائل میں بیٹھ کر بستی کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆.....☆

رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل بچھائے ہوئے تھے۔ کچے راستے پر تیل گاڑی چلی آ رہی تھی۔ تیل گاڑی کے چوٹی تختے کے نیچے لائٹیں جھول رہی تھی اور اس میں چار افراد موجود تھے۔ ایک بوڑھا شخص تھا باقی دو میاں بیوی تھے۔ بوڑھے کا بیٹا اور اس کی بیوی جب کہ چوتھا ان کا سات سالہ لڑکا تھا جو اچانک بیمار پڑ گیا تھا۔ یہ لوگ ایک حکیم کے گھر سے دوا لے کر واپس اپنے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔

کھیتوں کے درمیان غل کھاتے کچے راستے پر تیل گاڑی دھیمی رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ تیل گاڑی جو ان شخص چلا رہا تھا جب کہ چوٹی تختے پر پھونس بھی رہی پر اس کا بوڑھا باپ اور بیوی بیٹھے تھے۔ نو عمر بیمار لڑکا ماں کی گود میں سر دھے سو رہا تھا۔ اس کے اوپر ایک رلی ڈالی ہوئی تھی۔ اچانک بیلوں نے چلنا بند کر دیا اور وہ بے چینی سے

ماہنامہ سرگزشت

**قارئین متوجہ ہوں**

**پرچا**

**نہیں ملتا**

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ ہر چاند ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ **ایک سال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔**

☆ **شہر اور علاقے کا نام۔**

☆ **ممکن ہو تو ایک سال کا FICOL یا میسجنگ فون نمبر**

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

**نصر عباس**

03012454188

**جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز**

**سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت**

**33-عزیز پور، سندھ، پاکستان**

**35802552-35386783-35804200**

**ای میل: jdpgroup@hotmail.com**



روشن علی اپنی بیوی کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ بوڑھے نے ہانگ سنبھال کر بیٹوں کو نکارا۔ عمر بے سود۔ انہوں نے تو جیسے آگے نہ بڑھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

بوڑھے کے چہرے پر الجھن کی طاری ہو گئی۔ وہ نیچے اتر اور بیلوں کے قریب جا کر اس کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا پھر یہ غور ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے تجربے نے فوراً بتا دیا کہ یہ معصوم سے جانور کسی ناویدہ شے سے خوف زدہ تھے۔ اس نے تیل گاڑی کے تھنچے کے نیچے جھپکتی ہوئی لائین اتاری اور اسے ہاتھ میں لے کر ذرا آگے بڑھا اور زمین پر روشنی کر کے دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دونوں تیل کی سانپ کو دیکھ کر کے ہیں۔

اچانک بوڑھے کو اپنے دائیں جانب کی خود رو جھاڑیوں سے ایک حیر خراٹے دار آواز سنائی دی۔ وہ لائین اٹھائے اس طرف مڑا ہی تھا کہ ایک زوردار غراہٹ کے ساتھ اسے ایک بھاری بھرکم ہولا بھولا نظر آیا۔ اس ہیولے نے اپنے ہاتھ کے نوکیلے ناخنوں والا پنجرا کی گردن پر اس زور سے رسید کیا کہ بے چارے بوڑھے کی نصف گردن ادھر کر رہ گئی۔ اس کے حلق سے کرب ناک چیخ خارج ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر مڑا۔ اس کے جوان بیٹے نے باپ کی دلدادہ چیخ سنی۔ وہ فوراً کلباڑی سنبھالے تیل گاڑی سے کودا۔ لائین زمین پر گر رہی ہوئی تھی۔ وہ ابھی بھی نہیں تھی مگر اس کی لٹو ڈوب رہی تھی۔ وہی روشنی میں روشن علی نے اپنے باپ کو بے سدھ زمین پر پڑے پایا۔ اس کی گردن سے تیزی کے ساتھ خون بہہ رہا تھا۔ روشن علی کو اپنے سامنے صرف پندرہ سولہ گز کے فاصلے پر وہ ہولا نظر آ گیا۔ روشن علی ایک بہادر نوجوان تھا۔ اس نے سب سے پہلے لائین اٹھانا چاہی مگر اس ہیولے نے زوردار غراہٹ کے ساتھ اس پر حملہ کر دیا۔ روشن علی نے دونوں ہاتھوں سے کلباڑی تھام کر اس درندے پر دار کرنا چاہا مگر درندے نے اسے پہلے ہی چھاپ لیا۔ روشن علی کو اپنے نتھنوں میں سخت بدبو کا محسوس ہوا محسوس ہوا۔

ہیولے نے اسے اپنے طاقت ور ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ تیل گاڑی میں موجود عورت نے رونا چلانا شروع کر دیا۔ ٹھیک اسی وقت آسمان پر بادلوں کی زوردار گڑگڑاہٹ ابھری اور ساتھ ہی بڑے زور سے بجلی چمکی۔ بیلوں نے جھرا کر دوڑ لگا دی۔ عورت نے اس چمکتی ہوئی آسمانی بجلی میں بھیا تک منظر دیکھا۔

دوڑتی ہوئی تیل گاڑی میں بیٹھی اس عورت نے قریب سے گزرتے ہوئے آسمانی بجلی کی لگاتی چمک میں وہ بھیا تک منظر دیکھا۔ اسے کوئی بھاری بھرکم عجیب و غریب وجود نظر آیا تھا۔

خوف اور بدحواسی کے باعث اس قلیل سی پلک جھپکتی روشنی میں وہ صرف اتنا ہی دیکھ پائی تھی۔ عورت نے اپنے شوہر کا انجام بھی اپنی دہشت کے مارے ہنسی ہنسی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ جسے وہ دو بیروں والی عجیب الفتت بلا اپنے لمبے چوڑے بازوؤں میں دبوچے مسل رہی تھی۔ اس کے بعد تیل گاڑی دو رتک دوڑتی چلی گئی۔

اس بھیا تک واقعے نے اس بستی کے لوگوں کو بھی لرزا کر رکھ دیا۔ صبح پو پھٹتے ہی لوگوں نے بد نصیب عورت کے ساتھ جا کر جائے وقوعہ کا جائزہ لیا اور عورت سے بھی پوچھا۔ اس بد نصیب عورت نے وہی کچھ بتایا جو وہ بتا چکی تھی۔ وہاں دونوں باپ بیٹوں کی اوھڑی ہوئی لائینیں پڑی ملی تھیں۔

کھوجیوں نے بیروں کے نشانوں سے اس خون خوار درندے کے متعلق وہی اندازہ قائم کیا تھا جو کھجوروں والی بستی کے کھوجیوں نے ان عجیب و غریب بدو شیع بیروں کے نشان بات کو دیکھ کر لگا یا تھا کہ یہ کسی ایسے عجیب و غریب شے کے خون خوار درندے کے پاؤں تھے جو دو بیروں پر کھڑا ہو سکتا تھا مگر عورت کے بیان کے مطابق یہ جانور چوپایا نہیں تھا۔ لوگوں میں ایک ہراس سا پھیل گیا تھا کہ جانے یہ کیسی بلا تھی۔ اس کا تعلق بہر حال جانوروں اور درندوں کے قبیل سے محسوس نہیں ہوتا تھا۔

اس طرح دوسری اور پھر تیسری واردات بھی اس بستی میں رونما ہوئی۔ عام طور پر یہاں کی بستی کے لوگوں میں بھی خوف و ہراس کی فضا قائم ہو چکی تھی۔

جب اس دوسری اور تیسری وارداتوں کی اطلاع رحمت اللہ تک پہنچی تو اسے پورا یقین ہو گیا کہ ہونا ہو اس پر اسرار بلا کا تعلق وزیر خان سے ہے۔ اب وہ اپنے اس پائنتو درندے کے ذریعے پہلے اپنے دشمن کی بستی میں دو دشمن عام سی وارداتیں کروائے گا اور پھر اس کے بعد یہ حملہ صولت علی کے خاندان کے کسی فرد پر بھی ہو سکتا تھا۔ وہ اسی وقت کھودہ بستی پہنچا اور وہاں کے امیر زمیندار صولت علی سے اوطاق حاکم کے ملاقات کی۔

☆.....☆

رحمت اللہ کے منہمی وزیر خان کے برٹکس منسار اور



خوش اخلاق محسوس ہوا۔ صولت ایک تندرست اور جوان سا شخص تھا۔ وہ اس وقت کڑکڑاتی کلف لگی شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ رحمت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے پہلے اسے یہی بتایا کہ اس پر اسرار درندے کی خونی وارداتوں کی ابتداء اس کی بہتی سے ہوئی تھی۔ رحمت نے ابھی اپنے مطلب کی بات کو محفوظ رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

”سائیں! ہم سب لوگوں کا یہی خیال ہے کہ وزیر خان نے اپنے ذاتی جنگل ڈیرے میں جو پالتو جانور رکھے ہوئے ہیں ان میں چند خون خوار درندے بھی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان میں کوئی درندہ پاگل ہو کر بھاگ نکلا ہو اور اب وہ خون آلودی برائے آیا ہو؟“

صولت علی نے بغور رحمت کی بات سنی اور چند لمحے کی پرسیج خاموشی کے بعد بولا۔ ”ممکن ہے۔۔۔ مگر ہم جب تک اس درندے کو پکڑیں گے نہیں، ہمیں کیسے معلوم ہوگا؟“ تب رحمت نے اس کی تائید پا کر کہا۔ ”سائیں! میں نے سنا ہے کہ آپ کی وزیر خان سے کوئی پرانی دشمنی بھی چلی آ رہی ہے؟“

اس کی بات سن کر صولت کے چہرے پر ناموار تاثرات ابھرے اور وہ اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”ہاں! ہماری اس سے دشمنی کی وجہ بھی یہی تھی کہ سب سے پہلے ہم نے ہی اس پر یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ اپنے پالتو جانوروں میں بالخصوص درندوں کو نہ رکھے۔ اس سے پہلے اس کے جنگل ڈیرے کی حدود ہماری جاگیر تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہماری مخالفت کی ابتداء اس وقت ہوئی تھی جب اس کے جنگل ڈیرے سے ایک ہاتھی پاگل ہو کر ہمارے کھیتوں میں گھس آیا تھا اور ہماری ساری فصلیں نہ صرف تباہ کر ڈالی تھی بلکہ ہمارے کسانوں کو بھی بری طرح زخمی کیا تھا۔ ہم نے فوراً اس پاگل ہاتھی کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ اس کے بعد اس کے جنگل ڈیرے سے ایک چیتا بھاگ نکلا تھا۔ تب سے ہم نے اس کی مخالفت شروع کر دی تھی اور انتظامیہ کو اس کے خلاف رپورٹ کر دی۔ اس کے بعد وزیر خان نے ہمیں قتل کی دھمکیاں دینا شروع کر دی تھیں کیوں کہ انتظامیہ نے اس کے خلاف سخت ایکشن لیا تھا اور اسے مجبوراً جنگل ڈیرے کی نصف حدہ کو خالی کرنا پڑا تھا۔“

وہ تفصیل بیان کرنے کے بعد خاموش ہوا تو رحمت نے فوراً اصل بات کہہ ڈالی۔ ”سائیں! میرے دل میں اس لیے یہ شک ابھرتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے اپنے

جنگل ڈیرے کے کسی درندے کو جان بوجھ کر ان خون آشام وارداتوں پر لگا دیا ہو اور اس کی آڑ میں وہ کوئی اپنا دیرینہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہو؟“

صولت علی پھر بھی اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا اور بولا۔ ”کیا مطلب؟ ذرا کھل کر بات کرو۔“

”سائیں! آپ برہمت مائیے گا۔ کچھ ایسا لگتا ہے کہ دو ہاتھیلوں کی اس سرد جنگ میں ہم بے گناہ ٹوگ مارے جا رہے ہیں۔“ رحمت نے اتنا کہا اور لمحہ بھر متوقف کے بعد دوبارہ بولا۔ ”شاید آپ کو میرے اس خیال سے اتفاق ہو کہ مجھے لگتا ہے وزیر خان آپ سے اپنی دشمنی کو بھولا نہیں ہے۔ وہ آپ سے خفیہ اور گھٹاؤنے طریقے سے دشمنی نکالنے کا ارادہ رکھتے ہوئے ہے۔ وہ اپنے اس خون خوار درندے سے چند خونی وارداتیں کروانے کے بعد آپ کو بھی اس پر اسرار درندے کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ میرے اس خیال کو تقویت اس طرح بھی ملتی ہے کہ اب پچھلے چند روز سے آپ کی جاگیر میں ایسی دو تین لرزہ خیز وارداتیں ہوئی ہیں اور اب آئندہ اس درندے کا کون نشانہ بن سکتا ہے اس کا آپ خود اندازہ کر لیں۔“ رحمت اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا مگر اس کی بھانپتی ہوئی نظریں صولت علی کے چہرے پر مرکوز تھیں جہاں سبزی سے تاثرات تبدیل ہونے لگے تھے۔ پھر اس نے دیکھا ان تاثرات میں غیظ کا تاثر غالب نظر آنے لگا۔ وہ اس لمحہ میں رحمت اللہ سے بولا۔

”اگر یہ بات ہوئی تو میں وزیر خان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

رحمت اللہ فوراً بولا۔ ”سائیں! میرا مقصد آپ دونوں کو لڑواتا ہرگز نہیں ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ معاملے کا کھوج لگایا جائے اس کے بعد اگر وزیر خان مجرم ثابت ہوا تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔“

”شاید یہی طریقہ بہتر رہے گا۔“ بالآخر صولت علی نے اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ رحمت اللہ کو اس کی افہام و تفہیم والی طبیعت پسند آئی۔

”رحمت اللہ! اب تم ہی بتاؤ کہ اس درندے کا کس طرح کھوج لگایا جائے؟“ صولت علی نے چند چہرے خاموش رہنے کے بعد اس سے پوچھا۔

”مجھے یقین ہے کہ وہ خونی درندہ ایسی خوف ناک وارداتیں کرنے کے بعد کہیں وزیر خان کے جنگل ڈیرے میں پناہ لیتا ہوگا۔ یہ کام اب مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ صرف



محتاج رہیں اور بستی والوں کی حفاظت کے اقدامات پر توجہ دیں باقی میں دیکھ لوں گا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور رخصت چلائی۔

صوبت علی نے گرم جوشی کے ساتھ اسے رخصت کیا اور ساتھ ہی ہر ممکن تعاون کا بھی اسے یقین دلایا۔

☆.....☆

رحمت نے اپنی بیوی امیر زادی کو اپنی اس خطرناک مہم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جس پر وہ آج شام عمل کرنے کا پکا ارادہ کر چکا تھا تاہم اپنی غیر موجودگی کے سلسلے میں اسے اپنی بیوی کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔

رحمت کا ارادہ سر شام وزیر خان کے جنگل ڈیرہ کی طرف نکلنے کا تھا۔ رحمت کو چونکہ اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ خونی درندہ اس کی بستی کا رخ نہیں کرے گا تاہم پھر بھی جب شام کے آٹھ نمودار ہونے لگے تو اس نے اپنی بیوی امیر زادی کو گھر میں محتاط ہو کر رہنے کی تاکید کی اور اسے کسی دوست کے ہاں ملنے کا یہاں نہ کر کے گھر سے نکل پڑا۔

اس نے اپنے ساتھ ایک عدد تارچ رکھ لی تھی چنانچہ وہ اپنی گھوڑا گاڑی پر سوار ہو کر اللہ کا نام لے کر نکل پڑا۔ جنگل ڈیرے کی حدود میں پہنچ گیا۔ کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر گھر سے نکلنے وقت اس نے ایک عدد دیو اور بھی رکھ لیا تھا جس کے جیبیر میں چھ گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ ایک عدد کھلاڑی بھی اس نے ساتھ رکھ لی تھی۔

جنگل ڈیرے کے آس پاس نیکر کا جنگل اور قد آدم خود رو جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ وہ جنگل ڈیرے کے قریب پہنچ کر گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں رک گیا۔ آسمان صاف تھا۔ ابھی اندھیرا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ اس نے جھاڑیوں کی اوٹ سے جنگل ڈیرے کے بڑے سے چوٹی گیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں وہی کن پلازار چوکیدار قریب ہی ایک چارپائی پر نیم دراز ریڈیو کان سے لگائے موسیقی سن رہا تھا۔

دروازہ بند تھا مگر اس پر قفل نظر نہیں آ رہا تھا۔ رحمت چند ثانیے وہاں چھپا کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس کے بعد اندھیرا جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا۔

اپنی گھوڑا گاڑی اس نے تھوڑے فاصلے پر کھڑی کر کے گھوڑے کے منہ پر چارے کا "توڑا" لگا دیا تھا۔ تاکہ وہ زور سے منٹائے نہیں اور اندر ہی چارہ پگھلنے میں مصروف رہے۔

بہر طور.....! وہ گیٹ سے کافی دور آ گیا تھا۔ یہاں اب خاردار باڑھ نظر آرہی تھی۔ خاردار باڑھ کی یہ دیواریں دس بارہ فٹ بلند تھیں۔ آہنی باڑھ کو اس طرح جالی دار بنا کر لینا گیا تھا کہ کوئی اس میں داخل نہ ہو سکے۔

مگر رحمت نے کسی بھی طرح اندر داخل ہونے کا تہیہ کر رکھا تھا اگرچہ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک خطرناک کام کر رہا تھا کیوں کہ اگر وہ وزیر خان کے کسی آدمی کی نظروں میں آ گیا تو مصیبت میں پڑ سکتا تھا لہذا اس نے ہر لحاظ سے خود کو محتاط رکھنے کی بھی کوشش کی تھی۔

جنگل ڈیرے کا رقبہ بہت طویل تھا۔ رحمت چلتے چلتے تھک کر رک گیا مگر اسے اندر داخل ہونے کی کوئی چور جگہ یا گوشہ نظر نہیں آیا۔ وہ چند ثانیے وہاں ہونٹ بیچنے کھڑا کچھ سوچتا رہا اس کے بعد وہ واپس پھانگ کی جانب پلٹا تو اچانک اسے ایک گھر گھرائی آواز سنائی دی۔

وہ بری طرح ٹھٹک گیا۔ وہ گیٹ سے ابھی خاصا دور تھا لیکن اس نے جب اس گھر گھرائی آواز کی سمت دیکھا تو اسے سامنے کسی گاڑی کی تیز روشنی دکھائی دی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پھر وہ ایک لمحہ بھی وہاں نہ رہا اور اس طرح تیز تیز قدموں سے جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا آگے بڑھتا رہا پھر جب وہ گیٹ کے تھوڑا نزدیک پہنچ کر رکا تو اس نے دیکھا وہ وزیر خان کی جیب تھی جو اب گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

رحمت بہ غور آنکھیں میکر کر دیکھنے لگا۔ اسے وزیر خان کی جھٹک نظر آئی تھی۔ جیب اندر داخل ہوئی تو رحمت نے بھی اپنی جگہ سے حرکت کی وہ ذرا اور آگے بڑھا پھر اس نے چھپ کر جھاڑیوں کی اوٹ سے گیٹ کی طرف دیکھا جس کے دونوں دیو پیکل پٹ کھلے ہوئے تھے۔ جیب اندر جا چکی تھی جب کہ وہ ممکن بردار چوکیدار تن کر کھڑا تھا۔ اس کا جھوٹا ساریڈیو اب چارپائی پر سر ہانے کے قریب رکھا نظر آ رہا تھا۔

رحمت اللہ دھڑکتے دل کے ساتھ وہیں چھپا کھڑا رہا۔ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔

ذرا دیر بعد اسے دوبارہ جیب کی آواز سنائی دی۔ اس کے عذاب تن گئے۔ وزیر خان شاید اپنی جیب میں واپس آ رہا تھا۔ رحمت نے دیکھا جیب گیٹ سے جیسے ہی نمودار ہوئی اسے کسی حوالہ خوار جانور کے غرآنے اور وقفے وقفے سے دھاڑنے کی آواز سنائی دی۔ جیب باہر آ کر موڑ کاٹنے



رک مٹی تو رحمت اللہ نے دیکھا جب کے پیچھے وہی روں کی آمد ورسد والا ٹرار بھی تھا اور اس کے اندر اسے شیر نظر آیا۔ حالانکہ اس سے پہلے جب رحمت نے جب سے دیکھا تو اس کے عقب میں ٹرار تھی نہ تھا۔ کسی کے تحت اس کا دلی یکبارگی زور سے دھڑکا تاہم اب بغور اپنی آنکھیں سیکڑے ٹرار کے اندر اس غراتے رھاڑتے شیر کو نگے جارہا تھا جو انتہائی غضب ناک نظر آ رہا تھا۔

رحمت اللہ جب ٹرار سے کم و بیش پچیس تیس گز کے فاصلے پر تھا۔ جب ابھی تک رکی ہوئی تھی اس کے بعد رحمت اللہ نے وزیر خان کو جب سے اترتے دیکھا۔ وہ ٹرار پر رکھے آگنی بنجرے میں غضب ناک انداز میں شیر کو ادھر ادھر ہو کر دیکھ رہا تھا۔ وزیر خان چند ٹاپے اسے دیکھتا رہا اور پھر کچھ سوچ کر دوبارہ جب میں سوار ہو گیا۔ اس کے بعد جب آگے روانہ ہوئی۔

رحمت اللہ سمجھ گیا کہ یہی وہ خون خوار اور پاگل درندہ تھا جس نے پورے علاقے میں وحشت مچا رکھی تھی مگر باوجود اس کے وہ پوری طرح مطمئن نہ تھا۔ اس کے ذہن میں جس خون خوار پراسرار درندے کا خاکہ تیار تھا اس پر یہ پورا نہیں اترتا تھا۔ وہ سوچ میں گم اپنی گھوڑا گاڑی میں سوار ہو گیا۔

رحمت اللہ کی مقدور بھرکوشش یہی تھی کہ وہ کم از کم جب کی سمت کا قین تو ضرور کر لے کہ وہ کس طرف مڑتی ہے جب بھاری بھر کم ٹرار کی وجہ سے وہی رفتار کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ رحمت کو اُمید تھی کہ وہ جب کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دے گا۔ پھر اچانک اسے جب ٹرار سمیت دائیں جانب ایک چٹیل میدان کی طرف مڑتی ہوئی نظر آئی۔ یہاں چھدری چھدری جھاڑیاں لگتی ہیں نظر آرہی تھیں۔ تب پھر اس نے اچانک جب کو رکے دیکھا تو وہ بھی ذرا دور جا کر رک گیا۔ گھوڑا گاڑی ایک طرف روک کر وہ نیچے اتر آیا۔ اب وہ زمین پر چھدری چھدری جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کے قریب چھپ کر بیٹھ گیا۔

اس نے دیکھا وزیر خان جب سے اترتا تو اس کے دو خدمت گار ساتھی بھی نیچے اترے۔ ان کے ہاتھوں میں انتہائی طاقت ور راکٹس تھیں۔ وزیر خان کے ہاتھ میں بھی راکٹ نظر آرہی تھی۔

رحمت اللہ اپنی جگہ دم سادھے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے دیکھا کہ وزیر خان اور اس کے دونوں ساتھی

ٹرار کی چھت پر چڑھ گئے اور پھر ایک نے اوپر سے سلاح دار ووازہ اوپر اٹھا لیا۔ شیر غضب ناک غراہٹ کے ساتھ باہر کودا۔

رحمت اللہ کے پورے وجود میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اسے یہ ڈر ہوا کہ کہیں وہ شیر دھاڑتا غراتا ہوا اس کی ہوسگھٹ یہاں نہ آجائے لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے دیکھا کہ وہ شیر ٹرار پر رکھے بنجرے سے کود کر ایک طرف بھاگا۔ چھت پر موجود وزیر خان نے اپنی راکٹ سے اس کا نشانہ باندھا اور گولی چلا دی۔ کان پھاڑ دھماکا ہوا۔ جس سے اس پاس کا علاقہ گونج اٹھا۔

گولی شیر کے کسی ایسے نازک مقام پر لگی تھی کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وزیر خان نے احتیاطاً ایک اور گولی داغ دی۔ شیر کے تن مردہ میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی تو وہ تینوں چھت سے نیچے اتر آئے۔

اس کے بعد وزیر خان کے دونوں ساتھیوں نے مردہ شیر کے وجود کو ڈنڈاؤلی کر کے اٹھایا اور واپس ٹرار پر رکھے بڑے سے آگنی بنجرے کے اندر پھینک دیا اور دوبارہ جب میں سوار ہو گئے۔ اب جب واپس جنگل ذریہ کی طرف جا رہی تھی۔ رحمت اللہ کو سمجھ میں یہ سب نہ آسکا تھا۔ اس کے چہرے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی الجھن آمیز تاثرات مترج ہو رہے تھے۔

بہر طور واپس پلٹا۔ اپنی گھوڑا گاڑی میں سوار ہوا اور روانہ ہو گیا۔

شام اب رفتہ رفتہ رات کی تاریکی میں بدلنے لگی تھی۔ شکر تھا کہ آسمان صاف تھا اور چاند کی روشنی سے اطراف کا علاقہ مقدور بھر روشن تھا۔ رحمت اللہ گھوڑا گاڑی کو مناسب رفتار سے دوڑائے جارہا تھا۔ اس کا رخ اب اپنے گھر کی جانب تھا۔ اس کا دل و دماغ نہ جانے کیوں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ انجاناً خوف تھا جو اسے جکڑے ہوئے تھا۔ وہ شاید اس خوفی درندے سے خوف زدہ ہو رہا تھا۔ پھر ابھی وہ اپنے گھر سے ذرا دوری پر تھا کہ اسے کچھ لوگوں کا ہچکچاہٹ بھرا ہجوم نظر آیا۔ وہ دوڑتا ہوا ان کے قریب پہنچا۔ گھوڑا گاڑی اس نے ایک قریبی درخت سے باندھ دی تھی۔ اس قریب وہ بنجرے انکشاف ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وہ خوفی درندہ ایک شخص کو ہلاک کر کے بھاگا تھا۔

رحمت اللہ نے اس شخص کو اس کا حاقب کرنے کو کہا۔ ان سب کے ہاتھوں میں پائے بڑے لٹھے، سونٹے اور



کھڑیاں تھیں۔ رحمت اللہ نے بھی اپنی کھڑی ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔

یہ لوگ سب ایک جلوس کی صورت میں دوڑے چلے جا رہے تھے۔ ان کی تعداد چند سو سے زیادہ تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جو رات کو جاگ کر باری باری پہرہ دیتے تھے۔ مرنے والا شخص بھی انہی میں سے ایک تھا۔ غم و غصے کے باعث ان لوگوں کے چہروں سے غیظ مترشح تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آج ان لوگوں نے اس خونی درندے کو ہلاک کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

مگر کافی تلاش بسیار کے بعد وہ درندہ انہیں کہیں نظر نہ آیا تو رحمت اللہ نے ان لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے چار چار افراد کی ٹولیاں بنا کر اس خونی درندے کے تعاقب میں جانے کا حکم دیا۔ لوگوں کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ وہ درندہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔

یوں یہ سب لوگ چار چار افراد کی ٹولیوں میں بٹ کر چار مختلف سمتوں کی طرف بڑھ گئے۔ رحمت اللہ بھی اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ چوتھی سمت کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ انہیں ایک تیز تر زہ خیز انسانی چیخ سنائی دی۔ چیخ کی آواز زیادہ دور سے نہیں آئی تھی ان چاروں نے چیخ والی سمت کی طرف دوڑ لگا دی۔

دفعتاً انہیں ایک دوسری چیخ بھی سنائی دی۔ اس بار چیخ کی سمت ..... دائیں جانب سے سنائی دی تھی۔ یہ لوگ ر کے بغیر دوڑتے رہے۔ اچانک انہیں سامنے سے گرتا پڑتا دوڑتا ہوا ایک شخص آتا دکھائی دیا۔ چاند کی مدھم روشنی میں یہ لوگ اسے اپنے آدی کی حیثیت سے پہچان گئے تھے۔ وہ بری طرح خواس ہاتھ اور خوں زدہ تھا۔

یہ چاروں ٹھٹک کر رہ گئے جب انہوں نے ایک جگر خراش منظر دیکھا۔ دوڑتے ہوئے آدی کے عقب میں انہیں بد ہیئت سا انسانی ہیولا بھی نظر آیا جس نے آج رات میں اس دہشت زدہ شخص کو دبوچ لیا۔ چاند کی روشنی میں یہ ایک ایسا انسان نما جانور نظر آیا جو انہوں نے زندگی میں پہلے ہی نہیں دیکھا تھا۔ اس خوف ناک جانور کی ہیئت اس قدر کریبہ انگیز اور ناقابل یقین تھی کہ ان چاروں کو سکتہ ہو گیا۔

ایک ہیبت تھی جو ان پر اس بری طرح جاری تھی کہ وہ اپنے بدنصیب ساتھی کو بھی اس ہیبت ناک درندے سے پہچانا بھول گئے جو اس کے خونی پنجوں میں بری طرح تروپ رہا تھا۔ تب پھر رحمت نے ہی حرکت کی اور اپنی جیب سے تیش

بور کا پستول نکال کر ایک ہوائی فائر کیا۔ دھماکے کی آواز اس خونی درندے نے اپنے شکار کو چھوڑا اور ان کی متوجہ ہوا۔ رحمت کے تینوں ساتھی اس عجیب درندے کو دیکھ کر بری طرح سے دہشت زدہ ہو گئے ان میں آگے بڑھنے کی جرأت ہی نہ ہو سکی۔

اس درندے کا پورا جسم انسان کی طرح نہ چہرہ..... مگر چھ کی طرح۔ دونوں ہاتھوں کے نیچے بھی بڑے نوکیلے ناخنوں والے تھے۔ اس کے جسم کی کھال بھی مگر چھ کی طرح کھردری اور موٹی تھی۔ اس کے کاندھے ڈھلکے ہوئے تھے۔ وہ ایک وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ رحمت اللہ کی طرف لپکا۔

رحمت اللہ نے اپنے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا اور بے درپے ٹرائیگر دبا تا چلا گیا۔ گولیوں کے دھماکے ہوئے۔ کئی گولیاں اس مگر چھ نما انسان کی موٹی کھال والے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ اس کے حلق سے ایک زوردار غراہٹ ابھری۔

وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا مگر رکنا نہیں اور چشم زدن میں رحمت اللہ کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کے ریوا لور کی گولیاں ختم ہو گئی تھیں۔ اس نے پستول پھینک کر اپنی کھڑی دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی وہ چاہتا تھا کہ اس مگر چھ والے تھوخنے پروار کرے مگر اس سے پہلے ہی اس عجیب الخلفت خونی درندے نے اپنے نوکیلے ناخنوں والا چہرہ اس کے چہرے پر مارا۔

رحمت کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ وہ چیخ مار کر گرا۔ کھڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ اس اثناء میں اس کے ساتھیوں کی غیرت جاگی اور انہوں نے اس درندے پر کھڑکیوں اور لٹھوں سے حملہ کر دیا۔

اس دوران شور شرابے کی آواز پر ان کے دیگر ساتھی بھی وہاں آ پہنچے۔ بس پھر کیا تھا۔ سب نے لٹھیوں اور کھڑکیوں سے اس درندے کو چاروں طرف سے گھیر کر اس پر حملہ کر دیا۔

وہ ساتھیوں نے زخمی رحمت اللہ کو تھمیت کر ایک طرف کر دیا۔

اس عجیب و غریب خونی درندے کی لاش بیچ میدان میں گر گئی اور بستی کے لوگ ہی نہیں بلکہ آس پاس کے علاقوں سے بھی جوق در جوق لوگ آ کر حیرت و خوف بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔